
خیام شناسی
اخلاق احمد آہن

خیام شناسی

اخلاق احمد آہن

از آمدن و رفتنِ ما سودی کو
وز تارِ وجودِ عمرِ ما پودی کو
در چنبرِ چرخ جانِ چندین پاکان
می سوزد و خاک می شود دودی کو

خیام

خیام شناسی

مرتبہ

اخلاق احمد آہن

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

''یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے
نیز شائع شدہ مواد سے اردو کونسل کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔''

KHAYYAM-SHANASI

Edited by: PROF. AKHLAQUE AHMAD 'AHAN'

Centre of Persian and Central Asian Studies
School of Language, Literature and Culture Studies
Jawaharlal Nehru University, New Delhi-67
Ph.:011-26704657(O), akhlaq.ahan@gmail.com

Year of Edition 2017

ISBN 978-93-86486-94-3

₹ 300/-

نام کتاب : خیام شناسی
مرتب و ناشر : اخلاق احمد آہن
مستقل پتہ : پروفیسر، شعبۂ فارسی، اسکول آف لنگویزیز، جواہرلعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔۶۷
سال اشاعت : ۲۰۱۷ء
قیمت : ۳۰۰ روپے   تعداد : ۵۰۰
کمپوزنگ : مغیث احمد
مطبع : روشان پرنٹرس، دہلی۔۶

رابطہ

■ روزورڈ بکس، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۲۵ ■ ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ
■ بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔۴ ■ مکتبہ دین وادب، امین آباد، لکھنؤ
■ کتاب منزل، نزد جامع مسجد، موتیہاری، بہار ■ مکتبہ جامعہ، اردو بازار، دہلی۔۶

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

بسم الله الرحمن الرحيم

انتساب

نانا جان

مرحوم عبدالرحمٰن خاں الٰہ آبادیؒ

کے نام!

اخلاق آلحسن

آورد باضطرابم اول بوجود
جز حیرتم از حیات چیزے نفزود
رفتیم باکراه ندانیم چه بود
زین آمدن و بودن و رفتن مقصود

خیام

فہرست

ج۔ فکر و فلسفہ:

د۔ ترجمہ و تفہیم: ....

مقدمہ

منعم بہ کوہ و دشت و بیابان غریب نیست
ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت
سعدی

خیام کی اقلیم سلطنت تمام عالم پر محیط ہے۔اس کی امارت کے آگے ایک دنیا نے سر تسلیم و نیاز خم کیا ہے۔اس کا طلسم جہانگیر ہے۔اس کی رباعیاں، اس کی زندگی کے گمنام گوشے، اس کا فلسفہ و فکر، اس کے علمی کارنامے، اس کے دوست و معاصر؛ یہ سب گذشتہ ایک صدی سے مشرق و مغرب کے علمی و ادبی حلقوں میں دلچسپی کا موضوع بنے ہوئے ہیں اور ان تمام دلچسپیوں کا نقطہء آغاز ایڈورڈ فٹز جیرالڈ کا ترجمہء رباعیات خیام ہے، جو اس نے پہلی بار ۱۸۵۸ء اور دوبارہ ترمیم و اضافہ کے ساتھ ۱۸۶۴ء میں شائع کیا۔رباعیات خیام کے ان ترجموں کو بھی یکا یک شہرت تو نہ ملی، لیکن جیسے ہی خواص و عوام نے اسے دیکھا، مسحور ہو کر رہ گئے۔پھر دیکھتے ہی دیکھتے عام محفلوں سے علمی محفلوں تک، کلبوں سے میخانوں تک، بازاروں سے درباروں تک ہر خاص و عام کی زبان پر خیام کی رباعیات کا ذکر، ہر بزم میں اس کا چرچا اور ہر سر میں اسی کا نشہ! ایسا لگا جیسے لوگوں کو کوئی گمشدہ دولت ہاتھ آ گئی ہو۔پھر کیا تھا، خیام کے نام پر میخانے آباد کئے جانے لگے، علمی محفلیں سجائی جانے لگیں، مے خاروں نے اس کا نام لیکر جام ٹکرائے، تو فلسفیوں نے اس جام مے میں رموز زندگی کے رنگہائے تازہ دیکھے اور محققوں

نے اس کی رباعیات کے صحیح ترین نسخوں کی تلاش شروع کر دی، اس کے علمی آثار کو موضوع بحث بنالیا۔ خیام کو اپنی ان چند رباعیوں کے طفیل وہ شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی، جس پر اکابر شعراء کے دواوین وکلیات رشک کرنے لگے۔ معروف ایرانی اسکالر مجتبیٰ مینوی نے بجا فرمایا کہ "بلاشبہ شعرائے ایران کے درمیان کوئی ایسا نظر نہیں آتا، جسے خیام کے مانند عالمی شہرت ملی ہو۔" (۱)

بہر کیف، بات مغرب سے اٹھی تھی تو اس کا عالمی ہونا ناگزیر تھا۔ ہندوایران بھی اس شور مغرب سے جاگ اٹھے۔ نسخے اور مخطوطات ٹٹولے جانے لگے۔ قدیم تصنیفات میں اس کا سراغ ڈھونڈا جانے لگا۔ یہاں بھی ہر جگہ رباعیات خیام کی دھوم مچ گئی۔ شاعروں کے تصورات، محققوں کے مقالات، ملاؤں کی تقریروں، پنڈتوں کے پروچنوں، پجاریوں کے بھجنوں، قوالوں کی قوالیوں میکشوں کے جام، عاشقوں کے جنون، طوائفوں کے کوٹھوں اور فلموں کے نغموں میں ان رباعیوں کے راگ سنے جانے لگئے۔ مختصر یہ کہ کہاں کہاں، کس کس کی زبان پر اور کس کس روپ میں اس کا ذکر نہ ہوا اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

''خیام شناسی'' انھیں خوبصورت کڑیوں کو جوڑنے کی ایک کوشش ہے، جو مضامین اور مقالوں کی شکل میں گذشتہ ایک صدی میں مختلف ادبی مجلوں، رسالوں میں منظر عام پر آتے رہے ہیں۔

جیسا کہ معلوم ہے، موجودہ عہد میں اہل مغرب نے خیام شناسی کی باضابطہ داغ بیل ڈالی اور خیام کی شخصیت، اس کے علمی کارناموں اور خاص طور سے اس کی رباعیات کی دریافت اور شناخت میں قابل تحسین محنت وکاوش کا ثبوت دیا۔ خیام کی رباعیات کی تلاش وجستجو جن مغربی محققین نے خاص طور سے جانفشانی اور دقت نظری کا مظاہرہ کیا، ان میں ویلیم جونس، کرسٹن سن، ڈاکٹر روزن، ژوکوفسکی، بودلین اور ہیرون آلن کا نام خاص طور لیا جاتا ہے۔ لیکن، ایسا بھی نہیں ہے کہ فٹز جیرالڈ اور مذکورہ محققین سے قبل مغربی دنیا خیام سے یکسر نابلد تھی، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ مغربی سائنسدانوں نے بوعلی سینا، ابن حوقل، المسعودی وغیرہ جیسے ایرانی اور عرب سائنسدانوں کی طرح عمر خیام کے انکشافات وتحقیقات سے بھی بھرپور استفادہ کیا۔ خیام کے ان مغربی خوشہ چینوں میں خاص طور سے کارڈن ڈیکارٹ اور فیراری کا نام لیا جاسکتا ہے،

۱۔ مجتبیٰ مینوی، پانزدہ گفتار، تہران ۱۳۳۳ شمسی، ص ۳۰۰

جنہوں نے ریاضی میں خیام کی تحقیقات کو پیش نظر رکھا۔

اس کے بعد ہندوستانی محققین اور ناقدین نے اس طرف توجہ دی اور اس ضمن میں گراں قدر تحقیقی کارنامے پیش کیے، جن میں سے چیدہ مقالے اور مضامین موجودہ کتاب میں شامل ہیں۔ ہندوستانیوں کے بعد ایرانی محققین اور علمائے ادب نے بھی اس طرف خاطر خواہ توجہ دی، جن میں محمد علی فروغی، قاسم غنی، سعید نفیسی، مجتبیٰ مینوی، علی دشتی، صادق ہدایت، عباس اقبال آشتیانی وغیرہ کے نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔

یہ وضاحت بھی لازم ہے کہ امر مذکور کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ہند و ایران، شاعر خیام سے یکسر نابلد تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ خیام بحیثیت شاعر ہر دور میں جانا جاتا رہا اور ایران و ہند کے علمی و ادبی حلقوں میں اس کی قدر دانی ہوتی رہی۔ اس کے ثبوت کے طور پر ہمیں دستیاب ہر دور میں اس کی رباعیات کے خوبصورت، مطلا و مذہب مخطوطات کی کاپیوں اور مختلف بیاضوں میں دیگر معروف شعراء کے کلام کے ساتھ خیام کی رباعیات کی موجودگی ہے۔ رباعیات خیام کے قدیم ترین نسخے بھی اس خطے کے کتابخانوں میں دستیاب ہیں۔ ان میں گوری پرشاد سکسینہ کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ۸۲۶ھ (مطابق ۱۴۲۳ء) کا نسخۂ رباعیات خیام ہے، اس کی کتابت قوام بن محمد بن مازندرانی نے کرمان میں کی تھی۔ (۱) اسی طرح ایک دوسرا نہایت اہم نسخہ کلکتہ کے پروفیسر مجیب اشرف ندوی کو دستیاب ہوا، جو سیالکوٹ کے نزدیک پسرور کے رہنے والے منشی دیوی پرشاد پسروری کی ملکیت میں رہا تھا۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ اسے سلطان حسین بایقرا (۸۷۲-۹۱۱ھ مطابق ۱۴۶۸-۱۵۰۵ء) کے لیے معروف خطاط سلطان علی مشہدی نے لکھا اور بہزاد جیسے شہرۂ آفاق مصور نے اپنے ہنر سے آراستہ کیا۔ (۲) یہی نہیں، اس قسم چنانچہ جس فٹز جیرالڈ اور اس کے ترجمہ کے سبب خیام، 'مغرب کے ذریعہ کشف شدہ شاعر' کہلایا، اس فٹز جیرالڈ کو خیام سے متعارف کرانے والا شخص پروفیسر ای۔ جی۔ کوویل کا تعلق ہندوستان کے شہر کلکتہ سے تھا۔ موصوف فٹز جیرالڈ کے فارسی استاد

۱۔ حسن انوشہ، دانشنامہ ادب فارسی، جلد چہارم، بخش دوم، تہران، ص۔۱۱۰۲

۲۔ رباعیات عمر خیام مع انگریزی ترجمہ، مرتبہ ایم۔ محفوظ الحق، کلکتہ، ۱۹۳۹ء، ص۔۱

تھے اور انھوں نے اس کے اندر فارسی شاعری کا ذوق پیدا کیا۔(۱)

بلاشبہ اس سلسلہ کا سب سے دلچسپ حصہ رباعیات خیام کے مختلف ترجموں اور تشریحات کا رہا ہے۔ برصغیر میں یہ سلسلہ سنسکرت، اردو، ہندی، بنگالی کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی شروع ہوا۔ ان میں کچھ براہ راست خیام کی فارسی رباعیوں سے ہوئے، تو اردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں بیشتر فٹز جیرالڈ کے ترجموں کی بنیاد پر، ہری ونش رائے بچن کا معروف ہندی ترجمہ بھی فٹز جیرالڈ کے ترجمے پر ہی مبنی ہے۔ ان کے علاوہ میتھلی شرن گپت، سُمتر انندن پنت جیسے معروف ہندی شاعروں نے بھی رباعیات خیام کے ترجمے کیے اور یہ تعداد ایک درجن تک پہنچتی ہے۔ البتہ اردو شاعر راجہ مکھن لال کو فٹز جیرالڈ پر فوقیت زمانی حاصل ہے، کیونکہ انہوں نے ۱۲۶۰ھ (مطابق ۱۸۴۴ء) میں ترجمہ کیا۔ موصوف اردو میں خیام کے پہلے مترجم ہیں۔ اردو میں یہ سلسلہ بڑا طویل ہے اور آج بھی اسی ذوق وشو ق کے ساتھ جاری ہے۔ ان میں خاص طور سے واقف امروہوی، عبدالحمید عدم، قزلباش دہلوی، میراجی، کاظم علی شوکت بلگرامی وغیرہ کا نام خاص طور سے لیا جاسکتا ہے۔ درست تو یہ ہے کہ فکر وفلسفۂ خیام، اردو شاعری کی خمیر میں سرایت ہوکر اس کا جزو لازم بن گئے ہیں۔

لوگوں میں عام خیال یہ ہے کہ فٹز جیرالڈ نے خیام کی ایک ایک رباعی کا فرداً فرداً ترجمہ کیا ہے اور ایسا سوچنا فطری بھی ہے، کیونکہ مترجم عام طور سے اصل متن پیش نظر رکھ کر اول تا آخر ترجمہ کرتا ہے، لیکن حقیقت اس سے تھوڑی مختلف ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے مستشرق اور خیام شناس ایڈورڈ ہیرون آلن (Edward Herun-allon) نے تحقیق کی۔ اس کی اس تحقیق پر مبنی کتاب ۱۸۹۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کے مطابق فٹز جیرالڈ کے اس ترجمہ میں ۴۹ رباعیاں نسخہ باڈلین یا نسخہ کلکتہ میں شامل ایک ایک رباعی کے آزاد ترجمے ہیں اور ۴۴ رباعیاں دو یا دو سے زائد رباعیوں پر مشتمل ہیں جب کہ باقی ۱۱ رباعیاں دو اشعار منطق الطیر عطار، اشعار حافظ یا خیام کی رباعیوں کے مجموعی تاثر پر مبنی ہیں۔ ایرانی محقق مسعود فرزاد نے بھی اس رائے کی تائید کی ہے۔(۲) علاوہ بریں، دنیا میں موجود رباعیات خیام

۱۔ انڈو ایرانیکا، کلکتہ، جلد۔ ۳۳، شمارہ۔ ۱-۴، مارچ۔ دسمبر ۱۹۸۰ء، ص۔ ۱۱

۲۔ فرزاد، مسعود، منظومۂ خیام وار فیتز جرالد، تہران، ص۔ ۵

کے نسخوں میں موجود اختلافات سے ہر پڑھا لکھا شخص آگاہ ہے، لیکن صرف فٹز جیرالڈ کے پیش نظر نسخوں میں شامل تعداد رباعیات کے فرق کو دیکھیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ ترجمہ شدہ ان رباعیات کا میلان کرنا کتنا مشکل، بلکہ بے سود ہے۔ مثلاً فٹز جیرالڈ نے ۶۰-۱۸۵۸ء میں بڑی کوشش اور تحقیق کے بعد ترجمہ رباعیات خیام کا جو نسخہ شائع کیا، اس میں رباعیات کی تعداد ۷۵ر تھی، جب کہ پیرس میں ایک منقولہ نسخہ میں جو ۱۵۲۷ء کے ایک نسخہ سے نقل کیا گیا تھا، اس میں بھی رباعیوں کی تعداد ۷۵ر تھی۔ دوسرا نسخہ جس کے بارے میں محققین کی رائے ہے کہ فٹز جیرالڈ نے اس سے استفادہ کیا، وہ باڈلین لائبریری آکسفورڈ میں ہے اور یہ نسخہ ۸۶۵ھ یعنی خیام کی وفات کے ۳۴۸ر سال بعد لکھا گیا۔ اس میں ۱۵۸ر رباعیاں ہیں۔ اسی طرح نسخہ کلکتہ، جو ۱۸۳۶ء میں شائع ہوا تھا اور وہ بھی فٹز جیرالڈ کو دستیاب تھا، اس میں ۴۳۸ر رباعیاں ہیں اور اس کے ضمیمہ میں مزید ۵۴ر رباعیاں شامل ہیں۔ اس طرح، اس فرق واختلاف کی ایک لمبی فہرست بن جاتی ہے اور اسی طرح الحاقی اور اصلی رباعیوں کا نزاع بھی اب طویل ہو چکا ہے۔

جہاں تک رباعیات خیام کے ترجمہ کا سوال ہے، تو یہ ترجمے دو طرح کے ہیں۔ ایک تو رباعیات خیام کے مختلف نسخوں کی بنیاد پر مترجمین نے اپنی پسند و انتخاب کے مطابق مختلف زبانوں میں ترجمہ کئے ہیں اور دوم وہ، جو ترجموں سے ترجمے ہوئے ہیں اور یہ خاص طور سے فٹز جیرالڈ کے ترجموں کی بنیاد پر کئے ہوئے ترجمے ہیں۔ یہ بھی اپنی اسلوب و زبان اور افادیت کے لحاظ سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ موخرالذکر زمرے میں حالیہ دنوں میں شائع عبدالرشید اعظمی کا ترجمہ ''میخانۂ عجم'' قابل ذکر ہے۔ مثال کے طور پر ہری ونش رائے بچن کا ہندی ترجمہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ جس نے ہندی ادب کو بڑا متاثر کیا ہے اور آج بھی بے حد مقبول ہے۔

خیام کے تعلق سے اردو میں لکھی گئیں چار تحریریں نہایت اہم ہیں، جنہیں ہم اردو میں خیام شناسی کا ڈھانچہ کہہ سکتے ہیں اور جن کے اردگرد یہ پوری عمارت بنائی اور سنواری گئی ہے۔ پہلی تحریر ابوالنصر آہ دہلوی کی ''الخیام'' ہے، جسے اس کی مضبوط بنیاد کہا جا سکتا ہے، دوسری مولانا

شبلی کی، جو موصوف کی معروف زمانہ تصنیف ''شعر العجم'' کا حصہ ہے، تیسری سید سلیمان ندوی کی ''خیام'' ہے، جو نہ صرف اردو میں خیام سے متعلق سب سے جامع کتاب ہے، بلکہ اسے دوسری زبانوں، بشمول فارسی کی بیشتر تحقیقی کاوشوں پر فوقیت حاصل ہے اور چوتھی عبدالباری آسی کی بعنوان ''رباعیات خیام پر تحقیقی نظر''، جس میں انھوں نے الحاق و مناسبت اور خیام کی شاعرانہ حیثیت کے حوالے سے محتاط روش کی بنیاد پر وسط و بسط سے بحث کی گئی ہے۔ البتہ، راقم کی اطلاع میں غالباً خیام پر اردو میں پہلا مقالہ ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ کے رسالہ معارف میں شائع ہوا، جسے مولوی غلام الثقلین، انسپکٹر مدارس گلبرگہ نظام نے بعنوان ''عمر خیام کا فلسفۂ زندگی'' تحریر کیا تھا۔ یہ مضمون اس وقت شائع ہوا، جب ہندوستان میں خیام سے متعلق شورِ مغرب کا غلغلہ پہنچ رہا تھا۔ اس مضمون کے تمہیدی حصہ سے بھی اس بات کا عندیہ ملتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اس مضمون کی ادبی و تاریخی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ ان نگارشات میں سے سید سلیمان ندوی کی ''خیام'' اور شبلی کے مضمون کے علاوہ، بقیہ تمام تحریریں شامل کتاب ہیں۔

اردو حلقہ میں خیام سے متعلق گذشتہ ایک صدی کی اس علمی بحث کے تنوع کے پیش نظر اسے چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اور اس کے تحت ہر باب میں قریب المفہوم مضامین کو جمع کیا گیا ہے۔ یہ ابواب بعنوان؛ تعارف و تنقید، تحقیق و تفحص، فکر و فلسفہ اور ترجمہ و تفہیم ہیں۔ یہ مختلف ابواب شاید مضامین کی رنگارنگی پر زیادہ روشنی ڈال سکتے ہیں، ورنہ عموماً خیام کی شخصیت کے کسی پہلو کو اکثر و بیشتر ان کے نام کو عنوان بنا کر ہی لکھا جاتا رہا ہے۔ یہ روش خود خیام کے طلسم و سحر کاری کی دلیل ہیں۔ اگر چہ خیام سے متعلق مضامین کی یہ فہرست خاصی طویل ہے اور اگر اس کے ساتھ ان دیباچوں اور مقدموں کو بھی شامل کر لیا جائے، جو خیام کے اردو تراجم میں آئے ہیں، تو یہ فہرست مزید طویل ہو جاتی ہے۔ البتہ موجودہ کتاب میں اس بحثِ طولانی کے اہم سنگہائے میل کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جس سے ہندوستان میں گذشتہ ایک صدی کی خیام شناسی پر نہ صرف خاطر خواہ روشنی پڑتی ہے، بلکہ پوری علمی دنیا میں خیام کے تعلق سے جو مباحث ہوئے ہیں، ان کا بھی بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

پہلے باب میں ابوالنصر غلام یٰسین آہ دہلوی کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد، جواد علی خان عالی، انور مسعود اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے مضامین شامل ہیں۔ان میں مولانا ابوالکلام آزاد کے بڑے بھائی ابوالنصر غلام یٰسین آہ دہلوی کا اہم مضمون ''الخیام'' بڑی اہمیت کا حامل ہے۔اس مضمون کی خوبی یہ ہے کہ موصوف نے جب خیام پر قلم اٹھایا اور ظاہر ہے ان کے پیش نظر مغربی غلغلہ بھی تھا تو کہیں نہ کہیں یہ دغدغہ بھی رہا ہوگا کہ روایت پسند اور دقیانوسی نقطۂ نظر کا حامی قاری، ان کو بھی انہیں بنیادوں پر تنقید کا نشانہ بنائے گا، جن کی بنیاد پر سلف نے خیام سے احتراز کیا،لیکن انھوں نے بڑی بے باکی اور صاف گوئی سے اپنی بات پیش کی، کیونکہ ان کو خیام کے آزاد خیال اور مذہب بیزار ہونے کے یقین کے باوجود اس کی علمی وادبی عظمت کا پورا اعتراف تھا۔یہ مضمون پہلے احسن الاخبار، کلکتہ میں ۱۹۰۲ء میں قسطوں میں شائع ہوا اور بعد ازاں ۱۹۰۳ء میں کتابی صورت میں بعنوان ''الخیام'' چھپا۔اس کی اہمیت یہ ہے کہ اردو میں خیام پر شائع ہونے والی یہ پہلی کتاب تھی۔اگر چہ اس سے پہلے بھی خیام کے حوالے سے مضامین اخبارات ورسائل میں شائع ہورہے تھے،لیکن یہ اس وقت تک کا سب سے مبسوط اور جامع مضمون تھا، چنانچہ بعد کی کتابوں اور مضامین میں اس کتاب میں پیش کردہ تفاصیل وجزیات کی پیروی یا انہیں سطور پر زیادہ مفصل اور محققانہ بحثیں ملتی ہیں۔البتہ یہ اغلاط سے پر ہے، جس کی تصحیح حواشی میں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ان فروگذاشتوں سے قطع نظر یہ پہلو بھی قابل توجہ ہے کہ انہوں نے بعض ایسے معاصر ایرانی مآخذ سے استفادہ کیا ہے، جن کا سراغ ان کے بعد لکھنے والوں کے یہاں بھی نہیں ملتا۔یہاں تک کہ خود سلیمان ندوی کی معرکۃ الآراء کتاب ''خیام'' بھی ان مآخذ کے بارے میں خاموش ہے۔انور مسعود نے اپنے مضمون میں شرق وغرب میں ہوئے اب تک کی تحقیقات ومطالعات کا اجمالی جائزہ لیا ہے۔اس کے ساتھ ہی اس مضمون کا ایک بڑا حصہ رباعیات کی تشریح وتوضیح پر مشتمل ہے۔سید صباح الدین عبدالرحمٰن کا مضمون اس نقطۂ نظر سے بڑا اہم ہے کہ انہوں نے دو اہم خیام شناس،شبلی اور سید سلیمان ندوی کی تحریروں کا نہ صرف تعارف کرایا ہے، بلکہ ان کے منتقدین، جن میں محمود شیرانی اور ان کے حلقۂ علمی سے وابستہ پروفیسر محمد اقبال وغیرہ کی تنقیدوں کا جواب دینے کی کامیاب سعی بھی کی ہے۔اس سے اس زمانے میں خیام شناسی سے متعلق پوری بحث کا اندازہ بھی ہوجاتا ہے۔

دوسرا باب تحقیقی مضامین کا ہے۔ پروفیسر محمد اقبال مکتب شیرانی کے پروردہ ہیں اور برصغیر کے اہم فارسی محققین میں ان کا نام لیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے خیام کے تعلق سے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی کارنامے انجام دئے ہیں، جن میں رباعیات یا نگارشات خیام کے نئے نسخوں کی اہمیت و افادیت سے بحث اور ان کا تعارف، الحاقی رباعیات کا مسئلہ وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر امیر حسن عابدی، جنہوں نے مخطوطات کی تلاش و جستجو اور غیر مطبوعہ اشعار کے حوالے سے بے حد اہم کام انجام دیے ہیں، اپنے مضمون میں کچھ ایسی رباعیات کی نشاندہی کی ہے، جو اب تک کسی مجموعۂ رباعیات خیام میں شامل نہیں۔ شبیر احمد خاں غوری نے خیام کے علمی کارناموں کے ان پہلوؤں کو چھوا ہے، جنہیں عام طور سے نظر انداز کیا گیا ہے اور وہ ہیں، ریاضیات میں خیام کے انکشافات و کارنامے اور تفسیر کبیر میں خیام کا حوالہ۔ فارسی تحقیق میں پروفیسر نذیر احمد کا نام سند کا درجہ رکھتا ہے۔ آپ نسخوں کی جستجو و تلاش اور بے شمار منابع کے حوالے سے بحث کرتے ہیں۔ مولانا عرشی نے خیام کی شخصیت اور کارناموں سے متعلق بعض پہلوؤں پر تحقیقی بحث کی ہے، ان میں سے ایک مضمون شامل کتاب ہے اور خاقانی سے عمر خیام کی قرابت داری کے حوالہ سے پھیلی غلط فہمیوں کا ازالہ کرتی ہے۔ بقیہ دو مضامین ''مقالات مولانا عرشی'' میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ دونوں مضامین، رباعیات عمر خیام کے نسخوں اور رباعیات کے مآخذ کے بارے میں خیام شناس مستشرقین کی تحقیقی کاوشوں پر معتد بہ اضافہ ہے۔ چنانچہ موصوف نے دوسرے قدیم نسخوں کی دریافت اور نئی رباعیات کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ متعلقہ حقائق کی بازیافت کی خاطر رباعیات کی تشریح و تفہیم اور فصاحتِ الفاظ کے بارے میں جس دقت نظری سے بحث کی ہے، وہ قابل تعریف ہے۔

کرنل بھولا ناتھ اردو کے ان خیام شناسوں میں ہیں، جنہوں نے اس موضوع پر ابتدائی دنوں میں قلم اٹھایا اور رباعیات خیام کے مذہبی اور متصوفانہ پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی۔ البتہ برہان احمد فاروقی نے جس وقیع انداز سے فلسفۂ خیام کے حوالہ سے مشرق و مغرب کی طرز فکر میں بنیادی فرق، فکر و فلسفۂ خیام کی امتیازی خصوصیات اور مغرب میں اس کی مقبولیت کے مختلف عوامل پر جو مدلل بحث کی ہے،

وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ساتھ ہی حسان ندوی کا ملخص اور ترجمہ شدہ مضمون عرب دنیا میں خیام کے متعلق مباحث پر روشنی ڈالتا ہے۔

ترجمۂ وتشریحاتِ رباعیات خیام، خیام شناسی کا سب سے دلچسپ پہلو ہے۔ اس ضمن میں یوسف سرمست نے، اردو میں سب سے پہلے ترجمہ کی نشاندہی کر کے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ ساتھ ہی اس ترجمہ کی خوبیوں پر بھی بحث کی ہے۔ ضیا احمد ایم۔ اے، خاقان حسین عارف اور اکبر حیدری کاشمیری نے اپنے مضامین میں مختلف اردو ترجموں کا ذکر کیا ہے اور ان کا تنقیدی موازنہ بھی پیش کیا ہے۔ ایک مختصر مضمون کلکتہ کے مشہور فارسی استاد محمد اسحاق کا مترجمِ خیام فٹز جیرالڈ کے بارے میں ہے، لیکن ایمانداری کی بات یہ ہے کہ یہ مضمون اپنی افادیت کے لحاظ سے آج بھی اتنا ہی تازہ، معلوماتی اور دلچسپ ہے، جتنا آج سے ستر سال پہلے تھا۔ محمود واجد نے اپنے مضمون میں بڑے اختصار کے ساتھ نہ صرف خیام اور بچن کی شاعری کا موازنہ اور تجزیہ کیا ہے، بلکہ اسی کے ذیل میں فارسی، اردو اور ہندی شاعری کے خوبصورت رشتہ کی بھی صحیح تصویر پیش کی ہے۔ سید علی عباس جلال پوری نے مصوری کے ذریعہ رباعیات خیام کی خوبصورت تشریح کرنے والے فنکار اکبر تجویدی کی مصوری کی تصویر کشی کی ہے۔

امید ہے، اہلِ ذوق وادب، اس کتاب کے مشتملات سے محظوظ ہوں گے۔ قارئین حضرات کی آراء اور مفید مشوروں کا انتظار رہے گا۔

آخر میں ان تمام حضرات کا تہہ دل سے شکر گذار ہوں، جنھوں نے اپنے مفید مشوروں سے نوازا اور حوصلہ افزائی کی۔

اخلاق احمد آہن
پروفیسر، سینٹر آف پرشین اینڈ سنٹرل ایشین اسٹڈیز
جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔ ۶۷
akhlaq.ahan@gmail.com

الخیام

ابوالنصر غلام یٰسین آہ دہلوی

بیا گرافی: اثارا لسلف عبرۃ للخلف

گاہے گاہے بازخوان این دفتر پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہاے سینہ را

تمہید: 'بیا گرفی' ایک یونانی لفظ ہے، جس کے معنی سوانح عمری سے ملتے جلتے ہیں۔ یہ علم تواریخ کی شاخ ہے اور ایسی شاخ، جس نے تاریخ کے سرسبز درخت کی رونق دونی کردی ہے۔ تاریخ کی ضرورت، تاریخ کے فوائد، اور تاریخ کی خوبیاں محتاج بیان نہیں۔ علامہ رازی (صاحب تفسیر کبیر) نے سورۂ فاتحہ سے تقریباً دس ہزار مسئلے استخراج کیے ہیں اور دکھا دیا ہے کہ کیا اصول، کیا فروع، کیا عقائد، کیا عبادات، سب کچھ اسی مبارک سورت میں ہے اور یہ فضائل علوم کی مبداء ہے۔ آخر میں انعمت علیھم غیرا لمغضوب علیھم ولا الضالین سے علم تواریخ اور تاریخ کی ضرورت ثابت کی ہے۔ اگلی امتوں میں فلاں جماعت سعید اور فلاں جتھا شقی تھا۔ اجی یہی تو علم تواریخ ہے اور کسے کہتے ہیں؟

اے صراط مستقیم پر چلنے والو! ہماری مقدس کتاب اور کلام پاک میں ایک جگہ نہیں،

سیکڑوں جگہ پر انبیاء کے قصص ہیں۔ سیکڑوں مقام پر پہلی امتوں کے تذکرے ہیں۔ ہمارے رسول مقبول صلے اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم مختلف بیانات میں مخاطب بنائے گئے ہیں جیسے الم تر کیف فعل ربك باصحاب الفیل۔ کیا نہیں دیکھا تو نے (یا محمدؐ) تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیسا (برتاؤ) کیا۔ بس ایسے ایسے واقعات ہی کے مجموعے تواریخ کی کتابیں کہی جاتی ہیں، جن کا فرض منصبی نصیحت ووعظ کے علاوہ عبرت کا سبق دینا ہے۔

قرآن شریف کے تقریباً ۱۸/ پارے پندونصیحت اور قصص واخبار میں ہیں اور ۱۲/ پارے احکام شرع حرام وحلال میں ۔اس زیادتی نے تواریخ کے فوائد ثابت کیا کیے ہیں، ہمیں ہدایت کی ہے کہ ہم بھی اپنے سلف صالح کے حالات دیکھ سن کے راہ راست اختیار کریں، کیوں کہ بڑوں کے اخلاق کا اثر چھوٹوں پر پڑتا ہے۔ اگلوں کی اچھی باتیں ہمیں بری باتوں سے دور رکھیں اور اگلوں کی بری باتیں دیکھنے میں آئیں تو ہم ان سے اجتناب کریں، جیسا قرآن شریف میں اگلی امتوں کی نافرمانی بھی بیان کی گئی ہے اور فرمانبرداری بھی۔

اے جاتی دنیا کے شیدائیو! اے چودھویں صدی والو! آؤ اور تاریخی واقعات کے فیوضات سے بہرہ اندوز ہو۔ آؤ اور سلف کی لائف کے ورق الٹو! تم نہیں جانتے کہ اگلوں کی نمایاں ترقیاں تمہارے کہاں تک حوصلے بلند کرتی ہے۔ تمہاری زندگی ایک کالبد بیجان ہے۔ روح کی خواہش ہے تو سلف کی سوانح عمری، ارباب تصوف کے مقالات (جو روحی قوت بڑھانے کے سوا دنیاوی امور میں بھی بکار آمد ہیں اور جنھیں تصوف والے، غذائے روح سے تعبیر کرتے ہیں) نظر تعمق سے دیکھو اور سنو!

سلف کے تذکرے غیرت اور عبرت کے نمونے ہیں، جن سے انسانی خصائل اور طبیعت کی اچھی طرح اصلاح ہوتی ہے۔ بزرگوں کی نیک نیتی اور پاکبازی اس امر پر مجبور کرتی ہے کہ تم بھی اگر ایسے نہیں بن سکتے تو ایسے ہونے کی کوشش ضرور کرو۔ بزرگوں کی دانشمندانہ اور حکیمانہ کاروائیاں تمہارے لیے عمدہ معیار ہیں۔ اگلوں کے

استقلال اور ہمتیں تمہارے استقلال اور ہمتیں بڑھا دیتی ہیں۔غرض کہ آدمی بننا چاہے تو سلف کے حالات اور واقعات پڑھے۔

تاریخ پر غور کرنے سے دنیا کا رنگ، زمانہ کی رفتار، عالم کی بیوفائی ظاہر ہوتی ہے۔ سلف کے ناموروں کے حالات یہ بتادیتے ہیں کہ ماحصلِ عمرِ انسان کیا ہے! رنج وغم خوشی ونشاط کسے کہتے ہیں۔ بقاوفنا کس شے کا نام ہے۔آدمی ذرے سے آفتاب کیوں کر بن سکتا ہے۔خصائل ذمیمہ کے مفاسد، جن سے عالم بھر کو تکلیف پہونچتی ہے، کیا ہیں؟ دنیا میں کون اچھے ہیں اور کون برے؟ ہمیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے؟ اچھی باتیں اخلاق کو کہاں تک درست کرتی ہیں اور بری باتیں اپنا زہریلا اثر کہاں تک ڈالتی ہیں؟ اور پھر ان سب کے نتائج کہ

از مکافاتِ عمل غافل مشو
گندم از گندم بروید جو ز جو

اسماء الرجال اور تاریخ کی کتابیں اس امر کی شہادت دیتی ہیں کہ اس فن کی داغ بیل قدیم زمانے میں پڑ چکی ہے، مگر اس کو کیا کیجیے کہ یورپ کی تذکرہ نویسی کے اصول اور مطالب سے ان پر پانی پھیر دیا ہے۔اجی وہ لائف ہی کیا، جس میں زندگی کا ہر پہلو نہ دکھایا گیا ہو، واقعے پر بحث نہ ہو، روایت درایت میں چھان بین نہ کی گئی ہو۔

کیا عربی تاریخیں، کیا فارسی تاریخیں، اصل مطلب فوت اور فروعی بحثیں اول سے آخر تک دیکھ ڈالیے، بہت ایسے ناموروں کے حالات نظر سے گزرے ہیں، جن کا سال وفات وولادت تک نہیں۔ان کی تصنیفات کی طرح ازواج واولاد کا ذکر ندارد اور معاشرت کے سوا ترقیوں کا بیان القط۔بھلا یہ بھی کوئی تذکرہ نویسی کا طریقہ ہے۔

التماس: مجھے اس بات کا نہایت افسوس ہے کہ میں خیام کی تمام زندگی پر ایک سرسری نگاہ تک نہ ڈال سکا۔اس میں اگر خطا دیکھیے تو میری نہیں اور ہے بھی۔

'خطا' یہ کہ مجھے علمیت نہیں۔شاید کچھ کا کچھ سمجھ گیا ہوں۔'بے خطا' یوں ہوں کہ

تذکرہ نویسی کے وہ اصول، جو ہمارے سلف نے قائم کیے تھے اور جن کی بنا پر تذکرہ نویسی کا بازار گرم تھا، اس وقت کی ضرورتوں کے لیے ناکافی ہی نہیں، بلکہ سلف کے عجیب وغریب کارناموں کی پاکیزہ صورت پر گمنامی کی سیاہ خاک بھی مل دیتے ہیں۔ اجی تذکروں کی بھرمار ہوئی تو کیا ہوا، مطلب کی بات کسی میں نہیں۔ بہر کیف، جس قدر مجھے مدد ملی ہے، میں اللہ کا شکرادا کرتا ہوں اور مختصر طور پر خیام کے حالات قلمبند۔ اگر خدا نے چاہا تو عنقریب اس کا دوسرا حصہ ملک میں پیش کروں گا۔

خیام سے تعصب: ایسے بہت پاک نفس مؤرخ گزرے ہیں، جنہوں نے خیام کو حد درجے کا ذلیل اور گناہ گار یا کافر سمجھ کر اپنی تصنیفی مجلس میں آنے کی اجازت نہ دی اور باہر ہی باہر ٹال دیا، تاکہ کوئی گروہ صرف شمولیت کی وجہ سے خیام کو نیک یا مسلمان نہ سمجھ لے۔ ''حسن الظن من حسن العبادۃ'' مانا، مگر کیا ضرور ہے کہ خیام جیسے بد اور گناہگار شخص کی نسبت ہو، حسن ظن کے لیے کیا اور نہیں ہیں؟ کھینچ تان کے مسلمان بنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر کچھ مسلمانی نام کی باقی ہے، جب بھی کافر۔ غرض کہ ایسے ایسے خیالات نے خیام کے حالات لکھنے نہ دیے اور خیام کے پورے سوانح کی کشتی ابھر نہ سکی۔ مولانا جامی علیہ الرحمتہ نے (۱) حافظ، سعدی، خاقانی، اوحدی، عراقی، مغربی (وغیرہا) کے حالات تو لکھے، مگر غریب خیام کو اسلام کے دائرے کے باہر سمجھ کر ذکر تک نہیں کیا۔ کیا خیام کی رباعیاں تصوف کی پُرکار رنگ سے رنگی ہوئی نہیں ہیں؟ کیا وہ ذی علم نہ تھا؟ کیا وہ مشہور بالاسلام نہ تھا؟ پھر کیا وجہ تھی کہ اس کا ذکر تو بجائے، خود کسی جگہ نام تک نہیں لیا اور کچھ انھیں پر یہ الزام نہیں ہے، بلکہ اسی طرح اور مؤرخ بھی (تعصب کی وجہ سے) تاریخی حالات کا خون کر گئے ہیں۔

افسوس کسی کو یہ خیال نہ آیا کہ اچھا بھئی اس کی مدح نہ کریں، اسے نیک نہ کہیں، مگر جیسے برے بھلے اس کے حالات مشہور ہیں، وہ تو حوالۂ قلم کر دیں۔ یہ کون کہتا ہے کہ تم

ستایش کرو۔ جیسا ہے ویسا تو کہہ دو۔ اپنا فرض منصب تو ادا کرو۔ آگے سمجھنے والے، خود سمجھ لیں گے۔ ایسی بخالت سے فائدہ؟ نتیجہ کچھ نہیں۔ اگر ایک نے کل حالات نہیں لکھے، دوسرے نے ادھورے ہی لکھ کے اپنی محدود واقفیت کا اعتراف کیا ہوتا۔

بے تعصب مورخین کی کتابیں: ذیل کے نقشے میں ان کتابوں کا نام لکھا جاتا ہے، جن میں خیام کے حالات (عام اس سے کہ تفصیلی ہوں یا اجمالی) قلمبند کیے گئے ہیں:

(نام کتاب)	(نام مصنف و کیفیت)
۱۔ نظام الارواح	(۲) مولانا محمد شہرزوری
۲۔ مرصاد العباد	ملا نجم الدین رازی۔ یہ کتاب ۶۲۰ ھ میں لکھی گئی۔ (۳)
۳۔ تاریخ الحکما	ابن القفطی۔ (۴)
۴۔ جامع التواریخ	رشید الدین، یہ کتاب ۱۲۸۳ء میں تصنیف ہوئی۔ (۵)
۵۔ تذکرہ دولت شاہ	(۶)
۶۔ اطہر البلاد	(۷) زکریا قزوینی در جغرافیہ عربی
۷۔ مجمع الفصحا	علامہ رضا قلی خان ہدایت، یہ کتاب دو جلدوں میں ہے (مطبوعۂ ایران) (۸)
۸۔ جیب السیر	(۹)
۹۔ چہار مقالہ	مولانا نظامی عروضی سمرقندی (۱۰)
۱۰۔ تذکرہ حسینی	میر حسین دوست خان
۱۱۔ نتائج الافکار	مولانا محمد قدرت اللہ خاں گوپاموی، یہ کتاب ۱۲۵۹ء میں مطبوع ہوئی۔
۱۲۔ لائف آف خیام	ڈاکٹر اے۔ ٹی۔ راس (۱۱)، یہ کتاب مختصر تو ہے، مگر صاحب کتاب نے بڑی تحقیق سے کام لیا ہے۔
۱۳۔ روضۃ الصفا	اخوند شاہ (۱۲)

۱۴۔حالات خیام مرزا محمد شیرازی، یہ کتاب ۱۲۹۷ہجری میں مطبوع ہوئی۔(۱۳)

۱۵۔تاریخ الفی (۱۴)

۱۶۔انسائیکلو پیڈیا (بریٹانیکا) پروفیسر ہرمین، اے۔ٹی کا مضمون

۱۷۔آتشکدۂ آذر لطف علی خاں آذر۔(۱۵)

۱۸۔تاریخ سرجان ملکم اس میں خیام کا ذراسا ذکر ہے۔

۱۹۔فردوس التواریخ اس میں ۱۴۰۵ء کے واقعات مندرج ہیں۔(۱۶)

۲۰۔سوانح امام عمر خیام مطبوعۂ ایران

۲۱۔خیابان پارس

خیام کا نام: تمام مورخین خیام کا نام 'عمر' بتاتے ہیں اور پروفیسر ہرمین صاحب ''غیاث الدین ابوالفتح'' بھی عمر ہی کا نام لکھتے ہیں۔خیام (بفتح اول و بہ تشدید ثانی، بمعنی 'خیمہ دوزندہ') تخلص تھا۔راس صاحب اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اس کا پیشہ خیمہ دوزی نہ تھا، بلکہ اپنے باپ کے پیشہ کی وجہ سے یہ خیام کے لقب سے مشہور ہوگیا۔ایک اسلامی مؤرخ لکھتا ہے کہ 'عمر' جس نے لقب 'خیام'، یعنی 'خیمہ ساز' کا غالباً اپنے باپ کی خیمہ سازی کی تجارت کے باعث پایا ہوگا۔ایک ایرانی سوانح نویس لکھتا ہے کہ اس کی فروتنی اور شکستہ دلی کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوگی کہ اس نے اپنا تخلص 'خیام' رکھا۔

خیام کا باپ اور اس کا پیشہ: خیام کے باپ کا نام ابراہم تھا، جس پر مشرق و مغرب کے مورخین کا اجماع ہے۔ابراہیم کا پیشہ خیمہ اور چادر دوزی کے سوا اور کچھ نہیں بتایا جاتا ہے۔راس صاحب بھی لکھتے ہیں کہ خیام کے باپ کی جانب اگر چادر درزی کی نسبت کی جائے تو یہ بات مفید یقین ہوسکتی ہے۔بعض کا قول ہے کہ خیام کا باپ خیمہ درزی نہیں کرتا تھا، بلکہ خیمہ کی تجارت کرتا تھا۔ایک ایرانی مورخ لکھتا ہے کہ اس حکیم کے والد کا پیشہ چادر اور خیمہ درزی تھا۔اس نے بھی اوائل عمر میں یہی پیشہ ختیار کیا، مگر کچھ دنوں بعد اس پیشہ سے اس کی طبیعت اکتائی تو اسے خیر باد کہہ کے

نیشاپور کو سدھدرا۔ میں کہتا ہوں، تجارت اور مزدوری میں کچھ عیب ہے کہ صاحب خاندان میں بٹہ لگ جائے گا۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے کپڑے کی تجارت کی تھی۔ شاید یہ سن کے کہا جائے کہ امت کو نبیوں سے کیا نسبت ہے؟ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ تو سنیے اوائل عمر میں حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کپڑے کی دکان کی تھی۔ دیکھو امام کردریؒ نے آپ کے تقویٰ کے بیان میں تھانوں کے فروخت کا ذکر کیا ہے یا نہیں؟ اگر خیام بالفرض خیمہ درزی کرتا تھا، تو کونسا برا کام کرتا تھا۔ ابھی تک حرمین شریفین میں بڑے بڑے امام، مشائخ، مدرس و واعظ حلال وجہ کی کمائی سے پیٹ پالتے ہیں، تو کیا ان کی علمیت ولیاقت کی سفید چادر پر معاذ اللہ داغ پڑ گئے؟ نہیں کبھی نہیں۔ تجارت یا مزدوری منفی لیاقت وقابلیت نہیں ہے، بلکہ مفت کے ٹکڑوں سے یہ بدرجہا بہتر ہے، جسے اللہ تعالےٰ توفیق دے۔

خیام کی ولادت اور جائے ولادت: خیام کس سنہ میں اور کہاں پیدا ہوا؟ یہ دو تاریخی سوال ہیں، جن کا صحیح جواب دینا کسی قدر دشوار ہے۔ مورخین کا اختلاف کوئی رائے قائم ہونے نہیں دیتا، مگر جہاں تک ہماری واقفیت ہے ہم بیان کیے دیتے ہیں۔

پہلے سوال کی نسبت جنہوں نے صرف 'ماندری' کہہ کے سر سے بلا ٹال دی ہے، وہ تو سستے چھوٹے اور خاصے رہے، مگر جنہوں نے سال ولادت لکھا ہے، انھیں ثبوت پہونچانے میں خدا جانے کیا کچھ دقتیں درپیش آئی ہوں گی۔ پہلی جماعت دوسری سے کہیں مزید ہے، جس نے خیر سے سال ولادت ہی اڑا دیا ہے۔ بہر کیف، ہمیں تو دوسری جماعت سے سروکار ہے، جس کے اقوال ذیل میں قلمبند کیے گئے ہیں:

۱۔ ۴۵۵ ہجری میں ولادت ہوئی۔ (۱۷)

۲۔ ۵۱۸ھ مطابق ۱۱۰۰ء میں دنیا کے اسٹیج پر خیام نے قدم رکھا۔

۳۔ سلاطین سلجوق الپ ارسلان اور ملک شاہ کا مشہور وزیر نظام الملک (جس کی ولادت ۴۰۸ھ (۱۰۱۷ء) میں مان لی گئی ہے) اپنی ایک تصنیف میں لکھتا ہے کہ عمر میری

ہی عمر کا تھا اور میرے ساتھ نیشاپور کے کالج میں درس لیتا تھا۔ میرے نزدیک پہلا قول اصح ہے۔

اب رہا دوسرا سوال کہ خیام کہاں پیدا ہوا؟ جس کے جواب میں مورخین کے دو فریق ہیں:

پہلا کہتا ہے کہ یہ زندہ دل حکیم نیشاپور کے کسی قریہ میں پیدا ہوا اور کچھ دنوں تک اپنے باپ کا پیشہ اختیار کیا، پھر ترک کر دیا۔

دوسرا فریق کہتا ہے کہ یہ حکیم شہر نیشاپور ہی میں پیدا ہوا اور باپ کے پیشے کے نزدیک تک نہیں گیا۔ تحصیل علوم میں مشغول رہا۔ فریق اول نے قریہ کا نام نہیں لکھا ہے، بلکہ یونہی 'کسی قریہ' لکھ دیا ہے۔ قطع نظر اس کے، میرے نزدیک تو فریق ثانی کا قول معتبر ہے۔ واقعی خیام کی ولادت بھی نیشاپور کی ہے، اس کا قیام بھی نیشاپور میں ہی رہا اور وفات بھی نیشاپور ہی میں ہوئی۔

نیشاپور: نیشاپور کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ خراسان کے مشہور شہروں (مرو، بلخ اور بخارا) میں شمار ہونے والا شہر لفظ 'نو' اور ''شاپور'' سے مشتق ہے۔ اس کی آبادی سے زیادہ اس کی بربادی رہی۔ پہلے تو اسے سکندر اعظم نے بری طرح تباہ برباد کیا اور بارہویں صدی عیسوی کے نصف میں (جب کہ بالاتفاق خیام کا انتقال ہو چکا تھا) سلطان سنجر نے اسے برباد کرنے میں جو کچھ کمی کی تھی، مغلوں نے بعد کو اپنے خونی چہروں سے تلافی کر دی اور پھر تو ہمیشہ کے لیے نیشاپور تختۂ مشقِ ستم ہو گیا۔

جو زبردست اٹھا اجاڑ کر چلتا ہوا۔ ادھر تو نیشاپور یوں مورد آفات رہا اور ادھر اس کی تباہی کی دوسری صورت زبردست 'زلزلوں' کے بھیس میں نظر آئی، جس نے حتی المقدور دست قدرت کی دستگیری سے حرف غلط کی طرح صفحۂ دنیا سے نیشاپور کو مٹانا چاہا تھا، مگر ہائے سخت جانی کو کیا کیجیے کہ ہزار کوششیں ہوئیں کہ اب نیشاپور (شاپور کا بسایا ہوا شہر) لوگوں کے دل سے کسی مرنے والے کی یاد کے طرح نکل جائے، مگر

صاحب نیشاپور کو تو دنیا بھر میں خیام کی وجہ سے مشہور ہونا تھا، کیونکر نابود ہوتا؟ آباد ہوا اور مشہور ہوا اور اچھی طرح مشہور ہوا۔ جس طرح شیراز حافظ کی شہرت کے قدم بقدم رہا۔

تعلیم: جو فریق یہ کہتا ہے کہ خیام نیشاپور کے کسی قریہ میں پیدا ہوا تھا، اس کا بیان ہے کہ خیام آبائی پیشہ ترک کر کے نیشاپور پہنچا اور مدرسہ دارالعلوم میں داخل ہو گیا، جس کے پروفیسر امام موفقؒ تھے اور جس فریق کا بیان ہے کہ نیشاپور خیام کا مولد ہے، وہ کہتا ہے کہ خیام نے سترہ برس کی عمر میں ابوالمفاخر محمد بن منصورؒ کی شاگردی کی اور ستائیس برس کی عمر تک فقہ، حدیث، اصول تفسیر کے علاوہ فلسفہ، حکمت، ریاضی اور نجوم میں پہلے درجہ کی مہارت پیدا کر لی۔ راس صاحب نے بھی مانا ہے کہ خیام، حافظ قرآن اور علم حدیث، ادب اور حکمت میں کامل تھا، مگر علم نجوم دہیئت وریاضی میں اس کے جھنڈے گڑے ہوئے تھے۔ خیام نے بالخصوص علوم عقلیہ کی جانب توجہ کی اور کیوں نہ کرتا جب کہ فلسفہ وغیرہ کا نہایت زور شور تھا۔

علوم عقلیہ کی گرم بازاری: ہجری کی پانچویں صدی میں علاوہ تفسیر، فقہ، حدیث اور اصول کے فلسفہ، منطق، طبیعت، الٰہیات، سحر، نجوم اور ریاضی کا بڑا چرچا پھیلا ہوا تھا۔ علوم عقلیہ کے لق ودق میدان طے کرنے والے بڑی عزت سے لیے جاتے تھے۔ اس کی ایسی گرم بازاری نہ تھی، جسے گرم بازاری کہیے! خصوصاً فارسی میں فلسفہ اور نجوم وریاضی کی شان ہی بدل گئی تھی۔ ان کے وہاں علوم عقلیہ کے بحر ذخار بہتے تھے۔ ہر مسئلہ میں کانٹ چھانٹ اور بات بات میں عقلی دلائل اور اس پر بھی اکتفا نہیں۔ دہری کچھ کہتے تھے، ملاحدہ کچھ کہتے تھے، متکلمین کچھ کہتے تھے، تعلمین کچھ کہتے تھے، زندقہ کچھ کہتے تھے، فرقۂ امامیہ باطنیہ کچھ کہتا تھا۔ غرض کہ ایک طوفان بے تمیزی برپا تھا۔ ایسے زور وشور میں سیکڑوں عالموں نے علوم عقلیہ کی کچی رسی تھام لی۔ بہتوں نے لغزشیں کھائیں، بہت سنبھلے رہے۔ یہاں تک کہ حضرت امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ کے مذہب میں بھی انقلاب واقع ہوا اور کچھ دنوں مختلف مذاہب کے میل جول

کے ہاتھوں علوم عقلیہ وفلسفہ کی بھول بھلیاں میں پھنس گئے اور ایسے کہ سوفسطائیوں کی سی حالت ہوگئی۔ بحکم الحال لابحکم النطق والمقال۔ بالآخر ایک مدت کے بعد کہیں جا کے چھٹکارا ہوا اور خیالات کی اصلاح ہوئی، جسے امام صاحب یوں بیان فرماتے ہیں کہ:

"لماشفانی الله من هذالمرض بفضله وسعة وجودةوانحضرت اصناف الطالبين عندی فی اربع فرق الخ" (۱۸)

(ترجمہ: جب اللہ نے اپنے فضل اور وسعت کرم سے مجھے اس مرض سے شفادی تو میں نے اپنے قریب طالبوں کے چار فرقے پائے۔)

آگے چل کر امامؒ صاحب نے عقل کے پجاریوں کی اچھی طرح تردید کی ہے اور صاف لکھ دیا ہے کہ:

"علمت ان ذلك ايضاً غير و ان بكمال الغرض وان للعقل ليس مستقلا با لا حاطة بجميع المطالب الخ" (۱۹)

(ترجمہ: جان لیا میں نے کہ البتہ یہ (فلسفہ) میری اصل غرض کے لیے ناکافی ہے اور البتہ عقل مستقل طور پر تمام مطالب کا احاطہ نہیں کرسکتی۔)

آمدم برسر مطلب، سلاطین سلجوقی کی جان ملک شاہ بن الپ ارسلان (اصل ارپ ارسلان) کی طبیعت علوم اور نجوم کی جانب بہت مائل تھی اور اس کی سلطنت کا استحکام اسے اپنے ارادوں میں ناکامیاب نہیں ہونے دیتا تھا۔ عباسی سلطنت کا چراغ کیا گل ہوا ترکوں نے پاؤں جمالیے۔ کاشغر سے قسطنطنیہ تک اور بیت المقدس سے خزرتک رحم کی طرح ان کی حکومت کی چادر بچھ گئی، جس پر جا بجا نیک کاموں کے گل بوٹے عجیب لطف دے رہے تھے۔ (۲۰)

قصہ مختصر، ایسے زمانے میں جب کہ دنیا بھر کو علوم کی جانب توجہ تھی، کیا یہ بات ممکن تھی کہ خیام علم منقول کی تحصیل کے بعد علوم معقول، فلسفہ، نجوم اور ریاضی کی جانب متوجہ نہ

ہوتا؟ متوجہ ہوا اور ان علوم سے بہت کچھ حصہ لیا، جس نے اس کی علمی شہرت میں پر لگا دیے اور وہ ملک ملک مشہور ہو گیا اور اس کے ہمعصر اس کی آئے دن کی ترقی دیکھ دیکھ کے جلنے لگے۔

خیام کے ہمدرس اور ان کا خیام کی طالب علمی کے وقت کا یہ واقعہ (جس کا بیان ذیل میں کیا جاتا ہے) ہر مورخ اور تذکرہ نویس نے اپنے طور پر بیان کیا ہے، بغور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک کے بیان میں کچھ بہت تفاوت نہیں ہے؟ سب کی بات ملتی جلتی ہے۔ میں دو ایک کا قول نقل کیے دیتا ہوں۔

ا۔ جس وقت خواجہ نظام الملک، امام موفق سے کتب حلوم دین پڑھتا تھا، عمر خیام اور حسن بن صباح اس کے ہمدرس تھے۔ چوں کہ یہ بات مشہور تھی کہ امام موفق کے شاگرد حکام ہوتے جاتے ہیں اور انھیں اکثر کامیابی کی مبارک صورت نظر آتی ہے، ان تینوں کو بھی بڑی بڑی امیدیں تھیں۔ ایک دن آپس میں انھوں نے اس بات کا اقرار کیا کہ ہم تینوں میں جو پہلے بہرہ مند ہو وہ دوسرے کو فتوحات میں شریک کرے۔

جس زمانے میں خواجہ نظام الملک عہدۂ وزارت پر ممتاز ہوا۔ عمر خیام بھی اس کی ملاقات کے لیے پہنچے۔ خواجہ نظام الملک کمال تعظیم و تکریم سے پیش آیا اور چاہا کہ اقرار کے مطابق ملک کی خدمت میں لے جا کر اسے کوئی اعلیٰ عہدہ اور بڑا منصب دلائے۔ خیام نے انکار کیا اور اس امر کی استدعا کی کہ کوئی ایسی معاش مقرر کر دی جائے، جس کے ہاتھوں میں مطمئن ہوکر درس تدریس کے مشغلے میں باقی عمر تمام کروں۔ خواجہ نظام الملک نے محاصل نیشاپور کے نام پروانہ لکھ دیا کہ سالانہ ایک ہزار بیس مثقال سونا خیام کے حوالے کر دیا جائے۔ اس کے بعد خیام کو نیشاپور واپس جانے کی اجازت دی اور خیام بخیر گھر پہنچا اور تمام عمر بہت فراغت خاطری سے گذاری۔

۲۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ صغر سنی کے زمانے سے عمر نے نظام الملک اور اپنے ہم مکتب حسن بن صباح سے گاڑھی دوستی پیدا کی تھی۔ ان تینوں دوستوں نے اپنے کو اس

سوگند سے جکڑ ڈالا تھا کہ ہم میں سے پہلے جو شخص کسی معزز عہدے پر مامور ہو، اپنے دوسرے دوستوں کی مدد کرے اور ان کی زندگی کو کامیاب کرنے کی کوشش۔

جب نظام الملک کو الپ ارسلان نے (۱۰۶۳۔۱۰۷۳) وزیر بنایا، نظام الملک کو اپنی قسم یاد آئی اور اس نے حسن بن صباح کو داروغگی کا عہدہ دیا اور عمر خیام کو بھی ایسا ہی ایک عہدہ دینا چاہا، مگر اس نے ایک مقرر شدہ سالانہ رقم پر قناعت کی، جس سے وہ اپنا تمام وقت اپنے دلخواہ علوم ریاضی و نجوم میں صرف کر سکتا تھا۔

۳۔ خیام کے ہمدرس دو تھے ابوالقاسم اور حسن بن صباح ایک جگہ بیٹھنے اٹھنے سے ان تینوں میں بے حد محبت ہوگئی تھی اور ہمدرس ہونا سلسلۂ اتحاد کو اور مضبوط کرتا تھا۔ ایک دن یہ تینوں دوست تخلیہ میں بیٹھے ہوئے مختلف مسائل میں بحث کر رہے تھے۔ خیام نے شوخی سے کہا کہ دوستو دنیا محل امید ہے کہ اگر لطف خدا شامل حال ہوا اور اقبال نے یاوری کی اور ہم میں سے کوئی اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوا تو کیا وہ اپنے دوستوں کی حسب خواہش اعانت اور مدد کرے گا۔ دونوں دوستوں نے اقرار کیا کہ "ہاں، بیشک، ضرور"!

کچھ مدت کے بعد ابوالقاسم کی تعلیم اختتام کو پہنچی۔ یہ گوئے سبقت لے گیا۔ تقدیر کا چمکنا تھا کہ سلجوقی دربار میں پہلے دبیر الملک ہوا اور کچھ دنوں بعد حسن انتظام کے وجہ سے درجہ صدارت پر پہنچا اور نظام الملک ہوگیا۔ رفتہ رفتہ اعتبار کی طرح عزت بڑھتی گئی۔ ملک بھر نے لوہا مان لیا۔ اس کا آستانہ مرجع خلائق ہوگیا۔ خیام اور حسن صباح بھی پہنچے۔ مشکل سے نظام الملک تک رسائی ہوئی۔ نظام الملک نے اپنا وعدہ یاد دلایا اور کوئی اعلیٰ منصب دینا چاہا۔ حسن صباح راضی ہوگیا، مگر خیام نے انکار کیا۔ نظام الملک نے کہا کیوں؟ خیام نے کہا:

مرد درویش صفت ہستم و پاکزہ خیال — کار من عشق پرستی، ہنرم شیدائی

پیشہ ام روز بدنبال حسینان رفتن — شب چہ پنہاں زتو تا صبح قدح پیمائی

باعلائق واسباب دنیا کہ دور روزہ است، ہیچ میل خاطر مذارم۔ اگر ممکن شود ہمان قریہ کہ وطن پیدائش من ست۔ در طیول من بدہی کہ عمر خود در صرف مے و معشوق بآسودگی بسر

برم، دیگر از شما خواہش ندارم۔"

نظام الملک نے حسن صباح کو سلطانی ملازمت دلائی اور خیام کی خواہش پوری کی۔ خیام بہت خوش ہو کر اپنے وطن کو سدھارا۔

میرے نزدیک پہلا قول "تاریخ حبیب السیر" کا (ان دونوں اقوال کے علاوہ اور بیانات سے) بہت مستند ہے کیوں کہ اور مورخین بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ بہر کیف، خیام کو امام موفقؒ کی شاگردی کے علاوہ امام غزالیؒ کی شاگردی بھی نصیب ہوئی اور خیام نے جی بھر کے علمی شکوک رفع کیے۔ غزالی جیسے محقق شخص کو خیام جیسا ذہین اور ذی علم شاگرد ملنا خوشی کا باعث ہوا۔

امام غزالی کی شاگردی: المنقذ من الضلال کے دیکھنے والے جانتے ہیں اور میں کس قدر بیان بھی کر آیا ہوں کہ امام صاحب نے بغداد میں پہنچ کر مدرسہ نظامیہ کی مدرسی کیا کی، ایک آفت مول لی۔ مختلف مذاہب والوں سے ملنا بلا ہو گیا۔ امام صاحب کو تحقیق حق کی سوجھی اور بہت متفکر ہوئے کہ ہر مذہب والا خدا ہی کا طالب ہے اور دوسرے مذہب کو مخالف اسلام بتاتا ہے۔ آپس میں بے حد اختلاف ہے۔ متکلمین، باطنیہ، فلاسفہ، صوفیہ، آخر ان چاروں فرقوں سے تو حق باہر نہیں، پھر کس کو حق پر جانیے اور کس کو غیر حق پر۔ چنانچہ امام صاحب کے یہ الفاظ ہیں: "فقلت فی نفسی الحق لا بعد و من ھذا الاصناف الابعة فھولاء ھم السالکون سبل طلب الحق فان شذالحق عنھم فلایبقی فی درك الحق مطمع الخ (۲۱)

غرض کہ امام صاحب نے مدرسی تو مدرسے ہی کے حوالے کر دی کہ 'عطائے تو بلقائے تو' اور آپ دمشق، بیت المقدس، حرمین (شریفین)، مصر، اسکندریہ ہوتے ہوئے نیشاپور پہنچے، جب کہ مدت سفر کے ریاضات و مجاہدات نے سب عقدے حل کر دیے تھے اور خیالات عمدہ جیسا کہ آپ لکھتے ہیں: بنور قذفه اللہ تعالیٰ فی الصدور و ذلك النور ھو مفتاح المعارف الخ۔ نیشاپور پہنچے تو دوبارہ درس دینے پر ملک نے مجبور کیا، کیوں کہ فلسفہ

وعقلیات کی ہر سمت ہوا بندھی ہوئی تھی۔ اجی ہوا کیا بندھی ہوئی تھی، ایک دھوم مچی ہوئی تھی اور مذہبی عقائد کا چراغ دھندلی روشنی دے رہا تھا۔ مذہب سے لوگ ہٹے جا رہے تھے اور بے دینی کا بازار گرم تھا۔

امام صاحب نے مجبوراً مدرسی قبول کی اور بڑے اہتمام سے درس دینے لگے۔ گو کہ اس وقت خیام کی عمر ۳۰ ربرس کے اندر ہی تھی، مگر علوم وفنون میں اچھی مداخلت ہو چلی تھی۔ اس سے بڑھ کر اور کون سا موقع خیام کو ملنا تھا۔ خیام نے بڑی خوشی سے بقیہ کتب منقول کے سوا، حکمت وفلسفہ کی کتابیں بھی پڑھیں اور تصوف کے سبق بھی لیے۔ تھوڑے ہی عرصے میں امام صاحب کے اثرِ صحبت نے خیام کو اور سے کچھ اور کردیا۔ اس نے بھی امام صاحب کی طرح عمر کا پہلا حصہ انہیں جھگڑوں میں تمام کیا اور آخری تصوف اور مشاہدہ و معاہدہ میں۔ و اللہ اعلم و علمہ احکم۔

خیام کی تصانیف: یہ بات غلط اڑائی ہوئی ہے کہ خیام کو تصنیف و تالیف کا مذاق نہ تھا۔ وہ بالکل خشک صوفی یا سرے سے عیش پسند غافل تھا۔ دنیا داری پر مرتا تھا۔ دنیا کے مشغلے اسے بھاتے تھے یا مطلق دنیا کو خیر باد کہہ کے کنج عزلت میں بیٹھ گیا تھا، بلکہ دنیا میں رہ کے دنیا سے الگ بھی نہیں تھا اور دنیا کے فریب میں آ بھی نہیں گیا تھا۔ اس کی تمام تصانیف کی تعداد کا بیان میری محدود واقفیت سے باہر ہے۔ تاہم ذیل کے نقشہ میں چند کتابوں کے نام لکھے جاتے ہیں:

۱۔ کتاب در علم جبر و مقابلہ: یہ عربی میں عجیب وغریب کتاب ہے، جس کے ذریعے سے خیام نے نظام الملک کی عنایتوں کا شکریہ ادا کیا ہے اور ۱۸۵۱ء میں مسٹر ایم وک صاحب نے انگریزی میں ترجمہ کر کے (پیرس میں) شائع کیا۔

۲۔ کتاب در علم اقلیدس

۳۔ رسالہ در حکمت طبیعہ

۴۔ الکون والتکلیف در علم طب

۵۔ الوجود در علم طب و حکمت

۶۔ نظام الحکم در علم حکمت

۷۔ لوازم الامکنہ در علم طبیعی

۸۔ رسالہ در اخراج: جذر یہ اقلیدس کے مشکل مسئلوں کی شرح میں ایسے رسالے واقع ہوئے ہیں، جنہوں

۹۔ رسالہ در جذر الکعب: نے خیام کو اس وقت کے علم والوں کی صف اول میں پہنچا دیا تھا اور ملک شاہ کے دربار میں وقعت بڑھا دی تھی۔

۱۰۔ مجموعۂ رباعیات: یہ رباعیاں وقت فرصت میں کہی جاتی تھیں، جو خیام کے انتقال کے بعد مرتب ہوئیں۔ (۲۲)

دار النجوم اور خیام کی ملازمت: میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ ملک شاہ نجوم کا حامی کیا تھا، بلکہ ترقی خواہ تھا۔ اسے علم نجوم و ہیئت سے خاص دلچسپی تھی اور ان علوم سے شغف ایسا کہ گویا ان علوم کے عجیب و غریب مسائل اور پیش گوئیوں کے قبول کا مادہ اس کی فطرت میں ودیعت تھا۔

اس نے ایک ایسا محکمہ قائم کیا، جہاں سے سال بسال تقویم مدون کر کے شائع کیے جائیں اور اس محکمہ کی علمی خدمت آٹھ منجموں کے متعلق تھی، جن میں ایک خیام بھی تھا۔

ملک شاہ نے اپنے دربار میں خیام کو طلب کیا اور اس کے سپرد یہ کام کیا کہ وہ نجوم کی حقیقت بہتر طور پر دریافت کرے۔ میں نے کسی قدر کوشش کی تھی کہ خیام کے سوا سات منجموں کے حالات نہیں تو صحیح نام ہی سے واقفیت پیدا کروں، مگر افسوس کتب تواریخ (۲۳) اور تذکرے خاموشی سے میرا منہ تک رہے ہیں اور میں اپنے ارادے میں ناکامیاب رہا جاتا ہوں۔

جلالی سن کی ایجاد: پروفیسر ہرمین اے ٹی اور راس صاحب کے علاوہ بعض اسلامی مورخ بھی لکھتے ہیں کہ محکمہ نجوم سلطانی میں خیام کی جستجو کے ہاتھوں دو بڑے کام ہوئے۔

پہلا یہ کہ اس نے ہندسۂ نجوم کا ایک ترمیم شدہ اڈیشن نکالا اور دوسرا یہ کہ اس نے ملک شاہی یا جلالی یا سلجوقی سن کی بناڈالی، جس کی ۱۵/ مارچ ۱۰۸۹ء سے ابتدا ہوئی۔

خیام کی ایڈیٹری: خیام کی آئے دن کی ترقیوں اور تحقیقات نے ملک شاہ کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ وہ اسے ایک ایسا رسالہ جاری کرنے پر آمادہ کرے، جس میں علم نجوم وہیئت کی بحثیں ہوں اور اس محکمہ کا نچوڑ۔ بالآخر خیام نے یہ درخواست قبول کی اور ''زیچ ملک شاہی'' نام ایک رسالہ اپنی ایڈیٹری میں جاری کیا۔

خیام کی پیش گوئیاں: ا۔ ڈاکٹر راس صاحب لکھتے ہیں کہ جب سلطان سنجر سے خیام نے ملاقات کی اور بیماری کی کیفیت پوچھی تو سنجر نے اس سے اس امر کی درخواست کی کہ وہ اس کی حیات وممات کے متعلق کوئی پیش گوئی کرے۔ خیام نے جواباً کہا کہ آپ کو اس مرض میں ہمیشہ کے لیے دنیا کو خیر باد کہنا پڑے گا اور یہی ہوا۔

۲۔ خیام نے اپنی وفات کے بعد کی ایک خبر دی، جس کو متعدد مورخوں نے مختلف طور پر بیان کیا: الف۔ نظامی عروضی سمرقندی زیارت حرمین کے لیے گھر سے نکلے تو بلخ پہنچے۔ یہاں ایک دن کسی مرغزار کے کنارے پر خیام کو شراب پیتے دیکھا، جو یہ رباعی بار بار پڑھتا تھا۔

رباعی

ابر آمد و زار بر سر سبزہ گریست
بے بادۂ گلرنگ نمیشاید زیست
این سبزہ کہ امروز تماشا گہِ ماست
تا سبزۂ خاک ما تماشا گہِ کیست

خیام نے نظامی سے گفتگو کی، جس کا آخری جملہ یہ تھا: ''تو وقت مراجعت، مارا مستغرق ریاحین خواہی دید۔'' ایک سال کئی ماہ کے بعد جب کہ نظامی حرمین کی زیارت سے مشرف ہوئے اور واپس ہوتے ہوئے نیشاپور پہنچے تو لوگوں سے دریافت کیا کہ حکیم

خیام ابھی تک بلخ میں ہیں یا یہاں چلے آئے۔ جواب ملا: ''تھوڑے دن ہوئے ان کا تو انتقال ہو گیا۔'' نظامیؒ خیام کے مزار پر گئے۔ دیکھا کہ اس قدر پھول ڈالے گئے ہیں کہ مطلق قبر نہیں دکھائی پڑتی ہے۔ تو انھیں یاد آیا کہ واقعی خیام نے درست کہا تھا کہ:

''تو وقتِ مراجعت، مارا مستغرق ریاحین خواہی دید۔''

ب۔ خواجہ نظام الملک کا بیان ہے کہ ایک دن نیشاپور کے باہر کسی باغ میں امام الحکما عمر خیام سے میری ملاقات ہوئی۔ اثنائے گفتگو میں خیام نے اپنی دلی خواہش باین الفاظ ظاہر کی کہ: ''قبر من در موضعے باشد کہ ہر بادشالی براو گل افشانی کند۔'' مجھے تعجب ہوا کہ یہ کیا تمنا ہے اور کیسی تمنا ہے، مگر میں خاموش ہو رہا۔ ایک مدت کے بعد خیام کا انتقام ہوا۔ میں قبر کی زیارت کے لیے گیا، دیکھا کہ مرقد ایک لہلہاتے باغ کے کنارے واقع ہے، جس پر میوہ دار درختوں کا سایہ، پھولوں کی شاخیں چاروں طرف سے ایسی جھکی ہوئی ہیں کہ قبر طرح طرح کے رنگین پھولوں سے منڈھ گئی ہے۔ قبر کا ہر حصہ پھولوں کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ جدھر نظر اٹھتی ہے، پھول ہی پھول نظر آتے ہیں۔ نظام الملک کی تحریر کا آخری جملہ یہ ہے کہ: ''چندان گل وشگوفہ بر سر او ریختہ بود کہ قبر او درمیان گلہا پنہان بود۔''

ج۔ ۵۰۶ھ میں خواجہ امام عمر خیام اور خواجہ امام مظفر اسپیازاری بلخ کے بردہ فروشوں کے بازار میں امیر ابوسعید کے مہمان ہوئے۔ (نظامی عروضی لکھتے ہیں کہ) میں بھی ایک دن حاضر تھا۔ کچھ دیر تو ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں، آخر میں خیام نے کہا: ''ہماری قبر اس جگہ ہوگی، جہاں درخت سال میں دو مرتبہ پھولتے پھلتے ہوں گے۔'' مجھے حیرت ہوئی، مگر ساتھ ہی یہ بھی خیال آیا کہ ایسا بزرگ شخص جھوٹ نہیں کہہ سکتا۔

۵۳۰ھ میں نیشاپور پہنچا۔ اس زمانے میں خیام مر چکا تھا۔ شب پنجشنبہ تھی، میں زیارت کو گیا اور ایک رہنما ہمراہ لیا کہ مجھے ان کی قبر بتائے۔ میرا رہنما مجھے 'حیرا' نام قبرستان میں لے گیا۔ میں سیدھا جاتے جاتے ذرا بائیں ہاتھ کو پھرا، یہاں تک کہ خیام

کا مزار قبرستان کی دیوار کے نیچے پایا، جس پر ایک شفتالو درخت سایہ افگن تھا اور اتنے پھول قبر پر گرے تھے کہ خیام کی قبر بالکل نمایاں نہیں ہوتی تھی۔ اب مجھے ان کی وہ پیش گوئی جو انھوں نے بلخ میں کہی تھی، یاد آئی اور میں بے اختیار رونے لگا۔

ڈاکٹر راس صاحب نے برونی صاحب (مترجم چہار مقالہ) کے اس اعتراض کو جو نظامی سمرقندی کے بیان پر واقع ہوتا ہے، یوں جواب دیا ہے کہ عرف میں گل کا اطلاق ہر پھول پر ہے، کچھ گلاب ہی کے پھول کو پھول نہیں کہتے۔ یہ کہنا کہ خیام نے گل کہا تھا اور نظامی عروضی نے شفتالو کے پھول لکھے ہیں، بالکل لغو ہے، کیوں کہ مسٹر ولیم سمسن جو ماہ اکتوبر ۱۸۸۴ء میں نیشاپور سے اپنے دوست مسٹر کواٹرچ صاحب کو یہ مضمون لکھتے ہیں کہ 'امام زادہ' کے مقابل ایک باغ ہے، جس میں دو تین پرانے درخت ہیں۔ آخر میں اس باغ کے حکیم عمر خیام کی قبر واقع ہوئی ہے، جس کے ارد گرد گلاب کے پھول کے درخت موجود ہیں۔

مورخ موصوف نے کیو گارڈن (انگلینڈ) میں لگانے کے لیے خیام کی قبر کے گلاب کے درخت کی ایک قلم نیشاپور سے روانہ کی اور اب تک وہ شاخ درخت کی حیثیت سے ہمیشہ پھولتی ہے۔

خیام نے دو موسم کہے تھے۔ اگر مولانا نظامیؒ اور مسٹر ولیم سمسن صاحب کے اقوال میں تطبیق دی جائے تو غیر ممکن بات نہ سمجھی جائے۔ یعنی گلاب کے درخت کو بھی پھول لگتے ہیں اور شفتالو کے درخت کو بھی، اس کے لیے ایک موسم، اُس کے لیے بھی ایک موسم ہے۔ دو موسم ہوئے یا نہیں؟ ایک ابتدائے سال میں پھولے پھلے، دوسرا انتہائے سال میں۔ غرض کہ خیام کی بات سچی نکلی۔ بے شک اس نے ٹھیک کہا تھا۔

خیام کی وفات: خیام نے کہاں وفات پائی؟ اور کس سن میں؟ اور کیوں کر؟ یہ تین سوال ہیں: الف۔ پہلے کی نسبت مورخین کا اتفاق ہے کہ شہر نیشاپور کو یہ شرف حاصل ہوا ہے، جسے میں لکھ آیا ہوں۔

ب۔ دوسرے سوال کے جواب میں مورخین کے دو تین گروہ ہو گئے ہیں:

۱۔خمس عشر وخمسہ ماۂ ہجری ۵۱۵ھ

۲۔۵۱۷ھ مطابق ۱۱۲۳ء

۳۔مگر جامع التواریخ نے ۱۱۱۱ء پر زور ڈالا ہے۔

میرے نزدیک پہلا قول اصح ہے۔ واللہ اعلم۔ اگر ولادت کے اقوال میں پہلا قول لیا جائے، جسے میں اصح کہتا ہوں اور یہاں بھی اس طرح پہلا قول لیا جائے تو خیام کی زندگی ۱۶۰ ر برس کی معلوم ہوتی ہے۔

ج۔ تیسرے سوال کے جواب میں دو قول ہیں، جو درج ذیل کرتا ہوں، مگر آخری قول ''فردوس التواریخ'' کا میرے نزدیک مزید معتبر ہے۔

ا۔ایک رات خیام بیٹھا ہوا شراب پی رہا تھا اور شراب کباب کی صحبت گرم تھی، دفعتاً ایسی تند و تیز ہوا چلی کہ چراغ گل ہو گئے، شمعیں خاموش ہو گئیں، اندھرا گھپ ہو گیا۔ شراب کی صراحی خیام کے ہاتھ سے گری اور چکنا چور ہو گئی ۔خیام کو نہایت صدمہ ہوا۔ ایک تو شراب کی مستی تھی، دوسرے غصے کی مستی چڑھ گئی۔ بیساختہ کہہ اٹھا:

ابریق مے مرا شکستی ربی   برمن درِ عیش را بہ بستی ربی
بر خاک بریختی مے ناب مرا   خاکم بدہن، مگر تو مستی ربی

اب جو روشنی ہوئی تو سب نے دیکھا، حضرت کا چہرہ بالکل سیاہ ہو گیا ہے۔ سب متنفر ہوئے۔ دوستوں یاروں نے اپنی اپنی راہ لی۔ خیام نے آئینہ منگوا کے چہرہ دیکھا اور رنس کے یہ رباعی پڑھی اور زار زار رونے لگا:

ناکردہ گناہ در جہان کیست بگو   وآنکس کہ گنہ نہ کرد چون زیست بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دہی   پس فرق میانِ من و تو چیست بگو

اب جو دیکھا تو چہرہ چاند کی طرح چمکنے لگا ہے۔ خیام نے اسی وقت سر سجدے میں رکھا اور جان جان آفرین کے حوالے کی۔

۲۔امام محمد بغدادی کہتے ہیں کہ میں حکیم خیام کی خدمت میں بیٹھا ہوا تھا اور خیام علم

تصوف کی ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ جب وہ وحدت و کثرت کے بیان پر پہنچا تو کتاب بند کر کے مجھے کہنے لگا کہ میرے دوستوں کو بلاؤ تا کہ میں ان کے روبرو آخری کلام کرلوں۔ میں گیا اور فرداً فرداً سب لوگوں کو بلالایا۔ خیام نے کسی کی جانب التفات نہ کی اور کھڑے ہو کے نماز پڑھنے لگا۔ جب نماز ظہر و عصر سے فراغت کر لی تو سر بسجود ہوا اور رو رو کے کہنے لگا:

''اے خدا! تو نے جس قدر مجھے علم بخشا، میں نے تیرے پہچاننے میں کمی نہ کی۔ اب تو مجھے بخش دے، کیوں کہ تیرا علم تیرے نزدیک میرا شفیع ہے۔''

یہ الفاظ کہتے کہتے خیام کی روح پرواز کرگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

موت: واقعی موت ایک ایسی شے ہے، جس سے فطرتاً کسی ذی نفس کو نفرت نہیں۔ یہ ایک ایسی ہر دلعزیز چیز ہے، جسے ہر زمانے والے کلیجے سے لگاتے آئے ہیں۔ "الموت جسر یوصل الحبیب الی الحبیب۔" موت ایک پل ہے، جو دوست کو دوست سے ملا دیتا ہے۔ بھلا ایسی عمدہ شئے کو کون برا کہے گا، جو آسمان کی مخالفت پر آمادہ ہو جاتی ہے اور دوست کو دوست سے ملا دیتی ہے۔ ہاں ایک بات ہے جو موت سے کنارہ کش ہونے اور موت کو برا سمجھنے کی ہدایت کرتی ہے، وہ کیا؟ ہمارے برے افعال، ناگفتہ بہ کردار! ورنہ ہم اور روزِ میثاق کے وعدے کو بھول جائیں اور اپنے پالنے والے کی جانب مراجعت کو بری نگاہ سے دیکھیں۔ بقول خیام:

تاظن نہ بری کہ از جہاں می ترسم وزمردن و از رفتن جان می ترسم
مردن چو حقیقت پس باکم نیست چوں نیک نزیستم ازان می ترسم

آہ ایک وہ زمانہ تھا، جس پر ناز کرنے والے اپنے اچھے کام اور نیک عملوں کی وجہ سے رات دن 'موت' 'موت' کیا کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ اس کی جانب جلد لوٹیں (طالب المولی)۔ مذکراسے چاہتے ہیں تو اس کی سمت جلد جائیں اور جب اس سے نہیں چاہتے تو اس کے سوا جس قدر کائنات ہے، اس میں کیوں دل پھنسائیں۔ وللہ درما قیل۔ رباعی:

آنکس کہ ترا بخواست جان راچہ کند فرزند و عیال و خان و مان راچہ کند

دیوانہ کنی ہر دو جہاں را بخشی   دیوانۂ تو "ہر دو جہاں را" چہ کند

حضرت جنیدؒ بغدادی سے جب کوئی معتقد دریافت کرتا کہ: "حضور میں فلاں ملک کو جاتا ہوں، آپ کے لیے کیا تحفہ لاؤں۔" آپ جواب فرماتے کہ اگر کہیں موت مل جائے تو میرے لیے لے آنا۔ 'غور سے دیکھیے یہ حال تھا ان لوگوں کا'۔

آہ! ایک یہ زمانہ ہے، جس کی گود کے پالے ہوئے نیک اور حد کے پابند شرع، نمازی، صائم الدہر اور بڑے بزرگ اشخاص موت کو فحش گالی سے بدتر سمجھتے ہیں اور غریب قائل سے زبانی مرمت کے سوا وہ سلوک کیا کرتے ہیں، جس کا نتیجہ ان کی اخلاقی کمزوری اور سست ایمانی کی صاف لفظوں میں گواہی دیا کرتا ہے۔

اس کی وجہ ہم سے سنیے کہ یہاں کون سے اچھے کام کیے ہیں۔ کون سی نیک راہوں پر چلے ہیں کہ عقبیٰ کا خیال آئے اور خدا کے سامنے جانے کو جی چاہے۔ اجی حضرت! ہم نے رمضان میں کون سے روزے رکھے ہیں کہ ستۂ شوال کی سوجھے۔

"الدنیا مزرعة الآخرة۔" نہ ہم نے بویا ہے، نہ کاٹیں گے۔ جس غرض سے آئے تھے، اس کے خلاف کرنے لگے، کچھ کا کچھ معاملہ ہوگیا، اب کیا منہ لے کے جائیں۔ یہی نا کہ دو چار پھٹکاروں کی نوبت آئے اور کالا منہ ہو۔ خدائی مار پڑے بس اور کیا۔ تو بہتر ہے، کچھ اور توقف ہو جائے۔ حساب تو دینا ہی ہے، اچھا دے لیں گے۔

خیام کا عقیدہ: خیام کے عقیدہ کی نسبت بھی میری واقفیت بہت محدود ہے۔ معتبر تواریخ سے مدد نہیں ملتی۔ کہوں تو کیا کہوں۔ عام مولویوں کی طرح اسے کافر اور ملحد تو کہہ نہیں سکتا کہ کوئی سند نہیں۔ رباعیوں سے اس کا مذہب تراشنا بڑی لغوی بات ہے، کیوں کہ شاعرانہ خیالات کو عقیدے اور مذہب سے چنداں سروکار نہیں۔ حافظ اور سعدی اور جامی رحمتہ اللہ علیہم کے پاک عقاید سے کون واقف نہیں ہے۔ انھوں نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اگر خیام معذور نہیں تو وہ مقدس حضرات بھی معذور نہیں رکھے جا سکتے۔ باقی رہا، شراب کا پینا، جو ہم آگے وفات کے بیان میں لکھ چکے

ہیں۔اس کے متعلق یہاں اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ حافظ علیہ الرحمہ بھی مے نوشی میں مشاق بتائے جاتے ہیں۔ اس طرح خیام بھی سمجھ لیا جائے۔ خدا ان مورخوں کا بھلا کرے، جو کچھ لکھتے ہیں اچھا لکھتے ہیں۔مگر شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ایک مورخ ایک بات کہتا ہے اور ایک ایک۔ خدا جانے کس کی بات سچی ہے۔ واللہ یعلم بحقیقتہ الحال۔

خیام کی وفات میں دو گروہ دو طور کی خبر سناتے ہیں، مگر ''فردوس التواریخ'' کا قول سب تذکروں اور تاریخوں پر بھاری ہے۔اس کی ہاں میں ہاں ملانے والے بھی آخر کچھ سمجھ ہی کے ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ رباعیات خیام سے خیام کا کفر ثابت کرنا، میرے نزدیک تو مسلمان کو کافر کہہ دینا ہے۔انھیں یہ کیوں کر معلوم ہوا کہ خیام نے جو شراب نوشی کا کسی رباعی میں امر کیا، خیام کا عقیدہ بھی یہی تھا۔ہوسکتا ہے کہ اس نے اتباع کی حالت میں شاعرانہ خیالات سے کام لیا ہو اور اس کا عقیدہ اس کے خلاف ہو۔

ہندوستان کے نامی مورخ جناب مولوی شبلی صاحب ''تراجم'' کے مضمون میں ضمناً لائے ہیں کہ ''مثلاً عمر خیام کی رباعیاں اپیکورس کے خیالات سے لبریز ہیں، لیکن چوں کہ وہ خیالات شاعری کے پردے میں ادا کیے گئے ہیں۔اس لیے الحاد و زندقہ کے طعنہ سے کسی قدر وہ محفوظ رہا۔''

میں کہتا ہوں کہ اپیکورس کا فلسفہ یہ تھا کہ ''آئندہ حشر و نشر کچھ نہیں، اس لیے جس قدر ہوسکے یہاں عیش کر لینا چاہیے۔'' خیام کی بعض رباعیات اس مضمون سے پُر بھی ہیں اور بعض اس کے خلاف بھی، جیسا کہ ذیل میں دو چار رکھ دی جاتی ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے۔

زان پیش کہ از جام اجل مست شوی — زیر لکد حادثہ ہا پست شوی
سرمایہ بدست آر درین رہ کانجا — سودے نکند اگر تہیدست روی
گر از پے شہوت و ہوا خواہی رفت — از من خبرے کہ بینوا خواہی رفت

بنگر چہ کسی و از کجا آمدہ؟ می دان کہ چہ می کنی کجا خواہی رفت

تا در ہوس لعل لب و جام مے ای تا در پے آواز دف و چنگ و نہ ای

اینہا ہمہ حشواست خدا می داند تا ترکِ تعلق نہ کنی ہیچ نہ ای

فردا کہ نصیب نیک بختان بخشند قسمے بمن رند پریشان بخشند

گر نیک ایم مرا از ایشان شمرند ور بد باشم مرا بدیشان بخشند

گردون ز زمیں ہیچ گلے بر نارد کس نشکند و باز بگل نسپارد

گر ابر چو آب و خاک را بردارد تا حشر ہمہ خون عزیزان بارد

غرض کہ دونوں رنگ کی رباعیات ہیں، بلکہ ان دو رنگوں کے علاوہ اور بھی بہت سے رنگ ہیں۔تصوف کے مسائل، جبر و اختیار کی بحثیں، معرفت نفس کے مضمون وقس علے ہذا۔ خیام کی رباعیاں نہیں ہیں، بلکہ مختلف پھولوں کا ایک گلدستہ ہے۔ آمدم بر سر مطلب، جو شخص مسلمان کا بیٹا کہلائے اور خود مسلمان ہونے کے علاوہ عالم بھی ہو، اسے خواہ مخواہ صرف ایک وہمی دلیل سے کافر یا ملحد کہہ دینا کتنی بری بات ہے۔ ملا علی قاری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص میں ۹۹ / باتیں کفر کی ہوں اور ایک بات اسلام کی، تو اسے ایک کی جانب کھینچنا چاہیے اور مسلمان کہنا چاہیے۔ کیا خیام میں خیر سے ایک بات بھی نہیں؟ اساتذہ کے نزدیک ''تذکرۂ حسینی'' وغیرہ کی ضعیف روایتیں قابل سماعت نہیں ہیں اور نہ رباعیوں سے کوئی بات پیدا کی جاسکتی ہے۔ اچھا خیر مان لیا کہ وہ شرابخوار تھا، تو بھی دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوسکتا۔ گنہگار ہے؟ اللہ بخش دے گا۔ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا۔ پھر ہمیں یوں کافر و ملحد کہنا کہاں تک زیبا ہے۔ اگر خیام گنہگار ہے تو خدا کا، ہمارے باپ دادے کا تو نہیں؟ پھر ہمیں کیا ضرور ہے کہ ہم خواہ مخواہ نکتہ چینیوں سے کام لیں۔

خیام نے قطع حجت کے لیے ایک ایسی بات کہی ہے، جو حاسدین کی زبانیں تھام لیتی ہے۔ ذرا آپ بھی سنیں کیسی کہی ہے اور کیا بات پیدا کی ہے۔ رباعی:

بر خود در عیش و آرزو بر بستم   وز منت ہر ناکس و کس وارفتم
گر صوفی مسجدم و گر راہب دیر   من دانم و او چناں کہ ہستم ہستم

خیام نے اس رباعی میں تو اپنے عقیدے سے مطلق آگاہ نہیں ہونے دیا اور "من دانم واو" کہہ کے پیچھا چھڑا لیا، مگر ایک دوسری جگہ مان لیا ہے کہ بے شک تم سچ کہتے ہو، میں بہت گہنگار ہوں، بلکہ دنیا بھر سے، مگر تمہیں تو نہ چاہیے کہ علمائے دین اور سراج الاسلام ہو کر مجھ بے قصور کو 'فقد کفر' کا چھرا لگاتے ہو۔ خدا سے ڈرو، یہ تمہاری شان کے لائق نہیں اور میں تو (تم جس قدر کہتے ہو، اس سے بھی) برا ہوں۔ رباعی:

با من تو ہرانچہ گوئی از کین گوئی   پیوستہ مرا ملحد و بے دین گوئی
من خود مقرم ہرانچہ گوئی ہستم   انصاف بدہ ترا رسد کین گوئی؟

اس وقت میری آنکھوں سے آنسو بہے جاتے ہیں۔ خدا جانے اس رباعی میں کیا جادو ہے۔ اس قول کی سچائی کی دلیل یہی ہے کہ اس کا اثر میرے دل پر ہوا جاتا ہے اور میرے جسم پر بال کھڑے ہو گئے ہیں۔

خیام کا مقبرہ: خیام کی جس قدر عزت ہوئی غیروں کے ہاتھوں ہوئی۔ اپنوں نے اب تک قدر نہ جانی۔ مرنے کے بعد تو کچھ دن نظام الملک کے اہتمام کی وجہ سے مقبرہ کی حالت اچھی رہی، مگر جس قدر مدت گذرتی گئی، ابتری نے آلیا۔ دوست بیگانہ ہو گئے، کسی کو بھی خیام کی یاد نے آٹھ آٹھ آنسو نہ رلوائے۔ غالب:

خاک میں ناموس پیمان محبت مل گئی   اٹھ گئی دنیا سے راہ ورسم یاری ہائے ہائے

غیر ملک والے تو خیام کے مداح ہوں اور نام کے شیدائی، جان و مال فدا کرنے کو تیار اور ہم شہر و اہل وطن، خبر تک نہ لیں! انھیں یہ بھی خیال نہ ہو کہ آیا خیام کی قبر مٹ مٹا کے زمین کے برابر ہو گئی ہے یا ابھی کچھ کچی پکی اینٹیں خیام کو اشارے سے بتا رہی ہیں۔

ہائے اگر یہی تغافل رہا تو شاید خیام کے نام اور کلام کے ساتھ ساتھ خیام کی قبر اور نشان قبر کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ صرف زمین کی سطح نظر آئے گی، جس کے نیچے سیکڑوں

ناموراپنی نیند سورہے ہیں اور بڑے آرام سے حشر کا انتظام کررہے ہیں۔

حضور لارڈ کرزن فرمان روائے ہند اپنے ''سفر نامۂ ایران'' میں (جس کا ترجمہ مولوی محمد ظفر علی خاں صاحب بی۔اے نے کیا ہے) یہی شکایت کرتے ہیں۔زمانے کی بے قدری، ہموطنوں کی بے مہری۔ اقربا اعزا کی بے وفائی۔ دیکھ دیکھ کے آپ کے قلم (نیب) کی آنکھوں سے بھی آنسو نکل آئے ہیں۔آپ کی ساری عبارت سے ایک ہمدردی، جوش عقیدت ٹپکی پڑتی ہے اور من وعن وہی شکایت ہے، جس سے ہمارے لب آشنا ہو چکے ہیں۔

مقبرۂ عمر خیام: بہت سے انگریزی ناظرین شاید نیشاپور کو صرف اس تقریب سے پہچانتے ہوں گے کہ یہ ایران کے اس ہیئت داں شاعر عمر خیام کا دارالقرار ہے، جس کا نام اور جس کا کلام موجودہ نسل کو فٹز جیرالڈ کے بے نظیر ترجمہ اور اس سے کمتر درجے کے بہت سے شعرا کے مطابق اصل وتصرف آمیز تراجم کے ذریعے سے اچھی طرح معلوم ہو گئے ہیں۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ اصحاب ثانی الذکر میں سے کسی ایک کی تصنیف کے دیباچہ میں میں نے یہ منکسرانہ درخواست لکھی ہوئی دیکھی تھی کہ کاش کوئی شخص میری اس کتاب کو نیشاپور میں لے جا کر عمر خیام کے مقبرے پر نذر چڑھادے'' اگر میرے پاس یہ کتاب موجود ہوتی تو یقیناً میں نے راقم کی درخواست کی تعمیل کی ہوتی اور جس وقت میں نے اپنا غیر ضروری سامان علاحدہ کیا تھا، اسی وقت شاعر کی قبر پر اس کتاب کو بھی نذر چڑھا دیتا۔ اگر چہ مجھے خوف ہے کہ اگر عمر خیام کی قبر کی تباہ حالت کو اس کے انگریزی معرفین دیکھتے تو انھیں سخت صدمہ پہنچتا۔

یہ قبر ایک ویران باغ میں ہے، جس میں کبھی پھولوں کی کیاریاں اور پانی کی نہریں تھیں، مگر اب سوائے خس وخاشاک کے اور کچھ نہیں رہا۔قبر پر کوئی کتبہ بھی نہیں ہے، جس سے شاعر کے نام یا شہرت کا پتہ چل سکے اور مقامِ افسوس ہے کہ آج کل کے ایرانی عمر خیام

کی مشت خاک کے طرح سے ویسے ہی بے پرواہیں، جیسے انیسویں صدی کے اہل لندن ''میتھیو پیرس'' یا ''ولیم آف مامس بری'' کی خاک کی طرف سے (انتھی کلامہ)

مسلمانوں! دیکھتے ہو غیر قوموں کی قدردانیاں'' یہ کس جوش و خروش سے باکمالوں کو یاد کیا کرتے ہیں۔ کتنی علم کی قدردانی ہے۔ ہائے کیا منکسرانہ درخواست ہے کہ کاش کوئی شخص میری اس کتاب کو نیشاپور میں لے جا کر عمر خیام کے مقبرے پر نذر چڑھا دیتا!

پروفیسر ہرمین کی شہادت: ہر چند مشرق میں عمر خیام کے سائنس کی شہرت بہت ہوئی، لیکن وہ دبی رہی۔ اس کی اس سے بڑھ کر شہرت شاعری کے ہاتھوں ہوئی۔ اس کی رباعیوں کی تعداد پانچ سو کے قریب پہنچی ہوئی ہے، جن کا جواب نہ متقدین کے کلام میں نکلتا ہے، نہ متاخرین کے کلام میں!

رباعیوں کی نرالی ترکیب (یعنی پہلا دوسرا اور چوتھا مصرع بقید قاعدۂ قافیہ اور تیسرا مصرع اکثر (گو ہمیشہ نہیں) بے قافیہ) سب سے پہلے مولانا شیخ ابوسعید بن ابوالخیرؒ سے کامیابی کے ساتھ فارسی لٹریچر میں شامل کی گئی اور صوفیوں کے اقسام سبجکٹ پر بڑے بڑے خیالات کے اظہار کا آلہ بنی۔

مگر عمر خیام حضرت ابوسعید کی تقلید نہیں کرتا۔ اس کا انداز جداگانہ ہے۔ گو کہ اس کی چند رباعیاں اسرار سے بھری ہوتی ہیں اور تصوف سے پر ہیں، لیکن اکثر ان میں بالکل جدا طرز پر ہیں۔ وہ مختصر بیاض ہے ایک آزاد اور سنجیدہ خیال والے کی جو بڑے زور سے متعصب علما کی ''کم ظرفی، تعصب، صلح پذیر نہ ہونے والی سختی'' اور صوفیوں کے حد سے بڑھ جانے والے عجیب حرکات مکر اور حشیانہ طرز کلام کی خبر لیتا ہے اور اپنے اسلحہ سے ان منھ آنے والوں سے کامیابی کے ساتھ لڑتا ہے۔ یہ وہ رنگ ہے، جو لسان الغیب حافظ کے رنگ سے ملتا جلتا ہے۔

اکثر لوگوں نے خیام کو مشرق کا والٹیر بتایا ہے اور دہری ونیچری کے نام سے یاد کیا ہے۔ عبارت کی صفائی، تمسخر کا سچا اور پسندیدہ مذاق، جاہل اور بگڑے ہوئے زہاد پر سر توڑ

حملے اور اس کے ساتھ ''اظہار انس تمام انسانوں کے ساتھ ان کی تکلیفوں میں'' یہ سب باتیں جب دیکھی جاتی ہیں تو عمر خیام بے شک ہم کو اس بڑے ذانیس (۲۴) (والٹیر) کی یاد دلاتا ہے۔

مگر یہ مشابہت کامل نہیں۔ والٹیر نے کبھی ایسی باتیں نہیں لکھیں، جو عمر خیام کی دل لبھانے والی بیساختہ نظم میں پائی جاتی ہیں اور اس میں اس کے دل کے پر جوش ولولوں کا جو خود اس کی طبیعت کی نرمی اور محبت سے لبالب ہیں، اظہار کیا گیا ہے اور اس میں سخت گیر اور نہ ٹلنے والی قضا کی مخالفت کے ساتھ ہی اپنی عاجزی اور مجبوری بیان کی ہے، جو دنیا کی ساری جلیل القدر اچھی اور خوبصورت چیزوں کو یا آہستہ آہستہ مٹا دیتی ہے یا مرگ ناگہانی بن کر ان کی خبر لیتی ہے یا ایک ہمیشہ کی کس سر پرستی کی حالت میں ڈال رکھتی ہے۔

اب ہم ''الخیام'' کے پہلے حصے کو ختم کرتے ہیں اور اس امر کا وعدہ کرتے ہیں کہ اگر ہمیں اپنے مشاغل سے کافی فرصت ملی تو عنقریب الخیام کا دوسرا حصہ شائع کریں گے، جس میں خیام کے بقیہ حالات درج ہونے کے علاوہ رباعیات کی نسبت رائے ظاہر کی جائے گی۔ انشا اللہ تعالیٰ وبعونہ؟

بپایان آمد این دفتر حکایت ہم چنان باقی
بصد دفتر نمی گنجد حدیث درد مشتاقی (۲۵)

ضمیمہ: (۲۶) چوں کہ یہ رسالہ مجموعہ اقوال واقع ہوا ہے اور غیر مرتب سا معلوم ہوتا ہے، مناسب ہے کہ وہ بھی درج ہو جائے اور میں یہ بھی بیان کر دوں کہ انگریزوں نے سولھویں صدی عیسوی کے اواخر میں خیام کے کلام سے آنکھیں روشن کرنے کا موقع پایا، مگر مسلمان ان سے پہلے اور بہت پہلے خیام کو خیام سمجھ کر اس قدر دانی سے پیش آئے جو ان کے شایان تھی۔ ڈاکٹر ٹامس ہائیڈ، پروفیسر السنۂ عربی و عبرانی، آکسفورڈ نے پہلے پہل خیام کو اپنے عیسائی بھائیوں کے سامنے پیش کیا اور اپنی مشہور کتاب ''تواریخ مذاہب'' میں، جو پہلی مرتبہ ۱۷۰۰ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۷۶۰ء میں آکسفورڈ میں چھپی، خیام کا وہ قصہ بیان کیا کہ

وہ اپنی موت کے بعد اپنی ماں کے روبرو حاضر ہوا اور اپنی مشہور رباعی پڑھ کر سنائی۔ ''تذکرہ حسینی'' نے بھی قریب قریب یہی بیان کیا ہے۔ اب رفتہ رفتہ ان لوگوں میں چرچے ہوتے ہوتے اشتیاق پھیل گیا۔ پہلا وہ یوروپین شخص، جس نے خیام کی رباعیات کا مطالعہ کیا گو بالاستیعاب نہ سہی وان ہیمپر پرگستال تھا۔ پرشین لنگویج میں یہ استاد مانا گیا اور خوبیٔ خیالات میں آپ اپنی مثال۔ اس نے اپنی کتاب مطبوعۂ وائنا، ۱۸۱۸ء میں صرف ۲۵ رباعیوں کا ترجمہ کیا اور بہت کچھ بحث کی، مگر یہ نہ بتایا کہ یہ رباعیاں کس قلمی نسخہ سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ اس کی محبت ٹھکانے لگنے کو تو لگی، مگر پھر کسر رہ گئی۔ ان کے بعد ایک صاحب فریڈرک روکرٹ نام اٹھے، جنھوں نے اپنی کتاب ''قواعد وعروض فارسی'' مطبوعۂ گاتھا ۱۸۷۴ء میں صرف دو رباعیاں اضافہ کیں۔ گو کہ فریڈرک روکرٹ (متوفی ۱۷۶۶ء) نے اپنی کتاب میں خیام کا ذکر اور اس کے کلام کو درج کرکے خود کو جدید معلومات اور فارسی زبان کا ماہر ثابت کردیا اور اس میں شک بھی نہیں کہ وہ اپنے طور پر فارسی کا ماہر بھی تھا، مگر دراصل وان ہیمپر ہی کی محنت کا نتیجہ اس نئی حیثیت سے ظاہر ہوگیا اور کوئی بات نہ تھی۔ اس طرح سر گوراوسلی بھی نقل نویسی کے ہاتھوں کیا کچھ بن گئے۔ انھوں نے اس قدر رباعیاں اپنی کتاب مطبوعۂ لندن ۱۸۴۶ء میں درج کردیں، جس قدر سابق الذکر دو صاحبوں نے درج کی تھیں تو اس سے کیا ہوا، کچھ نہیں۔ ہاں خیام کو خیام جاننے والا اور اس کی رباعیات کا از اول تا آخر اچھی طرح مطالعہ کرنے والا پروفیسر کاول تھا۔ اس کی جس قدر تعریف کیجیے، بجا ہے اور اس کے بعد اس کا ہم پلہ ایڈورڈ فٹجر الڈ گویا خیام کے کلام کو یورپ میں شہرت دینے کے لیے عدم سے وجود میں آیا۔

اس کے وہ قابل قدر خطوط، جس میں اس نے اپنے مطالعۂ زبان فارسی کا حال لکھا تھا (اور جنھیں حال میں مسرس میکملن نے مرتب کرکے شائع کیا ہے)۔ اگر سچ پوچھئے تو یورپین ناظرین کتب کے درمیان وہی خطوط خیام کی رباعیات کی شہرت کا باعث لے ہوئے ہیں۔

۱۸۴۵ء تک اسے فارسی زبان کے مطالعے کی جانب زیادہ میلان نہ تھا، مگر بعد کو طبیعت کا رنگ بدلا اور فارسی کی شیرینی مزہ دے گئی، جسے پھر یہ مدت العمر نہ بھولا۔

لب لباب فی ہذا الباب اس دن سے آج تک برابر افزونی ہوتی رہی، جو فارسی داں انگریز اٹھا، خیام کا کلمہ پڑھنے لگا۔ خیام کے کلام سے ہر ایک کو شغف رہا اور اب تو ہاں تک اضطراب پھیلا ہے کہ یورپ کے ہر حصہ سے خیام خیام کی آوازیں آ رہی ہیں۔

شیخ پنجاب (۲۷) ایک مقام میں تحریر فرماتے ہیں کہ مثلاً ''عمر خیام کلب'' کو لیجیے، جو لوگ اخبارات دیکھتے رہتے ہیں۔ انھوں نے بالخصوص اس کی لمبی لمبی رپورٹیں بھی دیکھی ہوں گی۔ اس کا آغاز چند ایسے علم دوست انگریزوں سے ہوا، جو فارسی زبان دانی کے شوقین تھے اور فارسی شعرا میں عمر خیام کی مشہور رباعیات کو پسند کرتے تھے۔ معمولی انگریزی کتابیں پڑھنے اور روزمرہ کے کام کے بعد انھیں عمر خیام کی رباعیات میں ایک جدت ملتی تھی، جو فرحت بخش تھی اور جوان کے تھکے ہوئے دماغوں کو بہت کچھ آرام دیتی تھی۔ لیکن فرق یہ ہو گیا کہ آگے تو ان میں سے ہر شخص اپنے اپنے گھر میں بیٹھ کے دل خوش کرتا تھا اور ڈرتا تھا کہ بعض اس کے ہم قوم اسے کسی قدر مجنون سمجھیں گے کہ ایک ایرانی شاعر کو خوبیوں کا پتلا سمجھتا ہے اور اب اس طرح ایک مجلس کے ذریعہ سے انھوں نے یہاں تک کامیابی حاصل کر لی کہ دلدادہ ہو گئے اور بانیان کلب اب فخر سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اکیلے وہی نہیں جو عمر خیام کی قدر کریں، بلکہ عمر خیام فی الواقع قدر کے قابل ہے

نہ من بر آن گل عارض غزل سرایم و بس   کہ عندلیب تو ہر از ہر طرف ہزار انند

اسعد آفندی سلیم نے ''الہلال'' میں اسی لیے سوال کیا ہے کہ علاوہ انگریزوں کے فرانس والے بھی خیام کے مجموعہ رباعیات سے مزے لیتے ہیں اور لطف اٹھاتے ہیں اور فرنچ لنگوج کے حاشیے اور ترجمہ اور تعجب میں ڈالتے ہیں کہ ایک ایرانی شاعر کے جانب ان کی توجہ اس قدر مبذول ہو گئی ہے۔ میری استدعا ہے کہ آپ اس کے مختصر حالات قلمبند

فرمائیں۔ جس کے جواب میں ایڈیٹر نے لکھا ہے کہ اہل عرب اور فارس نے اس فیلسوف شاعر کی نسبت جس قدر کاغذ کالے کیے ہیں، ذی علم اشخاص سے پوشیدہ نہیں۔ غالباً اتہام کی اصلی وجہ ان کا ضعف عقیدہ ہے۔ انھوں نے اور مسلمان فلسفیوں کی بھی ویسی ہی خدمت کی ہے، جیسی خیام کی خدمت کی ہے۔ واقعی یہ بات مدیر کی درست ہے، جہاں کسی نے خیالات فلسفیانہ سے کام لیا، گو پکا موحد اور مسلمان ہے، پھر بھی کافر بن گیا۔ آخر ''احیاء العلوم'' کیوں جلائی گئی۔ اندلس والوں نے امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ کو کیوں برا بھلا کہا؟ ''فصوص الحکم'' میں کیا برائی تھی؟ علامہ ابن عربی کیوں مطعون ہوئے؟ بس اسی آزادی کے رنگ کی وجہ سے، ورنہ ''مقاصد فلاسفہ'' اور ''فتوحات مکیہ'' جیسی کتابوں کا ستیاناس کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ خیام، فارسی، ریاضی، علم افلاک وغیرہ میں عجب کمال رکھتا تھا اور نجمیوں نے اسے ادیب کامل مان لیا تھا۔ اس کا لٹریچر مسلم تھا۔ اس کا نام غیاث الدین ابوالفتح عمر اور تخلص 'خیام' یا 'خیامی' تھا شاید اپنے باپ کے پیشہ کی وجہ سے یہ خیام کے نام سے زیادہ مشہور ہو گیا، ورنہ خیام نے تو خیمہ دوزی عمر بھر نہیں کی۔

خیام نیشاپور میں پیدا ہوا اور ۵۱۷ (۱۱۲۳ء) میں راہیٔ ملک عدم ہوا۔ ھذا ما اجمع علیہ الاکثرون، مگر مشہور سلجوقیوں کا وزیر نظام الملک لکھتا ہے کہ عمر میرا ہمعصر ہے اور ہم دونوں ایک عمر کے ہیں۔ امام موفقؒ سے نیشاپور کے مدرسہ میں پڑھتے ہیں اور نظام الملک ۴۰۸ھ میں پیدا ہوا تھا۔

علی ای حال مگر اس میں تو شک نہیں کہ یہ دونوں آپس میں بہت میل ملاپ رکھتے تھے اور مل کے سبق پڑھتے تھے۔ ان دونوں کا تیسرا دوست حسن ابن صباح فرقۂ حشاشین (۲۸) کا بانی ہوا، جو فرقہ اس سے پہلے 'اسماعیلیہ' کے نام سے مشہور تھا۔

ان تینوں دوستوں میں عہد و پیمان ہو چکے تھے کہ جس شخص کو پہلے ترقی ہوگی اور جو پہلے عالی عہدہ پائے گا، وہ اپنے دوستوں کی ہر طرح مدد کرے گا۔ اللہ کی شان ان دونوں سے پہلے نظام الملک کو بھاری رتبہ ملا۔ یہاں تک کہ سلطان الپ ارسلان سلجوقی (۱۰۶۳-۱۰۷۳) کا

وزیر اعظم ہوگیا۔

اس نے اپنے دونوں رفیقوں کو بلا کے حسب خواہش مالا مال کر دیا۔ خیام کو تو علم ریاضیات وفلک کا فطرتی مذاق تھا۔ اس نے 'علم جبر' میں ایک کتاب تالیف کی اور اپنے دوست نظام الملک کی نذر کی؟ پھر ایک اور کتاب ''علم المساحتہ والمکعبات'' میں تالیف کی، جس نے خیام کے نام کو شہرت کو پر لگا دئے اور کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

ملک شاہ نے جب اسے باکمال پایا تو ۴۶۷ھ میں فلکی رصد کی تدوین کی تکلیف دی کہ رصد خانہ اور تقویم دونوں کی حالت سنبھل جائے۔ خیام نے ایک مدت تک شاہی رصد خانہ کی خدمت کی۔ ایک ایسا زائچہ بنایا، جس میں رصدوں کی جدولین وغیرہ بہت خلاصہ طور پر دکھائی گئیں۔ تقویم درست کی۔ اس نے ملک شاہی سن یا جلالی سن کی ایجادی عزت حاصل کی، جس کی ابتداء ۴۷۱ھ سے ہوئی۔ (۱۵/ مارچ ۱۰۷۹ء م)

اس مقام پر اتنا اور کہہ دوں کہ اس نے ''جدول التقویم لسنویہ'' (۴۶۹ و ۴۷۰) کے حساب کے علاوہ 'فلکی سال' حد بھی معین کی اور نہایت صحیح حد تجویز کی۔

غرض کہ سلجوقی دربار میں یہ ہمیشہ حرمت کے ہاتھوں لیا گیا، مگر ایمان کی تو یہ ہے کہ جس قدر علوم ریاضی وغیرہ میں اس کی شہرت ہوئی، اس سے کہیں زیادہ اس کی شاعری نے دنیا بھر کے دل میں مقبول ہونے کی سفارش کی اور اثر نظم نے مشہور کر دیا۔ اس کی رباعیوں کی تعداد پانچ سو اشعار ہیں، جن میں ایک حصہ سے مزید میں صوفیوں کا فلسفہ کوٹ کوٹ کے بھر دیا ہے۔ خیام نے اپنی جدید رائیں ان رباعیوں میں کچھ اس انداز سے ظاہر کیں کہ عالموں کی قیامت اٹھ کھڑی ہوئی۔ یہ مقدس گروہ بڑی لے دے سے پیش آیا، مگر خیام نے بڑے استقلال سے زبان کے تیز ہتھیاروں سے ان کا مقابلہ کیا اور انھیں شکست فاش دی۔ اس ان بن کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ خیام پر بری بری تہمتیں قائم کی گئیں۔ بے دین کہہ دیا گیا اور حال کے علما نے آزادئ خیال وقول میں دوسرا والٹر کہہ دیا اور کہا خیام تو 'مادی المذہب' بالکل کافر تھا اور بعض کی رائے ہے کہ والٹر پر خیام کو ہر طرح فضیات ہے، جس نے بیرون

اورسونیبون اور شونبھور کے خیالات کو بڑی خوبی سے منظوم (۲۹) پیرائے میں دکھا دیا ہے۔
مختصر یہ کہ خیام 'واضع فلسفہ جدیدہ' تھا، جس پر اگلے فلسفیوں کو ناز تھا اور فارسی کو افتخار۔ فلسفۂ جدیدہ سے یہ بیکن کا فلسفہ مراد نہیں ہے، بلکہ وہی اگلا یونانی فلسفہ جسے خیام کی کوشش نے جدت کے رنگ میں رنگنا چاہا۔

گو کہ یہ پہلا حصہ حکیم خیام کے حالات میں ناتمام ہے، مگر پھر بھی خیام کی جانب ملک کو متوجہ کرنے کا ایک آلہ ہے۔ اگر زمانے نے مہلت دی تو عنقریب اس کا دوسرا حصہ اس بے پروائی سے شائع نہ کیا جائے گا، جس کا پتہ یہ پہلا حصہ دے رہا ہے، بلکہ اس کے خلاف خیام کے بقیہ حالات (جو غالباً کتب عربیہ سے اخذ کیے جائیں گے) اور رباعیات کی چھان بین کا ایک مجموعہ پیش کر کے اپنی محدود معلومات کا ثبوت دیا جائے گا۔

میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان چند اوراق کے مجموعے میں بہت سی فروگذاشتیں اور بہت سی لغزشیں واقع ہوئی ہوں گی، جن سے آگاہ کرنا ناظرین کا پہلا فرض ہے اور اس کی تصحیح میں میری مدد کرنی نہ صرف مجھے ممنون بنانے کی کوشش ہے، بلکہ ملک پر احسان کرنا ہے، جس کا مجھے انتظار رہے گا۔

والسلام علیکم ایہا القارئون

حوالہ جات وحواشی

۱۔ جن کی تصانیف سے کتاب "نفحات الانس فی حضرات القدس" صوفیائے کرام کے اقوال وحالات کا ایک بے مثال مجموعہ ہے۔صاحب مضمون

۲۔ یہ ''نزہتہ الارواح'' ہے، جسے مولانا شمس الدین محمد شہرزوری نے ۵۹۶ھ۔۶۱۱ھ میں تالیف ہوئی۔بحوالہ خیام، سید سلیمان ندوی، خیام، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۸۸ء، ص۔۲۳۔۲۱۔ مرتب

۳۔ جب کہ بقول زہرا خانلری یہ کتاب ۶۲۵ھ میں لکھی گئی اور سلجوقی بادشاہ علاء الدین کیقباد سے منسوب ہوئی۔اس میں تصوف، اخلاق اور آداب معاش ومعاد کا مفصل ذکر بڑی سلیس زبان میں کیا گیا ہے۔اس کے مصنف نجم الدین رازی، نجم دایہ کے نام سے مشہور ہوئے۔بحوالہ زہرای خانلری، فرہنگ ادبیات دری، انتشارات بنیاد فرہنگ ایران، بی تا، ص۔۴۵۹، مرتب

۴۔ نام مذکور غلط ہے۔درست نام ابوالحسن علی بن یوسف بن ابراہیم قفطی معروف بہ ابن قفطی (۵۶۸۔۶۴۶ھ) ہے۔کتاب کا اصل عنوان ''اخبار العلما باخبار الحکماء'' ہے۔''تاریخ الحکماء'' کے نام سے ظہیر الدین ابوالحسن بیہقی (المتوفی ۵۶۵ھ) یا بقول صاحب فرہنگ دری ابوالحسن علی بن ابی القاسم زید بن محمد بن الحسین البیہقی نے

بھی ایک کتاب ۵۴۹ھ میں لکھی تھی اور یہ کئی عناوین مثلاً تاریخ حکماء الاسلام یا تتمۃ صوان الحکمۃ سے بھی مشہور ہے، جس کا فارسی ترجمہ رشیدالدین فضل اللہ المقتول (۷۱۸ھ) کے بیٹے غیاث الدین کے عہد میں ''درۃ الاخبار ولمعۃ الانوار'' کے نام سے کیا گیا تھا۔ بحوالہ فرہنگ بزرگان، ایضاً، ص۔۳۹۵، خیام، ایضاً، ص۔ ۲۶ و فرہنگ ادبیات دری، ایضاً، ص۔۱۰۱۔ مرتب

۵۔ پورا نام رشیدالدین فضل اللہ، تاریخ تالیف ۷۱۰ھ، مغلوں کے دربار میں وزیر رہا اور غازان خان و الجائتو کے حکم سے یہ تاریخ لکھی، جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ البتہ تیسری جلد نایاب ہے۔ بحوالہ فرہنگ ادبیات دری، ایضاً، ص۔۱۵۵۔ مرتب

۶۔ مولف کا پورا نام امیر دولت شاہ بن علاء الدولہ سمرقندی تھا۔ وہ تیموریوں کے دور کے جلیل القدر اشخاص میں سے تھا۔ اس کے معاصرین میں امیر شیر علی نوائی اور جامی تھے۔ بحوالہ ایضاً، ص۔۲۱۴۔ مرتب

۷۔ معروف جغرافیہ داں عمادالدین زکریا محمد قزوینی (م۔۶۸۲ھ) کی دو عربی کتابوں کا ذکر آتا ہے، جو اس طرح ہیں: ا۔ عجایب المخلوقات و غرایب الموجودات، ۲۔ آثار البلاد۔ یہاں ''اطہر البلاد'' سہواً لکھا گیا ہے۔ اول الذکر کا فارسی ترجمہ بھی دستیاب ہے۔ بحوالہ ایضاً، ص۔۲۵۴۔ مرتب

۸۔ یہ تذکرہ دو جلدوں میں نہیں، البتہ چار ابواب میں منقسم ہے اور جامع ترین تذکروں میں شمار ہوتا ہے۔ بحوالہ ایضاً، ص۔۲۱۴۔ مرتب

۹۔ اس کا مولف غیاث الدین بن ہمام الدین معروف بہ خواند میر ہے، جس نے تین جلدوں پر مشتمل یہ کتاب ۹۲۹ میں لکھی اور ابتدا سے سال تالیف تک عمومی تاریخ عالم پر مشتمل ہے۔ بحوالہ ایضاً، ص۔۲۱۴۔ مرتب۔

۱۰۔ اس کا دوسرا نام ''مجمع النوادر'' ہے اور خیام سے متعلق مستند ترین منابع میں شمار ہوتا ہے۔ مرتب

۱۱۔ یہ غالباً ڈاکٹر ڈینی سن راس کا وہ مفصل مقدمہ ہے، جو انھوں نے ۱۹۰۰ء میں فٹز جیرالڈ کے ترجمۂ خیام کی اشاعت کے وقت لکھا تھا اور اس کے تین ابواب میں انھوں نے بالترتیب عہد خیام، زندگیٔ خیام اور فٹز جیرالڈ کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ مرتب

۱۲۔ اس کا پورا نام محمد بن سید برہان الدین خاوند شاہ بن کمال الدین محمود (م۔ ۹۰۳ھ) ہے اور میر خواند کے نام سے مشہور تھا۔ البتہ 'اخوند شاہ' غلط ہے۔ اس کی مذکورہ کتاب سات جلدوں پر مشتمل ہے، جس میں چھ جلدیں اس نے لکھیں اور ساتویں جلد خواند میر نے لکھی۔ بعد میں رضا قلی خان ہدایت (م۔ ۱۲۸۸ھ) نے ''روضۃ الصفائی ناصری'' کے نام سے قاچاری دور کے حالات کے بارے میں تین جلدوں کا اضافہ کیا۔ بحوالہ ایضاً ص۔ ۲۴۰، ۴۹۴، ۵۳۵۔ مرتب

۱۳۔ یہ کتاب انگریزی میں بعنوان ''لائف آف خیام'' ہے، جسے جے۔ کے۔ ایم۔ شیرازی نامی ایرانی مصنف نے ۱۹۰۵ء میں لندن سے شائع کی تھی اور بقول علامہ ندوی ''گمراہ کن اغلاط اور قیاسات'' سے پر ہے۔ بحوالہ خیام، ایضاً، ص۔ ۷۹ و ۸۶۔ مرتب

۱۴۔ مصنفہ احمد بن نصر اللہ ٹھٹھوی سندھی، تالیف ۱۰۰۰ھ۔ بحوالہ خیام، ایضاً ص۔ ۲۰۔ مرتب

۱۵۔ لطف علی بیگ آذر بیگدلی (م۔ ۱۱۹۵ش) نے یہ کتاب ۱۲۷۴ش میں تالیف کی۔ بحوالہ فرہنگ ادبیات دری، ایضاً ص۔ ۲ و ۵۔ مرتب

۱۶۔ مصنفہ مولانا خسرو ابرقوہی، تالیف ۸۰۸ھ۔ بحوالہ خیام، ایضاً ص۔ ۲۰۔ مرتب

۱۷۔ ۴۴۰ھ (یا اس کچھ پہلے) قرین قیاس ہے۔ مرتب

۱۸۔ المنقضد من الضلال، مطبوعہ مصر، صفحہ۔ ۶

۱۹۔ المنقضد من الضلال، مطبوعہ مصر، صفحہ۔ ۱۵

۲۰۔ ملک شاہ کو [حسن بن علی] نظام الملک وزیر کیا ملا گویا سونے کی چڑیا مل گئی یا یوں

کہوں کہ جاتی دنیا کی حکومت مل گئی اور صرف یہی نہیں، بلکہ دین کے دولت بھی !اس نے نظام الملک کی رائے سے سیکڑوں نیک کام کیے، مدرسے جاری کیے، علوم دین کو ترقی دی۔ کیا یہ کام کچھ کم ہیں؟ امام غزالیؒ جیسوں کی قدم بوسی نصیب ہوئی، علماء کی خدمت کی۔ بھلا ایک بادشاہ کے لیے ایسی ایسی عمدہ باتیں تھوڑی ہیں؟۔ صاحب مضمون

۲۱۔ المنقضد من الضلال، مطبوعہ مصر، صفحہ۔۶

۲۲۔ یہاں اتنا ذکر کرنا کافی ہے کہ خیام کی تصانیف سے متعلق بحثیں اس کتاب میں شامل ہیں۔ متعلقہ اضافی بحث کے لیے سلیمان ندوی کی کتاب ''خیام'' بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں بعض کتابوں کے نام بھی درست درج نہیں ہیں۔ مثلاً ''میزان الحکم'' کو ''نظام الحکم'' لکھا گیا ہے وغیرہ۔ مرتب

۲۳۔ اصل۔ تاریخین، اسی طرح رباعی کی جمع رباعیین وغیرہ۔ مرتب

۲۴۔ اصل لفظ (Geneous) ہے، جو اردو میں 'جینی اَس' لکھا جانا چاہیے۔ ساتھ ہی وضاحت بھی ضروری ہے کہ مضمون نگار موصوف نے ہر جگہ 'عمر' لکھا ہے، جسے ہیں نے 'خیام' یا 'عمر خیام' کر دیا ہے۔ مرتب

۲۵۔ ہفت روزہ احسن الاخبار، کلکتہ، جلد۔۱، شمارہ۔۲۲ تا ۳۱، ۱۸ جولائی ۱۹۰۲ء، تا ۱۹ ستمبر ۱۹۰۲ء۔ اول تو یہ مضمون احسن الاخبار، کلکتہ سے ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا اور مضمون نگار نے اپنا پتہ کلکتہ امرا تلا لین نمبر۔ ۱۱ لکھا ہے۔ یہاں اخبار میں اس کی اشاعت کی تفصیلات درج کی گئی ہیں۔ اس کے بعد کتابی شکل میں ۱۹۰۳ء میں پہلی بار مع ضمیمہ شائع ہوا۔ دوبارہ کراچی سے ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری کے مقدمہ اور مفید نوٹ کے ساتھ اسے من و عن ۱۹۹۷ء میں چھاپا گیا۔ مرتب

۲۶۔ یہ نہایت ہی مختصر رسالہ الخیام کا پہلا حصہ ہے، جس نے صرف چند نوٹوں کے بہم ہونے کی وجہ سے ایک مجموعی صورت اختیار کر لی ہے۔ اسے چھپنے کے لیے لکھنؤ

روانہ کرچکا تو ۱۶ شوال کا پرچہ ''الھلال'' ذیقعدہ کی چڑھتی تاریخوں میں میرے ہاتھوں میں آیا۔کوئی بزرگ اسعد آفندی سلیم ان کے سوال کے جواب میں مدیر ''خواجہ جرجی زیدان'' نے خیام کے حالات لکھے ہیں۔ یہاں سے الھلال کا ذکر کردیں کہ قاہرہ کا ایک قابل قدر اور بڑی آب وتاب سے نکلنے والا پرچہ ہے۔اس کا عربی ٹائپ نہایت ہی خوشنما ہے۔گیارہ برس ہوئے ہر ماہ میں دو بار شائع ہوا کرتا ہے۔عربی لٹریچر میں بھی یہ کچھ کم نہیں ہے۔تاریخی ،فلسفیانہ اور سائنس سے متعلق مضامین اس کے کالموں کو رونق دیا کرتے ہیں۔ مشاہیر کے سوانح اس کی جان ہیں۔ایسے وقت میں یہ میگزین غنیمت ہے۱۲۔ صاحب مضمون

۲۷۔ یعنی فاضل مہربان شیخ عبدالقادر صاحب، بی۔اے، ''آبزرور'' اور ''مخزن'' کے ایڈیٹر۱۲۔ صاحب مضمون

۲۸۔ حشیش، بھنگ کو کہتے ہیں۔ یہاں فرقۂ حشاشین سے مراد فرقۂ باطنیہ قرامطہ ملاحدہ ہے۔ چونکہ حسن ابن صباح نے یہ گھاس نکالا تھا اور اس کے عرق وسفوف سے اپنے جانباز مریدین کو جو 'فدائی' اور 'باطنی' کے خوفناک نام سے مشہور تھے، بے ہوش کر کے 'التمونت' کی پہاڑیوں میں اپنی بنائی ہوئی جنت کی سیر کراتا تھا اور اسی جنت کی آرزو میں سنگدل فدائی خون کرتے پھرتے تھے۔ یہ ایسے سخت واقعات ہیں، جن کے سامنے مرحوم شاہ ایران ناصرالدین شاہ قاچار کا واقعۂ قتل اور مرزا رضا کی بے باکی اور سنگدلی بالکل خفیف سانحہ نظر آتا ہے۱۲۔ صاحب مضمون

۲۹۔ اصل۔نظمی۔ مرتب

☆☆☆

رباعیاتِ عمر الخیام

مولانا ابوالکلام آزاد

پچھلے دنوں بعض اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ رباعیاتِ عمر الخیام کا ایک نیا ایڈیشن امریکہ میں مرتب ہوا ہے اور عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ ولایت کی پچھلی ڈاک میں اس کے تفصیلی حالات آ گئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ نیویارک کی ایک بہت بڑی پبلشر کمپنی جان مارٹن اس ایڈیشن کو چھاپ رہی ہے اور متعدد خصوصیات اس میں ایسی جمع کی گئی ہیں، جن کی وجہ سے یورپ امریکہ کے ''ادبائے عمر یین'' (۲) اس کی اشاعت کا نہایت دل چسپی سے انتظار کر رہے ہیں۔

مرقعات و رسوم: اس ایڈیشن کی ایک بڑی خصوصیت انتہا درجہ کا جمال طباعت اور حسن صورت ہے۔

عمر خیام کے اس وقت تک بے شمار پر تکلف ایڈیشن مختلف شکلوں میں نکل چکے ہیں لیکن بیان کیا جاتا ہے کہ اس نئے ایڈیشن کے تکلفات کے آگے تمام پچھلے ساز و سامان ہیچ نظر آئیں گے۔ علی الخصوص اس کے مرقعات اور تصاویر و رسوم جو دلدادگان خیام کی نظر افروزی کے لیے ہر تیسرے چوتھے صفحہ کے بعد لگائے گئے ہیں:

مشاطہ رانگر (۳) کہ بر اسباب حسن دوست

چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسد!

یہ خیالی تصویریں جو آج کل پر تکلف ادبی تصنیفات کے ساتھ چھاپی جاتی ہیں، غالباً عام قارئین کرام کو ان کی قدر و قیمت کی صحیح اطلاع نہ ہوگی۔ مشاہیر گذشتہ کی تصنیفات کے متعلق خیالی تصاویر بنانا ایک مستقل فن ہے، جس کے بڑے بڑے ماہرین و مشاہیر ہیں۔ جب کبھی کوئی نادر کتاب چھپتی ہے تو اس کے لیے ان کی خدمات محفوظ کر لی جاتی ہے۔ وہ ایک ایک تصویر کے لیے سو سو پاؤنڈ اجرت پیشگی لیتے ہیں۔

پچھلے دنوں انگلستان کے ایک کلب نے ''الف لیلہ'' کے ترجمہ برٹن کا نہایت پر تکلف ایڈیشن دس جلدوں میں طبع کیا تھا اور اس کے بڑے بڑے مناظر حسن و عشق و خلافت وسلطنت کی تصویریں یورپ کے مشہور ماہرین فن رسوم خیالیہ سے بنوا کر شامل کتاب کی تھیں۔ میں نے یہ نسخہ دیکھا ہے۔ پوری کتاب میں کم از کم پچاس مرقع ضرور ہوں گے، لیکن فی مرقع ۳۰ ر پونڈ سے لے کر دو سو پاؤنڈ تک اجرت دی گئی تھی۔

''رباعیات عمر خیام'' بھی پچھلی چوتھائی صدی سے بڑے بڑے مصوران مشہور کے فکر و تخیل کا ایک معرکتہ الآرا موضوع رہا ہے۔ عمر خیام کی صورت کا موزوں تصور کرنے اور اس کی رباعیات و مطالب کو تماثیل مصورہ کی اشکال میں پیش کرنے کے لیے بڑے بڑے مصوروں نے اپنے اپنے جوہر کمال دکھلائے۔ علی الخصوص موجودہ یورپ کے مشہور ترین مصور مسٹر گلبرٹ جیمس کی تصویریں عدیم النظیر تسلیم کی گئیں، جن میں سے بعض کو فٹز جیرالڈ (Edward J. Fitzgerald) کے ترجمے میں آپ نے جا بجا دیکھا ہوگا۔

لیکن امریکن ایڈیشن کے شائع کرنے والوں کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے تمام پچھلے نسخوں سے بہتر مرقعات کا اہتمام کیا ہے۔ اب تک اس قدر روپیہ اور دماغ خیام کی تصویروں پر کسی نے صرف نہیں کیا۔ یورپ کے مشہور مصوروں کی خدمات کئی سال پیشتر سے حاصل کر لی گئی تھیں اور فارسی شاعری کی ادبی تاریخ اور اس عہد کے عجمی حکما و شعرا کے لباس و اشکال کا

تاریخی مواد اس غرض سے بہم پہنچایا تھا کہ مصوروں کو بہتر سے بہتر اور اقرب سے اقرب تصور قائم کرنے میں ان سے مدد ملے۔

ان تصویروں میں خود خیام کی تصویریں نہایت اعلیٰ درجہ کی کھینچی ہیں اور کامل الفن اشخاص معترف ہیں کہ تمام پچھلی تصویروں سے زیادہ مشرقی اور خیام کے خیالات کے لحاظ سے کامل تر قیافہ کے مطابق ہیں۔ ان کے علاوہ سو سے زائد رباعیوں کے بھی مرقع کھینچے ہیں اور رنگین اور مطلاّ و مذہّب طبع کیا ہے۔ ان مرقعات میں سے چار تصویریں ''سفیر'' لندن نے شائع کردی ہیں۔ ان کی نقل ہم بھی شائع کرتے ہیں۔ ان کے نیچے انگریزی میں رباعیات کا ترجمہ بھی درج تھا۔ تین ترجموں کی اصل رباعیاں یاد آگئیں اور درج کرلی گئیں، لیکن ایک ترجمہ اس درجہ مبہم، مختصر اور کسی بہت ہی غیر معروف رباعی سے تعلق رکھتا ہے، جس کی اصلی رباعی کا سرسری طور سے پتہ نہ لگ سکا اور صرف اتنی سی بات کے لیے رباعیات کی ورق گردانی کون کرتا؟

مکمل ترجمہ: ایک بہت بڑی خصوصیت اس ایڈیشن کی یہ ہے کہ اس میں عمر خیام کی تمام رباعیات کا مکمل انگریزی ترجمہ دیا گیا ہے۔ وہ مشہور فٹز جیرالڈ کے ترجمے کی طرح نظم میں ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ فارسی شاعری کے اس سب سے بڑے قادرالکلام مترجم کا نسق و انداز اور اسلوبِ خاص ہر رباعی کے ترجمے میں ملحوظ رہے۔ حتیٰ کہ اس کی جمع وتہذیب کرنے والوں کا خیال ہے کہ ایک ناواقف شخص، فٹز جیرالڈ کی نظم میں اور اس کے تراجم میں بمشکل فرق کرسکے گا۔

ہم نے بعض اردو جرائد میں دیکھا کہ اس نسخے کی اشاعت کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے اسے پہلا مکمل ترجمہ خیال کیا ہے، حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ اس سے پیشتر ایک بڑی تعداد میں ایسے ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں، جن میں فٹز جیرالڈ کی ترجمہ کردہ رباعیات کے علاوہ کئی سو اور رباعیوں کا ترجمہ بھی نظم و نثر میں دیا گیا ہے اور بعض میں تو یہ التزام کیا ہے کہ رباعیات کے جس نسخے کو اصل قرار دیا، اس کی تمام رباعیوں کا ترجمہ بھی ساتھ درج

کر دیا۔ اس قسم کے مترجموں میں گارنر، ہنری دے فرنان، نیکولس اور علی الخصوص پروفیسر والانیتن ژوکوفسکی کا نام قابل ذکر ہے، جس نے نسخۂ کلکتہ اور نسخۂ سینٹ پیٹرز برگ کی تمام رباعیات کا ترجمہ کر دیا ہے۔

ان میں سے آخر الذکر مستشرق کا نسخہ میرے پاس موجود ہے۔ اس نئے امریکن ایڈیشن سے پہلے یہی ایڈیشن سب سے آخری ایڈیشن سمجھا جاتا تھا۔ اس میں سینٹ پیٹرز برگ کے نسخے کی ۳۴۰ / رباعیوں کا مکمل ترجمہ شامل کیا گیا ہے۔ دیگر نسخوں کی مترجمہ رباعیوں کو شامل کر لیا جائے تو انگریزی ترجمہ شدہ رباعیوں کی تعداد پانچ سو تک پہنچ جاتی ہے۔

اسی طرح فرانسیسی، ڈنمارکی، آلمانی (جرمن) اور روسی زبان میں بھی ۷۵ / سے ۴۰۰ / تک رباعیوں کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

لیکن یہ ترجمے وہ قبولیت حاصل نہ کر سکے جو 'مغربی خیام' یعنی فٹز جیرالڈ کی ۷۵ / رباعیوں کے لیے قدرت نے مخصوص کر دی تھی۔ اس کی انگریزی رباعیوں میں جو سلاست و عذوبت اور حسن ترکیب و تاثرِ بیان پایا جاتا ہے، اس کے سامنے یہ تمام ترجمے اس طرح نظر آتے ہیں، جیسے کسی اصلی فارسی نظم کے مقابلے میں اس کا بے اثر لفظی ترجمہ۔ فارسی شاعری اور مغربی ادبیات اصولاً اس درجہ باہم مختلف ہیں کہ دونوں میں تبائن و تضاد کا ایک اٹلانٹک بہہ رہا ہے۔ اسے عبور کرنے میں صرف فٹز جیرالڈ ہی کی ہمت کام کر گئی اور وقت و حالات، جدت و حداثت، اتحاد خیالات و مشرب، نیز جماعت کے وقتی انفعال و تاثر نے ایک مرتبہ اس کا ساتھ دے دیا۔ یہ باتیں ہمیشہ اور ہر شخص کے حصے میں نہیں آ سکتیں۔

یہی سبب ہے کہ یہ تراجم ایک ادبی یا حکیمانہ مترجمہ ذخیرہ سے زیادہ وقعت حاصل نہ کر سکے۔ ان سے صرف یہ کام لیا گیا کہ غیر فارسی داں ادبائے عمر یبین نے ان کے ذریعہ بقیہ رباعیوں سے بھی واقفیت حاصل کر لی۔ ان سب میں مسز بورین اور ہانفیلڈ کے بعض تراجم نسبتاً زیادہ فصیح و دل نشیں تھے، جنھوں نے کیمبرج کے نسخے کی بعض رباعیات کا ترجمہ

سنہ ۱۸۹۰ء میں کیا تھا اور مجلس عمر خیام لندن نے سنہ ۱۸۹۶ء میں شائع کیا۔ تاہم نہ تو وہ فٹز جیرالڈ کی طرح عشاق خیام کے وسیع حلقہ میں کوئی ادبی محبوبیت حاصل کر سکیں اور نہ انگریزی ادبیات میں ایک داخلی جز و شعری کی طرح انھیں قبولیت ہوئی۔ ان کا شمار بھی ترجمہ میں ہے، البتہ اعلیٰ قسم کے تراجم میں۔

پس یہ کہنا تو صحیح نہیں کہ نیا امریکن ایڈیشن رباعیات کا پہلا مکمل ترجمہ ہے، البتہ اس کی خصوصیت یہ بتلائی جاتی ہے کہ ان کے تراجم میں فٹز جیرالڈ کے اتباع، بلکہ ہمسری کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ فٹز جیرالڈ کا اصلی کارنامہ سوئن برن کے الفاظ میں یہ ہے:

> ''وہ یورپ کا خیام ہے۔ اس نے ترجمہ نہیں کیا ہے،
> بلکہ انگریزی میں خیام کی روح شعری کو متشکل و متمثل کر دیا
> ہے۔ اگر خیام انیسویں صدی کے اندر انگلستان میں پیدا ہوتا اور
> فردوسی کی جگہ چوسر کی زبان میں (یعنی انگریزی
> میں) رباعیات کہتا، تو یقیناً وہ ایسی ہی ہوتیں جیسی کہ اس مغربی
> خیام کے دل پر مشرقی فیضان لاہوتی سے القا ہوئی ہیں۔''

اس ایڈیشن کے مرتب کرنے والوں کا دعوا ہے کہ فٹز جیرالڈ نے ایسا ترجمہ صرف ۷۵ رباعیوں کا کیا ہے، لیکن یہ خیام کی تمام رباعیوں کا ویسا ہی مکمل ترجمہ ہوگا۔

ادبا و شعرائے عمر بیین کی ایک بہت بڑی امریکن اور انگریزی جماعت نے ترجمے کا نیا کام باہم بانٹ لیا تھا، چند اصول مقرر کر لیے تھے، جن کی پابندی کی ہر مترجم کوشش کرتا تھا۔ ان میں سے اکثر مترجم ایسے ہیں، جنھوں نے ایک ایک رباعی کا ترجمہ ایک ششماہی میں کیا ہے۔ پہلے ترجمہ کیا جاتا، پھر تمام ترجموں سے مقابلہ ہوتا، اس کے بعد نظم کیا جاتا۔ پھر عرصے تک خود ناظم اپنے مختلف اوقات و اثرات میں کمال استغراقِ شعریہ و شرقیہ کے ساتھ پڑھتا، خاص خاص نغمات مخصوصۂ خیام میں گاتا اور دوسروں سے لے میں پڑھوا کر سنتا۔ جب اس طرح اس کی کیفیت و وجدان کے ذوق و تاثیر کی طرف سے پورا پورا اطمینان

ہو جاتا اور کئی کئی مرتبہ ترمیم و اضافہ ہو چکتا تو پھر تمام مترجمین کی صحبت میں پیش کیا جاتا اور کئی کئی دن تک محافل و مجالس شعرائے عمر یئین میں اس پر بحث و مذاکرہ ہوتا۔ جو لوگ باہر کے شریک کار ہیں، ان کے پاس لکھ کر بھیج دیا جاتا اور اس طرح تمام رائیں جمع کی جاتیں۔

ان تمام مراحل کے بعد مترجمہ رباعی کتاب کی جاتی۔ اس وقت بھی کہ کتاب چھپ رہی ہے اور عنقریب نکلنے والی ہے تغیر و تبدل اور اصلاح و نقد کا سلسلہ برابر جاری ہے۔

ہر نظم گوہریں کہ بیاد تو گفتہ ام
دل رخنہ کردہ و جگر خویش سفتہ ام

رباعیات کی تعداد: رباعیات عمر خیام کی اصلی تعداد کا سلسلہ اب تک مختلف اور ایک حد تک مشتبہ ہے۔ مختلف نسخے جو یورپ اور مشرق میں پائے جاتے ہیں، باہم تعدد میں مختلف ہیں۔ مصنفین یورپ نے ان کی تحقیقات و کشف حقیقت کے لیے بڑی بڑی کوششیں کی ہیں۔

سب سے زیادہ قدیم نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ہے، جو آٹھویں صدی ہجری کے اواخر کا لکھا ہوا ہے، یعنی عمر خیام کی وفات سے تقریباً سو برس بعد کا۔ اس میں ۴۰۶؍ رباعیات ہیں۔ میں نے یہ نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی میں ممبر ہونے سے پہلے دیکھا تھا۔ اس کے بعد ایک مرتبہ نکلوانا چاہا تو معلوم ہوا کہ لندن گیا ہے اور غالباً مسٹر اڈورڈ براؤن نے منگوایا ہے۔ اب عرصے سے بالکل مفقود الخبر ہے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کہاں گیا؟ (۴) اس کے ساتھ گلستان کا وہ قیمتی نسخہ بھی مفقود الخبر ہے، جو عالمگیر اورنگ زیب نے نہایت اہتمام سے نقل کرایا تھا اور اس نسخہ کی نقل تھا جو خود شیخ سعدی کے لڑکے کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر بروکلمین اور سر جان گلگرسٹ نے گلستان کے ایڈیشن اسی نسخے سے نقل لے کر شائع کیے تھے۔ (۵)

میں نے کئی بار سکریٹری کو توجہ دلائی کہ برٹش میوزیم سے خط و کتابت کر کے تحقیق کیا جائے، وہیں یہ نسخے گئے ہیں اور رکھ لیے گئے ہیں، لیکن غریب ایشیاٹک سوسائٹی کو اس کی

جرأت کب ہوسکتی ہے کہ انڈیا آفس کے زیر اثر کتب خانہ سے کسی طرح کا مطالبہ کرے؟

اس کے بعد سر گوراوسلی کا نسخہ ہے۔ وہ ایران سے لائے تھے اور اب آکسفورڈ کے کتب خانہ بولڈین میں محفوظ ہے۔ اس کا سال کتابت سنہ ۱۴۶۱ء ہے، (۶) یعنی اسی نسخے پر اعتماد کیا ہے، مگر اس میں صرف ۱۵۸/رباعیاں ہیں۔

تیسرا قدیمی نسخہ سینٹ پیٹرزبرگ کے کتب خانہ کا ہے، جس کا عکس پروفیسر والاتین ژوکوفسکی (Valentinn Zhukovski) نے باعانت بیرن ویکٹر روزین معلم السنہ مشرقیہ، پیٹرزبرگ یونیورسٹی شائع کیا ہے اور جو نہایت اعلیٰ ترین خط نستعلیق میں فی صفحہ ایک رباعی کی ترتیب سے لکھا گیا ہے۔ اس کے کاتب نے اپنا نام 'سید علی الحسینی' لکھا ہے۔ سال کتابت سنہ ۱۴۹۹ء ہے، یعنی سر گوراوسلی کے نسخے سے تقریباً چالیس برس بعد۔ اس میں ۳۴۰/رباعیاں ہیں۔

چوتھا نسخہ بانکی پور کے کتب خانہ کا ہے۔ پانچواں کیمبرج یونی ورسٹی کا، جو کسی قدیم تہرانی نسخہ (۷) کی نقل ہے۔ اول الذکر میں ۶۰۴/رباعیاں ہیں، دوسرے نسخہ میں ۸۰۰۔

ان کے علاوہ بے شمار حدیث العہد قلمی نسخے یورپ کے مختلف کتب خانوں میں ہیں، جن میں سے بعض کی مندرجہ رباعیات پندرہ پندرہ سو تک شمار کی گئی ہیں۔ پروفیسر براؤن نے ایک قدیم نسخۂ تہران میں دیکھا تھا، جس میں ۷۷۰/رباعیاں تھیں اور عہد صفویہ کے درمیانی زمانے کا نوشتہ تھا، مگر جو نسخہ تہران میں چھپا ہے، اس میں صرف ۲۳۰/رباعیاں ہیں۔ اسی کی نقل بمبئی میں بھی بار بار چھپ چکی ہے۔

ایک اور نسخہ پرانا رباعیات کا ہے، جس کا ذکر مجھے آج کل کے ایک روسی سیاح و مستشرق موسیو اموانوف (۸) نے کیا ہے، جو انھوں نے اصفہان میں دیکھا تھا اور اس کی نقل لے لی تھی۔

یہ نقل آج کل میرے ہی پاس ہے۔ اس میں ۷۱۴/رباعیاں ہیں اور عام ترتیب ابجدی کی جگہ ابتدا میں حمد و نعت کی تمام رباعیاں جمع کر دی ہیں۔ اس کے بعد بغیر کسی ترتیب

کے باقی رباعیاں درج کی ہیں۔ سیاح موصوف کا بیان ہے کہ اصلی نسخہ سنہ ۸۰۷ ہجری کا نوشتہ ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو یہ نسخہ سب سے زیادہ قیمتی ہے اور سر گور اوسلی کے نسخہ سے بھی زیادہ اس کو قیمتی سمجھنا چاہیے۔ اسی خیال سے میں دیگر نسخوں سے اس کا مقابلہ کر رہا ہوں۔ چند رباعیاں اس میں بالکل نئی ہیں۔

ان رباعیوں کی تعداد اختلاف نے یہ مسئلہ پیدا کر دیا کہ اصلی رباعیوں کی تعداد کتنی ہے؟ اور یہ جو زیادہ سے زیادہ تعداد تک رباعیاں موجود ہیں، یہ سب کی سب عمر خیام ہی کی ہیں یا نہیں؟

مستشرقین عمر یئین کا عرصے تک یہی خیال رہا کہ جس قدر زیادہ رباعیاں نکلتی آتی ہیں، وہ سب کی عمر خیام کی ہیں اور جن نسخوں میں تعداد کم ہے وہ یا تو ناقص ہیں یا کسی شخص نے اپنے مذاق کے مطابق اصل دیوان رباعیات کا انتخاب کر لیا ہے۔ چنانچہ جب کبھی کسی زیادہ تعداد والے نسخے کی، ان میں سے کسی کو اطلاع ملی تو وہ اس درجہ خوش ہوا گویا علوم وحکمت قدما کا کوئی گم شدہ ذخیرہ ہاتھ آ گیا ہے یا برباد شدہ مدرسۂ اسکندریہ کے کتب خانے کا سراغ مل گیا ہے۔

غالباً سب سے پہلے مستشرق بزرگ وشہیر پروفیسر والانتین ژوکوفسکی (Valentin Zhukovski) نے اس غلطی کو محسوس کیا اور ایک محققانہ رسالہ عمر خیام پر لکھ کر ثابت کیا کہ بڑی تعداد رباعیات منسوبۂ خیام کی الحاقی ہے اور بعد کو کسی غلط فہمی کی وجہ سے خیام کی جانب منسوب ہو گئی ہے۔

یہ رسالہ ۱۸۹۷ء میں ''المظفریہ'' کے رسائل کے ساتھ سینٹ پیٹرز برگ سے چھپ کر شائع ہوا۔ اس وقت سے یورپ اور امریکہ کے عمر یئین وخیامیین کے حلقے میں الحاقی رباعیات کی تحقیق وتجسس کی ایک نئی کاوش پیدا ہو گئی ہے۔

پروفیسر ژوکوفسکی نے اپنے دعوے کے ثبوت میں ۸۲/رباعیاں پیش کی ہیں، جو مختلف معروف ومتداول نسخوں میں خیام کی طرف منسوب ہیں۔ حالانکہ خیام سے انھیں کوئی

تعلق نہیں۔ وہ دراصل شیخ عطار، خواجہ حافظ، مولانائے روم، شیخ عبداللہ انصاری اور انوری وغیرہ متوسطین شعرائے ایران کی ہیں۔

اس مضمون کو پڑھ کر مستشرقین فرنگ نے الحاقی رباعیات کی تلاش شروع کردی۔ پروفیسر براؤن نے ۴۲/رباعیوں کا اور ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق اس وقت تک کل ۱۰۱/رباعیاں الحاقی ثابت ہوچکی ہیں۔(۹)

اس میں شک نہیں کہ پروفیسر والاتین ژوکوفسکی کی تلاش وجستجو قابل تحسین ہے، لیکن افسوس کہ مستشرقین کے بعض دیگر مباحث خیامیہ کی طرح یہ بحث ہمارے لیے چنداں قیمتی نہیں ہوسکتی اور نہ اس بارے میں پروفیسر مذکور کی تحقیقات کے ہم محتاج تھے۔

اگر وہ مشرق کے کسی ایسے شخص کی اعانت بہم پہنچا لیتے، جو فارسی شاعری کا تھوڑا سا بھی ذوق رکھتا ہے اور عام تذکروں اور دیوانوں کا مطالعہ کرچکا ہے تو اس مشکل کی قیمت چند لمحوں کی سرسری نظر سے زیادہ نہ نکلتی اور بغیر کسی زحمت وتلاش کے اس سوال کا حل مل جاتا. بلکہ جس حد تک وہ حل کرسکے ہیں، اس سے کہیں زیادہ وسیع وتشفی بخش ہوتا۔

اصل یہ ہے کہ الحاقی کلام کا سوال صرف خیام ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ ایک حد تک عام ہے۔ الحاقی منسوبات کی عام بلا سے شاید ہی کوئی مشہور شاعر بچا ہو۔ اس درجے سے بھی نظر بلند تر کیجیے اور عام طبقۂ مشاہیر واعاظم مصنفینِ متقدمین ومتوسطین کو دیکھیے تو ہر علم وفن کے ارباب کمال اسی مصیبت سے دوچار نظر آئیں گے۔ آج کتنی ہی تصنیفات ہیں، جو امام ابوحنیفہ، جابر طرطوسی، ابن قتیبہ، امام غزالی، ابومعشر فلکی، فخرالدین رازی، بوعلی سینا، معلم ثانی، ابن عربی، محقق طوسی وغیرہ سے منسوب ہیں، جن کی مصنفات ہر عہد اور ہر حصۂ عالم میں معروف ومتداول رہیں، لیکن نظرِ دقت سے دیکھا جائے تو از سرتا پا الحاقی ہیں۔

ناصر خسرو، فردوسی، خواجہ حافظ، جلال الدین رومی، حکیم سنائی، سب کے دیوانوں کا یہی حال ہے، لیکن جن لوگوں کو ایک ادنی ذوق بھی فارسی شاعری اور مختلف اعصار ادب و علوم کے متعلق حاصل ہے اور ہر شاعر کے اندازِ مخصوص اور افکارِ مختلفہ کے متعلق نظر وبصیرت

رکھتے ہیں، وہ بغیر کسی زحمت و کاوش کے باول نظر اندازہ کر لیتے ہیں کہ کس قدر کلام اصلی ہے اور کس قدر بعد کو اغلاط رواۃ کاتبین اور سہو و التباس ناقلین یا بعض دسائس واغراض شخصیہ ودینیہ سے ملا دیا گیا ہے؟

علی الخصوص عمر خیام کے متعلق تو یہ مسئلہ کچھ بھی دشوار نہ تھا۔ اس کا انداز بیان ونظم ایک خاص طرز کا ہے۔ وہ اپنے افکارِ شعریہ وحکمیہ میں بعض ایسی خصوصیات رکھتا ہے، جو چند رباعیوں کے مطالعے کے بعد ہی نمایاں ہو جاتی ہیں اور کسی دوسرے کا کلام سامنے آ کر دھوکا نہیں دے سکتا۔

تصوف واخلاق، سنائی اور عطار دونوں کہتے ہیں۔ رزم و جنگ فردوسی اور نظامی دونوں نے لکھا ہے۔ خمریات اور جام وصراحی، حافظ کی طرح سب کے ہاتھ میں ہے۔ تغزل اور راز و نیازِ عشق سے سعدی کی طرح خسرو اور نظیری کی اور اسی طرح عرفی کی کائنات شعر بھی معمور ہے، لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟ گو ان سب کا لباس اور شکل وصورت ایک ہے، لیکن ادائیں تو خاص خاص ہیں، جو کسی طرح صاحبانِ نظر سے چھپ نہیں سکتیں:

من انداز قدت را می شناسم!

میں تو کہتا ہوں کہ اس شخص کے لیے فارسی شاعری کے ذوقِ مطالعہ کا دعویٰ حرام ہے، جس میں اتنی اداشناسی بھی نہ ہو کہ صرف کلام سن کر ایک شاعر کو اس کے دوسرے ہم رنگ وہم فکر شاعر سے تمیز کر لے:

ہر کہ خواہد میل دیدن، در سخن بیند مرا!

علاوہ بریں، جو رباعیات عمر خیام کے نام سے منسوب کی گئی ہیں، ان کا بڑا حصہ فارسی کے تذکروں اور دیوانوں میں دیگر شعرا کے نام سے موجود ہے، جس کے لیے کسی بڑے علمی تجسس کی ضرورت نہیں۔ تذکرہ دولت شاہ، مرآۃ الخیال، آتش کدہ، مجمع الفصحا، ریاض الشعراء (۱۰)، (اصل۔ والہ داغستانی، چونکہ یہاں صرف تذکروں کے نام درج ہیں، اس لیے یہی بہتر تھا کہ والہ داغستانی کے تذکرہ کا ذکر ہوتا۔ مرتب) اس درجے کی

مشہور کتابیں ہیں کہ معمولی درجہ کے فارسی دانوں نے بھی انھیں ضرور دیکھا ہوگا۔ ان میں وہ رباعیات دوسروں کے کلام میں ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔ شیخ بوعلی سینا کی یہ رباعی ہمارے یہاں بچے بچے کی زبان پر ہے:

در دہر چو یک منی و آں ہم کافر
پس در ہمہ دہر یک مسلماں نبود

لیکن بعض نسخوں میں اسے عمر خیام کے نام سے لکھا دیا ہے۔ ہمارے یورپین محققوں کو یہ ثابت کرنے کے لیے بڑی ہی جانکاہ محنتیں گوارا کرنی پڑیں کہ یہ رباعی خیام کی نہیں، بلکہ شیخ کی ہے۔

اسی طرح شیخ جامی کی لوائح، لمعات، شرح ابن فرض وغیرہ رسائل میں جو رباعیات وحدۃ الوجود وغیرہ کے متعلق بکثرت درج کی گئی ہیں، ان کو بھی بعض ناقلین نے خیام کی طرف منسوب کردیا۔ پروفیسر ژوکوفسکی نے ان کی تحقیقات میں کئی سال بسر کردیے اور سینٹ پیٹرز برگ کے کتب خانہ کی ایک ایک کتاب دیکھ ڈالی۔ حالانکہ شیخ جامی کے یہ رسائل نہایت عام اور کثیر الاشاعت ہیں اور بمشکل کوئی فارسی داں شخص ایسا ہوگا، جس نے انھیں نہ پڑھا ہو۔

شیخ جامی کے بعد سب سے زیادہ التباس شیخ الاسلام انصاری کی بعض رباعیات میں ہوا ہے۔ شیخ کی مناجاتوں کا عام انداز یہ ہے کہ وہ پہلے نثر مسجع میں ایک دعا مانگتے ہیں یا رحمت ورافت الہیہ سے مخاطبہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد ایک قطعہ یا رباعی مناسب مقام پر ایزاد کر کے دوسرا مخاطبہ شروع کرتے ہیں۔ سوز وگداز، والہانہ طلب وسوال، عاشقانہ شکوہ وشکایت اور عارفانہ وحکیمانہ حکم ومقابلہ، شیخ الاسلام کی نظم ونثر کی خصوصیات ہیں، مگر یہی باتیں ایک دوسرے فلسفیانہ رنگ میں خیام کے ہاں بھی ہوتی ہیں۔ عوام کو اس میں دھوکا ہوا اور شیخ کی بہت سی رباعیاں خیام کے نام سے نسخوں میں لکھ دیں۔ رباعیاتِ خیام کا جو نسخہ آج کل ایران اور ہندوستان میں رائج ہے، اس میں بھی شیخ کی متعدد رباعیات مل گئی ہیں۔

ایک نئی دریافت: یہاں تک تو ہم نے ان الحاقی رباعیات کے متعلق لکھا ہے، جن کی تعداد ایک سو سے متجاوز ہے اور جن کا بڑا حصہ پروفیسر والانتین ژوکوفسکی نے تحقیق کیا ہے، مگر اب ہم مستشرقین یورپ کی تحقیقات سے الگ ہو کر خود نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔ خیام کی مسلمہ رباعیات میں سے، جن کو تمام ناقدین و محققین و مترجمین نے خیام کے مخصوص نوادرِ فکر و شعر میں سے شمار کیا، ایک رباعی یہ ہے:

من بندہ عاصیم، رضائے تو کجاست؟
تاریک دلم، نور و صفائے تو کجاست؟
مارا تو بہشت اگر بطاعت بخشی
آن بیع بود، لطف و عطائے تو کجاست؟

اکثر تذکرہ نویسوں نے بھی اس رباعی کو خیام کے ترجمہ میں لکھا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ایک نہایت ہی بلند ترین مقام عبودیت و تذلل و اعتراف ہے، جو بہتر سے بہتر طریقے اور موثر سے مؤثر انداز میں شاعر نے اس میں بیان کیا ہے۔ اس کا حقیقی لطف صرف انھیں صاحبانِ حال و کیفیت کو حاصل ہو سکتا ہے، جو اس مقام تک پہنچ چکے ہیں۔ قرآن حکیم میں برادرانِ یوسف (صلی نبینا و علیہ السلام) کا عزیزِ مصر سے یہ کہنا، اسی نکتے کی طرف اشارہ ہے:

جِئنَا بِبِضَاعَةٍ مُزجَاةٍ فَاَوفِ لَنَا الکَیلَ، وَتَصَدَّق عَلَینَا، اِنَّ اللّٰہَ یَجزِی المُتَصَدِّقِین!

ہم ایک ناقص پونجی لے کر تیرے سامنے حاضر ہوئے ہیں، لیکن تو اس کے نقص اور کمی کو نہ دیکھ، بلکہ اپنے لطف و کرم پر نظر رکھ کر ہمیں بھرپور غلہ دے دے۔ یہ خرید و فروخت اور برابر کا معاوضہ نہیں ہے۔ تجھ سے بطور صدقہ و عطیہ کے طلب گار ہیں۔ خدا صدقہ دینے والوں کو اس کا بدلہ ضرور ہی دیتا ہے! ''بدریوزہ گری آمدہ ایم نہ بہ تجارت''

وقال المتنبی:

وهبت علی مقدار کفی زماننا
ونفسی علی مقدار کفك یطلب!

لیکن خیام کے مطالعہ کرنے والے تعجب سے سنیں گے کہ یہ رباعی خیام کی نہیں ہے، بلکہ عارف مشہور و جلیل سلطان ابوسعید ابوالخیر قدس اللہ سرہ کی ہے۔

سلطان ابوسعید کا کلام نظم غالباً ایک جگہ جمع نہیں کیا گیا ہے۔صرف تذکروں میں چند رباعیات مل جاتی ہیں۔(۱۱) ان مشہور رباعیات میں یہ رباعی نہیں ہے۔اسی لیے کسی شخص کو اس کی نسبت شبہ پیدا نہیں ہوا، لیکن شیخ کے حالات و مقامات میں ایک نہایت ضخیم کتاب ان کے پوتے شیخ محمد بن المنور بن ابوسعید نے لکھی ہے، جس کا نام ''اسرار التوحید فی مقامات الشیخ ابی سعید'' ہے۔اس کا مطالعہ کرتے ہوئے یکایک اس رباعی پر میری نظر پڑ گئی۔اس کے مصنف نے تصریح کردی ہے کہ ایک خاص وجدانی حالت میں یہ دوبیتی شیخ کی زبان پر جاری ہوئی تھی۔

اگر مزید تلاش کی جائے تو عجب نہیں کہ اسی طرح الحاقی رباعیات کے متعلق غیر متوقع معلومات کا ایک ذخیرہ جمع ہو جائے۔

نیا امریکن ایڈیشن: اس تفصیل سے مقصود یہ تھا کہ نئے امریکن ایڈیشن کی منتخبہ رباعیات کی مقدار پر نظر ڈالی جائے۔ بیان کیا گیا ہے کہ اس میں ۴۱۸/رباعیوں کا ترجمہ دیا گیا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ایڈیشن کے مؤلفین کے نزدیک اصلی مقدار اتنی ہی ہے، مگر ہم کو یقین ہے کہ اس میں ایک بڑی تعداد الحاقی رباعیات کی ہوگی، کیونکہ اگر سرگوراوسلی کے نسخے کی تمام رباعیات اصلی تسلیم کرلی جائیں، تب بھی اتنی تعداد اصلی رباعیات کی ثابت نہیں ہوتی۔

(الہلال، کلکتہ، ۲۴/جون و یکم جولائی ۱۹۱۴ء)

حوالہ جات وحواشی

۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے یہ مضمون اپنے رسالہ ''الہلال'' کے کالم ''مطبوعاتِ جدیدہ'' کے ذیل میں رباعیات عمر خیام کے نئے امریکن ایڈیشن کے تعارف وتبصرہ کے طور پر تحریر کیا تھا۔ بعد ازاں، ابوالنصر آہ کے مقالہ کو جب ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری نے ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، کراچی، پاکستان سے با مقدمہ و حواشی کے چھاپا تو مولانا کے اس مضمون کو اس کے 'تکملہ' کے طور پر شائع کیا۔ (مرتب)

۲۔ 'ادبائے عمر یئین' سے مقصود یورپ اور امریکہ کے وہ اربابِ ادب وشعر اور صاحبان فلسفہ وحکمت ہیں، جو اپنے تئیں عمر خیام کی طرف نسبت دیتے ہیں اور اپنے خیالات وادبیات میں بالکل اس خراسانی حکیم کے پیرو ومقلد ہو گئے ہیں۔ کچھ ضرور نہیں کہ وہ مستشرق (اورینٹیلسٹ) اور فارسی داں بھی ہوں۔ ایسے بھی ہزار ہا شعرا وادبا اس حلقے میں داخل ہیں، جنھوں نے محض فٹز جیرالڈ یا اس کم تر درجے کے مترجمین کے ذریعے خیام کے خیالات سے واقفیت حاصل کی، مگر رباعیات کے انداز بیان و اسلوب شاعری سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ اسی رنگ اور اسلوب پر نظم ونثر فخریہ لکھنے لگے۔ (صاحب مضمون)

۳۔ اصل۔ بگر

۴۔ ولادیمیر ایوانوف نے ایشیاٹک سوسائٹی کی جو وضاحتی فہرست ۱۹۲۴ء میں تیار کی تھی، اس میں رباعیات خیام کے جن دو نسخوں کا ذکر آیا ہے، وہ مولانا آزاد کے ذکر کردہ نسخوں سے مختلف ہیں۔ ان میں ایک نسخہ پروفیسر ای۔ بی۔ پاویل کے پاس موجود کسی نئے نسخہ سے ۱۸۹۸ء میں نقل کیا گیا ہے اور اس میں ۵۰۳ر رباعیاں ہیں، جو الفائی لحاظ سے ترتیب دی گئی ہیں۔ جب کہ دوسرا نسخہ بھی اسی کی نقل ہے، البتہ اس میں کچھ رباعیاں زیادہ ہیں۔ ایوانف کے اس فہرست کو من وعن دوبارہ ۱۹۸۵ء میں چھاپا گیا ہے۔ ایک دوسرا نایاب خطی نسخہ مع حواشی وتعلیقات (از محفوظ الحق) ایشیاٹک سوسایٹی نے ۱۹۳۹ء میں چھاپا ہے۔ یہ پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی کی ذاتی ملکیت تھا اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ ۹۱۱ھ مطابق ۱۶۰۵ء کا ہے اور غالبا سلطان حسین بایقرا کے عہد میں معروف خطاط سلطان علی مشہدی کی کتابت اور مشہور زمانہ نقاش بہزاد یا اس کے شاگرد کے ذریعہ بنائے گئے نقاشیوں سے مزین ہے۔ اس لحاظ سے یہ بڑے قیمتی نسخہ پر مشتمل ہے۔ بحوالہ ولادیمیر ایوانوف، کونسائز ڈسکرپٹیو کیٹلاگ آف دی پرشین مینوسکرپٹ، ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ، ۱۹۸۵، ۹۴۔۱۹۳ نیز دی رباعیات آف خیام، مرتبہ ایم۔ محفوظ الحق، روائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ، ۱۹۳۹ء، صفحات مختلف۔ مرتب

۵۔ اس نسخےسے متعلق اطلاع بھی ایوانوف کے فہرست میں موجود نہیں ہے۔ مرتب

۶۔ مولانا آزاد نے 'ء' مخفف عیسوی کے بجائے ہر جگہ مسیحی لکھا ہے، جس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ البتہ اردو میں اول الذکر ہی رائج ہے، جب کہ ایران میں میلادی یا اس کا مخفف 'م' لکھا جاتا ہے۔ مرتب

۷۔ اصل۔ طہران، البتہ جدید املا 'تہران' ہے۔ مرتب

۸۔ یہ غالباً وہی ایوانوف ہے، جس کا ذکر سطور بالا میں آچکا ہے۔ مرتب

۹۔ ان نئی الحاقی رباعیوں کی تفصیل کے لیے پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران (Literary History of Persia)اب۔۲، صفحہ۔ ۲۴۶ سے ۲۵۹ تک دیکھئے۔
صاحب مضمون

۱۰۔ اصل۔ والہ داغستانی، چونکہ یہاں صرف تذکروں کے نام درج ہیں، اس لیے یہی بہتر تھا کہ والہ داغستانی کے تذکرہ کا ذکر ہوتا۔ مرتب

۱۱۔ اب ان کے اشعار کا مجموعہ بعنوان ''دیوان شعر'' شائع ہو چکا ہے۔ان کے اشعار کی تعداد بہت مختصر ہے۔ اگرچہ ان سے منسوب اشعار کی تعداد ۱۵۰۰ تک بتائی جاتی ہے، جس میں بیشتر دوسروں کے ہیں۔ بحوالہ فرہنگ بزرگان اسلام و ایران، باہتمام۔ آذر تفضلی و مہین فضائلی جوان، تہران، ۱۳۷۲ش، ص۔ ۴۲۰، مرتب

☆☆☆

حکیم عمر ابن خیام

جواد علی خانعالی

اگر کلیم شود ہم سخن، سخن نکنیم
و گر خلیل شود میہمان بگردانیم

خیام (۲) کے بحرِ زندگانی میں جس گوہر شاہوار کو غواص نظر ڈھونڈ نکالتا ہے، وہ درِ یک دانہ حسن طلب ہے، جو عمر کے فروغ پر نور معرفت بن کر اس کے رخ انور پر چمکتا ہے، اس کے آئینہ زندگی میں دیکھو خط وخال سے روحانی جذبات کی امنگ پائی جاتی ہے۔ صاف وشفاف رنگت کے نیچے معرفت کا لطیف شہابی خون جھلکتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ طبعی استغناء واستقلال کے بل چہرے پر پڑے ہیں، جو ہر ایک گفتار و کردار میں اپنی جھلک دکھاجاتے ہیں۔

خیام کے سلسلہ وار واقعات گوش گذار کیے جاتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ ساتھ ہی ساتھ نتیجہ بھی نکلتا جائے۔ جس خاک نیشاپور سے اس کا خمیر تیار (۳) ہوا تھا، وہیں کے فیوض و برکات نے اسے جامۂ کمال پہنایا۔

امام موفق الدین نیشاپوری جو اپنے وقت کے اکابر فن میں مسند امتیاز پر بٹھلائے

جاتے تھے، درس وتدریس کی گرم بازاری اور علم کی خالص فیاضیوں نے ان کے مذہبی تقدس، مجتہدانہ شہرت اور علمی جامعیت میں حسن قبول کے چار چاند لگا دیے تھے۔

جس زمانے کے واقعات ہمارے پیش نظر ہیں، یہ مکتب فیض عجیب گلدستۂ پر بہار بنا ہوا تھا، جس میں علم ودانش کے شوخ رنگ گل بوٹے کھلے ہوئے تھے۔ پھر بھی ان میں سے نظر انتخاب تین کی طرف اٹھتی تھی، جن کی حیرت خیز ذکاوت وفطانت نے اگر ہم سب ساتھیوں کو ان سے مرعوب کر رکھا تھا تو خود انھیں استاد کا چشم وچراغ کردیا تھا۔ ان کے ادراک بلند، نکتہ نوازی اور دقیقہ رسی کا شہرہ ہو گیا تھا۔

ہم آپ کو بتلائے دیتے ہیں کہ یہ تینوں تھے کون؟ سب سے پہلے جو نام زبان پر آنے کا مستحق ہے، وہ نصیر الدین طوسی کا نام ہے، جو آگے چل کر 'معلم ثانی نظام الملک محقق طوسی' کہلایا۔ (۴) دوسرا نام گرامی حسن ابن صباح اور اس اتحاد ثلاثہ کا تیسرا رکن، یا مثلث دانائی کا تیسرا ضلع ہمارا عالی خیال حکیم عمر وخیام تھا۔ (۵) ایک دن کا ذکر ہے جبکہ یہ تینوں حلقۂ درس سے اٹھ کر حسب دستور اپنے درسی مسائل پر مناظرانہ گفتگوئیں کرتے ہوئے جارہے تھے کہ حسن ابن صباح نے مبحث گفتگو سے گریز کر کے زبان نیاز سے آرزو مند لہجے میں یہ جملہ ادا کیا کہ:

> ''یہ بات زبان زد عام وخاص ہے کہ جس نے اس مکتب فیض میں زانوئے تلمذ تہہ کیا اور اس شہریارِ علم کی آستان بوسی کی، بیدار بختی نے اس کے قدم لیے۔ اقبال مندی نے رکاب تھامی اور آسمان شہرت کا ستارا بن کر چمکا۔ مانا کہ ہم میں سے بھی کوئی کسی منصب جلیل پر فائز ہو تو اس شرطِ وفا کو نہ بھولے کہ آج ہم تینوں اس خوشگوار اور مکروہات سے پاک معاشرت میں ایک دوسرے کی جان ہیں۔''

اس خلوص ومحبت میں ڈوبے ہوئے الفاظ کا جس جوش سے خیر مقدم کیا گیا ہوگا، وہ

اسی سے ظاہر ہے کہ ہر ایک کو کتنی اہم ذمہ داری سے سبکدوش کرنے والے کلمات تھے۔ الغرض تینوں نے محرک کے حسب منشا باہم عہد واثق کیا۔

نصیر الدین طوسی کا قول ہے کہ اس قول وقرار کے بعد ہم لوگوں کو نہایت اطمینان ہو گیا تھا اور بفراغت ہم سب نے چار سال آئندہ اس مبارک مکتب میں گذار دیے۔

طوسی کہتا ہے کہ تعلیمی دائرے سے نکل کر مجھے رختِ سیاحت تیار کرنا پڑا۔ سیاحت میں خراسان، ماوراء النہر، غزنی، کابل کی خاک چھان کر جب میں لوٹا، بارگاہ سلطان الپ ارسلان سے خطاب ومنصب عالی وقار سے مالا مال کیا گیا۔ گذشتہ واقعات کا شیرازہ منتظم ہو چکا تھا کہ ہمارا دوست خیام بھی وہاں وارد ہوا۔ انھیں دیکھتے ہی مجھے ایام طفلی کے عہد کی یاد تازہ ہو گئی اور میں اس بات پر آمادہ ہوا کہ اسی تقریب میں تقرب سلطانی سے باریاب ہونے کا موقع ان کے لیے نکالوں۔ تذکرۃً جب اس خیال کا اظہار خیام کے روبرو میں نے مع اس کی علت متخیلہ کے کیا تو اس نے قطعاً اس سے ناراضی ظاہر کی اور صاف کہہ دیا کہ ''میں تحقیق وانکشاف کی زندگی پھٹے حالوں میں بسر کرنے کو لاکھ درجہ اس زندگی پر ترجیح دیتا ہوں، جس سے مادی ترقی دنیاوی عیش وعشرت کو جس قدر فوقیت حاصل ہوتی جائے، اسی قدر روحانی ترقی میں انحطاط آتا جائے اور جوہر کمال کو نیازمندانہ حالت میں رکھنا جس کا اصول محکم ہو۔''

مستیِ عیشِ دو عالم کی نہیں پروا مجھے
دیکھنے والا ہوں میں اس نرگسِ مخمور کا

الغرض جب شاہی درباداری کی طرف خیام کا میلِ خاطر ہونے سے میں بالکل ناامید ہو گیا اور میں نے دیکھ لیا کہ

یک قلم بے سود ہے اظہارِ حالِ آرزو
حُسنِ بے پروا کے آگے عشق نامنظور کا

تو اس کے ساتھ مسلوک ہونے کی اس کے سوا دوسری صورت نظر نہ آئی کہ

بیت المال نیشا پور سے سو مثقال زر احمر کا ماہوار وظیفہ اس کے نام جاری کرایا جائے۔

ناظرین معیار انصاف وصداقت پر خیام کے عالی حوصلہ و بے نیاز دماغ سے نکلے ہوئے خیالات کو جانچ کر آپ ہی کہہ دیں کہ کیا یہ خیالات عام اقتضاء انسانی سے چوٹی کے نہ تھے اور کچھ دور کی نہیں کہتے تھے؟ اس خیال کی وقعت میں اس وجہ سے اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے کہ نصیرالدین طوسی کے توسل کی وجہ سے اسے حسب مذاق ومنشاء ایسی خدمت تفویض کی جا سکتی تھی، جو اس کے علمی ذوقِ تحقیق کی روبراہ ہو سکے۔ اس سے قطع نظر کی جائے تو میزان تقابل پر تولتے ہوئے بھی اس کا رتبۂ عالی تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

خیام کی آن بان تو دیکھ ہی چکے۔ حسن ابن صباح جو اسی میکدۂ علم کا میخوار تھا، دربارشاہ کا اشارہ پاتے ہی ایسا کس جاتا ہے کہ ہٹائے نہیں ہٹتا۔

واقعات کا سلسلہ اکھڑ کر پھر یوں جمتا ہے کہ خیام یہاں سے نیشا پور پہنچتا ہے اور وہاں ریاضیات بالتخصیص علم ہیئت کے متعلق ایسی ایسی عرش کی اتری ہوئی باتیں بتلاتا ہے کہ سننے والے ششدر وحیران رہ جاتے ہیں۔ اس کے کمالات کا غلغلہ دور دور مقامات پر پہنچتا ہے اور بہت تھوڑے عرصے میں اپنی کشور کشا عالی دماغی کی بدولت ارباب، دانش و ماہرین فن کی طبیعتوں پر ایسا قبضہ حاصل کر لیتا ہے کہ مرکز ارباب بصیرت قرار پا جاتا ہے۔ اس مرجعیت کا زمانہ ایسے تھیئٹر (۲) کا اسٹیج معلوم ہوتا ہے، جس پر حکیمانہ شان و وقار سے علم وحکمت کے دلنشیں تجربات وخیالات کے اظہار کا پارٹ کیا گیا ہو۔ بالآخر زمانے نے اس بلند آہنگی سے اس کے نام کا خطبہ شہرت کے ممبر پر للکار کے پڑھا، جس کی آواز بازگشت ایوان شاہی سے ٹکرائی اور جس کا اثر یہ ہوا کہ ایماء شاہی سے شاہی مہندسی کی خدمت اسے قبول کرنی پڑی۔ جس کو اس نے بڑی آن بان اور نیک نامی سے انجام دیا۔ ایک بڑا کام اس نے اسی خدمت کے زمانے میں یہ کیا کہ فارسی کی قدیم تقویم کی غلطیاں ثابت کر کے دکھائیں اور ان کی اصلاح کی۔

خیام کی طبیعت پر فلسفیانہ رنگ غالب ہونے کا نتیجہ لازمی تھا کہ عوام اور مذہبی گروہ اس سے برگشتہ رہے۔ چنانچہ مذہبی زبان میں اسے وہ وہ بے نقط سنائی گئیں، جنھیں سن کر ایک سخت ساخت بے غیرت بھی عرق انفعال میں ڈوب جاتا۔ لیکن خیام نے ان کا منھ بند کرنے کے لیے ان کی نظروں سے اوٹ ہو جانا ہی مناسب خیال کیا:

تا کنم خاموش غوغائے جنون

بر چراغِ عمر دامان میزنم

سارا ٹھاٹھ یہیں کا یہیں چھوڑا، مبارک سرزمین حجاز کی ٹھانی اور وطن کو خیرباد کہہ کر چل کھڑا ہوا۔ دولت حج سے مالا مال ہو کر شرف زیارت روضۂ اقدس جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حاصل کی اور بعد زیارت حرمین شریفین بغداد پہنچا۔ بغداد والے جو خیام کا شہرۂ کمال سن کر پہلے سے نادیدہ مشتاق ہو رہے تھے، دیکھتے ہی اس پر ٹوٹ پڑے۔ لیکن خیام کی طرف سے بجائے کسی اخلاقانہ برتاؤ اور خوش کلامی کے خاموشی کا ٹکا سا جواب ملا اور جب اظہار خیال پر بے حد اصرار ہوا تو مجبوراً اسے یوں بولنا پڑا کہ:

''مشغلہ علوم قدیمی بکلی گذاشتہ ام بلکہ از مطالعہ آن نیز دل برداشتہ ام''

وقت طلوع دیکھا، وقت غروب دیکھا

اب فکر آخرت ہے، دنیا کو خوب دیکھا

آخر زمانہ خیام کا رنگ طبیعت اس سفر کے آغاز ہی سے بدل چلا تھا اور جب وہ خالص مذہبی خیال وعقیدت سے نکلا تھا تو کیوں نہ بدلتا۔ بجائے بادہ گساری کے صبح و شام تسبیح و مصلّی سے کام تھا۔ بغداد میں چپ چاپ بیٹھنا آسان نہ تھا، اس لیے بغداد سے سیدھا وطن کو واپس ہوا۔ لیکن وطن سے نکلنے کی جو شان تھی، اس میں اور موجودہ شان میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اب اسے نہ بادہ گساری کا سبق یاد تھا، نہ بادۂ شبانہ کی سرمستی تھی۔ لو جس کی طرف لگی تھی، ہر وقت اسی کا دھیان تھا اور وہی نام نوک

زبان اور پھر دم واپسین تک یہی لیل ونہار رہے۔

کیا ان واقعات سے مسلک خداشناسی وحق طلبی میں خیام کے سودائے سنگین کا سراغ نہیں لگتا اور اس کی ازلی صلاحیت کو نہیں تسلیم کرنا پڑا۔ جو اس کے لیے عین اس وقت جب کہ اس کا سفینۂ خیالات فلسفہ کی باد مخالف سے ڈگمگانے لگتا ہے، خضر طریقت بنتی ہے اور طبیعت کا بہاؤ جو بہتی گنگا سے کم نہ تھا، یک بیک سکون پر آجاتا ہے، جس کے بعد اس سے تصوف کی موجیں بلند ہوتی ہیں۔

خیام اور صوفیا: خیام کے بارے میں حضرات صوفیا کی رائے ابتدا ہی سے نہایت صائب تھی۔ وہ دیکھتے تھے کہ اس کا سینہ گنجینۂ اسرار وغوامض ہے، جس کے بیش بہا جوہر اس کی زبان رولتی ہے۔ وہ کلام خیام کے نہایت شائق اور اسے اشارات معنوی سے مملو مانتے تھے۔

حکایت مزار: زندگی کے واقعات آپ نے سن لیے، لیکن انصاف یہ ہے کہ ایک قصہ خواں کو موت کے واقعات اسی شوق سے پڑھنا چاہیے، جس دلچسپی سے قلم تذکرہ نویس لکھتا ہے۔

نظام الدین عروضی سمرقندی کہتے ہیں کہ ایک بار امام الحکماء عمر وابن خیام ایک پھلے پھولے باغ رشک گلزار ارم میں مصروف گلگشت تھے۔ اس وقت بہرہ کشان فیض صحبت میں میں بھی تھا۔ میری طرف مخاطب ہوکر یہ الفاظ ارشاد فرمائے کہ ''قبر من در نزہتکدۂ باشد کہ باد شمال بہر موسم بہار برادگلفشانی کند، و بہار تازہ از خاکم سر زند'' بات گئی گذری ہوگئی۔

تھوڑے دنوں میں بعد وفات خیام، جب پھر میں نیشاپور آیا تو اس کی سیف زبانی کا کرشمہ مہر پیش نظر تھا۔ میں نے دیکھا کہ حسن اتفاق سے ان کا مزار ایسے موقع پر ہے، جس پر ہر وقت چہار جانب سے درختان سرسبز وشاداب گلفشانی وشگوفہ باری کرتے رہتے ہیں اور کثرت گل سے ان کا قبہ پھولوں کا گنبد بن گیا ہے۔

تصانیف: خیام کے علمی کارناموں کی یادگاریں حسب ذیل ہیں:

تاریخ جلالی: یہ تاریخ جلال الدین ملک شاہ سلجوقی کے ایماء سے لکھی گئی اور اسی نام سے موسوم ہوئی۔

رسالہ جبر ومقابلہ: مونیشوز ڈہیکی جو یورپ کی کسی زبان میں اس کا مترجم ہے۔ اس رسالے سے اس کی قوت استقراء واستدلال کا نہایت فیاضی سے اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

> ''خیام درفلسفہ دانی بے نظیر روزگار بلکہ درخراسان امام وقت خویش بود۔ وبناخن فکر رسا گرہ سررشتۂ اسرار حکمیہ می گشود۔ مردم را بتعلیم تزکیۂ نفوس بمشاہدہ صنائع صانع مطلق می کشید، ودر بازنمودن اسرار سیاست مدن بمشرب یونیان مے کوشید۔''

معلقات حدود اقلیدس: اسے یورپ میں بے نظیر ہر دلعزیزی ومقبولیت دلانے والی سب سے بڑی چیز اس کی رباعیاں ہیں، جو فلسفیانہ تخیل کے ساتھ دلفریب طرز ادا کا جوہر لیے ہوئے ہیں۔ لطف یہ کہ رباعی کے ساتھ دیگر اساتذۂ کلام کا باوجود اعتناء کلی کرنے کے اس خاص صنف میں قبول عام کی دولت قدرتاً خیام کے لیے خاص ہو رہی ہے۔ ان کی رباعیوں کا مجموعہ گویا جامِ شراب ہے اور ایسا لبریز جام کہ چھلکنے پر بھی جس کے چھلک جانے کا اندیشہ نہ جائے۔ زندگی موت ہر وقت کے لیے اسی کی فرمائش ہے۔ تفنن طبع کے لیے مختلف مضامین کی چند رباعیاں پیش کش ناظرین ہیں۔ مر کر بھی شوق شراب نہیں جاتا، بلکہ وصیت کی جاتی ہے۔

چون فوت شوم بباده شوئید مرا — تلقین بشراب ناب گوئید مرا
خواہید کہ روز حشر یابید مرا — از خاکِ در میکدۂ جوئید مرا

ایضاً

چون مردہ شوم خاک مرا گم سازند و احوال مرا عبرت مردم سازند
بس خاک و گلم بادہ آغشتہ کشند وز کالبدم خشت سر خم سازند

ثبوت حلت مے میں ایک لطیف الزامی استدلال کرتے ہیں۔

گویند بہشت و حور عین خواہد بود وآنجا می ناب و انگبین خواہد بود
گر ما می و معشوق پرستیم رواست چون عاقبت کار ہمین خواہد بود

اخلاقی مضامین بھی ایسے ہی کثرت سے ہیں۔

دل تنگ مشوکہ تا جہان خواہد بود از تو بجہان نام و نشان خواہد بود
تا چرخ اثیر دختران سیر کند نقدِ تو خلاصۂ زمان خواہد بود

تغیرات ونیرنگ عالم:

روزے فلکم جامہ دہد میر کند روزے دگرم برہنہ چون سیر کند
با چون و چرائے فلکم کارے نیست غم خوردن بیہودہ مرا پیر کند

رضاجوئی:

خواہی ز فراق در فغان دار مرا خواہی ز وصال شادمان دار مرا
من با تو نگویم کہ چسان دار مرا زانسان کہ دلت خواست چنان دار مرا

رندانہ مشی:

کو مطرب و مے تا بدہم داد صبوح خوشوقت ولے کہ میکند یاد صبوح
ما را بجہان سہ چیز میباید خوش سرمستی و عاشقی و فریاد صبوح

فاسق کو نار جہنم نہ اثر کرے گی:

دست چو منی کہ جام و ساغر گیرد حیف است کہ آن دفتر و ممبر گیرد
تو زاہد خشکی و منم فاسق تر آتش نشنیدہ ام کہ در تر گیرد
در میکدۂ عشق نیازے داریم با شمع رخش نور و گدازے داریم
آنکہ بمئ عشق طہارت کردہ با روے بتِ خویش نمازے داریم

تقسیم کائنات وجود:

حق جان جہان است و جہان جملہ بدن واصناف ملائکہ حواس این تن
افلاک عناصر و موالید اعضاء توحید ہمین است و دگرہا ہمہ تن

حکیمانہ مقولہ:

بیگانہ اگر وفا کند خویش من است در خویش جفا کند بد اندیش من است
گر زہر موافقت کند تریاق است در نوش مخالفت کند نیش من است

حور لعدا الکو:

آنروز کہ توسن فلک زین کردند آرائش مشتری و پروین کردند
این بود نصیب ما ز دیوان قضا ما را چہ گنہ قسمت ما این کردند

امید بمغفرت خدا:

گہہ تختِ سلیمان بہ لئیمے بخشی گہہ تاج نبوت بہ یتیمے بخشی
یارب چہ شود گر مرا بے سببی از روضۂ مغفرت نسیمے بخشی

ہمارا انتخاب محض سرسری ہے، ورنہ خیام کے ہر ہر لفظ میں اسرار حکمت بھرے پڑے ہیں۔ یہ بات سخت قابل افسوس ہے کہ خیام سے زمانہ ایک شاعرانہ حیثیت سے روشناس ہے، لیکن درحقیقت خیام محض شاعر نہ تھا۔ اس کی حکیمانہ روش تھی اور فی الحقیقت وہ حکیم تھا۔ یورپ میں اس خاص نکتہ کے لحاظ سے اس کا کلام بہت بڑے پایہ کا مانا جاتا ہے اور اس سے نہ صرف لطف شاعری بلکہ لطف حکمت بھی لیا جاتا ہے۔

سنو! سنو! خیام کی روح کچھ بول رہی ہے۔ علامۂ فیضی کا یہ شعر ہے

من صرف نہ شاعرم حکیم
دانندۂ حادث و قدیم

(ماہنامہ زمانہ، کانپور، جلد ۱۲، نمبر ۳، مارچ ۱۹۰۹ء، ص ۱۴۱۔۱۴۸)

حواشی وحوالاجات

۱۔ اصل متن۔ عمرو

۲۔ غیاث الدین عمرو ابن ابراہیم الخیام نام ابوالفتح کنیت، سنہ پیدائش کے متعلق اختلاف ہے، لیکن سلطان سنجر کے عہد کی پیدائش ہے۱۲۔ صاحب مضمون

۳۔ اصل متن۔ طیار

۴۔ ان کا اصل نام ابوعلی حسن بن علی بن اسحاق طوسی تھا اور نظام الملک لقب تھا اور مشہور صوفی ابوسعید ابوالخیر اسے 'خواجہ جہان' کہہ کر پکارتے تھے، البتہ اس کے نام کے طور پہ 'نصیر الدین' کا ذکر نہیں ملتا۔ ۴۰۸ھ میں طوس میں تولد ہوا اور ۴۸۵ھ میں حسن بن صباح کے کسی پیرو کے ہاتھوں شہید ہوا۔ الپ ارسلان اور اس کے بیٹے ملک شاہ کے زمانے میں وہ تقریباً تیس سال تک وزیر کے عہدہ پر فائز رہا۔ بحوالہ فرہنگ بزرگان اسلام و ایران (از قرن اول تا چہارم دہم ہجری)، آذر تفضلی و حسین فضائلی جوان، انتشارات قدس رضوی، تہران، ۱۳۷۲ش، ص ۱۵۲ و فرہنگ ادبیات فارسی، زہرای خانلری کیا، انتشارات بنیاد فرہنگ ایران، ۱۳۴۸ش، ص ۵۱۰۔ مرتب

۵۔ ان کے ہم عصر ہونے میں کوئی شبہ نہیں، البتہ محققین نے ان تینوں حضرات کے ہم درس ہونے پر شک کا اظہار کیا ہے۔ مرتب

۶۔ اصل متن۔ ٹھیٹھر

☆☆☆

خیام: ایک مطالعہ

انور مسعود

انیسویں صدی کے وسط میں خیام عالمی افق پر نمایاں ہوتا ہے۔ اس کی بین الاقوامی شہرت سو برس کی شہرت ہے۔ اس ایک صدی کے عرصہ میں اس کی شخصیت اور شاعری پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس تمام تنقیدی اور تحقیقی سرمائے کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ڈنمارک کے محقق اور خاور شناس پیر پاسکال کا کہنا ہے کہ:

> ''گزشتہ سو برس میں خیام کی رباعیات کے جو ترجمے ہوئے اور جو رسالے اس پر لکھے گئے ان کی فہرست بنانا محال ہے۔''

''دمے با خیام'' (کچھ دیر خیام کے ساتھ) کے ایرانی مصنف علی دشتی کی تحقیق کے مطابق خیام کا کلام انگریزی میں ۳۱ مرتبہ فرانسیسی میں ۱۶ مرتبہ، جرمنی میں ۱۲ دفعہ، عربی میں آٹھ دفعہ، اطالوی میں چار دفعہ، ترکی اور روسی میں دو دفعہ اور ڈنمارکی، سویڈش اور ارمنی میں بھی دو مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔ خود فٹز جزالڈ خیام کا ترجمان بن کر زندہ جاوید ہو گیا۔ اس کا ترجمہ ۱۹۲۵ء تک ۱۳۹ بار شائع ہوا۔ نیویارک کی پبلک لائبریری میں اس موضوع پر پانچ سو عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔

ایک شاعر کی حیثیت سے دریافت ہونے سے پہلے بھی اس کی فضیلت اور علمی

حیثیت مسلم تھی۔ وہ اپنے عہد کے جملہ علوم و معارف پر حاوی تھا۔ اتنا زبردست ہیئت دان تھا کہ اپنے مربی ملک شاہ سلجوقی کے لیے 'التاریخ الجلالی' کے نام سے اس نے جو کیلنڈر تیار کیا، وہ گریگوری (Gregory) کے کیلنڈر سے زیادہ قرین صحت ہے۔ گریگوری کے کیلنڈر میں تین ہزار تین سو سال میں ایک دن کا مغالطہ پڑتا ہے، جب کہ عمر خیام کے کیلنڈر میں پانچ ہزار سال میں ایک دن کا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ ایک ایسا ماہر اور اعلیٰ پائے کا ریاضی دان تھا کہ اس نے تیسرے درجے کی مساوات حل کیں اور کارڈن (Cardon) ڈیکارٹ (Decartes) اور فیراری (Feaurari) کے لیے راستہ ہموار کیا۔ اس کے اس کارنامے کی بدولت تیسرے اور چوتھے درجے کی مساوات کی الجبرائی حل دریافت ہوئے۔ الجبرے میں جیومیٹری اور جیومیٹری میں الجبرے کے استعمال سے اس نے تجزیاتی ہندسے کی بنیادوں کو مستحکم کیا۔

جہاں تک اس کی شاعری کا تعلق ہے، اس کے بارے میں مختلف نقادوں کی آراء اسی طرح ہیں، جس طرح شراب مختلف پیمانوں میں پہنچ کر مختلف شکلیں اختیار کر لیتی ہے۔ علی دشتی کے نزدیک اس کی طرز فکر حکیمانہ ہے اور وہ ہر بات کے لیے عقلی دلیل تلاش کرتا ہے۔ سید سلیمان ندوی کے خیال کے مطابق وہ ایک صوفی تھا اور اس کا پیغام روحانی ہے۔ اسی طرح بغداد کے ایک فاضل نقاد احمد حامد الصراف نے عربی میں ''عمر الخیام'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے اور اس کے فلسفے کی روحانی تعبیر کی ہے۔ ان کے نزدیک خیام کا فلسفہ، فلسفہ اسلام سے متصادم نہیں۔ بغداد ہی کے ایک دوسرے فاضل معاصر نے اسے ایک ایسا انقلابی شاعر قرار دیا ہے، جو ہر روایت کا باغی ہے اور مذہب کے خلاف بھی اس نے صدائے احتجاج بلند کی ہے اور تقدس و زہد کے ہر مرکز پر ہلہ بولا ہے۔ بعضوں کے نزدیک وہ باطنی تحریک کا داعی تھا۔ ترکی کے معرف اسلامی مفکر رضا توفیق نے ان لوگوں پر کڑی تنقید کی ہے، جو خیام کے فلسفے کو 'اپی کیورین' فلسفہ کہتے ہیں۔ اسی طرح بعض نقادوں کے نزدیک وہ 'لاادریت' کے فلسفے کا ترجمان ہے اور اس نے لادینیت اور کفر والحاد کا پرچار

کیا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی اسے سعدی سے بھی بڑا 'معلم اخلاق' قرار دیتے ہیں۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ خیام سے منسوب رباعیاں اس آریائی روح کا اظہار ہیں، جو سامی عقیدوں سے رہائی چاہتی ہے اور لطف یہ ہے کہ ان سب کے سب نقادوں کے دلائل رباعیات خیام سے ماخوذ ہیں۔

خیام اس اعتبار سے بڑا خوش قسمت شاعر ہے کہ دنیا کی تمام بڑی اور اہم زبانوں میں اس کی رباعیات کے ترجمے ہو چکے ہیں، لیکن مفسروں کے اس انبوہ اور مترجموں کے اس اژدہام میں گھری ہوئی یہ شخصیت بڑی مظلوم بھی ہے۔ ایک خیام ہے، لیکن کیا کچھ نہیں۔ سید المحققین بھی، فیلسوف بھی، حجۃ الحق بھی، زندیق بھی، سچا مسلمان بھی، ملحد بھی، مفسر قرآن بھی، صوفی بھی، حکیم الاسلام بھی اور مذہب کا باغی بھی۔ مختلف شارحین نے اس کی فکر اتنے ان گنت مداروں میں گردش کرتی ہوئی دکھائی ہے کہ روس کے مشہور مستشرق ژوکوفسکی کو کہنا پڑا۔

> ''اگر کوئی شخص سو سال عمر پائے اور دن میں دو مرتبہ اپنا
> عقیدہ بدلے تو بھی اتنے متناقض خیالات پیش نہیں کرسکتا۔''

وہ مظلوم یوں بھی ہے کہ اس کے آئینے میں ہر نقاد نے اپنی شبیہ دیکھی ہے اور زندگی کے بارے میں اپنے نقطہ نظر کو خیام کا نقطہ قرار دیا ہے۔ جن بزرگوں کے نزدیک خیام کا کلام اسلامی تعلیمات کا علمبردار ہے، میں ان کے اس حسن گمان کا احترام کرتا ہوں، لیکن اس مضمون میں مجھے وہ کچھ بیان کرنا ہے، جو اس کی رباعیات کے مطالعے سے میں نے اخذ کیا ہے۔ ان تاثرات کے اظہار سے پیشتر میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ واضح کر دیا جائے کہ خیام کی ان رباعیات کی تعداد کتنی ہے جو زیادہ سے زیادہ مستند قرار پاتی ہیں اور میں نے اس سلسلے میں جس نسخے پر اعتماد کیا ہے، اس کی صحت کا مرتبہ کیا ہے؟

دراصل خیام کے بارے میں الحاقی اور سیار رباعیات کا مسئلہ بنیادی اور اہم ترین مسئلہ ہے۔ اس موضوع پر کافی تحقیق ہو چکی ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جوں جوں یہ تحقیق

آگے بڑھی ہے، اصل رباعیات کی تعداد کم ہوتی گئی ہے۔ یہ تعداد پھیلنے لگی تو ایک ہزار سے بڑھ گئی اور سمٹنے لگی تو صرف تیرہ ۱۳/رہ گئی۔ اسی لیے ۱۹۳۴ء میں ایک محقق شیڈر (Shaeder) نے اپنی تحقیق شائع کی اور یہ دعویٰ کیا کہ خیام نے ایک رباعی بھی نہیں لکھی اور اس کا نام فارسی شعرا کی فہرست سے خارج کر دینا چاہیے۔

اس دلچسپ تحقیق کی تفصیل یہ ہے کہ خیام کی زندگی میں شاید ہی کسی کو معلوم ہوا ہو کہ وہ شعر بھی کہتا ہے۔ اس کی وفات کے سو سال بعد تک اس کی کوئی رباعی منظر عام پر نہیں آئی۔ سب سے پہلے عماد الدین کاتب نے اپنی معروف کتاب ''جریدۃ القصر'' میں اس کا تذکرہ ایک شاعر کی حیثیت سے کیا ہے۔ یہ کتاب خیام کی وفات کے پچاس برس بعد تالیف ہوئی اور اس میں اس کا ذکر صرف عربی کے ایک شاعر کی حیثیت سے کیا گیا ہے اور اس کے عربی کے چار شعر بھی نقل کیے گئے ہیں۔ اس کی فارسی کی ایک رباعی پہلی مرتبہ امام فخر رازی کے رسالے ''التبنیہ'' میں ملتی ہے۔ پھر ''سندباد نامہ'' میں پانچ رباعیاں نقل ہوئی ہیں۔ اس طرح ساتویں صدی ہجری سے لے کر آٹھویں صدی کے وسط تک مختلف ماخذ میں نقل شدہ رباعیات کی تعداد ۳۶/ رہے اور خیام کی وفات کے دو سو سال بعد تک یہ تعداد پچاس تک پہنچ گئی ہے۔ ۸۲۰ ہجری تک خیام سے منسوب رباعیات کی تعداد ۶۰/ ہو گئی۔

علی دشتی کا قیاس یہ ہے کہ سیاسی اور سماجی حالات کے ناسازگار ہونے کے باعث خیام کی رباعیات پردہ خفا میں رہی ہیں، اس لیے کہ تاتاری حملے اور سقوط بغداد سے پہلے کی فضا خیام کے افکار کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ یوں لگتا ہے کہ متعصب فقیہوں کے خوف سے خیام اپنے چند قابل اعتماد دوستوں کے سوا کسی کو اپنے شعر نہیں سناتا تھا۔ اس لیے کہ اس کے افکار عمومی معتقدات سے ہٹ کر تھے۔

۸۴۰/ ہجری تک اس کی جو رباعیات نقل ہوئی ہیں، وہ زیادہ قابل اعتماد ہیں۔ اس کے بعد کئی لوگوں نے اس کے انداز میں رباعیاں کہنی شروع کر دیں، جو اس سے منسوب کر دی گئیں۔ خیام کی وفات کے تین سو سال بعد یہ تعداد ۸۰۰/ تک پہنچ گئی اور اس کی

رباعیات کے کئی نسخے مرتب ہو گئے۔

خیام کی اصل رباعیات کی تلاش میں محققین نے بڑی کاوش کی ہے۔ اس جستجو میں کرسٹن سن، ڈاکٹر روزن، ژوکوفسکی اور بودلین جیسے مغربی مستشرقین بھی شامل ہیں اور محمد علی فروغی، سعید نفیسی، علی دشتی اور صادق ہدایت جیسے ایران کے بلند پایہ محقق بھی۔

بودلین کا نسخہ ۱۵۸ ررباعیات پر مشتمل ہے۔ یہ نسخہ اس لیے قابل اعتماد نہیں کہ خیام کی وفات کے ۳۵۰ رسال بعد مرتب کیا گیا ہے۔ کرسٹن سن نے ۱۲۱۳ ررباعیات میں سے ۱۲۱ رکا انتخاب کیا ہے۔ یہ ساری رباعیاں بھی رباعیات اصیل قرار نہیں دی جاسکتیں۔ روسی محقق ژوکوفسکی کے نزدیک خیام سے منسوب سو رباعیاں بھی رباعیات اصیل قرار نہیں دی جاسکتیں۔ روسی محقق ژوکوفسکی کے نزدیک خیام سے منسوب سو رباعیاں ایسی ہیں، جو فارسی کے دوسرے بڑے شعرا مثلاً عطار اور رومی کے دواوین میں بھی موجود ہیں۔ اس نے ان رباعیات کو رباعیات سرگردان (Wandering Quatrains) کہا ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں سوامی گوبند رام تیرتھ نے اپنی کتاب (Nectur of Grace) کی تالیف کے سلسلے میں رباعیات خیام کے نسخوں کا مطالعہ کیا۔ ایرانی محققوں نے خیام کی اصل رباعیات کی دریافت کے ضمن میں انتہائی قابل تحسین کنجکاوی کی ہے۔ انھوں نے مغربی انداز تنقیح متن کی پیروی بھی کی ہے اور تنقیح قیاسی سے بھی کام لیا ہے۔ سعید نفیسی مرحوم کو خیام کے متن رباعیات کے ۱۱۹ رنسخے ملے، جن میں مفصل ترین نسخہ لکھنؤ کا چھپا ہوا ہے۔ اس میں رباعیات کی تعداد ۷۷۲ رہے جو ۱۲۲۴ ررباعیات میں سے انتخاب کی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں علی دشتی کا کارنامہ بے انتہا مورد ستائش ہے کہ اس نے مغربی محققوں کے کام کا محاکمہ بھی کیا ہے اور ذاتی طور پر رباعیات خیام کے ایک ایک ماخذ کا پتہ لگایا ہے اور پھر ایک ایک رباعی پر بحث کی ہے کہ اگر خیام کی ہے تو کیوں ہے اور اگر اس کی نہیں تو کیوں نہیں۔ خیام کی طرز فکر اور طرز اظہار سے اسے بے پناہ آگاہی حاصل ہے۔ اس بنیاد پر اس نے رباعیات کے اس ذخیرے کو منسوب، سیار، سرگرداں، الحاقی، مشابہ اور

خیام وار کی مختلف اقسام میں تقسیم کیا ہے۔

اس وقت دنیا میں قدیم ترین نسخہ عباس اقبال کا نسخہ ہے، جسے پروفیسر آربری نے ۱۹۵۰ء میں شائع کیا۔ عباس اقبال نے ثابت کیا ہے کہ یہ نسخہ ۶۰۴ ہجری کا لکھا ہوا ہے اور خیام کی وفات کے ۷۵ برس بعد مرتب کیا گیا ہے اور اس میں رباعیات کی تعداد ۲۵۲ ہے۔ یہ وہی نسخہ ہے جو ایران کے ''مجلّہ یادگار'' میں شائع ہوا اور پھر کیمبرج یونیورسٹی کو فروخت کر دیا گیا۔ معروف خیام شناس پیر پاسکال نے بھی اپنے کام کی بنیاد اسی نسخہ پر رکھی ہے۔

محمد علی فروغی نے اپنی تحقیق کا ماخذ ان کتابوں کو ٹھہرایا ہے، جو نویں صدی ہجری سے پہلے تالیف ہوئی ہیں۔ اس نے اپنے ترتیب دیے ہوئے نسخے پر ایک فاضلانہ دیباچہ بھی لکھا ہے اور اپنے ماخذ (مرصاد العباد، تاریخ جہانگشائے جوینی، تاریخ گزیدہ، نزہت المجالس، مونس الاحرار اور جنگ اشعاری) کے تفصیلی حوالے دیے گئے ہیں۔ ان ماخذ سے فروغی نے ۶۶/رباعیاں اکٹھی کی ہیں اور پھر ان کو بنیاد مان کر خیام سے منسوب تقریباً پانچ سو رباعیوں کو پرکھا ہے اور پھر ان میں سے خیام کے شیوہ بیان اور روش فکر سے قریب محسوس ہوتی ہوئی رباعیاں اختیار کر لی ہیں اور باقی ماندہ کو رد کر دیا ہے۔ ایک ہی مضمون کی مختلف رباعیوں میں سے اس نے پختہ تر کو اختیار کیا ہے اور اس طرح ۱۷۸/رباعیات پر اپنے قوی احتمال اور اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ علمی اصولوں اور اسلوب شناسی کے قاعدوں کے مطابق جو تحقیقات عمل میں آئی ہیں، ان سے یہ بات مسلم ہے کہ رباعیات خیام کی اصل تعداد ۱۷۸ سے متجاوز نہیں ہے۔ علی دشتی بھی فروغی کے نسخے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس پر اطمینان کا اظہار کرتا ہے، اس لیے کہ یہ نسخہ عباس اقبال کے نسخے سے بھی زیادہ احتیاط کا حامل ہے۔

میں نے مطالعہ خیام کے سلسلے میں اسی نسخے پر اعتماد کیا ہے۔ اس مقالے میں جتنی رباعیاں نقل ہوئی ہیں، ان میں سے بیشتر کے بارے میں خیام شناس متفق ہیں کہ وہ خیام ہی کی ہیں۔ صرف ایک دو رباعیاں ایسی ہیں، جن کے بارے میں کچھ شبہ ہو سکتا ہے، لیکن

فکری پہلو کے پیش نظر ان کو خیام وار تسلیم کیا گیا ہے۔

صاحب چہار مقالہ نظامی عروضی سمرقندی کا دعویٰ ہے کہ اس نے خیام سے اکتساب فیض کیا ہے، لیکن اپنے استاد کی شخصیت اور زندگی کے بارے میں جو قیمتی معلومات فراہم کی ہیں، وہ صرف اس قدر ہیں کہ خیام ایک منجم تھا اور اس کی قبر پر سدا بہار پھول کھلتے ہیں۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ خیام نے مصلحت کے پیش نظر نظامی عروضی سے اپنی شخصیت کے شاعرانہ پہلو کو چھپا رکھا ہو اور اسے شایان اعتماد نہ سمجھا ہو۔ بہر حال اس ضمن میں نظامی کے خامے کی خاموشی حیرت آور ضرور ہے۔ نظامی نے چہار مقالہ میں قدیم نظریہ آفرینش بیان کرتے ہوئے انسانوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ ان میں سے ایک قسم وہ ہے کہ:

''لیلاً و نہاراً و جہاراً کار ایشان آن باشد کہ ما کہ ایم

واز چہ در وجود آمدہ ایم و پدید آرندۂ ما کیست؟

یعنی کہ از حقائق اشیاء بحث کنند و در آمدن خویش تامل

واز رفتن تفکر کہ چگونہ آمدیم و کجا خواہیم رفتن؟

این نوع را حکماء خوانند۔''

یعنی یہ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ شب و روز ظاہری طور پر بھی اور در پردہ بھی ان کا کام ہی سوچنا ہے کہ ہم کون ہیں؟ کہاں سے وجود میں آئے ہیں؟ ہمیں وجود عطا کرنے والا کون ہے؟ مختصر یہ کہ یہ لوگ حقائق اشیاء سے بحث کرتے ہیں اور اس دنیا میں آنے اور یہاں سے جانے کے بارے میں غور و فکر کرتے ہیں کہ ہم اس عالم وجود میں کیسے آگئے اور یہاں سے ہمیں کدھر جانا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں حکماء کہا جاتا ہے۔

اس عبارت کی رو سے اپنے تلمیذ رشید کی تقسیم کے مطابق خیام ایک مفکر اور حکیم قرار پاتا ہے۔ زندگی اور موت فکر خیام کے بڑے موضوعات ہیں۔ اس نے انہی بنیادی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ ایک انتہائی کم آمیز انسان تھا۔

شاعری اس کی نفسیاتی ضرورت تھی۔ اس کی رباعیاں اس کی روح کا آئینہ ہیں۔

ایک ایسی روح جو زندگی کے راز کو ڈھونڈتے ہوئے حیران ہوگئی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حکیم عمر خیام نے ان مسائل پر فکر کرنے کے بعد کیا نتائج اخذ کیے ہیں اور زندگی میں انسان کو کیا رویہ اختیار کرنے کی تلقین کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے فلسفے کے جتنے بھی اساسی رجحانات ہیں ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں جو اس سے پہلے وجود نہ رکھتا ہو۔

دنیا کی بے ثباتی ایک بدیہی حقیقت ہے اور انسان کا سب سے بڑا روگ یہی ہے۔ تمام فلسفے اسی ایک بنیادی نقطے کے گرد گھومتے ہیں۔ موت کی ہنگامہ آرائیاں انسان کو مجبور کردیتی ہیں کہ وہ زندگی کے بارے میں کوئی نہ کوئی نقطۂ نظر متعین کرلے۔ انسان جب یہ دیکھتا ہے کہ زندگی اتنی زود گذر ہے کہ برق بھی اس کے مقابلے میں پابہ حنا ہے تو اس مقام پر اس کا ردعمل تین مختلف صورتیں اختیار کرسکتا ہے۔ یا تو وہ سنبھل جاتا ہے یا سہم کر کسی غار میں جا چھپتا ہے یا پھر قرض کی ان چند سانسوں کو کسی بزم طرب پر نچھاور کردیتا ہے۔ خیام کے یہاں یہی گونج بار بار سنائی دیتی ہے:

ساقیا!...... جام، کہ بنیاد جہاں کچھ بھی نہیں۔

اس نے اسی غم کو کلیجے سے لگالیا ہے اور یہی نقطہ اس کے یہاں پھیل کر دائرہ بن گیا ہے۔ وہ زندگی کے گوشے گوشے سے ایسے مناظر فراہم کرتا ہے جن پر دست قضا نے بربادیوں کی مہر لگادی ہے۔

آن قصر کہ بر چرخ ہمی زد پہلو
بر در گہہ او شہان نہادندے رو
دیدیم کہ بر کنگرہ اش فاختہ ای
بنشستہ ہمی گفت کہ کو کو کو کو

(وہ قصر شاہی جو اپنی رفعت کے اعتبار سے رشک فلک تھا۔ جس کے دربار میں بڑے بڑے سلاطین سجدہ ریز ہوتے تھے۔ اب اس کے کلس پر ایک فاختہ بیٹھی ہوئی کوکو کر

رہی ہے۔اس کا نوحہ یہ پوچھ رہا ہے کہ اس ایوان کے رہنے والے کہاں چلے گئے ہیں؟)

خیام کے نزدیک یہ دنیا ایک فتنہ گاہ ہے اور زندگی کا راستہ قبرستان کی طرف جاتا ہے۔

اے دیدہ اگر کور نہ ای گور ببین
وین عالم پر فتنہ و پرشور ببین
شاہان و سران و سروران زیر گل اند
رو ہائے چو مہ در دہن مور ببین

(اے آنکھ! اگر تو اندھی نہیں تو قبر کو دیکھ۔اس دنیا کو دیکھ جو شور و شر سے لبریز ہے۔ بڑے بڑے شہنشاہ، سرور اور سردار مٹی کے نیچے دفن ہیں...... اور دیکھ کہ چاند جیسے چہرے چیونٹیوں کے دہن کی گرفت میں ہیں)۔فنا کہ اس بھیانک تصور کے ساتھ خیام کے ہاں جا بجا یہ اعتراف ملتا ہے کہ وہ زندگی کے حقائق کو بالکل نہیں سمجھ پایا۔زندگی کے آغاز و انجام کے بارے میں اس نے بار بار اپنی بے خبری کا اعلان کیا ہے۔وہ اپنے آپ کو اسرار کے پردوں میں گھرا ہوا محسوس کرتا ہے۔اسے کچھ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کیا ہے؟ کہاں سے آیا ہے اور اسے کدھر جانا ہے؟ اسے صرف اتنی خبر ہے کہ اسے مرنا ہے۔

دریاب کہ از روح جدا خواہی رفت
در پردۂ اسرار فنا خواہی رفت
مے نوش ندانی ز کجا آمدہ ای
خوش باش ندانی بکجا خواہی رفت

(تو یہ جان لے کہ ایک روز تجھے روح سے جدا ہونا ہے۔ایک فنائے مرموز (Mysterious Death) کے گھاٹ اتر جانا تیرا مقدر ہے۔شراب پی کہ تجھے کچھ خبر نہیں کہ تو کہاں سے آیا ہے؟ خوش رہ کہ تو نہیں جانتا کہ تجھے کدھر جانا ہے۔) انسان کے مقصد تخلیق کو سمجھنے میں خیام عاجز محض دکھائی دیتا ہے:

ہر چند کہ رنگ و بوی زیباست مرا
چوں لالہ رخ و چو سرو بالاست مرا
معلوم نہ شد کہ در طربخانہ خاک
نقاش ازل بہر چہ آراست مرا

(بے شک میرا (انسان کا) رنگ روپ بڑا دلآویز ہے۔ میرے چہرے میں لالے کی جھلک ہے اور میرا حسن قامت سرو کی مانند ہے۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ نقاش ازل نے میرا نقش آخر کس لیے اس قدر سنوارا ہے؟)

یہی لاعلمی اس کے ہاں تشکیک کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اریتاب وتشکیک کا نمائندہ ہے۔ اپنی لاعلمی سے گھبرا کر جب وہ آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے تو تشکیک کی منزل پر جا پہنچتا ہے اور اس سے آگے اسے کچھ بھائی نہیں دیتا۔ جنت کو وہ دور کے ڈھول سمجھتا ہے:

اے دل تو بہ اسرار معما نرسی
در نکتہ زیرکانِ دانا نرسی
اینجا بہ مئے لعل بہشتی می ساز
کانجا کہ بہشت است رسی یا نرسی

(اے دل! تو زندگی اور وجود کے معمے کے اسرار کو نہیں جان سکتا۔ اس ضمن میں داناؤں نے جو نکتے بیان کیے ہیں، وہ میرے ادراک سے بالا ہیں۔ اس دنیا میں بہشت کی سی شراب ارغوانی پیے جا۔ کیا خبر کہ جہاں بہشت ہے تو وہاں پہنچے یا نہ پہنچے)۔

ایک مقام پر وہ کہتا ہے 'کون کہتا ہے کہ خیام دوزخی ہے؟ کون دوزخ میں گیا ہے اور کون جنت سے واپس آیا ہے؟'' اس غم زندگی اور خلشِ تشکیک نے اس کا سارا چین چھین لیا ہے...... وہ سوچتا ہے اور پریشان ہوتا ہے۔ اس کی اس قدر بے چینی اور بے قراری خود اس بات کی دلیل ہے کہ اسے مقصود فکر نہیں مل سکا۔ اس کا یہ درد جب بے

پایاں اور بے قابو ہو جاتا ہے تو وہ اس کے فوری علاج کی سوچتا ہے اور اس غم سے اپنا دامن چھڑانے کے لیے ساقی کا دامن تھام لیتا ہے اور ایک ایک لمحے کو طربناک بنا کر زندگی کا رس نچوڑ لینا چاہتا ہے۔ غم فردا سے بچنے کے لیے عیش امروز میں ڈوب جاتا ہے۔ صحرائے علل سے بھاگ کر میکدے کی راہ لیتا ہے۔ زلفوں کے سائے میں اسے جو ایک جرعۂ مے نصیب ہوتا ہے، اس کے نزدیک سلطنت کیکاؤس اور مملکت طوس سے بہتر ہے۔ یہ جان کر کہ گزرتے ہوئے وقت کو روکنا اس کے بس کی بات نہیں، اس کی جستجو پر مایوسیوں کے گھنے سائے پڑنے لگتے ہیں اور پھر ان مایوسیوں کی تلخی کے زہر کو وہ شراب کی تلخی سے کاٹنا چاہتا ہے۔

این قافلۂ عمر عجب می گذرد
دریاب دمے کہ با طرب می گذرد
ساقی غم فردائے حریفان چہ خوری
پیش آر پیالہ را کہ شب می گذرد

(عمر کا یہ قافلہ عجیب ڈھب سے گزرتا ہے۔ تو ایک ایسے لمحے کی تلاش کر جو خوشی کے ساتھ بسر ہو سکے۔ اے ساقی! تو حریفان میکسار کے لیے کل کی فکر کیا کرتا ہے؟ ادھر لا پیالہ...... کہ رات گزرتی جا رہی ہے۔)

لیکن اس فرار میں اس کا احساس فرار باقی رہتا ہے...... کوزہ شراب کے قریب ہوتے ہی اس پر پھر وہی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ چلا اٹھتا ہے:

ایں کوزہ چو من عاشق زارے بودست
در بندِ سرِ زلفِ نگارے بودست
این دستہ کہ بر گردن او می بینی
دستیست کہ بر گردن یارے بودست

(یہ کوزہ کبھی میری طرح عاشق زار تھا۔ یہ بھی کبھی کسی محبوب کی زلفوں کا اسیر تھا اور یہ

دستہ جو تو اس کی گردن پر دیکھ رہا ہے، وہی ہاتھ ہے جو کبھی محبوب کی گردن میں حمائل تھا۔)

'کوزہ' خیام کے یہاں فنا کا تصور دلانے کے لیے ایک خاص علامت ہے اور اس نے اسے کثرت سے استعمال کیا ہے:

درکار گہ کوزہ گرے رفتم دوش
دیدم دو ہزار کوزہ گویا و خموش
ناگاہ یکے کوزہ بر آورد خروش
کو کوزہ گر و کوزہ خر و کوزہ فروش

(کل مجھے ایک کوزہ گر کی دکان پر جانے اتفاق ہوا۔ میں نے وہاں پر ہزاروں کوزے دیکھے۔ کچھ بول رہے تھے اور کچھ چپ تھے۔ ایک کوزہ اچانک چلا اٹھا: ''کہاں ہے کوزہ بنانے والا؟ کہاں گیا کوزہ خریدنے والا؟ اور کدھر گیا کوزہ بیچنے والا؟'')

خیام انسان کو اتنا بے حقیقت جانتا ہے کہ جیسے ایک مکھی نمودار ہوئی اور غائب ہوگئی...... آمد مگسے پدید و ناپیدا شد...... فرصتِ حیات کو اتنا غیر یقینی سمجھتا ہے کہ سانس کی جو ڈوری اندر گئی ہے، کیا خبر باہر آنے سے پہلے کٹ جائے۔ وہ زندگی کی بے ثباتی سے بے طرح لڑکھڑا گیا ہے۔ بہاروں کی رنگینیاں اور محبوب کی رعنائیاں اسے اپنی طرف ضرور کھینچتی ہیں، لیکن یہ حسن زوال آمادہ اسے اور بے تاب کر دیتا ہے۔ محبوب کے چہرے کو غبار آلود دیکھ کر وہ اس گرد کے ذرے کا ماتم شروع کر دیتا ہے:

ہر ذرہ کہ در خاک زمینے بودست
پیش از من و تو تاج و نگینے بودست
گرد از رخ نازنین بہ آزرم فشاں
کاں ہم رخِ خوب نازنینے بودست

(خاک زمین کا ہر ذرہ تجھ سے اور مجھ سے پہلے کسی تاج کی صورت میں تھا یا کسی نگینے کی شکل میں۔ محبوب کے چہرے سے گرد کو نرمی اور آہستگی سے صاف کر کہ یہ گرد بھی تو کبھی کسی نازنین کا چہرہ تھی۔)

خیام کا یہ سارا دکھ اس بات سے پھوٹتا ہے کہ وہ جبر کا قائل ہے اور اس جبریت کے خلاف اس کا ردعمل قنوطیت پر مبنی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ زمانے کا تند ریلا ایسے خوفناک تغیرات برپا کررہا ہے، جن کے آگے انسان کی کوئی پیش نہیں جاسکتی۔ بہرام اور جمشید جیسے شہنشاہ اس سرائے فانی سے کوچ کرنے پر مجبور ہیں۔ روز و شب کا سلسلہ مہ جبینوں اور لالہ رخوں کو خس و خاشاک میں تبدیل کیے جارہا ہے۔ وہ اس جبر کے خلاف سراپا احتجاج بن جاتا ہے۔ اگر یہ کائنات پیدا کی گئی ہے تو پھر اسے مٹانے میں کیا مصلحت ہے؟ اگر یہ بزم وجود حسین ہے تو اسے تغیرات کے حوالے کیوں کردیا گیا ہے؟ اور اگر حسین نہیں ہے تو اس میں قصور کس کا ہے؟

دارندہ چو ترکیب طبائع آراست
از بہر چہ افگندش اندر کم و کاست
گر نیک آمد شکستن از بہر چہ بود
ور نیک نیامد این صُور عیب کراست

(سرشتوں کی آرائش ترکیب کے وقت خالق و مالک نے انھیں زوال آمادہ اور انحطاط پذیر کیوں بنایا تھا؟ اگر یہ بزم وجود اسے پسند آئی تھی تو پھر اسے توڑتا پھوڑتا کیوں ہے؟ اور اگر یہ صورتیں اسے پسند نہیں آئی تھیں تو یہ عیب کس کا ہے؟)

کبھی کبھی اس کی ناامیدی احتجاج کا ایک اور رخ اختیار کرتی ہے۔ اس کے ہونٹوں پر ایک زہر خند پھیل جاتی ہے۔ وہ حقارت آمیز انداز میں مسکراتا ہے۔ شوخی پر اتر آتا ہے اور مقدسات پر طنز کرتا ہے۔ شیخ ظاہر پرست کو زن فاحشہ کے سامنے حقیر ثابت کرتا ہے۔ رند بادہ خوار کو زاہد شب دار سے زیادہ معقول سمجھتا ہے۔ معاصی کبیرہ کے لیے توجیہات تراشتا ہے:

گر مے نخوری طعنہ مزن مستان را
بنیاد مکن تو حیلہ و دستان را

تو غرہ بدیں مشو کہ مے می نخوری
صد لقمہ خوری کہ مے غلام است آن را

(اگر تو شراب نہیں پیتا تو بادہ مستوں کو طعنہ مت دے۔ مکر وفریب کو بنیاد زہد مت بنا۔ تو اس بات پر گھمنڈ نہ کر کہ شراب نہیں پیتا۔ تو سینکڑوں ایسے ناپاک لقمے کھاتا ہے، جن کے سامنے شراب کنیز کی حیثیت رکھتی ہے۔)

خیام کے فلسفے کے بنیادی نکات یہی بنتے ہیں کہ زندگی فانی ہے اور فنا کے اس بھیانک سفر سے واپسی ناممکن ہے اور یہ زندگی موجودہ مشخصات اور تعینات کے ساتھ پھر نہیں ملے گی۔ عالم قدیم ہے اور اس کے آغاز وانجام کی کچھ خبر نہیں ہے۔ تفسیر حیات بس اتنی ہے کہ ہمارے بس میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اس عالم جبر میں اپنا کوئی اختیار تہمت اختیار ہے۔ اس اندوہ جبر وفنا کا مداوا آب طربناک یعنی اکتساب نشاط ہے۔

ان اساسی رجحانات کے ساتھ کبھی کبھی اس کے یہاں اخلاقی آہنگ کی گونج بھی سنائی دینے لگتی ہے۔ وہ عقل پرستی چھوڑ کر قلندری اختیار کرنے کی بھی تلقین کرتا ہے۔ ترک نفس کو ارتقائے انسانی کے لیے ناگزیر قرار دیتا ہے۔ انسان کو اپنے احتساب پر اکساتا ہے۔ مشکلوں اور مصیبتوں کا مقابلہ کرنے کا درس بھی دیتا ہے۔ حرص و ہوا کی مذمت کرتا ہے۔ قناعت شعاری کی ترغیب دیتا ہے۔ **فاعتبروا یا اولی الابصار** کا نعرہ بھی لگاتا ہے۔ روح اور حیات جاوداں کا تذکرہ بھی چھیڑ دیتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ خیام کے یہاں ان گوناگوں تصورات کا مجموعی تاثر کیا ہے؟ اپنی بات اس نے جس انداز میں کی ہے، قاری اور سامع پر وہ انداز کیا اثر چھوڑتا ہے؟ جہاں تک بے ثباتی دنیا کے موضوع کا تعلق ہے، عین ممکن ہے کہ اس کا مقصد درس عبرت کی فراہمی ہو اور وہ انسان میں اجتماعی اور اخلاقی شعور بیدار کرنے کے لیے اس چندروزہ زندگی کو احسن طریقے سے گزارنے کی ترغیب دیتا ہو، لیکن کیا کیا جائے کہ اس نے اس تصور کو اپنی فکر پر اس قدر طاری کر لیا ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ زندگی کی

میت اٹھائے ہوئے ہے۔ وہ اپنی خلوتوں اور بزم ساقی میں اسی لاشے کو لیے لیے پھرا ہے۔ وہ زندگی کی ایسی بھیانک تصویر کھینچتا ہے اور اس پر ایک ایسی کاری ضرب لگاتا ہے کہ سنبھلنے سے زیادہ زندگی سے بیزار ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ وہ انسان کو اس طرح جھنجھوڑتا ہے کہ اس کی صلاحیتیں بیدار ہونے سے زیادہ خوفزدہ ہو جاتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ غفلت انسان کا خوفناک مرض ہے۔ خیام نے اس مرض کی تشخیص ضرور کر لی ہے، لیکن علاج ایسا تجویز کیا ہے، جس میں دوا کی مقدار اور تلخی حد اعتدال سے تجاوز کر گئی ہے اور یہ طریق علاج نفس انسانی کی صحت کا یقینی ضامن نہیں ہے۔ یہ تاثیر تعمیر سے زیادہ تخریب کا پہلو لیے ہوئے ہے۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کی نظر کوزے تک پہنچ کر رک کیوں جاتی ہے۔ وہ انسانی جسم کی فنا کا ماتم کیوں کرتا ہے؟ اگر وہ روح کا قائل ہے تو مادے کے بندھنوں سے آزاد ہونے پر خوشی کا اظہار کیوں نہیں کرتا۔ اس کی افسردگی اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ اس کی نظر مادے تک محدود ہے۔ اگر وہ ایک صوفی ہے تو صوفیا تو اس دنیا کو چھوڑنے پر کبھی افسردہ نہیں ہوتے۔ رومی نے تو یہ کہا تھا کہ ''میرے جنازے کے ساتھ شادیانے بجائے جائیں''۔ صوفی تو روح مطلق سے وصال ہی کو سب سے بڑی نعمت سمجھتے ہیں:

ہر کسے کو دور ماند از اصلِ خویش
باز جوید روزگارِ وصلِ خویش

غزالی جیسا عظیم اسلامی مفکر ایک عرصہ تک ارتیاب کا شکار رہا۔ ایک مدت تک اس کی روح میں تشکیک کے کانٹے چبھتے رہے اور جب تصوف کے سہارے اس نے اپنے وجدان کے تار چھیڑے تو اس کی روح کے سب دھند لکے دور ہو گئے، لیکن اس کے برعکس خیام غبار تشکیک ہی میں کھو گیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ الہیاتی مسائل کو حل کرنے کے لیے اس نے صرف اپنی عقل خردہ بیں پر بھروسہ کیا۔ اسی لیے پریشان رہا۔ اس نے

خالص فلسفیانہ طریق فکر کو ان معاملات میں اپنا راہنما بنایا ہے، جہاں صرف وحی کی راہنمائی راستہ دکھاتی ہے۔ اگر وہ ایک اسلامی مفکر ہے تو اس نے قرآن سے رجوع کیوں نہیں کیا۔ قرآن نے تو ان مسائل میں کوئی ابہام نہیں چھوڑا اور انسان پر اس کا مقصد تخلیق واضح کر دیا ہے۔ نیابت، عبادت اور حسن عمل کی تصریحات کے ہوتے ہوئے بھی خیام پر یہ واضح نہیں ہو سکا کہ نقاش ازل نے اسے کیوں بنایا ہے؟ آخر ایک مسلمان آخرت، زندگی بعد موت اور جنت اور دوزخ پر ایمان لائے بغیر مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟

یہ صورت حال دیکھ کر اگر کچھ لوگوں نے اسے مذہب کا باغی قرار دیا ہے تو وہ کسی زیادتی کے مرتکب نہیں ہوئے۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ اس دور کے مذہبی علما اسے بری نظر سے کیوں دیکھتے تھے اور مورخوں اور تذکرہ نویسوں نے اسے مورد طعن و تشنیع کیوں قرار دیا؟ اس کی تہہ میں یقیناً اس کے ایسے ہی خیالات تھے جو واشگاف طور پر اسلام سے متصادم ہیں۔ قفطی کا کہنا ہے:

"اس کی شاعری خوبصورت سانپ کی طرح ہے، جو
باہر سے خوش رنگ ہے اور اندر سے زہر۔"

مولانا روم کے فرزند کا کہنا ہے کہ "اللہ تعالیٰ خیام کی غلطیوں کو معاف کرے۔"

اس کے ہاں قنوطیت کی لہر اس لیے ہے کہ زندگی سے اس نے بالکل سمجھوتہ نہیں کیا۔ آخر مسئلے کا ایک پہلو یہ بھی تو ہے کہ یہ زندگی اگر فنا پذیر نہ ہوتی تو پھر کیا لطف باقی رہ جاتا۔ غالب اس مقام پر خیام سے بڑا مفکر نظر آتا ہے، اس نے پوری طرح محسوس کیا ہے کہ زندگی کا سارا حسن اس کے زوال میں پنہاں ہے:

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

غالب کو پوری طرح احساس ہے کہ آب حیات میسر آ جانے سے زندگی کی دل کشی

میں نہیں بلکہ بوریت میں اضافہ ہوگا:

بے صرفہ ہی گزرتی ہے گرچہ ہو عمر خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے

خیام اگر ایک عظیم مفکر ہے تو اس کی نظر اس طرف کیوں نہیں جاتی؟

یقیناً اس کی شراب کے سلسلے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ اتنا بھیانک پس منظر محض مادی شراب کے لیے قائم کرتا ہے۔ ممکن ہے شراب کو اس نے زندگی سے استفادے اور بھرپور تمتع کے معنی میں استعمال کیا ہو...... اس لیے کہ شعرا کے ہاں یہ لفظ استعارے کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہے۔ انگور کی یہ بیل سنائی سے شروع ہوئی ہے اور پھر ساری فارسی شاعری پر چھا گئی ہے۔ خیام کے کلام میں ایسے شواہد ملتے ہیں، جن سے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ اس کے پیمانے میں دختر انگور ہی رقص کرتی ہے۔ اب اس کی توجیہ کیا ہوسکتی ہے:

گر بادہ خوری تو با خردمنداں خور
یا با صنمے لالہ رخے خنداں خور
بسیار مخور، زود مکن، فاش مساز
اندک خور و گہ گہ خور و پنہاں خور

(اگر تو شراب پیتا ہے تو داناؤں کے ساتھ بیٹھ کر پی۔ یا پھر کسی مسکراتے ہوئے لالہ رو محبوب کے ساتھ پی۔ بہت زیادہ مت پی، جلدی جلدی نہ پی، راز میکشی کو فاش مت کر...... تھوڑی تھوڑی پی، کبھی کبھی پی اور چوری چوری پی۔)

نہ جانے اس رباعی میں کس شراب معرفت کی تراکیب استعمال سمجھائی گئی ہے؟

ابھی عرض کیا گیا تھا کہ خیام کے ہاں مثبت فکر بھی ملتی ہے، لیکن یہ لمحات اس کے ہاں بہت کم ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہی افکار اس کے بارے میں مختلف آراء کے پیدا ہونے کا باعث ہوئے ہیں۔ اس کے یہاں ایسے نظریات ملتے ہیں جو آپس میں متناقض اور متصادم

ہیں۔ آزادیٔ فکر نے اسے ایسا الجھا رکھا ہے کہ وہ ایقان کی دولت سے محروم ہوگیا ہے۔ چونکہ وہ خود بھی الجھا ہوا ہے، دوسروں کو بھی مخمصے میں ڈال دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی اسے صوفی سمجھ لیتا ہے اور کوئی بادہ خوار۔ آخر ایمائیت کا سہارا کہاں تک ساتھ دے سکتا ہے؟ کس کس لفظ کی توجیہ کی جائے اور کب تک تفسیر میں تاویلوں کا رنگ بھرا جائے۔

یورپ میں خیام کی مقبولیت بھی اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ اس کا فلسفہ اسلامی فلسفہ ہرگز نہیں ہے۔ اگر اس کی تعبیر غلط کی گئی ہے تو یہ بات بھی اس چیز کو ثابت کرتی ہے کہ اس کے یہاں خطرناک حد تک مجازی لچک موجود ہے۔ یورپ میں اقبال اور رومی اتنے مقبول کیوں نہیں ہوتے؟ اس لیے کہ ان کے ہاں ایسی کوئی گنجائش نہیں۔ اقبال نے اسی بات کے پیش نظر حافظ کی مخالفت کی تھی کہ غلط تعبیر سے اس کے کلام کا رخ غلط سمت میں موڑا جا سکتا ہے۔ اہل یورپ کو مشرق میں ایک ہی ایسا شاعر ملا ہے، جس کا مزاج ان کے مزاج سے ہم آہنگ ہے اور وہ خیام ہے۔

جمہوری اور صنعتی دور کے آغاز سے پیشتر زرعی اور جاگیردارانہ نظام کے تحت انسان جبریت کے ایک شدید کرب سے دوچار تھا۔ گوتم بدھ سے لے کر زرعی دور کے آخر تک انسان نے اسی دکھ کو سینے سے لگائے رکھا۔ خیام بھی اسی فلسفہ جبر کا قائل تھا۔ اسی لیے زندگی کے بارے میں ہمیں کوئی نئی بات نہیں دے سکا۔ مفکر تھا سوچ سوچ کر زندگی کی تلخیوں کا شعور حاصل کرتا رہا۔ وہ اس قدر قنوطی تھا کہ جیتے جاگتے گوشت پوست کے انسان کے اندر اسے صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنے فکر کی روشنی سے انسان کے (Skeleton) کا ایکس رے کرتا ہے اور موجود میں صرف معدوم ہونے کی صلاحیت دیکھتا ہے۔

جہاں تک اس کی شاعری کے فنی پہلو کا تعلق ہے، وہ ایک عظیم فنکار ہے۔ اس کا موضوع بھی اسی لیے باعث نزاع ہے کہ وہ بڑا شاعر ہے۔ جملہ نقاد اس پر متفق ہیں کہ وہ فارسی زبان کا صف اول کا سخنور ہے اور ایک رباعی گو کی حیثیت سے ایران کا سب سے

بڑا شاعر ہے۔ اس کے اسلوب کو اپنانا اس کا منھ چڑانے والی بات ہے۔ اس کی رباعی فلسفیانہ فکر اور سادگیٔ بیان کا ایک عجیب امتزاج ہے۔ اس نے اپنی حیرت اور خلش تشکیک کا اظہار بہت متین انداز میں کیا ہے۔

اس کے فن کو جاننے کے لیے رباعی کی تکنیک کو سمجھ لینا بہت ضروری ہے۔ رباعی کو ترانہ اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ ایک خاص آہنگ کے ساتھ گائی جاتی ہے، جو ستار کے لیے بہت موزوں ہے۔ موسیقی کے لحاظ سے رباعی کے کل آٹھ اجزا بنتے ہیں۔ رباعی کو رباعی اس لیے نہیں کہتے کہ اس میں چار مصرعے ہوتے ہیں۔ اس بنیاد پر تو چار مصرعوں کے قطعے کو بھی رباعی کہنا چاہیے۔ رباعی کا (Unit) بیت ہے اور ایک بیت عربی الحان کے لحاظ سے چار اجزا پر مشتمل ہے۔ یہ چار اجزا آپس میں ربط رکھتے ہیں کہ پورا آہنگ موسیقی کے لحاظ سے چوتھے جزو پر ختم ہوتا ہے۔

رباعی اس شخص کا اسلوب ہے، جو اشارے میں بات کرتا ہے۔ خیام کی رباعیاں وہ سرگوشیاں ہیں، جو اس نے اپنے آپ سے یا اپنے کسی ہمراز سے کی ہیں۔ رباعی کا فن یہ ہے کہ پہلے تین مصرعے اہتمام کلام ہوتے ہیں اور فنکار کا کمال یہ ہے کہ یہ اہتمام بنیادی موضوع سے ہم آہنگ ہو۔ بنیادی بات چوتھے مصرعے میں ہوتی ہے۔ رباعی میں صرف ایک مرکزی مفہوم ہوتا ہے۔ چاروں مصرعے جس قدر ہم آہنگ ہوں گے، رباعی اتنی لطیف ہوگی۔ اگر سب مصرعے مل کر صوتی اور معنوی اعتبار سے ایک جملہ ہو تو رباعی انتہائی پست ہوگی۔ دو جملے بنیں تو رباعی پست ہوگی۔ اگر ہر مصرع ایک جملہ ہو تو رباعی انتہائی پست ہوگی۔ یہ ایک سانس کی صنف سخن ہے اور خیام کی رباعی اس معیار پر پوری اترتی ہے۔ اس کا چوتھا مصرع ایک ایسی مضبوط بنیاد ہوتا ہے، جس پر باقی تین مصرعوں کی عظیم الشان عمارت کھڑی ہوتی ہے۔

کسی شاعر کے فن میں سب سے دلچسپ مطالعہ اس کی پیکر تراشی (Imagery) کا ہوتا ہے، یعنی وہ اظہار و ابلاغ کے کون سے سانچے استعمال کرتا ہے یا یوں کہیے کہ اس کی

علامتوں کا مربوط نظام کیا ہے۔ اسی سے اس کی انفرادیت متعین ہوتی ہے۔ خیام کے موضوع کے دو بڑے پہلو ہیں، ایک طربیہ اور دوسرا حزنیہ۔ اسی لیے اس کے ہاں دو بڑے نظام علامات ملتے ہیں۔ ایک وہ ہے، جو حسن و جمال اور مسرت و انبساط کی آئینہ داری کرتا ہے اور دوسرا وہ ہے، جو ویرانی، بربادی اور فنا کا ترجمان ہے۔ لالہ، سبزہ، نوروز، چمن، بہار، ساقی اور جام اول الذکر پہلو کی نمائندگی کرتے ہیں۔ 'کوزہ' اس کا سب سے بڑا استعارہ ہے۔ اس لیے کہ یہ اس کی دوطرفہ علامت ہے۔ ظرف بادہ ہونے کی حیثیت سے طرب کوشی کا نمائندہ ہے اور ساتھ ہی فنا کا تصور بھی دیتا ہے۔ خیام نے اکثر ایک ہی رباعی میں اس سے دونوں کام لیے ہیں:

بر خیز بتا بیار بہر دل
حل کن بجمالِ خویشتن مشکل ما
یک کوزہ شراب تا بہم نوش کنیم
زان پیش کہ کوزہ ہا کنندہ از گلِ ما

(اے محبوب! اٹھ اور اپنے جمال سے ہماری مشکل کو حل کر دے۔ ہمارے دل کی آرزو پوری کر اور ایک کوزہ شراب لا جو ہم مل کر پئیں۔ اس سے پہلے کہ ہماری مٹی کے کوزے بنا ڈالے جائیں۔)

بربادی اور پامالی کا منظر دکھانے کے لیے کوزے کے علاوہ وہ گرد، غبار، خاک، گور، گل، زمین، خشت، در و دیوار شکستہ اور چرخ کوزہ گر کی علامتیں بھی استعمال کرتا ہے اور یہی اس کی انفرادیت ہے۔ بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اگر غالب کی پیکر تراشی آتشی ہے اور غنیمت کی آبی ہے تو خیام کی امیجری خاکی ہے۔ شکوہ خسروانہ دکھانے کے لیے اس نے ایران باستان کا سہارا لیا ہے۔ وہ عظمت رفتہ کی تصویر کشی کے لیے کیکاؤس، جمشید اور بہرام کے پرجلال چہرے دکھاتا ہے۔

ایک رباعی ملاحظہ ہو:

آں قصر کہ جمشید درو جام گرفت
آہو بچہ کرد و روبہ آرام گرفت
بہرام کہ گور می گرفتے ہمہ عمر
دیدی کہ چگونہ گور بہرام گرفت

پہلا مصرع جلال اور شکوہ کا پس منظر ہے۔ ایوان شاہی اور ایوان شاہی میں جمشید گردوں شکوہ اور دست جمشید میں جام شراب۔ یہ مصرع ایک شاہ گیتی پناہ کی بزم کی رنگینیوں کی تصویر ہے۔ دوسرا مصرع انتہائی ویرانی کا منظر ہے۔ 'آہو' اور 'روبہ' اس ویرانی کے ڈرامائی کردار ہیں۔ ہرنی جیسی وحشت مزاج، جو میلوں کی آہٹ سے ڈر جاتی ہے، اس نے اس ایوان شکستہ کو اپنا زچہ خانہ بنالیا ہے اور لومڑی جس کے پاؤں میں بلی بندھی ہوتی ہے، یہاں پر آرام گزیں ہے۔ یعنی وہ مقام جہاں پر کل عیش و عشرت کے ہنگامے تھے، آج وہاں کوسوں تک کسی آدم زاد کی آہٹ سنائی نہیں دیتی۔ دوسرے دو مصرعوں میں لفظ 'گور' سے جو استفادہ کی گیا ہے، وہ اس تقابلی تصویر میں اور بھی رنگ آمیزی کر رہا ہے، یعنی وہ بہرام جو عمر بھر گور (گورخر) کا شکار کرتا رہا، آج گور (قبر) نے اسے کیسا جکڑ رکھا ہے۔ یہیں فنکاری خیام کا کمال ہے کہ وہ آن واحد میں اوج ثریا کو تحت الثریٰ میں بدل دیتا ہے اور ایسی کاری چوٹ لگاتا ہے کہ دل دہل جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس کے انتخاب الفاظ کا کرشمہ ہے۔ معنوی حسن کے ساتھ الفاظ کے اس اعجاز کی ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے:

چون ابر بہ نوروز رخ لالہ بشست
بر خیز و بجام بادہ کن عزم درست
کاین سبزہ کہ امروز تماشا گہ تست
فردا ہمہ از خاک تو بر خواہد رست

یعنی بہار کا آغاز ہے۔ جشن نوروز کی تیاریاں ہیں۔ لالہ سال بھر کی نیند سے

بیدا ہو رہا ہے اور ابر بہار اس کا منھ دھو رہا ہے۔ کتنی خوبصورت اور فطری منظر کشی ہے۔ سونا، بیدار ہونا اور منھ دھونا۔ مصرعہ اولی پوری داستان حیات ہے۔ زندگی ان ہی کیفیتوں کے حسن تکرار کا نام ہے اور یہ ایک پیغام بھی ہے کہ انسان بھی نئے ولولے لے کر اٹھے۔ رخ لالہ، جام بادہ، ابر بہار اور سبزۂ نورستہ ان تراکیب نے مل کر پورے تین مصرعوں میں ایک حسین پس منظر قائم کیا ہے اور چوتھے مصرعے میں ایک لفظ 'خاک' اس فنکارانہ انداز میں استعمال ہوا ہے کہ ساری بزم نوروز دھندلا کر رہ گئی ہے۔

فن شاعری میں تشبیہ اور استعارے کی جو اہمیت ہے، اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ یہ تو شاعر کی متجسس فطرت کا کرشمہ ہے۔ وہ زندگی میں مماثلتیں اور رابطے تلاش کرتا رہتا ہے۔ اس کی یہ کوشش زندگی کی وحدت کو بے نقاب کرنے کی کوشش ہے۔ نئی تشبیہ یوں ہی نہیں پیدا ہو جاتی، بلکہ بعض مسائل کو سلجھانے کی ضرورت اس کی ایجاد کا سہارا بنتی ہے۔ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ شعراء نے انسان کے فکری ارتقاء میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ خیام ایک عظیم شاعر ہے۔ مثال کے طور پر اسے یہ بات کہنی ہے کہ دل کا راز فاش نہیں کرنا چاہیے۔ اب اگر یہ بات سادے سے ناصحانہ انداز میں کہہ دی جائے تو کون مانے گا۔ اپنے اس دعوے کے لیے موزوں دلیل فراہم کرنے کے لیے اب اس کی متخیلہ بزم فطرت میں سرگرم سفر ہے۔ وہ زندگی کا کوئی ایسا گوشہ تلاش کر رہا ہے جو اس حقیقت پر گواہی دے کہ شاعر ٹھیک کہتا ہے۔ اچانک اس کی نظر سمندر کی موجوں کو چیرتی ہوئی بطن صدف میں پروان چڑھتے ہوئے فرزند گہر تک جا پہنچی ہے اور دوسری طرف اس کے شہباز تخیل نے عنقا کو شکار کر لیا ہے اور وہ اس فاتحانہ دریافت کے نشے میں پکار اٹھا ہے:

آں راز کہ اندر دل دانا باشد
باید کہ نہفتہ تر ز عنقا باشد
کہ اندر صدف از نہفتگی گردد دُر
آن قطرہ کہ رازِ دلِ دریا باشد

(ایک دانا آدمی کے دل کے راز کو عنقا سے بھی زیادہ پوشیدہ رہنا چاہیے۔ اس لیے کہ وہ قطرہ جو سمندر کے دل کا راز ہوتا ہے، صدف کے اندر چھپ کر ہی تو موتی بنتا ہے۔)

خیام کی رباعی سے متعلق فنی بحث کے ضمن میں یہ سوال بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ اپنے خیالات کے اظہار کے لیے اس نے رباعی کی صنف کو کیوں اختیار کیا ہے؟ حالانکہ اس دور میں دوسری انواع شعر (مثنوی، قصیدہ، قطعہ، غزل وغیرہ) بھی فارسی شاعری میں مروج اور انتہائی مقبول تھیں۔ اس سوال کے جواب میں یہ دلیل بھی ضرور ایک وزن رکھتی ہے کہ اس کی عدیم الفرصتی بھی طول کلام میں مانع تھی، لیکن اس سے بڑھ کر قرین قیاس بات یہ ہے کہ رباعی کی صنف میں جو تفصیل اور اجمال ہے، وہ کسی اور صنف میں نہیں ہے۔ ایسے مضامین اگر ایک شعر میں ادا کیے جائیں تو بھی ایک تشنگی کا احساس رہتا ہے اور بات اگر چار مصرعوں سے بڑھ جائے تو بھی تفصیل کا شکار ہو کر اپنی تاثر کھو بیٹھتی ہے۔ رباعی کی ہیئت اور تکنیک میں ایک خاص ترفع پایا جاتا ہے اور یہ ترفع حکیمانہ مضامین کے اظہار کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ خیام کی فنی عظمت کی ایک وجہ موضوع اور ہیئت کی یہ ہم آہنگی بھی ہے۔ اس کی بنیاد جہاں انتخاب الفاظ، تشبیہات و استعارات کے مخصوص استعمال اور پیکر تراشی کے خاص رخ پر ہے، وہاں اس صوتی تاثر پر بھی ہے جو خیام کی رباعی کی فضا کو مکمل کرتا ہے۔

ہر لفظ جہاں اپنے ساتھ ایک ذہنی تصویر (Image) لاتا ہے، وہاں ایک خاص لے اور آہنگ بھی لے کر آتا ہے، جس کی کئی تہیں ہوتی ہیں۔ جنہیں سماعی تخیل سے ہی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہ تصویر اور لے مل کر شعر کی فضا میں معنوی وسعتیں پیدا کرتے ہیں۔ خیام جب کوئی پرعظمت اور پرشکوہ منظر پیش کرنا چاہتا ہے تو ایسی آوازیں جمع کرتا ہے۔ جو نہایت بلند آہنگ ہوتی ہیں۔ مثلاً یہی رباعی دیکھیے:

اے دیدہ اگر کور نہ ای گور ببیں
دین عالم پر فتنہ و پر شور ببیں

شاہان و سران و سروران زیرِ گل اند

روبائے چومہ در دہن مور بہیں

اول تو پہلا مصرع ہی ایسا چونکا دینے والا ہے کہ انسان فوراً اپنے آپ کو کسی منظر کی گرفت میں محسوس کرتا ہے۔ کور، گور اور پر فتنہ و پر شور میں بعض آوازوں کی تکرار ایک خاص رفتار سے بلندی کی طرف بڑھتی ہے۔ تیسرے مصرع میں آواز انتہائی بلندی پر جا پہنچتی ہے۔

شاہان و سران و سروران زیر گل اند

'زیر گل اند' کے ٹکڑے سے یہ آواز یک دم گر جاتی ہے اور آخری مصرع ''روبائے چومہ در دہن مور بہین'' عام گفتگو کی سطح پر آ جاتا ہے، لیکن اس میں لہجے کا ایک عجیب تاسف ہے، جو پہلے تین مصرعوں کے مقابلے میں غیر معمولی طور پر نمایاں ہے۔

خیام کی فنی عظمت کے بیان کے سلسلے میں ان ہی چند مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ خیام کو ایک بڑا فنکار ثابت کرنے کی کوشش بھی ایک تکلف ہے، جب کہ اس کا ہر مصرع اس حقیقت کی گواہی دیتا ہے۔ آخر میں اس کے موضوع اور فن پر ایک جملہ کافی سمجھتا ہوں کہ...... وہ ایک مادہ پرست متشکک ہے اور زندگی کا مرثیہ گو ہے...... لیکن انتہائی کامیاب!

(فارسی ادب کے چند گوشے (مجموعہ مضامین)، اسلام آباد، ص۔ ۹۸۔۱۱۶)

خیام

سید صباح الدین عبدالرحمن

عمر خیام مشرق سے زیادہ مغرب میں مقبول ہوا۔ فریڈرک روزی نے لکھا ہے کہ مشرق کے کسی شاعر کو اتنی مقبولیت نہیں ملی جتنی کہ خیام خیمہ دوز کو ہوئی۔ مغرب میں اس سے دلچسپی، اس کی رباعیات کے اس انگریزی ترجمہ سے ہوئی، جو فٹز جیرالڈ نے کیا۔ یہ ایک سو ایک رباعیوں کے اس کے ترجمے (۱) ایسے مقبول ہوئے کہ انجیل کی عبارت کے بعد انگریزی بولنے والوں کی زبان پر یہی اشعار ہوتے۔

خیام کی رباعیات، جرمن، فرانسیسی اور روسی زبانوں میں بھی ترجمہ ہوئیں۔ یوروپی مصنفوں میں ویلیٹنین ژوکووسکی، ڈینی سن راس، ہیرون الن، جون پلن، مس جینا، دی کیڈل، ای۔ جی۔ براؤن، آرتھر کرسٹینس، ادٹو روتھ فولڈ اور سی۔ الیف۔ روزن وغیرہ نے خیام سے بڑی دلچسپی لی ہے، لیکن اس کی ذات سے بے سروپا کہانیاں، داستانیں، افسانے اور دوسرے مصنفوں کی بعض تصانیف اور کچھ دوسرے شاعروں کی رباعیات ایسی منسوب ہوگیئں کہ وہ ایک رند مشرب شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو گیا، جو شراب اور عورتوں کے پیچھے دیوانہ رہا۔ جرمن مستشرق ہیمر نے اس کو آزاد خیال اور مذہب کا تمسخر کرنے والا شاعر بتایا۔

لارڈ ٹینی سن نے لکھا کہ یہ تمھارا عمر ایک عظیم کافر ہے۔ طامس کارلائل نے اس کو ایک ایرانی بدمعاش کی حیثیت سے پیش کیا اور ایک انگریز پادری نے اس کو ہز مجسٹی ابلیس کا سفیر عظیم اور معزز قاصد کہا۔ (۲)

ان تمام غلط فہمیوں کو مولانا شبلی نے شعر العجم، جلد اول اور پھر مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنی زیر نظر کتاب ''خیام'' میں دور کیا ہے۔

مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ خیام کو آج زمانہ، شاعر کی حیثیت سے جانتا ہے، لیکن وہ فلسفہ میں بو علی سینا کا ہمسر اور مذہبی علوم اور فن ادب و تاریخ میں امام فن تھا۔ (۳) آگے چل کر لکھتے ہیں: امام غزالی نے بھی اس کا اعتراف کیا کہ خیام کو فن قرأت کی جو معلومات تھیں، وہ قراء میں سے کسی کی نہیں ہوسکتیں۔ (۴) وہ مفسرین کے اقوال، ان کے دلائل اور شواہد، اس تفصیل سے بیان کرتا تھا کہ ان کو قلمبند کر لیا جاتا تو اچھی خاصی کتاب بن جاتی۔ (۵) وہ جب فلسفیانہ خیالات بیان کرتا تو امام غزالی بھی کہہ اٹھتے: وجاء الحقُ وزَهقَ الباطِل، اِنَّ الباطلَ کانَ زَھُوقاً۔ (۶)

ان باتوں کو مولانا شبلی نے جس انداز میں پیش کیا ہے، اس سے یوروپ کی یہ پھیلائی ہوئی غلط فہمی ضرور دور ہوئی کہ خیام محض ایک ایرانی بدمعاش، عظیم کافر شاعر تھا اور پھر خیام کی رباعیات کا دوسرے زاویۂ نگاہ سے مطالعہ کیا۔

مولانا شبلی اس کی رباعیات پر بھی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ خیام کی رباعیاں، اگرچہ سینکڑوں اور ہزاروں ہیں، لیکن سب کا قدر مشترک صرف چند مضامین ہیں۔ دنیا کی بے ثباتی خوش دلی کی ترغیب، شراب کی تعریف، مسئلۂ جبر، توبہ واستغفار، ان میں سے ایک ایک مضمون کو وہ سو سو دفعہ ادا کرتا ہے، لیکن ہر دفعہ اس طرح بدل کر ادا کرتا ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی نئی چیز ہے۔ دنیا کی بے ثباتی اور اس سے عبرت کا مضمون نہایت پامال مضمون ہے، لیکن خیام ہر بار ایک نیا اسلوب ڈھونڈ لاتا ہے کہ نیا اثر پیدا کرتا ہے۔ توبہ استغفار ایک فرسودہ مضمون ہے، لیکن جس طرح خیام اس کو ادا کرتا ہے، سننے والے کی آنکھ سے آنسو نکل

پڑتے ہیں۔ مغفرت کی دعا، اس جدت اسلوب سے مانگتا ہے کہ دعا کا اثر بڑھ جاتا ہے۔(۷) وہ نہایت شوخ اور ظریف الطبع تھا، اس لیے اکثر مضامین کو ظرافت اور شوخی کے پیرایہ میں ادا کرتا ہے، جس میں اس کے خمریات بھی ہیں، وہ فلسفی اور حکیم تھا، صوفی نہ تھا۔ ورنہ حافظ کی یہی شراب، شراب معرفت بن جاتی۔(۸) خیام کی شاعری میں فلسفہ بھی ہے اور یہ فلسفہ لاعلمی کا ہے، یعنی تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو، کیا کرتے ہو، کہاں جاؤ گے؟ خیام ان سوالوں کی تحقیقات کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ ان سے بڑھ کر فلسفہ کے اور کیا مسائل ہو سکتے ہیں۔(۹) خیام، جبر کا قائل اور معتقد تھا۔(۱۰) خیام کے بارے میں عام خیال ہے کہ اس کے یہاں ایپکوریس کی آواز بازگشت ہے، یعنی کھاؤ، پیو اور خوش رہو، لیکن خیام سے ایسے خطرناک فلسفہ کی توقع نہیں۔ اس نے بہت سی رباعیوں میں معاد، جزا اور سزا کا اقرار کیا ہے۔ نیکوکاری اور برائیوں سے بچنے کی ہدایت کی ہے۔(۱۱) خیام کی اخلاقی تعلیم میں ریاکاری سب سے بڑا جرم ہے اور اس نے جس خوبی سے اس کی پردہ دری کی ہے، آج تک کسی نے نہیں کی ہے۔(۱۲)

مولانا شبلیؒ نے خیام کی شاعری کی خوبیوں کو بڑی حد تک واضح کیا، لیکن اس کے حالات، تصانیف اور دوسرے مشاغل کی تفصیلات پر زیادہ بحث نہیں کی ہے۔ ''شعر العجم'' کی پہلی جلد میں عمر خیام پر صرف ایک باب ہے، جو ۳۱ ر صفحے پر مشتمل ہے۔ اس میں تفصیلات کی گنجائش بھی نہ تھی۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ ''ہماری کتاب کا موضوع شاعری ہے''۔(۱۳) اسی لیے خیام پر جو کچھ ۳۱ ر صفحے میں لکھا ہے، ان میں ۲۳ ر صفحے تو اس کی شاعری پر ہے۔ بقیہ آٹھ صفحے میں اس کے حالات فضل وکمال، تصانیف اور یورپ میں اس کی قدردانی کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے کہ ان محدود صفحات میں پھیل کر لکھنے کا موقع نہ تھا۔ حالات تو ڈھائی صفحے میں لکھ کر ختم کر دئے گئے ہیں، جس میں دولت شاہ کے تذکرہ کے حوالے سے حسن بن صباح، خیام اور نظام الملک کی معاصرت کا بھی ذکر کر گئے ہیں۔ جب ''شعر العجم'' کی جلدیں شائع ہوئیں تو رسالہ اردو، مرتبہ مولوی عبدالحق میں ان پر محمود

شیراتی کی تنقیدیں شائع ہوئیں۔مولانا شبلیؒ نے خیام پر جو کچھ لکھا تھا، اس پر اس زمانہ کے اورینٹل کالج، لاہور کے پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال نے اکتوبر ۱۹۲۲ء کے رسالہ اردو میں کچھ تنقیدیں کیں۔ یہ حصہ ''تنقیدات شعرالعجم'' میں شامل کر دیا گیا ہے۔اس میں انھوں نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ مولانا نے حسن بن صباح، نظام الملک اور خیام تینوں کو ایک ہی مکتب میں ہم سبق کیسے قرار دیا۔وہ خود ہی یہ لکھتے ہیں کہ یہ حصہ تاریخ اور تذکرے کی متعدد کتابوں میں منقول ہے۔ایسی کتابوں میں جامع التواریخ، تاریخ گزیدہ، روضتہ الصفا، حبیب السیر اور تذکرۂ دولت شاہ کے نام بھی لیے ہیں، پھر یہ بھی لکھتے ہیں کہ مولانا نے محض ایک مقبول عام روایت کو مختصر طور سے لکھ دینے پر قناعت کی۔ (۱۴) خود مولانا، خیام کی شاعری کو اصل موضوع بنانا چاہتے تھے، لیکن اس لیے اس کی زندگی کے اور پہلوؤں پر ناقدانہ نظر ڈالنے کے بجائے مختصر طور سے لکھ دینے پر قناعت کی اور پھر تنقید نگار نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس پر ایک اچھی بحث مرزا محمد قزوینی شارح ''چہار مقالہ نظامی عروضی'' نے کی ہے، جو ''شعرالعجم'' کی اشاعت کے بعد چھپی۔اگر یہ مولانا کی زندگی میں چھپ جاتی تو اس سے وہ ضرور استفادہ کرتے۔فاضل تنقید نگار کا یہ بھی کہنا ہے کہ مولانا شبلیؒ نے خیام کے حالات لکھنے میں صرف تذکرہ دولت شاہ سمرقندی، نزہتہ الارواح شہرزوری، تاریخ الکامل لابن الاثیر، تاریخ الحکما قفطی اور چہار مقالہ نظامی عروضی کو سامنے رکھا ہے۔حالانکہ اس کے حالات کے اور بھی ماخذ ہیں۔ پہلے ذکر آیا ہے کہ مولانا شبلیؒ، خیام کے سوانح نگار بننا نہیں چاہتے تھے۔صرف اس کی شاعری پر تبصرہ کرنا، ان کا اصلی مقصد تھا۔اسی لیے اور ماخذوں کی چھان بین نہیں کی۔جن ضروری حالات کی تلاش ان کو تھی، وہ مل گئے، تو پھر اور ماخذوں کی جستجو کی فکر نہیں کی۔تنقید نگار کا یہ بھی اعتراض ہے کہ مولانا نے اس پر کوئی بحث نہیں کی ہے کہ کون سی رباعیات خیام کی ہیں اور کون سی اس کی نہیں ہیں۔حالانکہ وہ خود لکھتے ہیں کہ قلمی نسخے، جو یورپ اور ایشیا کی بڑی بڑی لائبریریوں میں موجود ہیں، ان رباعیات کی تعداد اور ترتیب میں اس قدر تفاوت ہے کہ ان سب نسخوں کا مقابلہ اور موازنہ کر کے مشترکہ رباعیوں

کی ایک قابل اعتبار تعداد کو نکالنا اور ان کو مناسب طور سے ترتیب دینا ممکن نہیں، (۱۵) لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ جو رباعیاں مولانا نے تنقید کے لیے انتخاب کی ہیں، ان میں دس ایسی ہیں جو پروفیسر ژوو کوفسکی کی ان بیاسی رباعیوں میں سے ہیں، جن کو انھوں نے اوروں کی طرف منسوب پایا ہے۔(۱۶) اس کے یہ معنے ہیں کہ مولانا نے اس میں بقیہ جو ساٹھ، ستر، رباعیاں درج کی ہیں، ان کو رد کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ تنقید نگار کے اعتراضات دو اور ہیں۔ ایک تو یہ کہ مولانا نے لکھا ہے کہ خیام کی زیچ یورپ میں چھپ گئی ہے۔ تنقید نگار کی رائے میں یہ یورپ میں نہیں چھپی۔ پھر ان کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ مولانا نے ''عرائس النفائس'' کو خیام کی تصنیف بنایا ہے، مگر اس کے لیے کوئی سند نہیں دی ہے۔(۱۷)

ان تمام اعتراضات کو سامنے رکھ کر حضرت مولانا سید سلمان ندویؒ نے اپنی کتاب ''خیام'' لکھنی شروع کی، پھر ''شعر العجم'' میں جو کمی رہ گئی تھی، اس کو بھی یہ کتاب لکھ کر پورا کیا، جس میں وہ اپنی پوری تحقیقی شان میں دکھائی دیتے ہیں۔ جب کبھی دنیا کی اعلیٰ ترین تحقیقی کتابوں کی فہرست تیار کی جائے گی، تو اس میں اردو کی یہ کتاب ضرور شامل کی جائے گی اور جس دقت نظر سے یہ لکھی گئی ہے، اردو میں اس سے پہلے کوئی اور کتاب نہیں لکھی گئی۔ خیام کی شاعری کے علاوہ اس کے حالات اور تصانیف کو مصنفوں نے بہت ہی گنجلک اور گمراہ کن بنا دیا تھا۔ سید صاحب نے اپنی اس کتاب میں خیام سے متعلق ہر چیز کو منقح کیا ہے۔ انھوں نے گزشتہ مصنفوں کی بے شمار باتوں سے اختلاف کیا ہے۔ اسی لیے اس کتاب کے ہر صفحہ میں ان کی دیدہ وری اور تحقیق کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔'' پروفیسر شیخ محمد اقبال جو کچھ خیام سے متعلق چاہتے تھے اور جو کچھ انھوں نے نہیں بھی چاہا ہو، وہ سب اس کتاب میں مل جائے گا۔ اس کتاب کی ابتدا خیام کے مآخذ و مصادر کے ناقدانہ تبصرہ سے ہوئی ہے۔ اس میں جیسی عالمانہ بحث کی گئی ہے، ویسی کم دیکھنے میں آتی ہے۔ ان میں فرانسیسی مستشرق ہوتسما، روسی مستشرق دانٹین ژوکووسکی، انگریز مصنف ڈینی سن راس، پروفیسر ای۔ جی۔

براؤن اور علامہ عبدالوہاب قزوینی نے جن ماخذوں کا ذکر کیا ہے، ان سب کے نام تفصیل سے لکھ دیئے ہیں۔ پھر آخر میں بڑے وثوق کے ساتھ اپنی طرف سے ان ماخذوں کے نام لکھے ہیں، جو صحیح ترتیب زمانی کے لحاظ سے قابل اعتبار ہیں۔ ان ماخذوں سے وہ اہل قلم پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں، جو خیام پر تفصیل سے کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔ اپنی اس محبت میں وہ مذکورہ فاضل مصنفوں کی کچھ باتوں سے اختلاف بھی کر گئے ہیں۔ مثلاً ژوکووسکی کے متعلق لکھا ہے کہ اس نے حکیم خیام کی ۸۴ / رباعیات نقل کی ہیں، لیکن اس نے دوسرے شعراء کی رباعیات میں ان کو مخلوط کر دیا ہے۔ (۱۸) ڈینی سن راس کے متعلق لکھا ہے کہ اس نے خیام کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کی تعیین کی ناتمام کوشش کی ہے۔ (۱۹) اوٹو روتھیفلڈ کی ایک کتاب عمر خیام اور اس کے زمانہ کے نام سے تارپوروالا بمبئی نے شائع کی تھی۔ اس کے متعلق سید صاحب لکھتے ہیں کہ گو فلسفی خیام کو اس نے سمجھنے کی سب سے بہتر کوشش کی ہے، مگر کتاب حشو وزوائد سے پاک نہیں۔ (۲۰) خیام کے حالات زندگی کے سنین بہت ہی ناصاف اور گنجلک تھے۔ سید صاحب نے ان کو پہلے صاف اور منقح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کو خیال ہوا کہ خیام کی زندگی کے ساتھ یہ واقعہ مشہور کر دیا گیا ہے کہ وہ نظام الملک اور حسن بن صباح کا ہمدرس تھا۔ اگر اس کے غلط اور صحیح ہونے کی نوعیت معلوم ہو جائے تو پھر اس کی زندگی کے سنین متعین ہو سکتے ہیں۔ اس واقعہ کا بڑا گہرہ تجزیہ کیا ہے۔ جن جن ماخذوں میں اس کا حوالہ ہے یا جن جن بیانات میں اس کا ذکر ہے، اس پر ایسی عالمانہ بحث کی ہے کہ اس سے ان لوگوں کو شاید دلچسپی نہ ہو جو ہلکی پھلکی تحریریں پڑھنے کے عادی ہیں، مگر وہ گوشہ گیر اہل نظر، جن کو تحقیق و تدقیق سے شوق ہے، ایسی بحث سے بہت ہی لطف اندوز ہوں گے۔ حضرت سید صاحب سارے ماخذوں اور بیانات کا تجزیہ کر کے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ واقعہ من گھڑت ہے، جو خیام کی زندگی کے بہت بعد اس کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ ان کے دلائل یہ ہیں کہ خیام کی مستند تاریخ ولادت ۴۴۰ھ ہے اور نظام الملک کی تاریخ ولادت پورے سند کے ساتھ ۴۰۸ھ یا ۴۱۰ھ بتائی جاتی ہے، یعنی نظام الملک عمر خیام کی

پیدائش سے تقریباً چالیس ۴۰ سال پہلے پیدا ہوا۔ پھر دونوں ہمدرس کیسے ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح حسن بن صباح کا بچپن رے میں گزرا اور خیام کی پیدائش نیشاپور میں ہوئی۔ وہیں اس کی ابتدائی تعلیم ہوئی۔ اس لیے حسن بن صباح اور خیام کا مکتب میں ہمدرس ہونا ممکن نہیں۔ فرانسیسی مستشرق ہوتسما نے پہلی دفعہ ان تینوں کی ہمدرسی کو مشکوک بتایا تھا، لیکن سید صاحب نے اس کو یقینی طور پر بے سروپا اور من گھڑت ثابت کیا۔

اس کے بعد سید صاحب نے خیام کی وفات اور ولادت کے سنین کی تعیین کی ہے۔ وہ مختلف شواہد کے گہرے مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ عمر خیام نے ۵۲۶ھ میں وفات پائی اور اس کی ولادت ۴۴۰ھ میں ہوئی۔ ۱۹۴۱ء میں سوامی گووند تیرتھ نے عمر خیام پر انگریزی میں ایک کتاب ''دی نکٹر آف گریس'' کے نام سے لکھی۔ انھوں نے ''زیچ ایلخانی'' کی مدد سے خیام کا زائچہ تیار کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ولادت ۴۴۰ھ ہی میں ہوئی، جو عیسوی سنہ کے لحاظ سے تاریخ ۱۸ رمئی ۱۰۴۸ء ہوتی ہے، مگر ان کا بیان ہے کہ خیام کے مزار پر اس کی تاریخ وفات ۱۲ رمحرم ۵۱۲ھ لکھی ہوئی ہے، جس سے سید صاحب کی تحقیق کی تائید نہیں ہوتی ہے، لیکن سید صاحب کا ماخذ ''چہار مقالہ عروضی'' ہے۔ خیام اس کے مصنف کا استاد تھا اور یہی مصنف لکھتا ہے کہ اس نے ۵۲۴ھ میں استاد کی خدمت میں حاضری دی، پھر حج کو چلا گیا۔ تین سال کے بعد واپس آیا تو دریافت کیا، معلوم ہوا کہ استاد نے وفات پائی۔ پھر ان کے مرقد کی زیارت کو نیشاپور گیا۔ پھر یہ کیسے یقین کر لیا جائے کہ خیام کی وفات ۵۱۶ھ میں ہو گئی تھی۔ شاید مزار کے کتبہ پڑھنے میں تسامح ہوا ہو۔

''تاریخ الفی'' کے مولف احمد نصر اللہ ٹھٹھوی (۱۰۰۰ھ) نے خیام کا وطن قریہ شمشاد تابع بلخ یا قریہ سنگ تابع استر آباد بتایا ہے۔ فریڈرک روزن نے بعض کتابوں کے حوالوں سے لکھا ہے کہ اس کا مولد لوکر تھا، جو رود خانہ مرغاب کے کنارے مرورد کے قریب تھا۔ سید صاحب نے ان دونوں کے بیان کی تردید کی ہے اور پورے وثوق کے ساتھ لکھا ہے کہ اس کا مولد نیشاپور تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ خیام کا نام عمر اور اس کے

باپ کا نام ابراہیم تھا،لیکن مولوی عبدالرزاق نے اپنی مشہور تصنیف ''نظام الملک طوسی'' میں لکھا ہے کہ عمر کے باپ کا نام عثمان تھا اور خیام خاقانی شروانی کا چچا تھا۔ان کو خاقانی کے جس شعر سے یہ غلط فہمی ہوئی، اس کی تفصیل بتا کر سید صاحب نے ان کے اس بیان کی تردید کی ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ عمر عام طور سے خیام کی نسبت کے ساتھ مشہور ہے۔اس کو کبھی خیامی بھی لکھا گیا ہے، مگر رباعیات میں وہ خیام ہی لکھتا ہے۔'خیام' کے معنی 'خیمہ دوز' کے ہیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے خاندان میں خیمہ دوزی کا پیشہ ہوتا تھا۔اسی مناسبت سے وہ خیام کے نام سے مشہور ہے۔بعض مصنفوں اور خصوصاً فریڈرک روزن نے خیمہ دوزی کی نسبت عمر خیام کی بزرگی کے خلاف جان کر خیام کے معنی 'خیمہ ساز' کے بجائے 'خیمہ نشیں' لیے ہیں اور کچھ مصنفوں نے اس کو عرب کا کوئی قبیلہ بنانے کی کوشش کی ہے۔سید صاحب نے ان تمام باتوں کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ خیال کہ خیمہ دوزی کے خاندانی پیشہ سے ہمارے ایک عالی مرتبہ فلسفی اور بلند مرتبہ شاعر کی توہین ہوتی ہے،غلط ہے۔مساوات پسند اسلام کی تاریخ میں ایسی بے شمار ہستیاں ہیں، جوادنیٰ خاندانی پیشوں کی نسبت کے باوجود مشاہیر فن اور اکابر علم کی فہرست میں داخل ہیں۔امام محمد غزالی،سوت کاتنے والے تھے۔فقہ حنفی کے مشہور امام شمس الائمہ حلوائی تھے۔وحدۃ الوجود کے مشہور مبلغ وشہید حسین بن حلاج، نداف تھے۔'حلاج' کے معنی ہی 'نداف' کے ہیں۔

مولوی عبدالرزاق نے اپنی کتاب ''نظام الملک طوسی'' میں لکھا ہے کہ خیام نے تاہل کی زندگی اختیار نہیں کی اور ہمیشہ مجرد رہا،لیکن سید صاحب نے اس کی بھی تردید کی ہے اور مستند حوالہ سے بتایا ہے کہ اس نے تاہل اختیار کیا اور کم ازکم اس کی اولاد میں ایک لڑکی تھی، جس کی شادی اس کی زندگی میں بغداد کے ایک فاضل سے ہو چکی تھی۔(۲۱) مغرب ومشرق کے کسی تذکرہ نویس نے کہیں یہ نہیں لکھا ہے کہ خیام کا فضل وکمال، کن کن بزرگوں کی تعلیم و تربیت کارہین منت تھا۔سید صاحب نے اپنی محنت سے اس کمی کو اچھی طرح پورا کر دیا ہے۔ خیام کے زمانہ میں نیشا پور میں سات بہت اچھے مدرسے تھے ،جن کی تفصیل لکھ کر

سید صاحب نے اہل علم کے لیے خوان نعمت بچھا دیا تھا۔ پھر اس زمانہ میں جو علمی مجلسیں تھیں، ان کی ایسی مرقع آرائی کی ہے کہ ان کو پڑھ کر ارباب علم محظوظ ہوں گے۔ سید صاحب رقمطراز ہیں کہ نیشاپور کی متعدد درسگاہوں اور علما کی مجلسوں کے آغوش میں خیام پل کر جوان ہوا اور پھر معتبر ماخذوں کے حوالہ سے اس کی نشان دہی کی ہے۔ جمال الاسلام امام موفق شافعی (المتوفی ۴۴۱ھ) کی مجلس میں خیام نے مذہبی تعلیم حاصل کی۔ (۲۲) حکیم سنائی کے استاد مولانا شیخ محمد بن منصور سے بھی پڑھا اور سترہ برس کی عمر میں اپنے عصروں سے بڑھ کر کمال حاصل کیا۔ (۲۳) علم ہئیت میں اس کے اساتذہ میں ابوالحسن انباری تھے۔ (۲۴) خیام نے اپنے ''رسالہ کون وتکلیف'' میں بوعلی سینا کو اپنا استاد کہا ہے۔ سید صاحب اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بوعلی سینا اگر واقعی اس کے استاد نہ ہوں، لیکن وہ اس کی تصنیفات سے بے حد عقیدت رکھتا تھا۔ وہ بوعلی سینا کو متاخرین کے فلسفیوں میں سب سے بہتر کہتا ہے۔ اس کے ایجاد کردہ 'مسئلہ عقول عشرہ' کا قائل تھا اور اپنی زندگی کے آخر لمحہ میں بوعلی سینا کی ''شفا'' کے مطالعہ میں مصروف تھا۔ بوعلی سینا کے بہت سے تلامذہ اس کے زمانہ میں تھے۔ ممکن ہے کہ فلسفہ کا درس ان سے لیا ہو۔ اس لیے وہ بوعلی سینا کو اپنا استاد اور معلم کہتا ہو۔ (۲۵) ہم نے ان چند سطروں میں خیام کے اساتذہ کا ذکر کیا ہے، اس کو سید صاحب نے چودہ ۱۴ ر صفحے میں پھیلا کر جس طرح لکھا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے کس کس طرح سے جزئیات کو سمیٹ کر یہ ساری باتیں اپنے ناظرین کے سامنے پیش کی ہیں۔

پھر کارلائل نے جس کو ایرانی بدمعاش کہا ہے، اس کے فضل وکمال کا رتبہ سید صاحب نے جس طرح متعین کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فلسفہ وحکمت میں بوعلی سینا کے بعد اسی کا درجہ تھا۔ (۲۶) گو اس کو خود علم نجوم سے زیادہ شغف نہ تھا، لیکن وہ اپنے منجمانہ کمالات کی وجہ سے بھی مشہور تھا۔ (۲۷) طب میں اس کا پایہ بلند تھا اور وہ ملکشاہ کے دربار کا طبیب بھی تھا۔ (۲۸) عقلیات کے علاوہ علوم نقلی کا بھی ماہر تھا۔ فلسفی ہونے کے باوجود فن قرأت

ہیں بھی ید طولیٰ رکھتا تھا۔(۲۹) تفسیر اس کے دائرہ علم کی چیز نہ تھی، لیکن بعض سورتوں پر گفتگو کرتے وقت اپنے معلومات کے دریا بہادیتا۔(۳۰) جبر ومقابلہ کے علاوہ اس کو ہندی ریاضیات سے بھی واقفیت تھی۔(۳۱) اس کو عربی ادب کا بھی ذوق تھا۔(۳۲) عربی فارسی دونوں میں شاعری کرتا، مگر اس کی عربی اس کے رتبہ سے فروتر ہے۔اس کو ادیب اور شاعر دونوں حیثیت سے بعض اہل نظر نے جگہ دی ہے۔اس کا حافظہ ایسا قوی تھا کہ اس نے اصفہان میں ایک کتاب سات دفعہ بغور پڑھی اور یاد کرلی اور نیشاپور آکر لکھوادی۔ جب اصل سے مقابلہ کیا گیا تو کچھ بھی فرق نہ تھا۔(۳۳)

سید صاحب کی ان ساری تفصیلات سے وہ ناظرین حیرت زدہ ہوکر رہ جائیں گے، جو اس کو صرف ایک بادہ پرست شاعر تصور کرتے رہے ہیں۔

خیام نے شروع میں ایک کتاب "البرهان علی استخراج اضلاع المربعات والمکعبات" کے نام سے لکھی، جس میں اس نے دعویٰ کیا کہ ان میں ایسے قواعد دریافت کیے گئے ہیں جو پہلے دریافت نہیں ہوئے تھے، مگر اس کی کوئی قدر نہیں کی گئی۔ پھر اس نے جبر ومقابلہ اور اقلیدس کی بحث پر ایک مختصر رسالہ لکھا، جس میں اس فن کے مشکلات کو حل کیا اور اس کی نئی نئی صورتیں نکالیں۔(۳۴) وہ بددل تھا کہ اس کا کوئی مربی نہیں۔اس نے اپنی موخر الذکر کتاب میں اپنے ایک سرپرست قاضی القضاۃ ابوطاہر کا ذکر کیا ہے، مگر اس نے یہ نہیں لکھا ہے کہ کون اور کیا تھے۔سید صاحب نے اس ابوطاہر کی کھوج میں جو محنت کی ہے، وہ ان کی گہری تحقیق کی ایک اور مثال ہے۔انھوں نے تحقیق کی کہ یہ اصل میں مازندران کے ایک مقام ساریہ کے رہنے والے تھے، مگر ولادت اصفہان میں ہوئی۔ تعلیم وتربیت سمرقند میں پائی اور وہاں کے رئیس شافعیہ ہوگئے۔فقہ وحدیث کے عالم تھے۔ دولت مند بھی تھے۔خیام نے اپنی دوسری تصنیف کے لیے ان کا دامن پکڑا اور انھوں نے اس کو شمس الملک خاقان ترکستان کے دربار تک پہنچایا۔(۳۵) جس نے اس کی بہت قدردانی کی۔وہ اس کو اپنے ساتھ تخت پر بٹھاتا تھا۔(۳۶) اس سلسلہ میں سید صاحب لکھتے

ہیں کہ اس خاندان کی پوری تاریخ کہیں نہیں ملتی۔ پھر بھی انھوں نے اس کے متعلق جو تھوڑے تاریخی معلومات فراہم کردیے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا قلم مختلف سمتوں میں چلنے کا عادی تھا اور جس سمت میں نکل پڑتا، کچھ نہ کچھ گل بوٹے کھلا کر رہتا۔ وہ لکھتے ہیں کہ شمس الملک کا سسرالی تعلق اس زمانہ کے مشہور سلجوقی فرمانروا ملک شاہ سے تھا۔ شمس الملک نے ازراہ قدردانی خیام کو ملک شاہ کے دربار تک پہنچادیا۔ جہاں انیس ۱۹ ر برس تک رہا۔ اس قیام میں اس کا سب سے بڑا کارنامہ رصد خانہ ملک شاہی کی تعمیر ہے۔ اس سلسلہ میں اس نے بہت سی فلکیاتی تحقیقات کیں اور زیچ ملک شاہی، رسالہ کون وتکلیف اور دوسرے رسالے لکھے۔ (۳۷) سید صاحب کو خیام کے بنائے ہوئے رصد خانہ سے بڑی دلچسپی ہوئی۔ انھوں نے اس کی تفصیل میں قمری ماہ وسال، شمسی مہینے اور سال کے حساب مرتب کرنے اور مسلمانوں کے دور میں اس کی جو کوششیں ہوئیں، اسلام میں شمسی سال اختیار کرنے کے موانع، پھر مسلمانوں کی حکومتوں کے زمانہ میں مختلف رصد خانوں کی تعمیر، ان میں حرکت شمسی کی تحقیقات کی تفصیلات، نصیر الدین طوسی کے کارناموں، ہیئت پر جامع بہادر خانی، علامہ قوشجی کے ''رسالہ قوشجیہ'' گریگورین اصول کی نوعیت خیام کی تاریخ جلالی کی غلطیوں وغیرہ سے متعلق جو پر مغز معلومات اپنی طرف سے فراہم کیے ہیں، ان کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ قرآن مجید، حدیث، فقہ، سیرت اور کلام وغیرہ کے مطالعے میں ڈوب کر زندگی بسر کرنے والے مصنف کو علم نجوم و ہیئت سے ایسی گہری دلچسپی کیسے ہوگئی، مگر ان کی علمی زندگی کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو شروع سے اس فن سے لگاؤ رہا۔ اپنی ابتدائی زندگی میں اسلامی رصد خانے کے عنوان سے ایک مضمون لکھ کر علمی حلقہ سے خراج تحسین حاصل کیا تھا۔ اس لیے تحریر میں جب کبھی ہیئت و نجوم کا ذکر آجاتا ہے تو ان کا قلم بے قابو ہوجاتا ہے۔ یہ کہنے میں تامل نہیں کہ ان کا علم ایک بحر زخار تھا، جس کی علمی موجیں اور لہریں مختلف سمتوں میں امنڈتی رہتیں۔ انھوں نے اپنی یہ کتاب اپنی عمر کے ۴۹ ویں سال میں لکھی، لیکن ان کے علم کا بے پایاں بحر اور بڑھتا اور گہرا ہوتا گیا، جیسا کہ ان کی بعد کی

تصانیف سے اندازہ ہوتا ہے۔

اپنی اس کتاب میں سید صاحب نے یہ بھی دکھایا ہے کہ خیام کا تعلق نہ صرف ملک شاہ جیسے جلیل القدر سلجوقی فرماں رواسے رہا، بلکہ ملک شاہ کے جانشینوں میں سلطان سنجر بھی خیام کو اپنے ساتھ تخت پر بٹھاتا تھا (۳۸) اور اس کے بھتیجے شہاب الاسلام ابوالمحاسن عبدالرزاق کی مجلسوں میں بھی شریک رہتا تھا۔ (۳۹) معاصرین میں اس کے تعلقات بوعلی سینا کے نامور شاگردوں امام غزالی، فلسفہ مشائیہ کے نامور عالم اوحدالزماں ابوالبرز، رصدخانہ کے ماہر ابوعالم مظفر اور مشہور ریاضی داں محمد بن احمد معموری بیہقی سے بھی رہے اور ان سے خیام کے علمی مباحث ہوئے۔ ان کی تفصیل بھی لکھی ہے۔ خیام کی زندگی کے ان پہلوؤں سے واقفیت کے بعد یہ معلوم کرنے میں مدد ملے گی کہ وہ ایک معزز اور باوقار زندگی بسر کرتا رہا اور یورپی مصنفوں کی اس کی یہ تصویر کس قدر گمراہ کن ہے کہ وہ شراب اور عورت کے پیچھے دیوانہ رہا۔

بعض مصنفوں نے شکایت کی ہے کہ خیام اپنے علم میں بخیل تھا۔ اسی لیے نہ اس نے بڑی بڑی تصنیفات کیں اور نہ وہ طالب علموں اور شاگردوں کے ساتھ لطف سے پیش آیا۔ سید صاحب نے اس سے اتفاق کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ جس علمی منزل پر پہنچ گیا تھا، اس میں اس کو درس و تدریس اور شاگردی و استادی سب ہیچ نظر آتی تھی۔ پھر بھی اس کے دو تین شاگردوں کا پتہ چلا لیا ہے، جن کے نام ابوالمعالی عبداللہ، حکیم علی اور احمد بن عمر علی نظامی عروضی سمرقندی لکھے ہیں۔ پہلے دو تو کئی کتابوں کے مصنف ہوئے۔ نظامی عروضی اپنی کتاب ''چہار مقالہ'' کی وجہ سے بہت مشہور ہوئے۔ وہ علم نجوم میں خیام کے شاگرد تھے۔ (۴۰)

سید صاحب نے خیام کی تصنیفات کی تلاش بڑی جانفشانی سے کی ہے۔ انھوں نے مختلف ماخذوں، کتابوں اور کیٹلاگوں کو چھانا تو ان میں خیام کی اکیس (۲۱) کتابوں کا ذکر ملا، مگر انھوں نے کچھ کو خیام کی تصانیف تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ پھر اس کی اصلی اور

واقعی تصانیف اور تحریرات کی تعداد دس (۱۰) متعین کی ہے۔ ان میں سے بعض تو جبر و مقابلہ، بعض ریاضیات، اقلیدس، زیچ اور طبیعات پر ہیں، لیکن سید صاحب نے ان سب کا مطالعہ کیا اور ان کی نوعیت و حیثیت بتائی ہے۔ جس کے بعد یہ تعجب ہوتا ہے کہ سید صاحب کو ان تکنیکی کتابوں سے کیسے دلچسپی ہوئی اور پھر یہ لکھنے کو جی چاہتا ہے کہ ان کا علمی ذہن ایک طلسم ہوش ربا تھا، جس کے ذریعے سے ان کے علم میں طرح طرح کی نیرنگیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ خیام کے ان تصانیف کے نام پڑھنے سے بعض ناظرین کو وحشت ہوگی، مگر صرف ان کے نام معلوم کرنے سے اس کے اعلیٰ علمی رتبہ کو متعین کرنے میں مدد ملے گی اور پھر سید صاحب نے ان کو سمجھ کر جس طرح سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس سے ان کے امعان نظر کا بھی اندازہ ہوگا۔ ان پر تفصیلی تبصرہ تو سید صاحب کی کتاب میں پڑھا جا سکتا ہے، مگر ہم یہاں پر خیام کی اصلی تصانیف کے ناموں کے ساتھ ان کے تبصرے کا محض خلاصہ، سید صاحب ہی کے الفاظ میں پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

۱۔ رسالہ مکعبات: مربع اور مکعب چیزوں کے اضلاع دریافت کرنے کے جتنے طریقے اہل ہند کو معلوم تھے، جو معمولی استقرار پر مبنی ہیں اور وہ ایک سے لے کر نو تک کے مربعات ہیں، یعنی ایک دو تین مربعات اور اسی کے مضروبات جیسے دو کو تین میں ضرب دے، حاصل ضرب کیا جائے۔ خیام نے اس طریقۂ حساب کے صحیح ہونے اور اس سے صحیح مطلوب حاصل کرنے کے طریقے بتائے ہیں اور اس کی بہت سی قسموں کا بھی اضافہ کیا ہے۔

۲۔ جبر و مقابلہ: اس میں اس فن پر پہلے کے لوگوں نے جو غلطیاں کی تھیں، ان کی اصلاح کی ہے اور جو اگلے لوگ حل نہ کر سکے تھے، ان کو اپنی تحقیق سے حل کیا۔

۳۔ زیچ ملک شاہی: اس میں اپنی تاریخ جلالی کے اصول بیان کیے ہیں۔

۴۔ رسالہ مصادرات اقلیدس: اس میں اقلیدس کی ان شکلوں کی مشکلات حل کی گئی ہیں، جن کا ثبوت ایک دوسرے کے ثبوت پر موقوف ہے۔

۵۔ رسالہ طبیعات ولوازم الامکنہ: اس میں امکان کے لوازم وخصائص طبعی کا ذکر ہے۔

۶۔ میزان الحکم ورسالہ معرفہ مقدار الذہب والفقہ: اس میں سونے اور چاندی سے ملا کر بنائے ہوئے جسم میں ہر ایک وزن کو متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۷۔ رسالہ کون وتکلیف: بوعلی سینا کے دو شاگردوں نے خیام سے یہ وہ سوالات کیے گئے تھے کہ خدا نے دنیا اور جنوں وانسانوں کو کیوں بنایا اور انسانوں کو عبادات بجالانے کی تکلیف کیوں دی۔

پہلے سوال کے جواب کے سلسلے میں یہ لکھا کہ تمام فلسفہ کا نچوڑ صرف تین سوالات ہیں: ا۔ کیا یہ ہے؟ ۲۔ اگر ہے تو کیا ہے؟ ۳۔ اور کیوں ہے؟ پھر بتایا ہے کہ ہر وہ شئے جو دنیا میں موجود ہے وہ انیت (موجودیت) اور ماہویت (ماہیت) ہے، کبھی خارج نہیں ہوسکتی۔ البتہ لمیت سے بعض وجود بے نیاز ہوسکتے ہیں اور اس کی صورت یہ ہے کہ موجود کی دو قسمیں ہیں۔ ایک واجب الوجود اور دوسری ممکن الوجود۔ علت اور سبب کا سوال ضرور ہے کہ یہیں جا کر رکے اور ایک ایسی علت پر جا کر انتہا ہو، جس کی پھر کوئی علت نہ ہو۔ یہ شان واجب الوجود کی ہے اور ممکن الوجود کے تمام اسباب وعلل بالآخر علۃ العلل ہیں، یعنی اسی واجب الوجود پر جا کر ختم ہوتے ہیں۔ واجب الوجود جس طرح اپنے وجود کی علت سے بے نیاز ہے، اسی طرح اس کے اوصاف وصفات اور افعال بھی علل واسباب سے مستغنی ہیں۔ اس لیے یہ سوال ہی بے معنی ہے کہ اس نے کیوں بنایا اور ہست کیا۔ یہ واجب الوجود کے جود و کرم کا نتیجہ ہے کہ یہ دنیا ہست ہے اور ہم موجود ہیں۔

دوسرے سوال کا یہ جواب دیتا ہے کہ عبادات سے یہ فوائد حاصل ہوتے ہیں کہ نفس انسانی کو شہوات نفسانی سے احتراز ہو اور قوت عقلیہ کے پرورش پانے کا موقع حاصل کو امور الٰہیہ اور امور معاد وآخرت میں غور وفکر کرنے کا عادی بنایا جائے کہ وہ اس دار ناپائیدار کے طلسمات سے نکل کر جناب حق اور ملکوت ربانی کی طرف توجہ اور التفات کرے۔ اس سے یہ بھی فائدہ ہے کہ اس عالم میں امن داماں نظم واطمینان اور عدل وانصاف اور باہمی اجتماعی تعاون و

مشارکت پیدا ہو اور نظام عالم حکمت ربانی کے مطابق قائم ہے۔ اس رسالہ کے تتمہ میں سوالات کے اور جواب ہیں۔ یہ سوالات یہ ہیں، اس دنیا میں تضاد کیوں ہے؟ حشر ونشر کیوں ہے؟ باقی میں بقا ہے یا اس سے الگ کوئی چیز ہے۔

خیام نے ان سوالات کے بھی جواب دیئے ہیں، جن کا صرف خلاصہ یہ ہے:

پہلے سوال کے جواب میں لکھتا ہے کہ موجودات عالم میں تضاد اس کی مادیت کے لوازم میں سے ہے، جس میں کیوں کا سوال نہیں ہوسکتا۔ موجودات کو باہم متضاد کسی بنانے والے نے نہیں بنایا، بلکہ وہ بجائے خود متضاد ہیں۔ سیاہ وسپید کو باہم متضاد خدا نے نہیں بنایا، بلکہ وہ درحقیقت خود باہم متضاد ہیں۔ مگر ان کا خارج میں وجود نہ بھی ہو اور صرف ذہن دوہم میں ہوکر پائے جائیں تو بھی متضاد ہی ہوکر پائے جائیں گے۔ اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں کہ ان کو خدا نے متضاد بنا دیا۔ اللہ تعالےٰ نے اشیا کو بہ حیثیت اشیا کے بنایا۔ ان اشیا میں باہم نسبت اتحاد کی ہے یا تضاد کی ہے، یہ کسی بنانے والے سے نہیں ہے، بلکہ از خود ہے۔ اس لیے ان کی مجعولیت اور پیدائش خدا کی طرف بالذات منسوب نہیں بلکہ بابغرض ہے۔ اس کے بعد خیام کہتا ہے کہ خدا نے سیاہی کو اس لیے نہیں بنایا کہ سپیدی کی ضد ہے، بلکہ اس لیے بنایا کہ یہ بھی ممکن الوجود چیز بھی ہوسکتی تھی۔ اس لیے اس کے ہوسکنے کا موقع عنایت فرمایا۔ (۴۱)

خیر وشر کے جواب میں کہتا ہے کہ عالم میں شر کو خدا نے بالذات نہیں بنایا، موجودات کی پیدائش کے بعد اس کا ازخود ہو جانا ضروری تھا۔ خدا محض خالق خیر ہے۔ دنیا میں درحقیقت صرف خیر ہے۔ خیر سے شر کا وجود عرضاً اور تبعاً ہے۔ خدا نے اس کو بالذات پیدا نہیں کیا، بلکہ اشیاء کو پیدا کیا۔ ان اشیاء کے ساتھ جو ان کے ضروری لوازم تھے، وہ بھی بالعرض پیدا ہوگئے۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ اگر کوئی یہ کہے کہ پھر خدا نے ایسی چیز کیوں بنائی، جس کی نسبت وہ جانتا ہے کہ اس کو عدم اور شر لازم ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہر شے میں خیر کے جتنے پہلو ہیں، ان کے مقابلہ میں شر کا پہلو بمنزلہ صفر ہے۔ مثلاً سیاہی میں ایک

ہزار پہلو خیر کے ہیں، تو ایک شر کا۔ ایسی حالت میں ایک شر کے خیال سے ایک ہزار خیر کو نہ پیدا کرنا، خود شر عظیم تھا۔

آخری سوال کے متعلق کہتا ہے کہ یہ بحث فضول ہے۔ جب وجود کے متعلق یہ تسلیم ہے کہ وجود اور موجود خارج میں ایک ہیں، گو ذہن میں الگ الگ ہوں تو یہی صورت بقا کی نسبت کیوں نہیں ہو سکتی۔ وجود اور بقا میں صرف اسی قدر فرق ہے کہ وجود مطلق ہستی ہے اور بقا ایک مدت متعینہ تک کی ہستی کو کہتے ہیں۔ (۴۲)

۸۔ رسالہ موضوع علم کل: اس رسالہ کی بحث کا ماحصل یہ ہے کہ وجود کا تصور بدیہی ہے۔ وجود کے ثبوت کے لیے کسی دلیل کی حاجت نہیں۔ وجود عین موجود ہے۔ کلی موجود فی الخارج نہیں۔ موجود فی الخارج صرف جزئیات ہیں۔ واجب الوجود اور ممکن الوجود میں وجود کا اشتراک محض لفظی ہے۔ دونوں جگہ وجود کی حقیقت مختلف ہے۔ (۴۳)

۹۔ رسالہ فی الوجود: یہ چند صفحوں کا رسالہ ہے، جس میں وجود کی فلسفیانہ بحث ہے۔ اس کی پہلی فصل میں جوہر جسمیت (مرکب) محیط، عمل اور نفس... کی تعریفیں ہیں اور تقسیمیں ہیں۔ پھر عقل، نفس اور افلاک کی ترتیبی تخلیق کی بحث ہے۔ دوسری فصل میں افلاک، امہات (عناصر) اور موالید (عنصریات) کا اور ان کے باہمی علت و معلول ہونے کا بیان ہے۔ تیسری فصل میں عقل و نفس کے ادراک کا ذکر ہے۔ چوتھی میں ملکات خمس اور اعراض کا۔ پانچویں میں وجب الوجود، ممکن اور ممتنع کی تعریف ہے۔ چھٹی میں جوہر و عرض اور آثار و خصائص کی بحث ہے اور ساتویں میں اس وقت کے چار گروہ متکلمین، حکماء، اسماعیلیہ اور صوفیہ کے اصول (مسلک) پر مختصر تبصرہ ہے۔

۱۰۔ رسالہ وصف و موصوف: یہ سات صفحوں کا عربی رسالہ ہے۔ اس میں اولاً یہ بیان ہے کہ اوصاف ولوازم کا ثبوت اپنے موصوف اور ملزوم کے لیے کیوں کر ہو سکتا ہے اور وجود کا ثبوت موجود کے لیے کس طرح ہوتا ہے۔ اوصاف ولوازم کے اقسام ذاتی اور عرضی کی تعریف بھی ہے۔ پھر سارے رسالہ میں یہ بحث ہے کہ ممکنات کا وجود، موجود فی الخارج نہیں

اور زائد بر ذات ہے، وہ صرف مفہوم اختراعی ہے۔ ممکنات کی اصلیت عدم اور وجود واجب الوجود کے اثر سے خارج سے ان کو ملتا ہے۔ اس عام بحث کے علاوہ اس رسالہ سے یہ بھی ثابت ہے کہ چیزوں کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے فکر و مراقبہ اور ریاضت کی ضرورت ہے۔ (۴۴)

سید صاحب ''عرائس النفایس'' اور ''نوروز نامہ'' کو خیام کی تصانیف قرار نہیں دیتے۔ ان کو خیام کی ان کتابوں سے ایسی دلچسپی ہوئی کہ انھوں نے مذکورہ بالا فہرست کے شروع کے چار رسالوں کو چھوڑ کر بقیہ اور تمام تصانیف کو بڑی محنت سے ایڈٹ کر کے ان کے پورے متن کو اپنی کتاب میں منسلک کر دیا ہے۔ اس طرح جن ناظرین کو ان کی تلاش ہوگی، وہ ان کو اس کتاب میں مل جائے گی۔ یہ خیام سے ان کے گہرے شغف کا بھی ثبوت ہے۔ ان کی تلاش میں جو محنت کی ہے، اس کی پوری تفصیل کتاب میں ملے گی اور پھر جہاں جہاں فلسفیانہ بحث آئی ہے، اس میں وہ امام غزالی، ابن سینا اور ہیوم کے حوالے دے کر اس طرح شریک ہوتے نظر آتے ہیں، جیسے وہ خود بھی بڑے فلسفی ہوں۔ سیرت النبی میں جا بجا ایسی بحثیں آ گئی ہیں۔ ان کو قلم بند کرنے میں سید صاحب نے جس خوش سلیقگی کا ثبوت دیا ہے، اس سے بھی خیام کے فلسفے کو سنجھنے اور سمجھانے میں مدد ملی ہے۔

سید صاحب اپنی اس کتاب میں تحقیق، تلاش، نجوم، ہیئت اور فلسفہ کے ماہر نظر آتے ہیں، لیکن جب وہ شاعر خیام کے عنوان سے اپنے قلم کی بہار دکھاتے ہیں تو پھر وہ شعر و ادب کے بہت بڑے ماہر دکھائی دیتے ہے۔

شاعر خیام کی حیثیت سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ابتدائی سوانح نگار اس کا ذکر شاعر کی حیثیت سے مطلق نہیں کرتے ہیں۔ کہیں کہیں اس کے چند عربی اشعار اور فارسی کی ایک دو رباعیوں کا ذکر آ گیا ہے۔ رباعی گو کی حیثیت سے مشرق میں اس نے کوئی بڑا درجہ نہیں پایا، لیکن جب فٹز جیرالڈ نے اس کی رباعیات کا ترجمہ انگریزی میں کیا تو وہ صرف شاعر ہی کی حیثیت سے جانا گیا۔

سید صاحب کو اب خیام کا مطالعہ رباعی گو کی حیثیت سے کرنا تھا تو انھوں نے اس سلسلے میں عربی و فارسی میں رباعی گوئی کی پوری تاریخ لکھ دی ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ کیا ہے، مختلف دور میں اس کے کیا کیا نام رکھے گئے، اس کی ایجاد کب ہوئی، فارسی میں کون کون بڑے رباعی گو شاعر گذرے ہیں اور اس کی مقبولیت کے کیا اسباب ہوئے؟ ان تمام باتوں کو تقریباً اپنی اس کتاب کے چالیس صفحے میں لکھا ہے۔ اس کتاب کے اس حصے کو معارف میں شائع کیا تو اس سے علمی حلقہ میں بڑی دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اس کو لکھتے ہوئے نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ گذر چکا ہے، لیکن آج بھی یہ حصہ پڑھا جائے گا تو یہ شعروادب کے فن کا ایک شاہکار سمجھا جائے گا۔

اس کے بعد انھوں نے خیام کی رباعیات کے قدیم حوالے کی تفتیش کی ہے۔ پھر اس کی رباعیات کے قدیم نسخوں کی فہرست بنائی ہے اور گہرے مطالعہ، مقابلہ اور موازنہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ان قدیم نسخوں میں خیام کی رباعیات کے دوسرے شعرا کی رباعیاں مل گئی ہیں اور ان کی نشاندہی بھی کی ہے۔ اس تغلیط کے سات اسباب بتائے ہیں۔

۱۔ خیام کی رباعیات صوفیوں کی مجلس حال وقال میں چھٹی صدی ہجری کے اواخر میں پہنچ چکی تھی۔ اس طرح حکیم خیام، صوفی خیام کی صورت میں تبدیل ہوگیا۔ صوفیوں نے اس کی رباعیات میں صوفیانہ رباعیوں کی آمیزش کردی۔ دوسری طرف رند و بادہ پرست جو مذہبِ اباحیت کے پیرو تھے، وہ بھی خیام کے معتقد ہوگئے۔ ان رندوں نے باحی خیالات اور مستی و رندی والی رباعیات کو خیام کی رباعیوں کے ساتھ پڑھنا شروع کردیا۔ ایک اس کو صوفی صافی یعنی مذہبی صوفی ثابت کرنا چاہتا تھا اور دوسرا رند لاابالی، مگر درحقیقت حکیم خیام نہ یہ تھا اور نہ وہ، بلکہ وہ حکیم متقشف تھا اور اس کا تصوف اگر تھا تو حکیمانہ تصوف تھا، مذہبی صوفیانہ نہیں۔ (۴۵)

۲۔ بعض لوگوں نے خیام کی حکیمانہ رباعیوں کا جواب لکھا۔ کسی نے جواب کے

ساتھ سوال بھی لکھ دیا۔ وہ سوال و جواب دونوں خیام کے نام میں درج ہو گئے۔

۳۔ خیام کے مضامین پر دوسرے شعرا نے ہم معنی اشعار کہے ہیں۔ جامعین نے تشابہ کی بنا پر سب کو خیام کے سر تھوپ دیا۔

۴۔ کسی مناسب موقع پر خیام کی کوئی رباعی کسی مشہور آدمی نے نام بتائے بغیر پڑھی یا لکھی۔ ناواقف سننے والوں اور دیکھنے والوں نے سمجھا کہ رباعی اسی قائل کی تصنیف ہے۔

۵۔ خیام کی چند غیر خمریہ رباعیوں کے سبب سے دوسروں کی اکثر تیز و بدمست خمریہ رباعیاں اس کی طرف منسوب کر دیں۔

۶۔ بعض تندنوشوں نے دھوکہ کھا کر خیام کی رباعیوں کو حافظ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ حالاں کہ رباعی گوئی میں حافظ کا کوئی درجہ نہیں۔

۷۔ جن رباعیوں میں کوئی تخلص نہیں تھا، وہ بھی خیام سے منسوب ہو گئیں۔ (۴۶) پھر ان ایشیائی اور یورپی مصنفوں کی کوششوں کا بھی تجزیہ کیا ہے۔ انھوں نے خیام کی اصل رباعیات کو دوسرے شاعروں کی رباعیات سے الگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس تجزیہ میں انھوں نے اس کی بھی نشاندہی کی ہے کہ فارابی، ابوالحسن خرقانی، غزالی، ابوسعید ابوالخیر، ابن سینا، عبداللہ انصاری، عطار، افضل کاشی، سنائی، جلال الدین رومی، فخر الدین رازی، سیف الدین باخرزی، نجم الدین رازی، نصیر الدین طوسی، سراج الدین انوری مغربی، تبریزی اور کمال اسماعیل کی رباعیاں خیام کی رباعیوں سے مل گئی ہیں۔ جس طرح سید صاحب نے ہر رباعی کا مطالعہ اور موازنہ کر کے ان کو خیام کی رباعیوں سے الگ کر دکھایا ہے۔ اس سے ان کی تحقیقی، ادبی اور شعری دیدہ وری کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

ان رباعیوں کے مطالعہ کے بعد وہ خیام کے مذہب، مشرب اور مسلک پر بہت ہی محققانہ اور عالمانہ بحث کرتے ہیں اور بڑے وثوق کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس کا مذہب اسلام تھا، لیکن مشائیت آمیز اشراقی، فلسفیانہ اسلام جس کا خاکہ فارابی اور بوعلی سینا کے یہاں نظر آتا ہے۔ بہر حال، وہ مسلمان تھا خدا اور رسول کا قائل تھا، نماز پڑھتا تھا، حج

بھی کیا، مرض الموت کے آخری لمحوں میں بوعلی سینا کی کتاب الٰہیات ''شفا'' کا مطالعہ کر رہا تھا۔ جب واحد اور کثیر کی بحث پر پہنچا تو اس پر یہ اثر ہوا کہ اٹھ کھڑا ہوا۔ لوگوں کو بلا کر وصیت کی، پھر نماز پڑھی، اس درمیان میں نہ کچھ کھایا، نہ پیا۔ آخر عشا کی نماز پڑھ کر سجدہ کیا اور سجدہ میں بار بار یہ کہتا جاتا کہ خدایا تو جانتا ہے کہ میں نے اپنے امکان بھر تجھ کو پہچانا۔ تو مجھے بخش دے کہ میری التجا تیرے دربار میں میرا وسیلہ ہے۔ یہ کہہ کر یہ طوطی خوش نوا ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ (۴۷)

سید صاحب نے یہ سب کچھ مستند حوالوں سے لکھا ہے کہ خیام کے ایک صحیح مسلمان ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے اس پر بھی تفصیلی بحث کی ہے کہ وہ مسلمان ضرور تھا۔ لیکن جیسا کہ پہلے لکھا ہے۔ وہ فارابی اور ابن سینا کے مذہبی خیالات سے متاثر تھا۔ اسی لیے مسلمان ہونے کے ساتھ ایک حکیم تھا، مگر متکلم حکیم نہ تھا، فلسفی حکیم بھی نہ تھا، اسماعیلی حکیم بھی نہ تھا۔ اگر تھا تو صوفی حکیم اور اسی طریق کو وہ پسندیدہ اور صواب جانتا تھا۔ اس کا تصوف مذہبی نہیں، بلکہ حکیمانہ تھا، یعنی اس کے سامنے انبیا کے احوال نہیں بلکہ حکماء کے حالات اور خیالات تھے۔ اس طرح وہ فلسفیانہ تصوف کا قائل تھا۔ خدا اور اس کی ذات، پھر نبوت اور رسالت کے متعلق اس ۔کے وہی حکیمانہ خیالات تھے، جو بوعلی سینا کے یہاں ہیں۔ اسی لیے وہ بھی انسانیت کا کمال معرفت، اسی کو جانتا تھا، مگر اسی کے ساتھ وہ خدا کی کلی معرفت کے امکان کا قائل نہ تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ یہ انسان کی دسترس سے باہر ہے۔ پھر خدا کے عالم کل ہونے کا بھی وہ قائل تھا اور وہ اس پر یقین رکھتا تھا کہ تمام ممکنات اسی واجب تعالیٰ کا فیضان ہے۔ (۴۸) اسی لیے وہ مرجیت کے خیالات بھی رکھنے لگا تھا، یعنی وہ اس کا قائل تھا کہ خدا اپنی توحید و معرفت کے بعد کسی کو عذاب نہیں دے گا۔ گنہ گاروں کے تمام گناہ اپنے کمال مہربانی سے معاف کر دے گا کیوں کہ اس کو کینہ اور دشمنی نہیں ہے، وہ خیر محض ہے۔ (۴۹) وہ جبر کا بھی قائل نہیں تھا، یعنی اس کا جبر، مذہبی استدلالات پر مبنی تھا، بلکہ فلسفیانہ دلائل پر تھا، یعنی وہ جدید افلاطونی فلسفہ مشائیہ کے مطابق تھا۔ وہ زہد و ورع اور

پاکیزگی وطہارت کی بھی دعوت دیتا رہا، لیکن وہ بھی مذہبی نہیں، بلکہ یونان و اسکندریہ کے زاہد خشک فلاسفروں کی تعلیم کے مطابق ہے۔ (۵۰)

سید صاحب نے یہ جو کچھ لکھا ہے، اس کی سند میں وہ خیام کے رسالوں کے علاوہ اس کی رباعیاں بھی پیش کرتے جاتے ہیں، جن کو وہ خیام کی اصلی رباعیات سمجھتے ہیں۔ خیام کے ان حکیمانہ اور فلسفیانہ خیالات کے ساتھ انھوں نے اس کے پیشرو اور معاصر حکمائے اسلام کے حکیمانہ خیالات پر بڑی پرمغز بحث کی ہے۔ چناں چہ لکھتے ہیں: اس وقت تک متکلمین اسلام کے مختلف فرقے ہو چکے تھے۔ مثلاً حنبلیہ، شافعیہ، مالکیہ، حنفیہ وغیرہ۔ خیام ان میں کسی سے متاثر نہ ہوا۔ پھر حکما کے تین گروہ ہوگئے۔ ایک وہ جو صرف حکیمانہ خیالات رکھتے تھے، لیکن دنیا طلب اور عیش پرست تھے جیسے بوعلی سینا وغیرہ، دوسرے وہ جن کے خیالات اور اخلاق زاہدانہ تھے۔ یہ اسکندریہ کے افلاطونی حکیموں اور یونان کے روایتی فلسفیوں کی طرح رہے۔ حکیمانہ اصول اور خیالات کے مطابق خشک فلسفیانہ زندگی بسر کرتے تھے اور ریاضات شاقہ کے ذریعے سے تزکیہ نفس اور ترقی روح کے مدارج ڈھونڈتے تھے۔ ان کو 'فلسفی صوفی' کہتے تھے۔ تیسرے وہ تھے، جو فلسفیانہ خیالات کے ساتھ ایک امام کے اطاعت مطلقہ کے قائل تھے۔ وہ اس امام کی اطاعت کو نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ یہ لوگ باطنیہ اور اسماعیلیہ اور تعلیمیہ کہلاتے تھے۔ خیام ان تینوں میں سے کسی میں نہ تھا۔ وہ 'صوفی حکیم' تھا، جیسا کہ اس کے 'رسالہ کلیات الوجود' سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں سید صاحب نے حکمائے اسلام ابن سینا، فارابی اور ابن مسکویہ کے فلسفیانہ خیالات اور پھر فلسفیانہ تصوف اور مذہبی تصوف پر بڑی فاضلانہ بحث کی ہے، جس سے ظاہر ہوگا کہ ان موضوعات پر بھی ان کی نظر گہری تھی۔ ان تمام مباحث کا لب لباب یہ ہے کہ خیام صوفی حکیم ضرور تھا، لیکن وہ بوعلی سینا اور فارابی کے خیالات سے بھی متاثر رہا۔ وہ مسلمان بن کر زندگی بسر کرتا رہا۔

پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنی رباعیات میں شراب کا ذکر بار بار کیوں کرتا رہا۔

اس کا بڑا تفصیلی جواب سید صاحب نے ''خیام کی شراب'' کے عنوان سے دیا ہے۔

پہلے تو وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ حافظ ابوالحسن علی باخرزی، حکیم سنائی، ابوسعید ابوالخیر وغیرہ نے بھی اشعار کہے ہیں۔ وہ خیام کی طرح بدنام نہیں۔ پھر خمریات کی بہت سی رباعیاں دوسروں کی ہیں، مگر خیام کے نامۂ اعمال میں داخل کر دی گئیں۔ پھر اس کی بعض رباعیاں ایسی بھی ہیں، جو بالکل سادہ اور معصوم، لیکن جب یہ دوسرے نسخوں میں نقل کی گئی ہیں تو ان میں شراب کی آمیزش کر دی گئی ہے۔

خیام کی شراب کی ایک قسم اخلاص کی بوتل میں بند ہے۔ صوفی شعرا میں یہ رسم ہوگئی تھی کہ رندی کے ان ظاہری لوازم، جام و ساغر و بادہ کو اخلاص اور باطنی نیکوکاری کے معنوں میں اور تسبیح و سجادہ اور دستار کو فریب ملاقات اور تلبیس و نفاق کے معنوں میں بولیں۔ خیام کی بھی بہت سی رباعیوں میں یہی شراب بھری ہے۔ (۵۱)

خیام کے پیالہ میں ایک ایسی شراب بھی نظر آتی ہے، جس کا نام بادۂ حقیقت ہے۔ وہ شراب کی غیر مرئی و غیر محسوس حقیقت روح حق، جذبۂ روحانی اور معرفت قلب کے معنوں میں استعمال کرتا ہے، مگر عام طور سے لوگ خیام کی اس شراب کو دنیا کی مکدر شراب سمجھتے ہیں۔ خیام جب اپنی رباعیات میں شراب، نور بادہ، صراحی، پیالہ اور گل کوزہ کا ذکر کرتا ہے تو ان سے پینے کا نہیں، بلکہ دیکھنے کا کام اور جب ان کے ٹوٹنے پھوٹنے کا ذکر کرتا ہے تو ان کے ذریعے سے زوال، فنا اور تعبیر کی تشبیہوں اور استعاروں کو ادا کرتا ہے۔ ان کا تعلق مستی و سرشاری سے نہیں ہوتا۔ (۵۲)

سید صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ شاعر کے شعر میں ایسی لچک ہوتی ہے کہ جس مذاق کا آدمی جس خیال کو دل میں رکھ کر پڑھتا ہے، ان کے مطابق معنی، شعر میں نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ مثال بھی دی ہے کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے سامنے خیام کی رباعی پڑھی جاتی تو وہ رو پڑتے اور ان پر حال طاری ہو جاتا۔ (۵۳)

سید صاحب نے اوپر خیام کی شراب کی قسموں کی جو نوعیت بتائی ہے، اس کی تائید

میں اس کی رباعیات بکثرت پیش کی ہیں اور اپنے دعویٰ کے ثبوت میں بعض رباعیوں کے معانی ومطالب بتا کران پر مدلل بحث کی ہے۔

کتاب کے آخری باب کا عنوان ''جعلی خیام'' ہے۔اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ بعض حلقوں میں یہ کہا جاتا ہے کہ خیام ایک لا ابالی شخص تھا، جو شب و روز مست پڑا رہتا تھا۔ عالم خمار میں جو کچھ بک جاتا تھا، وہ رباعی بن جاتی تھی۔ وہ تناسخ کا بھی قائل تھا اور وہ تمام وجودات کے ساتھ خدا کو بھی وہم قرار دیتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ سید صاحب نے ان تمام باتوں کی تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ ساری باتیں خیام پر سراسر الزام اور بہتان ہے۔جعلی خیام میں تو یہ باتیں نظر آئیں گی، اصلی خیام میں نہیں پائی جائیں گی اور اپنی اس کتاب کا خاتمہ خیام کی ان ستائیس رباعیوں کو نقل کر کے کیا، جس سے بقول ان کے قطرۂ حیات ٹپکتا ہے۔

اس کتاب میں نسخہ جدیدہ رباعیات خیام کا متن بھی دے دیا گیا ہے۔ یہ ۹۱۱ھ کے اس مخطوطہ کی نقل ہے، جو مشہور کاتب سلطان علی المتوفی ۹۱۹ھ کا لکھا ہوا ہے۔ اسی کو سید صاحب نے خیام کی رباعیات کا مستندترین نسخہ قرار دیا ہے، جس میں ان کے خیال میں الحاقی رباعیاں نہیں ہیں۔ آخر میں یہ کہنا ہے کہ اس کتاب کو شروع سے آخر تک پوری محنت سے پڑھنا، ہر شخص کے بس کی بات نہیں، لیکن جو بھی ارباب ذوق پوری محنت سے پڑھنے کی تکلیف گوارہ کریں گے، وہ اس میں سید صاحب کی ذہنی کارفرمائیوں، علمی کاوشوں اور قلمی کرشمہ سازیوں کے مختلف حصوں سے محظوظ ہوں گے۔ انتہائی عرق ریزی سے علمی تلاش، تجسس اور تحقیق کس طرح کی جائے، اس کے اس میں اعلیٰ نمونے ملیں گے۔غلط قسم کی تحقیقات کی تردید کیسے کی جاتی ہے، اس کی مثالیں بھی اس میں پڑھی جاسکتی ہیں۔ اگر کسی کو نجوم، ہیئت، فلسفہ اور حکمائے اسلام کے حکیمانہ خیالات سے دلچسپی ہے تو یہ بھی اس کے مطالعہ سے پوری ہوسکتی ہے۔ اگر کوئی رباعی کی وجہ تسمیہ اور اس کے ارتقا کی تاریخ اور مقبولیت کی وجہ جاننا چاہتا ہے تو اس کے لیے بھی اس میں بہت سی خاطر خواہ چیزیں دستیاب ہو جائیں گی۔ اس کے ساتھ اس میں جعلی، رند، لاابالی، بادہ پرست، تناسخ کے قائل، خدا کے

منکر، خیام کے بجائے نجوم، ریاضیات، طب اور رصد خانے کی تعمیر کے ماہر خیام کے علاوہ مسلمان، نماز کا پابند، حج کا فریضہ ادا کرنے والا، آخری زندگی میں اللہ تعالیٰ کی بخشایش کا خواستگار اور صوفی حکیم خیام کی نئی دریافت ملے گی۔ اصلی خیام کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں ملے گی۔ پھر تحقیق و تدقیق اور باوقار انداز بیان کے جس معیار کے ساتھ یہ کتاب جانچی جائے گی، یہ دنیا کی اعلیٰ پایہ کی کتابوں میں شمار کیے جانے کے لائق سمجھی جائے گی۔ ہاں اگر نرگسیت کا نام تنقید نگاری ہے اور عیب جوئی کا نام علمی کارگذاری ہے تو اس کتاب پر بہت کچھ لکھ کر نرگسیت، تنقید نگاری اور علمی کارگذاری کا ثبوت دیا جا سکتا ہے۔

اگر میری تحریر میں تکرار پیدا ہو جائے تو اس کی معذرت کرتے ہوئے آخر میں یہ کہنا ہے کہ یہ کتاب تنقید نگارانہ تحقیق اور محققانہ تنقید نگاری کی شاہکار بھی ہے۔ اس کی تنقید نگاری کبھی تحقیق ہو جاتی ہے اور اس کی تحقیقی کاوش کبھی تنقید نگاری کے آرٹ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس میں خیام کے ماخذ و مصادر، خیام پر یوروپین مصنفوں کی تحریروں، اس کے مولد، اس کی زندگی کے مختلف سنین، اس کے اصلی نام، اس کے تخلص، اس کی تاہل کی زندگی، اس کے استادوں کی نشاندہی، اس زمانہ کی علمی درسگاہوں، فلسفہ، نجوم، ہیئت، طبابت میں اس کا رتبہ، اس کے مربیوں کی تفصیلات، اس کی تصانیف کی اہمیت اور اس کی رباعیات کی اصلیت، اس کے مذہبی عقائد، محبت کے سلسلے میں حکمائے اسلام کے مختلف فرقوں، رباعی گویوں کی قسموں، آخر میں خیام کی رباعیوں میں اس کی شراب کی نوعیت اور آخر میں حکیم خیام، صوفی خیام، علمی خیام اور اصلی خیام پر جو ناقدانہ مباحث ہیں، وہ ان نقادوں کے لیے پیام عبرت و بصیرت ہے، جو شعر و ادب، افسانہ نویسی اور ناول نگاری پر ہلکی پھلکی تنقیدیں لکھ کر اپنے کو تنقید نگاری کا امام تسلیم کرانے کی فکر میں رہتے ہیں۔

پھر اسی تنقید نگارانہ تحقیق کے ذریعے سے خیام کی جو سوانح عمری مرتب ہوگئی ہے، اس سے سوانح نگاری کے فن میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوگیا ہے۔ خیام کی زندگی کے تمام پہلو سامنے آگئے ہیں۔

اس کی ولادت، وفات، تعلیم، اساتذہ، تلامذہ، شاہی درباروں سے وابستگی، اس کی قدرومنزلت، علمی سرگرمیاں، عادات واطوار، سیرت وکردار، علمی فضائل اور شاعرانہ کمالات جب سامنے آجاتے ہیں، تو یوروپین مصنفوں نے خیام کو جس رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی تھی، اس پر خاک پڑ جاتی ہے۔ سید صاحب نے اس کو جس طرح پیش کیا ہے، اس پر مسلمان اس کی ذات اور کارناموں پر بجا طور سے فخر کر سکتے ہیں اور انھوں نے اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے بڑے سے بڑا محقق شاید اختلاف نہ کر سکے گا۔

جہاں تک اس کتاب کی زبان کا تعلق ہے، اس میں زبان کا جاذب نظر اور دیدہ زیب موزیک تو دکھائی نہ دے گا، لیکن اس میں زبان کی سنجیدگی، متانت، وزن اور وقار کا سنگ مرمر کا ایک ایسا فرش بچھا ہوا دکھائی دے گا، جس پر خوب صورت الفاظ کی مسبت کاری، حسین جملوں کی پچے کاری اور عبارت آرائی کی پرچیں کاریں تو نظر نہیں آئیں گی، لیکن تنقید نگاری اور تحقیق کے لیے جو سنجیدہ، متین، باوزن اور باوقار زبان ہونی چاہیے، وہی اس کتاب کی زبان ہے۔ اس میں خشکی پیدا نہیں ہونے پائی ہے، بلکہ اس کی سنجیدگی اور متانت ناظرین کو اپنی طرف مائل کرتی ہے۔ یہاں پر ان کے دو چار اقتباسات اس حصے سے پیش کرتے ہیں، جس میں انھوں نے خیام کی شراب سے بحث کی ہے:

> ''خیام کی دوسری قسم کی شراب اخلاص کی بوتل میں بند ہے۔ چوں کہ زہاد وعباد کے نزدیک بادۂ مے، رندی و اوباشی کی علامت سمجھی جاتی تھی اور یہ زہاد وعباد تمام تر تلبیس ومکروزور اور فریب خلق میں مبتلا رہتے تھے۔ اس لیے صوفی شعرا میں یہ رسم سی ہوگئی تھی کہ رندی کے ان ظاہری لوازم جام وساغر و بادہ کو اخلاص اور باطنی نیکوکاری کے معنوں میں اور تسبیح وسجادہ و دستار کو جو زہاد وعباد کی ظاہر فریب علامات ہیں، تلبیس ونفاق کے معنوں میں بولیں۔ خیام کی بھی بہت سی رباعیوں میں یہی

شراب بھری ہے۔'' (۵۴)

''خیام کے پیالہ میں ایک تیسری شراب بھی نظر آتی ہے، جس کا نام بادۂ حقیقت ہے۔ وہ شراب کو غیر مرئی و غیر محسوس حقیقت، روح حق، جذبۂ روحانی اور معرفت قلب کے معنوں میں بھی استعمال کرتا ہے۔ وہ لوگ جو خیام کی ہر شراب کو یہی دنیا کی مکدر شراب سمجھتے ہیں، وہ ذرا اس مئے صافی پر ایک نظر ڈالیں کہ کیا یہ شراب ظاہری طور سے پی بھی جا سکتی ہے۔ مجاز خود اس کی حقیقت کا پردہ کھول رہا ہے۔'' (۵۵)

''لوگوں کو اس کی رباعیوں میں رندی و میخواری کا ایک اور پہلو نظر آتا ہے، جس میں وہ شراب و نور بادہ و صراحی و پیالہ اور گل کوزہ اور ان کے ٹوٹنے پھوٹنے کا ذکر کرتا ہے، لیکن حقیقت میں ان سے پینے کا نہیں، بلکہ دیکھنے کا کام لیتا ہے، یعنی ان کے ذریعہ سے زوال و فنا اور تغیر کی تشبیہوں اور استعاروں کو ادا کرتا ہے۔ ان رباعیوں کو مستی و سرشاری سے کوئی تعلق نہیں۔ ایسا ہی ہے، جیسے ہم آج، صیاد و باغباں و بہار و خزان وغیرہ سے کام لیتے ہیں۔'' (۵۶)

(ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، جلد۔ ۱۳۷، شمارہ۔ ۴، اپریل ۱۹۸۶ء، ص۔ ۲۶۳۔ ۲۸۸)

حواشی

۱۔ عام خیال یہ ہے کہ فٹز جیرالڈ نے خیام کی ایک ایک رباعی کا فرداً فرداً ترجمہ کیا ہے اور ایسا سوچنا فطری بھی ہے، کیونکہ مترجم عام طور سے اصل متن پیش نظر رکھ کر اول تا آخر ترجمہ کرتا ہے، لیکن حقیقت اس سے تھوڑی مختلف ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے مستشرق اور خیام شناس ایڈورڈ ہیرون آلن (Edward Herun-allon) نے تحقیق کی۔ اس کی اس تحقیق پر مبنی کتاب ۱۸۹۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کے مطابق فٹز جیرالڈ کے اس ترجمہ میں ۴۹ رباعیاں نسخہ باڈلین یا نسخہ کلکتہ میں شامل رباعیات کے آزاد ترجمے ہیں اور ۴۴ رباعیاں دو یا دو سے زائد رباعیوں پر مشتمل ہیں، جب کہ باقی ۱۱ر رباعیاں اشعارِ منطق الطیر عطار، اشعار حافظ یا خیام کی رباعیوں کے مجموعی تاثر پر مبنی ہیں۔ ایرانی محقق مسعود فرزاد نے بھی اس رائے کی تائید کی ہے۔ (مرتب)

۲۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے: مولانا شبلی اور عمر خیام، آر، الف بھاجی والا، ص: ۵۶۔۵۴

۳۔ شبلی، مولانا، شعر العجم، جلد اول، اعظم گڑھ، ص۔ ۲۰۳

۴۔ ایضاً، ص۔ ۲۰۴

۵۔ ایضاً،ص۔۲۰۴

۶۔ ایضاً،ص۔۲۰۴

۷۔ ایضاً،ص۔۲۰۸

۸۔ ایضاً،ص۔۲۱۶

۹۔ ایضاً،ص۔۲۲۲

۱۰۔ ایضاً،ص۔۲۲۲

۱۱۔ ایضاً،ص۔۲۲۶

۱۲۔ ایضاً،ص۔۲۲۸

۱۳۔ ایضاً،ص۔۲۰۶

۱۴۔ شیرانی،محمود،تنقیدات شعرالعجم،ص۔۱۱۸

۱۵۔ ایضاً،ص۔۱۸۴

۱۶۔ ایضاً،ص۔۱۸۶

۱۷۔ ایضاً،ص۔۱۸۶۔۱۸۷

۱۸۔ ندوی،مولانا سید سلمان،اعظم گڑھ،ص۔۳

۱۹۔ ایضاً،ص۔۵

۲۰۔ ایضاً،ص۔۱۴

۲۱۔ ایضاً،ص۔۱۷

۲۲۔ ایضاً،ص۔۷۹

۲۳۔ ایضاً،ص۔۸۰

۲۴۔ ایضاً،ص۔۸۰

۲۵۔ ایضاً،ص۔۸۲

۲۶۔ ایضاً،ص۔۸۱

۲۷۔ ایضاً،ص۔۸۹

۲۸۔ ایضاً،ص۔۹۰

۲۹۔ ایضاً،ص۔۹۱

۳۰۔ ایضاً،ص۔۹۲

۳۱۔ ایضاً،ص۔۹۴

۳۲۔ ایضاً،ص۔۹۳

۳۳۔ ایضاً،ص۔۹۴

۳۴۔ ایضاً،ص۔۹۵

۳۵۔ ایضاً،ص۔۱۰۳

۳۶۔ ایضاً،ص۔۱۰۵

۳۷۔ ایضاً،ص۔۱۰۰

۳۸۔ ایضاً،ص۔۱۴۰

۳۹۔ ایضاً،ص۔۱۴۱۔۱۴۲

۴۰۔ ایضاً،ص۔۱۵۴۔۱۵۵

۴۱۔ ایضاً،ص۔۱۹۴

۴۲۔ ایضاً،ص۔۱۹۹

۴۳۔ ایضاً،ص۔۲۰۰

۴۴۔ ایضاً،ص۔۲۰۶

۴۵۔ ایضاً،ص۔۲۷۱

۴۶۔ ایضاً،ص۔۲۶۴۔۲۸۲

۴۷۔ ایضاً،ص۔۲۹۶۔۲۹۷

۴۸۔ ایضاً،ص۔۳۲۲

۴۹۔ ایضاً،ص۔۳۲۴

۵۰۔ ایضاً،ص۔۳۲۵۔۳۲۸

۵۱۔ ایضاً،ص۔۳۴۳

۵۲۔ایضاً،ص۔۳۵۴

۵۳۔ایضاً،ص۔۳۵۹

۵۴۔ایضاً،ص۔۳۴۳

۵۵۔ایضاً،ص۔۳۴۵

۵۶۔ایضاً،ص۔۳۵۴

رباعیات خیّام کا ایک اور قدیم نسخہ

پروفیسر محمد اقبال

خیّام کی رباعیات کے متعلق علمی دنیا میں تحقیق وتفتیش کا کام بہت کثرت کے ساتھ ہوا ہے اوراس لیے اس کی شاعری کے ساتھ دلچسپی رکھنے والوں کی تعداد بہت کثیر ہوگئی ہے، لیکن با ایں ہمہ اس کی شخصیت، اس کے حالاتِ زندگی، اس کا اصلی اور صحیح کلام غرض ہر چیز اب تک بالکل تاریکی میں ہے۔ رباعیات کا ایک مجموعہ ہے، جو اس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، لیکن یہ بات اب تک طے نہیں ہوسکی کہ اس مجموعے میں کتنی اور کون کون سی رباعیاں اس کی اپنی ہیں۔ خیّام کی اصلی رباعیوں کو متعیّن کرنے کے لیے بعض محققین یورپ نے خاص خاص معیار قائم کیے ہیں، مثلاً ایک رائے یہ ہے کہ جن رباعیوں کے اندر خیام کا نام آیا ہے (اوران کی تعداد ۱۲ سے زائد نہیں)، وہ ضرور اصلی ہیں۔ یہ خیال فی الجملہ صحیح معلوم ہوتا ہے، اگرچہ اس صورت میں معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ ان میں سے بعض ایسی بھی ہوسکتی ہیں، جو اوروں نے خیام کو مخاطب کر کے کہی ہوں یا ممکن ہے کہ اصل میں خیّام کے بجائے وہاں کسی اور شاعر کا تخلّص ہو، جو خیّام ہی کے وزن پر ہو اوراس کو بدل دیا گیا ہو۔ ایک اور محقق کا قیاس ہے کہ جن رباعیوں میں زندگی کی ناپایداری، علم انسانی کا قصور، چیستانِ

کائنات اور نظامِ عالم پر نفرین کے مضامین باندھے گئے ہیں، ان کو اصلی قرار دینا چاہئے۔ اس لیے کہ خیّام کی وہ دو رباعیاں جو صاحبِ مرصاد العباد نے اپنے ہاں نقل کی ہیں اور جو یقیناً اصلی کہلا سکتی ہیں، انہی مضامین پر مبنی ہیں۔ بر خلاف اس کے جن رباعیوں کے اندر شراب نوشی کی تحسین و ترغیب ہے، ان کو قابلِ رد سمجھنا چاہئے، اس لیے کہ خیّام کی ابتدائی تعلیم و تربیت مذہبی فضا میں ہوئی ہے اور وہ بھی نیشا پور جیسے شہر میں، جو اس کے زمانے میں علم فقہ و شرع اسلام کا مرکز تھا۔ چنانچہ روایت بھی یہی کہتی ہے کہ وہ امام موفق جیسے فاضل یکتا کا شاگرد تھا اور خود بھی آگے چل کر اپنے زمانے کا مشہور فقیہ اور علوم شرعی کا ماہر ہوا۔ ان باتوں کو دیکھتے ہوئے یہ امر قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ اس نے ایسی مطلق العنانی کے ساتھ شراب خوری کی تعلیم دی ہو جیسا کہ ہم ان رباعیات میں دیکھتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ خیام کی شراب بھی وہی شراب روحانی ہے، جو اہلِ باطن کی مخموری کا باعث ہوا کرتی ہے تو یہ بھی قابلِ قبول نہیں، اس لیے کہ خیّام کے عہد میں شراب کو ہنوز روحانیت کے ساتھ لگاؤ پیدا نہیں ہوا تھا اور وہ ابھی تک لفظی معنوں ہی میں استعمال ہوتی تھی۔

لیکن یہ سب محض قیاسات ہیں، جن پر اعتراضات کی کافی گنجائش ہے۔ خیالات کو یا اندازِ بیان کو معیار قرار دینا ہماری رہنمائی نہیں کر سکتا۔ ایک شاعر کے کلام کا مکمل مجموعہ اگر دیکھا جائے تو اس کے اندر طرزِ بیان اور خیالات کی مختلف نوعیتیں نظر آئینگی۔ نوجوانی کی ابتدائی مشق اور آخری عمر کے پختہ کلام میں زمین آسمان کا فرق ہوگا اور عقائد مذہبی میں بھی لازمی طور سے اختلافات دیکھنے میں آئینگے۔ علاوہ اس کے ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ دوسرے اساتذہ کی جو رباعیاں خیّام کی رباعیوں کے ساتھ مخلوط ہوگئی ہیں، ان سب کا انداز قریب قریب یکساں ہے اور مضامین متحد اور مشابہ ہیں اور ان میں تمیز کرنا دشوار ہے۔ ہمارے نزدیک فقط ایک ہی بات ہوسکتی ہے جو اس مشکل کو قطعی طور سے حل کر دے، وہ یہ کہ کہیں ہماری خوش نصیبی سے رباعیات خیّام کا کوئی ایسا نسخہ پردۂ غیب سے نکل آئے جو شاعر کے زمانے سے قریب العہد ہو اور مکمل بھی ہو، لیکن جب تک ایسا قابلِ اعتماد نسخہ دستیاب نہیں

ہوگا خیّام کی رباعیاں متعین نہیں ہوسکیں گی۔

اس وقت جتنے نسخے رباعیات خیام کے مختلف کتب خانوں میں ہیں، ان میں سب سے پرانا نسخہ آکسفورڈ میں ہے، جو ۸۶۵ھ (۱۴۶۱ء) کا لکھا ہوا ہے[۱]۔ اس کے بعد کے جتنے مشہور نسخے فرانس، انگلستان اور ہندوستان کی لائبریریوں میں ہیں، وہ سب سولھویں صدی عیسوی کے ہیں اور ان میں رباعیوں کی تعداد بہت متفاوت ہے، لیکن حال میں ایک نسخہ ہمارے لاہور کے ایک فاضل ادیب سیّد محمد سلیم (ایم۔اے) نے جو فی الحقیقت صاحبِ ذوقِ سلیم ہیں، کہیں سے حاصل کیا ہے اور وہ انھوں نے کمالِ عنایت سے نہ فقط ہمیں دکھلایا بلکہ نہایت فراخ حوصلگی سے کام لے کر اس کو نقل کرنے کی بھی اجازت دی، یہ نسخہ آکسفورڈ والے نسخے کے سواء باقی تمام نسخوں سے قدیم تر ہے اور چونکہ رباعیات خیّام کے ایسے پرانے نسخے عام طور سے دستیاب نہیں ہوتے، لہذا ہم نے مناسب سمجھا کہ شائقینِ خیّام کی اطلاع کے لیے اس کا مختصر سا حال لکھ دیا جائے۔

یہ نسخہ بغداد میں ۸۶۸ھ میں تحریر ہوا ہے اور بلحاظ خط کے (جو نہایت خوشنما باریک نستعلیق ہے) آکسفورڈ والے نسخے سے بالکل مشابہ ہے، لیکن رباعیوں کی تعداد اس سے کمتر ہے یعنی کل ۱۴۳ر رباعیاں ہیں، جن میں سے ۱۳۴ر دونوں میں مشترک ہیں اور ان کا متن بھی دونوں جگہ بالکل یکساں ہے۔ اگرچہ ترتیب میں کسی قدر تفاوت ہے۔ باقی ۹ر رباعیاں جو اس نسخے میں مختلف ہیں، ان میں سے سات ایسی ہیں جو دوسری مطبوعہ ایڈیشنوں میں موجود ہیں۔

ہم یہاں ناظرین کی اطلاع کے لیے ان میں سے ہر ایک کا پہلا مصرعہ لکھ کر پوری رباعی کا حوالہ مطبوعہ ایڈیشن روز بازار پریس، امرتسر کے صفحات میں دیتے ہیں:۔

(۱) عمریست کہ مدّاحِ مے ورد من است (صفحہ ۶۱)

(۲) در عقل ہیچ ہیچ و در ساغر ہیچ (ر ۶۹)

(۳) از جملۂ رفتگانِ این راہِ دراز (۱۱۱/٫٫)

(۴) اے دل مطلب زمرد مان مرہم ریش (۱۱۸/٫٫)

(۵) خیام زمانہ از کسی دارد ننگ (۱۲۳/٫٫)

(۶) بردار پیالہ وسبوائے دلجو (صفحہ ۱۵۳)

(۷) شمع است وشراب وماہتاب اے ساقی (۱۶۵/٫٫)

باقی دو رباعیاں ہمیں ان مطبوعہ نسخوں میں جو ہمارے پیش نظر ہیں، نہیں مل سکیں ہے۔ ممکن ہے کہ کسی اور مجموعے میں موجود ہوں، تاہم چونکہ عام ایڈیشنوں میں شامل نہیں ہیں۔ لہذا یہاں تمام وکمال درج کی جاتی ہیں:

اے بیژنِ غم درچہ زندان غمت — سہرابِ غمت بستہ باریانِ غمت
برکین سیاوُش جہان کردہ خراب — ثعدان (؟) دلم رستم دستانِ غمت
چون بادہ زغم چہ بایدت جوشیدن — با لشکرِ غم چہ بایدت کوشیدن
سبز ست لبت بادہ ازان دور مباد — مے بر لبِ سبزہ خوش بود نوشیدن

ان میں سے پہلی رباعی تو مہمل سی معلوم ہوتی ہے۔ دوسری کا مطلب صاف ہے، لیکن وہ بھی کسی قدر سوقیانہ ہے اور وہ ثقاہت جو خیام کی رباعی میں ہونی چاہئے، اس میں نہیں ہے۔ اس بنا پر ہمیں کچھ تعجب نہ ہوگا، اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ دونوں رباعیاں الحاقی ہیں۔

نسخۂ زیر بحث میں اور کوئی خصوصیت ایسی نہیں جو قابلِ ذکر ہو، پہلے ہمارا ارادہ تھا کہ مسٹر سلیم سے اجازت حاصل کر کے اس نسخے کی رباعیات کو میگزین میں شائع کر دیا جائے، لیکن جب مقابلہ کرنے سے ثابت ہوا کہ آکسفورڈ والے نسخے میں (جو شائع ہو چکا ہے) یہی رباعیاں اور یہی متن ہے، علاوہ اس کے دوسری مطبوعہ ایڈیشنوں میں بھی یہ سارا مواد موجود ہے تو ہم نے اس کو غیر ضروری سمجھا۔

بلحاظ تعداد رباعیات کے جب ہم ان دو قدیم نسخوں کا باہمی مقابلہ کرتے ہیں

تو ایک بات پر بالخصوص روشنی پڑتی ہے، وہ یہ کہ نویں صدی ہجری کے وسط میں خیام کی جو رباعیات متداول تھیں، ان کی تعداد کم وبیش ڈیڑھ سو تھی اور پھر بمرور زمان اس تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ چنانچہ دسویں صدی کے نسخوں میں رباعیات کی تعداد بالعموم اڑھائی سو سے ساڑھے تین سو تک ہے اور بارہویں صدی میں آٹھ سو تک پہنچ گئی ہے۔ اس لحاظ سے خیام کی رباعیات کے ساتھ بالکل وہی سلوک ہوا جو فردوسی کی ہجو سلطان محمود کے اشعار کے ساتھ ہوا، جس کی ابتدا چھٹی صدی ہجری میں چھ شعروں سے ہوئی اور بالآخر تعداد بڑھتے بڑھتے سو سے بھی متجاوز ہوگئی۔

ہم یہ تو نہیں کہیں گے کہ خیام کی اصل رباعیوں کی تعداد ڈیڑھ سو ہی کے لگ بھگ تھی۔ یقیناً اس نے اپنی زندگی میں اس سے بہت زیادہ رباعیاں کہی ہوں گی، لیکن چونکہ اس کے اپنے زمانے میں اس کے فلسفیانہ خیالات مقبول نہیں ہوئے اور پھر اسکی وفات کے بعد ایران میں جو سیاسی انقلابات اور تباہیاں آئیں، ان کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کا سارا کلام تلف ہوگیا۔ پھر نویں صدی میں کچھ رباعیاں یکجا کر کے اس کی طرف منسوب کی گئیں اور یہی وہ رباعیاں ہیں، جن کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب ہے۔ ان میں سے بیس کے قریب ایسی ہیں جو دوسرے شعرا کی طرف منسوب پائی گئی ہیں اور ابھی ہم نہیں کہہ سکتے کہ کتنی اور ہونگی جو اسی طرح اوروں کے کلام میں ملیں گی اور کتنی ایسی باقی رہ جائیں گی، جو بالآخر خیام کی کہلا سکیں گی۔

(اورینٹل کالج میگزین، لاہور، جلد۔۲، نمبر۔۳، حصہ اول، مئی ۱۹۲۶ء، صفحہ۔۱۴۔۲۰)

حوالہ جات وحواشی

۱۔ اس نسخے میں ۱۵۸ / رباعیاں ہیں، جن کو مسٹر ہیرن ایلن نے عکسی چھاپے میں طبع کرا کے شائع کیا تھا (لنڈن ۱۸۹۸ء)، اب اسی نسخے کی نقل مرغوب ایجنسی، لاہور نے شائع کی ہے۔ صاحب مضمون۔

۲۔ ان مطبوعہ نسخوں سے مراد وِن فیلڈ، نکولس، نولکشور، امرتسر اور شرح رباعیاتِ خیام (از میر ولی اللہ) کی ایڈیشنیں ہیں۔ صاحب مضمون۔

☆☆☆

بیاض کرمان میں خیام کی نایاب رباعیاں

پروفیسر سیّد امیر حسن عابدی

نیشنل میوزیم، نئی دہلی میں ایک بہت اہم فارسی کی قلمی بیاض ہے، جس کا نام ''مجموعۂ مخطوطات'' دیا ہوا ہے(۱) اور جو ۸۲۶ھ (۱۴۲۳ء) اور ۸۴۶ھ (۱۴۴۲ء) کے درمیان کرمان میں لکھی گئی تھی۔ اس سے بہت سی نئی معلومات میں اضافہ ہوسکتا ہے، نیز بہت سے ادبی مسائل حل اور شکوک رفع ہو سکتے ہیں۔ یہ نسخہ بیشتر مطلاّ و مذہّب ہے۔ متن کے علاوہ حاشیہ میں بہت سی اہم چیزیں دی ہوئی ہیں۔ اس مقالے میں صرف ایک تعارف کرایا جارہا ہے۔

اس کی جلد پر اس کے مندرجات کی ایک فہرست دی ہوئی ہے۔ اس کے بعد کے ورق پر بھی وہی فہرست ہے۔ پھر پانچ خالی ورق چھوٹنے کے بعد کے ورق پر قطبی نامی شاعر کے سات شعر دیے ہوئے ہیں، جن میں سے صرف دو یہاں دیے جارہے ہیں:

مرغ روح از بدن خستۂ من داد صفیر　　　که درین منزل ویران دگر آرام مگیر

دل ازین ورطۂ پرفتنہ بکن قطبی وار　　　زانکہ سرگشتہ درین مرحلہ اند اہل بصیر

پھر انھیں کی ایک رباعی ہے، جس کے بعد ایک قطعہ دیا ہوا ہے۔ اس کے بعد مولانا

سائی کا کوئی دعویٰ اور مولانا حیرتی کا جواب ہے۔ پھر اسی ورق کے دوسرے صفحہ پر ایک عبارت ہے۔

اصلاً نسخہ کے پہلے مطلاً و مذہب ورق کے بعد مولف نے اس نسخہ کے مشمولات کی فہرست یوں دی ہے:

> ''ظفر نامہ در نصائح، قصہ یوسف علیہ السلام وزلیخا منظوم در متن و منثور بر حاشیہ، مختار نامہ فرید الدین عطار، فریدا لاول منظوم در ہیئت، رسالہ شمع، رسالہ قلندریہ، دو کتاب انشاء، رباعیات عمر خیام۔''

اس کے حاشیہ پر سلطان جمال الدین ابواسحق انجو اور بادشاہ محمد مظفر کے متعلق کچھ لکھا ہوا ہے۔ اسی صفحہ پر شیخ سنجابی کی ایک رباعی بھی دی ہوئی ہے، جس کا پہلا مصرع یہ ہے:

یارب سبب حیوۃ حیوان بفرست

پھر ایک مہر ہے، جو پڑھی نہیں جاتی اور یہ تحریر ہے: ''عرض ۲۷ / ربیع الثانی سنہ ۱۰۰۳ھ۔''

اس بیاض میں سب سے پہلے ''ظفر نامہ در نصائح'' ہے، جسے نصیحت نامہ بوذرجمہر وغیرہ بھی لکھا گیا ہے۔

اس کے بعد وہی مثنوی ہے، جو غلطی سے فردوسی (۲) کی طرف منسوب کردی، نیز مختلف عنوانات سے شائع اور یاد کی گئی ہے۔ اس بیاض میں اس کا نام ''قصہ یوسف علیہ السلام''، مگر اس کے مصنف کا نام نہیں دیا ہوا ہے۔ نیز یہ اس طرح شروع ہوتی ہے:

بنام خداوند ہر دوسرای   کہ جاوید باشد ہمیشہ بجای

نولکشوری نسخے میں اس مثنوی کا نام ''زلیخای فردوسی'' (۳) دیا ہوا ہے۔

اس مثنوی کے متعلق عرصے سے بحث چلی آرہی تھی اور اب محققین نے ثابت کردیا ہے کہ یہ فردوسی کی نہیں ہے، مگر کسی نے اس کے اصل متن تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی۔ اس

بیاض کے شروع میں اس بیت:

ازو گفت باید سخن در بدر   وزو جست باید ہنر سر بسر

کے بعد یہ ابیات ہیں، جو خلفائے راشدین کی مدح میں ہیں اور جو نولکشوری نسخے اور دوسرے نسخوں میں نہیں ہیں:

صحابانِ او جملہ آخر بدند   ہمی ہر یکی ہمچو اختر بدند
و لیکن ازیشان چہار آمدند   کہ در دین حق پایدار آمدند
ابوبکر صدیق شیخ عتیق   کہ بُد روز و شب مصطفیٰ را رفیق
پس او عمر بُد کہ قیصرے روم   ز سہمش نیارست خفتن بروم
سیم میر عثمان دیندار بود   کہ شرم و حیا زو بدیوار بود
چہارم علی ابن عم رسول   سر شیر مردان و جفت بتول (۴)

اگر یہ اشعار محققین کی نظر سے گذرتے، تو شروع ہی سے بآسانی کہہ سکتے تھے کہ مثنوی حتماً فردوسی کی نہیں ہے۔ نیز اس سے متعلق اتنی لمبی چوڑی بحثوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بہر حال، ضرورت ہے کہ اس مثنوی کو پھر سے اس بیاض کی بنیاد پر ایڈٹ کیا جائے۔

اس منظوم قصے کے بعد حاشیہ میں نثر میں بھی وہی قصہ دیا ہوا ہے۔ اس قصہٗ کو ۸۲۶ھ (۱۴۲۳ء) میں کرمان میں ختم کر کے کاتب لکھتا ہے:

''قد فرغ سن تحریر ہذہ الرسالہ فی تاریخ یوم الاثنین ثامن شہر رمضان المبارک سنہ ست وعشرین وثمانمایۃ بمقام کرمان۔''

نظم کی طرح نثر کے لکھنے والے کا نام بھی اس نسخہ میں نہیں دیا گیا ہے۔

اس کے بعد حاشیہ میں فریدالداین عطار (۵) کا ''مختار نامہ'' ہے، جس کی کتابت بھی ۸۲۶ھ (۱۴۲۳ء) میں کرمان میں ہوئی تھی۔ اس میں بھی اختلاف رہا ہے کہ ''مختار نامہ'' عطار کا ہے یا نہیں۔ البتہ پروفیسر سعید نفیسی نے انکار کیا ہے (۶)، مگر اس قدیم بیاض میں،

جس وضاحت اور اہتمام سے ان کی طرف منسوب کیا گیا ہے، اس سے شک کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔

اس کے بعد فرید احوال کا، جن کو کاتبوں نے غلطی سے 'اول' لکھ دیا ہے، ایک ۱۴۱ر شعر کا قصیدہ ہے، جو علم ہیئت سے متعلق ہے۔

اس کے بعد خواجو کرمانی (۷) کا ایک قصیدہ اور انوری (۸) کا ایک قطعہ انتخاب کیا گیا ہے، جو نرد سے متعلق ہے، مگر ان کے مطبوعہ دیوانوں میں نہیں ہے۔ اس کے بعد امیر محمد یمین (۹) کے سات اور پانچ شعروں کے دو قطعے دیے ہوئے ہیں۔ پھر ابن سیف کے آٹھ شعروں کا ایک قطعہ ہے۔ اس کے بعد جلال الدین الخوانی (۱۰) کا ''رسالۂ شمع'' ہے اور اس کے بعد میر.... باللہ ابو اسحٰق کا ''رسالۂ قلندریہ'' ہے، جس کی کتابت ۸۴۶ھ (۴۳-۱۴۴۲ء) میں قوام بن محمد مازندرانی نے کی تھی۔

اسی مجموعے میں عمر خیام (۱۱) کی رباعیاں بڑے اہتمام سے متن اور حاشیہ دونوں میں دی گئی ہیں۔ ان میں سے ذیل میں صرف وہ رباعیاں دی جا رہی ہیں، جو آج تک شائع نہیں ہوئی ہیں اور جو حتماً خیام ہی کی ہیں:

رباعیات سلطان الحکما عمر الخیام

زان پیش کہ پیکر جہانی بفراشت — درلوح ہر آنچہ خواست بودن بنگاشت
بیہودہ حہ ---دل اندر پنداست — --میدار--دما---چنانک---

خواہم کہ باعتقاد دو بارای درست — خود را بدر افکنیم ازین واقعہ چست
کز مذہب این قوم ملالم بگرفت — ہر یک زدہ دست عجز در شاخی سست

صیدم بشد و درید دام این بترست
نی درد شد و شکست جام این بترست
دل سوختہ گشت و کار خام این بترست
دین ناقص و دنیا نہ تمام این بترست

هر روز دلم خستهٔ تیغ دگرست
ماه طربم بزیر میغ دگرست
در حسرت یا ربی وفا هر نفسی
بر عمر گذشته ای دریغ دگرست

تقدیر ازل سابقهٔ حکم الست
دست و سر و پای جمله تدبیر بست
هر شیشه که وقت شام تدبیر بساخت
در وقت سحر بسنگ تقدیر شکست

گرچه غم و رنج من درازی دارد
عیش و طرب تو سرفرازی دارد
بر هر دو مکن تکیه که دوران فلک
در پرده هزار گونه بازی دارد

آرند یکی و دیگری بربایند
بر هیچ کسی راز همی نگشایند
ما را بقضا جز این قدر ننمایند
پیمانهٔ عمر ماست می پیمایند

چون بگذری از مردنشان خواهد ماند
رو نیکی کن کز تو همان خواهد ماند

تو بادہ خور و غم جہان ہیچ مخور
تا غم خورد آنک درجہان خواہد ماند

با خاک جماعتی کہ یکسان گردند
کی بستۂ بند کفر و ایمان گردند
آنہا کہ درین جہان طرب کم کردند
حقا کہ درآن جہاں پشیمان گردند

گہہ گہہ دل من درین قفص تنگ آید
از ہمرہی آب و گلشن ننگ آید
گفتم کہ مگر بشکنم این زندان را
پایم ز رکاب شرع بر سنگ آید

با دل گفتم بہشت چون و چندند
گفتا عقلا چنین سخن نہ پسندند
گفتم کہ جہانیان بر آنند کہ ہست
گفتا ہمہ بر بروت خود می خندند

بس ز شیران کہ تودۂ خاک بخورد
چہ شاہ چہ کی چہ شیر مردان نبرد
باقی بخورد کہ نایدش بر دل درد
با پختہ و با خام ہمی باید کرد

نفسم برہ تو مرکب عصیان راند
یک خط ز کتاب در عمر نخواند
پیری چو بیاید و جوانی چو گزشت
من ماندم و فضل تو دِگر ہیچ نماند

عاقل کہ در چشم عاقبت بین دارد
می خوردن و مست خفتن آئین دارد
تا جان دارم بدست بر خواہم داشت
تلخی کہ مزاج جان شیرین دارد

بیہودہ اگر سخن نگوئی چہ شود
بی عیب نہ ای عیب بجوئی چہ شود
در جامۂ خود پاک نیامدی (و) ہنوز
گر جامۂ دیگری نشوئی چہ شود

فرمای بتاکہ می باندازہ دہند
ہر لحظہ شراب ما تر و تازہ دہند
از دوزخ و از بہشت و از حور و قصور
فارغ بنشین کز آن خود آوازہ دہند

بر خاک منہ قدم بر آری زنہار
....سرسر کشان گیتی ہشدار

از ہر موضوع کہ بردند... روزی خار
آن مردمکِ چشم نگاری پندار

گویند یکی بتی تراشید از زر
این بدنامی بماند ازو تا محشر
آنکس کہ بتان روان کند در چادر
این فتنہ از آنجاست ازینجا بگذر

یک نکتہ منظم کردہ ام از اسرار
تا (حل) شود (این) مشکل من از اصرار
فعلِ ہمہ بندگان چو تقدیر خداست
تقدیرْ بدوزخ بردش باکردار

مائیم درین زمانۂ شور انگیز
مانندۂ نان خشک بر آتش تیز
ای قادر ذوالجلال اگر وقت آمد
یا روی بہی نمای یا راہ گریز

چندان برمن مراست تاوان کہ مپرس
وز خود گلہ ہا دارم چندان کہ مپرس
عمری کہ مراد من بجانی ارزید
بگذشت و گذاشتم بدانسان کہ مپرس

دنیا گذرانست نیابی بازش
نه غایت و فرجام نه نیز آغازش
چون روز تو نو گشت تو نو کن...ارش
کان روز که بگذشت نیابی بازش

در کوی خرابات نه صلحست نه جنگ
وین رهرو عشق را نه نامست نه ننگ
آنرا که کمال معرفت راه نمود
در بحر دو عالم اندر اندازد سنگ

گناه خرد بنزدیک خود عفو برند
بخرد کرده گنه نزد عفو تو نایم
از آن به پیش تو آور دوام گناه بزرگ
که تا بزرگی عفوت نخلق بنمایم

کو آن شب غفلت که غنودیم بهم
آن راز که گفتیم و شنودیم تہم
آیا بود اکه بینم ای جان و جهان
یک بار دگر چنانکه بودیم بهم

از بنده به مصطفیٰ بگوئید سلام
آن گاه بتعظیم بگوئید تمام

کای خواجه بگوئی که چرا شیر شتر
در شرع حلال باشد و باده حرام

ای بندهٔ امر نافذت آہن و موم
مامور ترا طبایع چرخ و نجوم
این نکته نمی شود کسی را معلوم
ظلم از تو روانی و جهانی مظلوم

تا عمر بود نظر بسوی تو کنم
شبگیر در آرزوی روی تو کنم
در خاک تهند روی ما قبله کنند
بر گردم و باز رو بسوی تو کنم

هر عاصی را بقدرتی دیگر (چون)
آراسته کرده ای تو از کن فیکون
شکر تو چگونه داند ای بار خدای
مشتی دو سه استخوان و سیری دو سه خون

خورشید بلند را به پست آوردن
بر لشکر تقدیر شکست آوردن
تیر شده را باز به شست آوردن
بتوان نتوان بدست آوردن

فرّاش چمن باد شمالست اکنون
بی باده و گل عمر و بالست اکنون
می خور که باجماع همه اہلِ خرد
خون رز و پای گل حلالست اکنون

ایام ببرد روزگار من و تو
از شربت مرگست خمار من و تو
در زیر زمین خویش و تبار من و تو
هستند بسی در انتظار من و تو

باز....قدرت خدائیم همه
اوراست توانگری گدائیم همه
با یکدگران زیادتی باری چیست
چون ما ز در یکی سرائیم همه

این عالم....بی....وفای تاینده
هر لحظه در و حادثه ای زاینده
مانند رباطیست تو گوئی بدو در
یک قوم رونده دیگری آینده

ای گنبد گردان ز تو زاریم همه
گہه از تو عزیز و گاه خواریم همه

درویش و توانگر (آ)نچه داریم همه
در وقت سپردن(۱۲) بسیاریم همه

(آن) بادهٔ گلگون درآن کاشانه
آمیزش.... صفت کن ای فرزانه
بر خاک تو هر لحظه که برباد دهند
سرمست رود تا بدَرِ میخانه

با بند و طلسم روزگار افسون چه
جز صبر علاج گردش گردون چه
با این همه تدبیر می گلگون چه
فردا نه بدید دی برفت اکنون چه

بسیار مخور غم اگرچه اندک داری
بسیار بود اندک و بر خود داری
چون اندک و بسیار همی بگذاری
زاندک چه ....ن از بسیاری

ای دوست حقیقت شنو ار می شنوی
با بادهٔ لعل باش و با سیم تنی
کانکس که جهاں گرد فراغت دارد
از سبلت چون توئی و ریش چو منی

غم جملہ نصیب چراغ خم بایستی
یا با غم ما صبر بهم بایستی
یا مایۂ غم چو عمر کم بایستی
یا عمر باندازۂ غم بایستی

دستم گیری (ای) خواجہ و در باغ بری
گوئی بکشم ترا اگر میوه خوری
پیشم بنشانی اردو صد حور و پری
گوئی بکشم دو دیده ات ار نگری

گر کار جهان جملہ نہ....ستی
امروز بجای روزه خود عیدستی
ہر کس بمراد خویش دستی بزدی
گر زانک نہ این بیهده تقلیدستی

اشیاء نجومی فگندنی مانندی
ای کاش کہ بنیاد جهان بفگندی
گفتم کہ برای کیست این طرفہ بنا
گفتا کہ برای ہر کسی یک چندی

بگذار جهان را کہ جهان چون تو بسی
بگذاشت وفا نکرد با ہیچ کسی

بیہدہ چرا تو دل نہی بر ہوسی
کین ہست ہمہ نیست شود در نفسی

بہمن خبہ است و روز برف ای ساقی
وقتی عجب و حال شگرف ای ساقی
گر صافی ....قدحی ہست بدہ
کین عمر بہرزہ رفت صرف ای ساقی

تنگی می لعل خواہم و ویرانی
سدّ رمق (ای) باید و نیمہ نانی
وانگہہ من و تو نشستہ در ایوانی
خوشتر بود از مملکت سلطانی

ان رباعیوں کے بعد ایک بہتر شعر کا قصیدہ ہے، جو کسی بادشاہ کی مدح میں ہے اور جو اس طرح شروع ہوتا ہے:

برد اندیشہ مرا باز کجا لا اعلم
تا چہ معنی بوجود آورد از کتم عدم

اس مجموعہ میں پچیس شعر کا علی بن حسن بن ابی طیب الباخرزی کا ایک قصیدہ بھی ہے، جو اس طرح شروع ہوتا ہے:

بہر آنکہ چون من نیایم نخوانی
چنان باشد ایدون کہ آیم برانی

اس کو نقل کرنے کے بعد صاحب بیاض لکھتا ہے کہ اس کے جواب میں سات قصیدے کہے گئے تھے، جن میں ایک عمادی (۱۳) نے علی بن الحسن کی تعریف میں لکھا

تھا، نیز کرمان کے لوگ اس پر فریفتہ تھے۔ جب مجد الدین ہمگر (۱۴) کرمان پہنچا تو اس نے اس پر چوالیس شعر کا ایک قطعہ کہا۔

یہ بیاض دست بدست مختلف حضرات کے پاس رہی ہے، نیز اس کے آخر میں ۹۲۰ھ ۱۵۵۳ء میں علاء الدین نے اپنے ہاتھ سے ایک رباعی لکھ دی، جس کا پہلا مصرع یوں ہے:

ای کام دل از حبّت اعلیٰ ہمہ تو

کاتب کے نام، سال کتابت کے ساتھ کی مہر بھی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''حرّرہ الفقیر ..... علاء الدین الحُسنی الحُسینی ۹۶۰ھ''

آخر میں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ یہ بیاض ان مستند اور قدیم منابع میں سے ہے، جس سے بہت سی گتھیاں کھلتی اور بہت سے مسائل حل ہوتے ہیں۔ نیز ہماری تحقیقی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔

(یادگار نامہ فخر الدین علی احمد، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۹۴ء، ص۔ ۳۱۸۔۳۴۳)

حوالہ جات وحواشی

☆ یہ مقالہ قدرے مفصل ہے، لیکن اس کتاب کے موضوع کے پیش نظر غیر ضروری حصہ کو مختصر کر دیا گیا ہے اور عنوان میں بھی قدرے تبدیلی کی گئی ہے۔ اصل عنوان ''بیاض کرمان'' تھا۔ مرتب

۱۔ نمبر۔ ۲۷، ۶۱

۲۔ وفات: ۴۱۱ یا ۴۱۶ھ (۱۰۲۰/ یا ۱۰۲۵ء)

۳۔ در مطبع نامی منشی نولکشور، کانپور، بار سوم، ماہ اگست ۱۸۹۸ء

۴۔ ابھی حال میں ٹونک کے مولانا ابوالکلام آزاد عربی اور فارسی انسٹی ٹیوٹ میں اسی مثنوی کا ایک عمدہ مطلا و مذہب قلمی نسخہ نظر سے گزرا، مگر اس میں بھی وہی نولکشوری نسخے کا انداز ہے، نیز اس کو فردوسی کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ صاحب مضمون

۵۔ وفات: ۶۲۷ھ/ ۱۲۳۰ء

۶۔ سعید نفیسی، جستجو در احوال و آثار فریدالدین عطار نیشاپوری، کتاب فروشی اقبال، تہران، ۱۳۲۰ھ، ص۔ ۱۱۸

۷۔ وفات: ۷۵۳ھ/ ۱۳۵۲ء

۸۔ وفات: ۵۸۳ھ/ ۱۱۸۷ء

۹۔ ابن یمین فریومدی، ۶۸۵۔ ۷۶۹ھ/ ۱۲۸۶۔ ۱۳۶۷ء

۱۰۔ ''خواف یکی از بخشہای تربت حیدریہ کہ از طرف شمال و مشرق بہ طیبات و قسمتی از مرز ایران و افغانستان و از جنوب بقاین محدود است۔'' فرہنگ معین۔

۱۱۔ وفات: ۵۱۷ھ/ ۱۱۲۳ء

۱۲۔ سپردن بتو

۱۳۔ امیر عمادالدین عمادی شہریاری، وفات: ۵۸۳ھ / ۱۱۸۷ء

۱۴۔ وفات: ۶۸۶ھ / ۱۲۸۷ء

☆☆☆

نوروز نامہ خیام

پروفیسر محمد اقبال

''نوروز نامہ''، منسوب بہ حکیم عمر خیام ایک فارسی رسالہ ہے، جس میں جشن نوروز کی اصلیت اور ابتدا سے بحث کی گئی ہے۔ اس رسالے کا واحد نسخہ برلین کے کتب خانہ میں اب سے چار پانچ سال پہلے دریافت ہوا تھا اور اب اس کو آقای مجتبیٰ مینوی نے باضافہ مقدمہ وحواشی وفرہنگ کتابخانہ کاوہ، طہران سے طبع کرایا ہے۔(۱)

مولوی سید سلیمان ندوی اپنی کتاب ''خیام'' میں جو پچھلے سال شائع ہوئی تھی۔(۲) اس رسالے کو ناظرین سے روشناس کر چکے ہیں۔(۳) اس وقت رسالہ ابھی طبع ہو کر نہیں آیا تھا، لیکن محض ابواب کی فہرست اور ان کے عنوانوں کو دیکھ کر انھیں شک پیدا ہوا تھا کہ ایسی کتاب خیام کی تصنیف نہیں ہو سکتی۔

ایسا شک ہر اس شخص کے دل میں پیدا ہونا چاہیے جو خیام سے واقف ہو اور چھٹی صدی کی فارسی تصانیف کی نوعیت کو پہچانتا ہو۔ ہمیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود ناشر نے بھی اس رسالے کو شبہ کی نظر سے دیکھا ہے، لیکن خیام کے ساتھ جو عقیدت اب نوجوان ایرانیوں کے دلوں میں موجزن ہو رہی ہے، اس نے اس کو اجازت نہیں دی کہ تصانیف خیام کی

فہرست میں ایک اور کتاب کا اضافہ نہ ہونے دیا جائے۔ مقدمہ میں کتاب کی بعض خصوصیات اور سبک تحریر پر توجہ دلانے کا بعد لکھا ہے:

''کلیہ این ممیّزات ...... در ہر کتابی جمع شد اگر در خود کتاب ہم تالیف آن بخیام نسبت دادہ نشدہ باشد، من آن را از خیام میدانم۔ چرا نداتم؟ برای اینکہ صاحبان تذکرہ ہا و کتب تراجم چنین کتابی باسم او نیاوردہ اند و من و شما تا امروز آن رانمی شناختیم و ندیدہ بودیم؟ مگر ارباب تذکرہ ہمہ چیز را نوشتہ اند یا ہمہ اقوال و روایات آنہا راست است؟ ...... چہ کسی راجز خیام توان یافت کہ با او ہم عصر بودہ باشد و چنین رسالہ ای را نوشتہ باشد، آنگاہ این قدر گذشت کردہ باشد کہ نام خیام را بر آن بگذارد؟ بالآخرہ این کتاب موجود است و صریحاً از تالیف خیام خواندہ شدہ و براہین نیز بر صحت این تصریح دارم۔ پس تا دلیل دندان شکن بر بطلان این نسبت اقامہ نشود، ہیچ کس را بتصاحب آن سزاوار تر از حکیم عمر خیام نیشاپوری نمی شمارم۔'' (۴)

اس ساری عبارت کو لکھنے کا باعث فقط چور کی داڑھی میں تنکا ہے، خود اپنے دل میں شک موجود ہے اور دوسروں کے دلوں میں اس کے آنے کی راہ روکی جارہی ہے۔ ''نوروز نامہ'' خیام کی تصنیف ہو یا نہ ہو۔ یہ ایک ادبی بحث ہے۔ ہمیں زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ ناشر نے اپنی دھن میں واقعات کو توڑ مروڑ کر کچھ کا کچھ کر دیا ہے اور تاریخ اور مذہب پر بھی وار کیے ہیں۔ جناب مجتبیٰ مینوی ان نوجوان ایرانیوں میں سے ہے ہیں، جن کے نزدیک ملکی ترقی کا راز وطن پرستی میں مضمر ہے اور وطن پرستی بھی ایسی کہ جس میں احترام مذہب کا کوئی شائبہ نہ ہو اور خصوصاً ایسے مذہب کا جو اپنے وطن کی پیداوار نہ ہو بلکہ باہر سے

آ کر ملک میں پھیلا ہو۔ انھیں جہاں یہ کہنا منظور ہے کہ قرآن میں یوں آیا ہے تو کہیں گے کہ ''دین آورِ تازیان در کتاب خود چنان گفتہ است۔'' عربوں کی فتح ایران کو ''ورود غارتگران عرب در ایران'' سے تعبیر کریں گے۔ وطن پرستی کے ان جذبات کو تو خیر بعض لوگ (خصوصاً دور حاضر میں) بنظر استحسان دیکھیں گے۔ ہمیں ایسے عقائد سے بحث نہیں، لیکن ادبی اور علمی نقطہ نگاہ سے یہ امر قابل افسوس ہے کہ یہی وطن پرستی ان اہل قلم سے واقعات کا انکار کرا رہی ہے۔ مشاہیر ایران کو وہ زرتشتی ثابت کرنے کی ہر جائز و ناجائز کوشش کر رہے ہیں۔ دقیقی اور فردوسی کے بارے میں تو انھیں مادہ پہلے ہی سے تیار ملا کہ وہ ایران کی قدیم عظمت کے گیت گانے والے تھے اور دقیقی نے تو صاف کہہ بھی دیا ہے کہ:

دقیقی چار خصلت برگزیدہ است　　　بہ گیتی از ہمہ خوبی و زشتی
لب یاقوت رنگ و نالۂ چنگ　　　می خون رنگ و کیش زرد ہشتی

لیکن اب خیام کو بھی ان زرتشتی شاعروں کی فہرست میں داخل کیا جا رہا ہے۔ جشن نوروز کے متعلق ایرانیوں کا عقیدہ ہے کہ وہ پیشدادی خاندان کے بادشاہوں (طہمورث، ہوشنگ اور جمشید) کا جاری کیا ہوا ہے، لہذا لازمی بات ہے کہ جو شخص (خواہ وہ خیام ہو یا کوئی اور) نوروز پر کتاب تصنیف کرے گا، وہ ضرور ان بادشاہوں کا ذکر کرے گا، لیکن اس ذکر سے نقادان ادب نے یہ نتیجہ نکالا کہ مصنف ایران قدیم کی عظمت کا شیفتہ اور اسلامی ایران سے بدظن ہے۔ چونکہ چند حکایتیں اس نے دور ساسانی کے بعض مشہور بادشاہوں مثلاً بہرام گور، خسرو پرویز، قباد اور نوشیرواں کے متعلق لکھ دی ہیں، لہذا ضرور ہے کہ وہ وہی عقیدہ اور مذہب رکھتا ہو جو ساسانیوں کا تھا!

ناشر ''نوروز نامہ'' نے جو دلائل اس امر کا یقین دلانے کے لیے کہ یہ خیام کی تصنیف ہے، پیش کیے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ دیباچہ میں خیام کا نام بالتصریح ہے،

۲۔ مصنف کا طرز فکر اور انداز بیان خیام کی طرف اشارہ کر رہا ہے،

۳۔ 'جشن نوروز' ایران کی رسوم ملی میں سے ہے، لہذا ظاہر ہے کہ اس موضوع پر کتاب لکھنے والا ملیت ایران کا حامی ہے۔ خصوصاً جب کہ وہ اپنے معاصر ترک (یعنی سلجوقی) بادشاہوں کو باصرار تاکید کر رہا ہے کہ اس جشن کا منانا واجب سمجھو۔ (۵) وہ قدیم اساطیری اور تاریخی شاہان ایران کو جو اسلام سے پہلے گزر چکے ہیں، بار بار یاد کر رہا ہے اور شاہنامہ کی روایات اور داستانوں کے جابجا حوالے دے رہا ہے، گویا شاہنامہ اسے خوب ازبر ہے۔ شاہان ساسانی کے آئین جہانداری کو وہ تحسین و تمجید کے ساتھ بیان کر رہا ہے۔ وہ منجم اور ریاضی داں بھی ہے، اس لیے کہ ہیئت کی اصطلاحوں کو اس نے جابجا برتا ہے۔ مسائل طبی سے بھی واقف ہے۔ شراب کے منافع اور مضرتوں اور دیگر خواص کے بیان کرنے میں ابن سینا اور رازی کے حوالے دے رہا ہے اور کتاب کو وہ نیشاپور میں لکھ رہا ہے، (۶) لہذا وہ خیام ہے!

وہ فیلسوف مادی ہے اور قائل نہیں ہے کہ خدا سب کا خالق ہے، بلکہ کہتا ہے کہ سب چیزیں برحسب گردش عالم ظہور میں آئی ہیں۔ زندگی کو تلخ اور وبال جان سمجھتا ہے۔ فکر مرگ سے وہ ہمیشہ رنج میں ہے۔ بنابریں، وہ ''خوش باش دمی کہ زندگانی اینست'' کا معتقد ہے۔ شراب کی اعلانیہ ستائش کرتا ہے، حسن صورت کا دلدادہ ہے اور اگرچہ وہ رسمی طور پر دیباچے کو حمد و درود سے شروع کرتا ہے، تاہم پیغمبروں کو وہ ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے اور کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دیتا۔ اسلام نے سونے کے برتنوں میں کھانے کو منع کیا ہے، لیکن وہ ان کے استعمال کو مستحسن سمجھتا ہے۔ اسلام نے شراب کو حرام قرار دیا ہے، لیکن وہ اس کا مداح ہے۔ گویا دوسرے لفظوں میں احکام اسلام سے برگشتہ ہے۔ پس ایسا شخص جو ان تمام صفات سے متصف ہو سوائے خیام کے اور کون ہو سکتا ہے؟

۴۔ مصنف اگرچہ کہتا ہے کہ میں نے اس کتاب کو ایک دوست کی فرمائش پر لکھا ہے، لیکن حقیقت میں وہ کسی بادشاہ کے لیے لکھ رہا ہے۔ اس لیے کہ وہ ان تمام چیزوں کو جو موبد موبدان نوروز کے دن بادشاہ کے لیے ہدیہ کے طور پر لے جاتا تھا، اپنی اپنی نوع کا بادشاہ

قرار دے رہا ہے۔ شراب شاہِ نوشید نیہا، زرشاہِ گوہر ہای گدازندہ، یاقوت شاہ گوہر ہای ناگدازندہ، اسپ شاہ چرندگان، باز شاہ پرندگان وغیرہ۔ کتنی قائل کن دلیل ہے!

وہ شاہان سلاجقہ کے عہد میں لکھ رہا ہے، اس لیے کہ ایک مقام پر اس نے افراسیاب کے ایک مقولے سے استشہاد کیا ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ افراسیاب سلجوقیوں کا مورث اعلیٰ تھا۔ سلجوقیوں کا یہ معاصر خیام ہی ہو سکتا ہے!

۵۔ مصنف ''نوروز نامہ'' کو ملک شاہ کے کسی جانشین کے عہد میں لکھ رہا ہے، اس لیے کہ ایک مقام پر وہ تعمیم کے طور پر کہہ رہا ہے کہ ہر بادشاہ کو چاہیے کہ جو عمارات (از قسم قلعہ یا شہر یا دیہہ یا رباط یا پل یا مدرسہ) اس کے باپ دادا نے بنانا شروع کی ہوں اور وہ انھیں ناتمام چھوڑ جائیں تو ان کو پورا کر دے تاکہ اس کا نام برقرار رہے۔ اگلے بادشاہ ہمیشہ اسی رسم پر کاربند رہے ہیں۔ ناشر صاحب بتلاتے ہیں کہ اس مقام پر مصنف جانشین ملک شاہ کو گویا اشارتاً یہ کہہ رہا ہے کہ ملک شاہ نے جو رسدگاہ بنوانا شروع کی تھی اور اس کو ادھورا چھوڑ مرا تھا، تم اس کو پورا کرو۔ لہذا، ظاہر ہے کہ ایسی رائے دینے والا اور یہ نصیحت کرنے والا خیام ہی ہو سکتا ہے، کیونکہ اسی کو اس رصدگاہ میں دلچسپی تھی۔

ناظرین خود ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ یہ دلیلیں کس قدر زوردار ہیں اور کہاں تک ان کی تردید کی ضرورت ہے؟ میرے خیال میں ان میں سب سے زیادہ قابل توجہ پہلی دلیل ہے یعنی یہ کہ دیباچے میں خیام کا نام بالتصریح مذکور ہے، لیکن اگر خود کتاب کے متن میں ایسے آثار موجود ہوں، جن کی وجہ سے ہمیں اس کو خیام کی طرف منسوب کرنے میں تامل ہو تو اس دلیل کا بآسانی جواب دیا جا سکتا ہے کہ قلمی نسخہ کے اڈیٹر یا کاتب نے کسی غلط فہمی یا قیاس کی بنا پر اسے خیام کی طرف منسوب کر دیا ہے، جیسا کہ بے شمار رباعیاں غلطی سے اس کی طرف منسوب ہوئیں۔

رہا یہ مبحث کہ مصنف کا طرز فکر خیام کی طرف اشارہ کر رہا ہے، اس سے ناشر کا مطلب یہ ہے کہ ''نوروز نامہ'' میں بعض خیالات خیام کی رباعیات کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ ہم کہتے

ہیں کہ سرے سے رباعیات ہی کے متعلق کہاں ثابت ہو سکا کہ وہ خیام کی ہیں بھی یا نہیں یا اگر ہیں تو کونسی ہیں؟ اور پھر جو عقاید ناشر کے نزدیک مصنف ''نوروز نامہ'' کے اپنے ہیں وہ اکثر جگہ اس کے اپنے نہیں ہیں، بلکہ وہ محض ان کا راوی یا بیان کرنے والا ہے۔ مثلاً شراب کے خصائص یا منافع کو وہ طبی تحقیقات کی روشنی میں پیش کر رہا ہے، نہ کہ مذہبی نقطۂ خیال سے اور پھر ساتھ ہی وہ اس کی مضرات کو بھی واضح کر رہا ہے۔ اسی طرح سونے کے برتنوں یا دوسری ممنوع چیزوں کے استعمال کے بارے میں بھی وہ طبی مسائل یا عقائد عامہ کو بیان کر رہا ہے۔ غرض یہ کہ آقای مجتبی مینوی نے ''نوروز نامہ'' کے بیانات کو بہت کھینچا تانی کے ساتھ خیام کے فرضی اعتقادات کے ساتھ مطابق کرنا چاہا ہے۔

جشن نوروز بے شک ایران کی رسوم ملی میں سے ہے، لیکن یہ کہنا کہ اس موضوع پر کتاب لکھنے والا (موجودہ معنوں میں) ملیّت ایران کا حامی ہے، محض تخیل ہی تخیل ہے۔ ''شاہنامہ'' کی داستانوں سے واقف ہونا یا قدیم ایرانی بادشاہوں کی حکایات بیان کرنا یا شاہان ساسانی کے آئین جہانداری کا مداح ہونا مصنف ''نوروز نامہ'' کے ساتھ مخصوص نہیں، فارسی ادب یا شعر کی کوئی کتاب اٹھا کر دیکھو اس میں جا بجا فریدون، جمشید، کیقباد، کیخسرو، رستم اور اسفندیار کے قصوں کی تلمیحات نظر آئینگی۔ صولت جم، جاہ فریدوں اور عدل انوشیروان کی کس شاعر نے تعریف نہیں کی؟ حشمت دارا اور شوکت کسریٰ کے افسانے کہاں دیکھنے میں نہیں آتے؟ لیکن کیا ہر ایسے شاعر یا مصنف کے متعلق ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ وہ زرتشتی عقائد رکھتا ہے؟ خیام کے جو حالات اب تک ہمیں معلوم ہوئے ہیں، ان سے کہیں یہ نہیں پایا جاتا کہ اس نے ''شاہنامہ'' یا قدیم تاریخ ایران کا خاص طور سے مطالعہ کیا تھا، بلکہ برعکس اس کے ہمیں یہ معلوم ہے کہ اسے عربی شاعری سے خاص شغف تھا اور ماوراء، ریاضی و ہیئت اس کی بناءِ شہرت ہیں۔ وہ قرأت اور تفسیر القرآن کا ماہر تھا۔

''نوروز نامہ'' کا جو قلمی نسخہ برلین کی لائبریری میں دریافت ہوا ہے، وہ (بقول میرزا محمد قزوینی) غالباً ساتویں صدی ہجری کا نوشتہ ہے۔ کتابت کی تاریخ اس میں درج نہیں اور

سبکِ عبارت سے واضح ہے کہ یقیناً چھٹی صدی کی تصنیف ہے اور عجب نہیں کہ خیام کے زمانے میں لکھی گئی ہو، لیکن بہر کیف ۴۸۵ھ کے بعد تصنیف ہوئی ہے۔ اس لیے کہ مصنف ملک شاہ کی وفات کا ذکر کر رہا ہے اور بتلا رہا ہے کہ تجدید تقویم کا کام جو اس نے شروع کرایا تھا، ادھورا رہ گیا۔ (۷) علاوہ اس کے آئین سیاست کے بعض اصول، جو اس نے صفحہ۔ ۱۵ اور ۱۶ پر دیے ہیں، صریحاً "سیاست نامہ" نظام الملک سے ماخوذ ہیں، جو ۴۸۵ھ کی تالیف ہے۔ انداز تحریر میں چھوٹے چھوٹے جملے، سادہ عبارت، قدیم محاورے، ہم کو پانچویں اور چھٹی صدی کی تصانیف کی یاد دلاتے ہیں۔

مصنف یقیناً ہیئت اور ریاضی سے واقف معلوم ہوتا ہے۔ طب سے بھی ضرور باخبر ہے۔ زبان عربی بھی بخوبی جانتا ہے۔ واقفیت عامہ بھی رکھتا ہے۔ قلم اور تلوار کی مختلف قسمیں، گھوڑوں کی بے شمار نوعیتیں اور ان کے خصائص، انواع خط اور ان کے موجد وغیرہ وغیرہ ان سب باتوں پر عبور رکھتا ہے، لیکن ہمیں قریب قریب یقین ہے کہ وہ خیام نہیں ہے۔ اس کے لیے جو دلائل ہم پیش کر سکتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ مصنف ایک نہایت ضعیف الاعتقاد اور تو ہم پرست آدمی ہے۔ جہلا کے عقائد کے ساتھ ہم آواز ہے اور عام سنی سنائی باتوں پر یقین رکھتا ہے۔ مثلاً جو فصل اس نے بہ عنوان "اندر علامت دفینہا" (۸) لکھی ہے، وہ بجز تو ہمات اور خیالی باتوں کے اور کچھ نہیں۔ لکھتا ہے کہ جہاں خزانہ دبا ہو، وہاں برف گرتے ہی پگھل جاتی ہے اور اگر چہ بنجر زمین ہی کیوں نہ ہو، وہاں خود بخود سپرغم اگ آتا ہے۔ بغیر اس کے کہ وہاں مردار ہو، گدھ جمع رہتے ہیں۔ بغیر اس کے کہ وہاں گہرائی ہو، بارش کا پانی تھمار رہتا ہے وغیرہ۔ اس قسم کے مہمل خیالات اور حکایات مسلسل بیان کرتا چلا گیا ہے۔ (۹) ہم پوچھتے ہیں کہ کیا وہ خیام جس سے ہم آشنا ہیں کہ ریاضی اور سائنس کا ماہر اور فطرت کا مطالعہ کرنے والا ہے۔ ایسی لغو باتوں کا مصنف ہو سکتا ہے؟

۲۔ ناشر نے مصنف کی بعض تاریخی اور ادبی غلط بیانیوں کو خود بھی دکھایا ہے۔ (۱۰)

منجملہ ان کے یہ کہ وہ عامیانہ اشتقاق سازی میں یقین رکھتا ہے۔ مثلاً 'دیبا' کے متعلق کہتا ہے کہ 'دیو بافت' سے مشتق ہے۔ ایرانی مہینوں کے ناموں کے اشتقاق بھی فرضی اور عامیانہ بیان کر رہا ہے۔ چنانچہ ناشر نے حواشی میں ان سب کی تصحیح کی ہے اور اصلی اور صحیح اشتقاق بیان کیے ہیں۔ (۱۱) اس قسم کی لغزشوں کی توقع ہم کو خیام کے قلم سے کیونکر ہو سکتی ہے؟ ناشر ''نوروز نامہ'' کو یہ بات خود بھی کھٹکی ہے، لیکن اس کا جواب اس نے یوں دیا ہے کہ ''از روی سبک انشای سریع ونقصہای عبارتی و پارہ ای غلطہای تاریخی وادبی آن حکم می کنم۔ خیام آن را بسیار سرد ستی، بدون صرف وقت ومطالعہ وتحقیق ومراجعہ فقط باعتماد حافظہ ومساعدت خیال بطور قلم انداز برای منظوری نوشتہ وبشاہ معاصر خویش تقدیم کردہ یا بلکہ اصلاً بتکلیف آن شاہ روی کاغذ آوردہ است۔'' (۱۲)

کیا یہ جواب شافی ہے؟

۳۔ مصنف ''نوروز نامہ'' سلطان ملک شاہ سلجوقی کے رصد گاہ بنوانے اور تقویم کی تجدید کرانے کے واقعہ (۱۳) کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

> ''سلطان سعید معین الدین (کذا) ملک شاہ را انار اللہ برہانہ ازین حال معلوم کردند۔ بفرمود تا کبیسہ کنند وسال را بجائگاہ خویش باز آرند۔ حکماء عصر از خراسان بیاورند (بیاوردند۔ ظ) وہر آلتی کہ رصد را بکار آید، بساختند۔ از دیوار وذات الحلق ومانند ایں ونوروز را بفروردین باز بردند ولیکن پادشاہ را زمانہ زمان نداد وکبیسہ تمام نا کردہ بماند۔'' (۱۴)

خود ناشر نے اس مقام پر حاشیہ لکھتے ہوئے بتایا ہے کہ ملک شاہ کے عہد میں جن ہیئت دانوں نے مل کر تجدید تقویم کا کام انجام دیا تھا، ان میں خود خیام بھی تھا اور انھوں نے یہ کام ۴۷۱ھ میں تمام کیا چنانچہ:

> ''ایشان تعدیلی کردند کہ بتعدیل جلالی معروفست واز

سال ۴۷۱ھ آن را بموقع اجرا گذاشتند و ابتداء وضع آن روز
جمعہ دہم ماه، رمضان ۴۷۱ھ بود و دران وقت نزول آفتاب
ببرج حمل در ہجدہم فروردین بود۔ ہجدہ روز اول را کبیسہ کردند
و روز نوز دہم را اول فروردین قرار دادند و سال ۴۷۱ھ مبداء
'تاریخ جلالی' گردید۔'' (۱۵)

معلوم نہیں کہ سابقہ عبارت میں مصنف کا '' کبیسہ تمام ناکردہ بماند'' سے کیا مطلب ہے۔ ظاہراً یہ ایک غلط بیانی معلوم ہورہی ہے، جو ہرگز خیام کے قلم سے سرزد نہیں ہوسکتی۔ خصوصاً جب کہ وہ خود ان منجموں کی جماعت میں شریک تھا، جن کو کبیسہ کرنے کا کام سپرد کیا گیا اور پھر سب سے بڑی تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ اسباب کا ذکر تک نہیں کرتا کہ میں بھی ان 'حکمائے عصر' کے زمرے میں شامل تھا۔

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ''نوروز نامہ'' کے بعض نادر الفاظ اور محاوروں کی ایک فہرست دے دی جائے، جن میں قدامت کا رنگ پایا جاتا ہے اور اب کم وبیش متروک ہیں۔ ناشر کتاب نے اخیر میں ایک فرہنگ دی ہے، لیکن اس میں یہ سب الفاظ اور محاورات درج نہیں ہوئے:

ا۔ دانا آن (۱۶)

ناسزا آن (۱۷)

بجائے 'دانایان' و 'ناسزایان' علامت جمع 'آن' قدیم فارسی کے باقیات میں سے ہے۔ جہاں مضاف الیہ (بحالت جمع) کی علامت 'آنام' ہے، بعینہ جیسے عربی میں 'ین' ہے، مثلاً قدیم فارسی میں 'کھشایتیا' بمعنی 'شاہ' ہے اور لفظ 'شاہ' اسی سے مشتق ہے۔ اگر کہنا ہو 'شاہ شاہان'، تو کہیں گے 'کھشایتیا نام'۔ رفتہ رفتہ آخر سے 'ام' گر گیا اور 'آن' جمع کی علامت باقی رہ گئی۔ ظاہر ہے کہ چھٹی صدی ہجری تک یہ اصلی حالت میں رہی۔ بعد کے کسی زمانے میں مبدل بہ 'یاں' ('یا' 'یان') ہوگئی، لیکن فقط ان الفاظ میں جو 'الف' یا 'واؤ' میں ختم ہوتے ہوں۔

۲۔'الف' علامت استعجاب: ''نیکا ِگردہا کہ گردہاء جو بود''! (۱۸) یعنی کیا ہی اچھی ہے وہ روٹی جو جو کی ہو!

''بزرگا شفیعا کہ تو آوردی''! (۱۹)

۳۔از بہر.....را۔''از بہر بزرگ داشتن آفتاب را'' (۲۰)

''بر پادشاہان واجبست آیین ورسم ملوک بجای آوردن از بہر مبارکی واز بہر تاریخ را'' (۲۱) ''از بہر نامش را'' (۲۲)، دیکھو فرہنگ راحتہ الصدور،

۴۔دوانزدہ (۲۳)=دوازدہ

۵۔فریشتہ (۲۴)=فرشتہ

۶۔بدید کرد (۲۵)=پدید کرد

۷۔'بزرگ منشی' بمعنی 'کبر ورعونت'۔''منی درخویشتن آورد، بزرگ منشی و بیدادگری پیشہ کرد۔'' (۲۶)

۸۔'ماندن' بمعنی 'رہا کردن' یعنی چھوڑنا، (۲۷) شاہنامے میں بکثرت آتا ہے۔

۹۔ماضی استمراری کی دوہری علامت یعنی شروع میں 'می' اور آخر میں 'ی':

''بوقت خویش برعادت معہود سال وماہ بدومی رسانید ندی۔'' (۲۸)

۱۰۔'خوار داشتن' بمعنی 'وقعت نہ کرنا'۔''فرمان را...... خوار داشتی۔'' (۲۹)

۱۱۔خوار کاری= سہل انگاری۔''وخزانہ بی مہر از خوار کاری وغافلی بود۔'' (۳۰)

۱۲۔کی= کہ (۳۱) پرانی تصانیف میں عام ہے۔

۱۳۔چشم زدگی= نظر بد۔''چو خاصیتش آنک چشم زدگی باز دارد''۔ (۳۲)

۱۴۔بایستگی= قابلیت (؟)''ومثال بایستگی قوت ہاضم نہادہ اند اندر معدہ و جگر۔'' (۳۳)

۱۵۔شِناو= شنا یعنی تیراکی۔''بیاموزید فرزندان را تیراندازی وشناو۔'' (۳۴)

۱۶۔خمانیدن= جھکانا۔''پشت دست باز خمانند۔'' (۳۵)

۱۷۔ 'بلندترین'، 'فروترین' بمعنیٰ 'زیادہ سے زیادہ' اور 'کم سے کم'۔ ''وزن کمان بلند ترین ششصد من نہادہ اند......وفروترین یک من بود۔'' (۳۶)

۱۸۔ 'فسانگاہ' غالباً بمعنیٰ 'کمان کے چلّہ کا وہ حصہ جہاں تیر جوڑا جاتا ہے'۔ ''وآغاز آرداز دو گروہہ چنانک در گوشۂ کمانست تافسانگاہ زہ۔'' (۳۷)

۱۹۔ قبضہ = مُشت، پنجابی۔ 'چپّا'۔ ''انواع تیروی سہ است، دراز وکوتاہ ومیانہ، دراز پانزدہ قبضہ، میانہ دہ قبضہ، کوتاہ ہشت قبضہ ونیم''۔ (۳۸)

۲۰۔ 'ب' در ماقبل ماضی منفی۔ ''حروف وکلماتش از حال خویش بنگردد۔'' (۳۹)

۲۱۔ پیدا کردن = واضح کرنا، بیان کرنا۔ ''اکنون پیدا کنیم کہ انگور از کجا پدید آمد۔'' (۴۰)

۲۲۔ پَرچین کردن = کسی چیز کے گرد کانٹوں کی باڑ وغیرہ لگانا۔ ''گرد اگرد اوپر چین کن تا چہار پا اندر وراہ نیابد'' (۴۱)

۲۳۔ بلگ = غالباً برگ کی ایک شکل ہے۔ ''شاخہاش بسیار شد وبلگہا پہن گشت۔'' (۴۲)

۲۴۔ بزرگوار = بزرگ۔ ''ای کنیزک گناہ مہتر تو بزرگوار تر از انست کہ آنرا آمرزش توان کرد۔'' (۴۳)

۲۵۔ باز زدن = رد کرنا۔ ''شفیع من بتو بزرگتر از انست کہ باز توان زد۔'' (۴۴)
''گفت'' 'وما شفیعک الذی لایُرَدّ'' کدامست این شفیع تو کہ باز نتوان زد۔'' (۴۵)

(ماہنامہ اورینٹل کالج میگزین، لاہور، نومبر ۱۹۳۴ء، ص ۱۰۳۔۱۱۵)

حواشی وحوالہ جات

۱۔ نوروز نامہ، باہتمام مجتبیٰ مینوی، ضخامت۔ ۳۰+۱۴۸ صفحے۔ ان میں متن۔ ۷۷ صفحے کا ہے۔ مضمون نگار

۲۔ علامہ ندوی کی یہ تصنیف پہلی بار ۱۹۳۳ء میں دارالمصنفین، اعظم گڑھ شائع ہوئی۔

۳۔ نوروز نامہ، مذکور ص۔ ۲۱۰۔۲۱۳

۴۔ نوروز نامہ، ایضاً، صفحہ۔ بیست وشش۔

۵۔ ایضاً ص۔ ۱۰

۶۔ مصنف کے نیشاپوری ہونے کی دلیل میں فقط یہ جملہ دیا ہے: ''فخر الدولہ برادر پنا خسروانہ نگاہ کہ بگریخت وبنیشابور آمد۔'' ایضاً ص۔ ۴۸

۷۔ ایضاً ص۔ ۱۲

۸۔ ایضاً ص۔ ۲۲

۹۔ ایضاً ص۔ ۲۲۔۳۳

۱۰۔ ایضاً ص۔ بیست ونہ

۱۱۔ ایضاً ص۔ ۸۱۔۸۳

۱۲۔ ایضاً ص۔ بیست ونہ

۱۳۔ تاریخ اسلام کا یہ مشہور واقعہ ہے جو ۴۶۷ھ میں ظہور پذیر ہوا۔ مضمون نگار

۱۴۔ نوروز نامہ، ایضاً ص۔۱۲

۱۵۔ ایضاً ص۔۸۹

۱۶۔ ایضاً ص۔۲، ۱۳، ۴۷، ۶۰، ۷۰، ۷۱

۱۷۔ ایضاً ص۔۴۶

۱۸۔ ایضاً ص۔۳۱

۱۹۔ ایضاً ص۔۴

۲۰۔ ایضاً ص۔۴

۲۱۔ ایضاً ص۔۵

۲۲۔ ایضاً ص۔۲۸۔س ۳

۲۳۔ ایضاً ص۔۴، ۳۷، ۴۹

۲۴۔ ایضاً ص۔۴، ۵۱

۲۵۔ ایضاً ص۔۷

۲۶۔ ایضاً ص۔۹

۲۷۔ ایضاً ص۔۱۱، س اخیر

۲۸۔ ایضاً ص۔۱۴

۲۹۔ ایضاً ص۔۱۶

۳۰۔ ایضاً ص۔۲۶

۳۱۔ ایضاً ص ۲۷، س ۱۲

۳۲۔ ایضاً ص۔۲۸

۳۳۔ ایضاً ص۔۳۵، اگر چہ عام فرہنگوں میں اس کا معنی 'سزاواری، بہتری وغیرہ آیا ہے۔ مرتب۔

۳۴۔ ایضاً، ص۔۳۹

۳۵۔ ایضاً، ص۔۴۰

۳۶۔ ایضاً، ص۔۴۰

۳۷۔ ایضاً، ص۔۴۰

۳۸۔ ایضاً، ص۔۴۱

۳۹۔ ایضاً، ص۔۶۷

۴۰۔ ایضاً، ص۔۶۵

۴۱۔ ایضاً، ص۶۷

۴۲۔ ایضاً، ص۔۶۷

۴۳۔ ایضاً، ص۔۴۷

۴۴۔ ایضاً، ص۔۴۷

۴۵۔ ایضاً، ص۔۴۷

☆☆☆

خیام کا ایک عظیم ہندسی شاہکار

"شرح ما اشکل من مصادرات اُقلیدس"

شبیر احمد خاں غوری

خیام ایک رباعی گو شاعر کی حیثیت سے مشہور ہے، مگر اس کی شہرت نے حقیقی 'خیام' کو نظروں سے چھپا دیا ہے۔ شاعری کی دنیا میں اس کا کوئی مقام ہو یا نہ ہو، عالمی ریاضی و ہیئت کی تاریخ میں اسے ایک ممتاز مقام ضرور حاصل ہے۔ وہ رصد گاہ ملک شاہی کا سربراہ تھا۔ کارڈان (Cardan) سے کہیں پہلے اس نے 'فصول مخروطی' (Conic sections) کی مدد سے تیسرے درجہ کی مساواتوں (Cubic Equations) کو منظم طور پر حل کیا تھا اور 'اصول اقلیدس' کے 'خطوط متوازی کے مصادرہ' (Parallel Postulate) کو ثابت کرنے کی جو مسلسل کوشش بطلمیوس (Ptolemy) (زمانہ ۱۵۰ مسیحی کے قریب) کے وقت سے آج تک ہوتی رہی ہے، اس کے اندر وہ سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب بعنوان "شرح ما اشکل من مصادرات اقلیدس" بھی لکھی تھی، جس کا واحد نسخہ لیڈن کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ یہ کتاب طبع بھی ہوئی تھی، مگر مطبوعہ نسخے کمیاب ہیں۔ سطور ذیل میں اسی کتاب کا ابتدائی تعارف پیش کیا جارہا ہے۔ مگر اس سے پیشتر اس

کے موضوع کی وضاحت مستحسن معلوم ہوتی ہے۔ اس ضمن میں دو باتوں پر روشنی ڈالنا ضروری ہے:

ا۔ مصادرہ کی حقیقت وماہیت،

۲۔'اصول اقلیدس' کے 'خطوط متوازی کے مصادرہ' کے ساتھ اعتنا کا اجمالی جائزہ۔

ا۔ مصادرہ مفہوم: 'مصادرہ' جسے انگریزی میں (Postulate) کہتے ہیں، منطقی اصطلاح ہے۔ اگرچہ اس کا استعمال زیادہ تر علم ہندسہ (Geometry) میں ہوتا ہے، اس اصطلاح کا بانی مشہور یونانی حکیم وفلسفی ارسطاطالیس (ارسطو) تھا، جو علم منطق کا بھی واضع و بانی ہے۔ مصادرہ کی توضیح اس نے اپنی منطقی تصنیف ''انالوطیقائے ثانی'' (Analytical Posterior) میں کی تھی۔ عہد حاضر میں اس کے ترجمے یورپی زبانوں (بشمول انگریزی زبان) میں ہوئے۔ میرے پیش نظر (Jonathan Barnes) کا ترجمہ ہے، جو ۱۹۷۵ء میں کیرنڈن پریس، آکسفورڈ سے "Aristotle Posterlor Analytics" (Translated by Janathen Barnes, Charendon Press, Oxford, 1975) کے نام سے شائع ہوا تھا۔

اس کتاب کے صفحہ ۷۱ پر ارسطو 'مصادرہ' (Postulate) کی تعریف بدیں طور کرتا ہے:

> ''مصادرہ'' وہ (دعویٰ یا مقدمہ) ہے، جو متعلم کی
> رائے کی ضد ہو اور ہر چند کے وہ ثبوت طلب ہو، اسے ثابت
> کیے بغیر ہی مان لیا جائے اور استعمال کیا جائے۔''

اس تعریف کی مزید توضیح ارسطو 'مفروضہ' یا 'اصول موضوعہ' (Suppostion) اور 'مصادرہ' میں امتیاز کر کے کرتا ہے:

> ''جو بات کوئی شخص بغیر خود اس کو ثابت کیے ہوئے
> فرض کر لیتا ہے، حالانکہ وہ ثبوت طلب ہوتی ہے۔ (اس کی دو

> شکلیں ہیں:) اگر وہ ایسے دعویٰ کو فرض کرتا ہے، جو متعلم کے نزدیک بھی صحیح ہے، تو وہ اسے (Suppose) کرتا ہے، لیکن اگر وہ اس بات کو اس حالت میں مان لیتا ہے کہ یا تو اس کے بارے میں اس کی کوئی رائے ہی نہیں ہوتی یا اگر ہوتی تو ہے، مگر وہ (دعویٰ کے اصل مدعی کے موقف کے) خلاف ہوتی ہے تو وہ اسے بطور 'مصادرہ' کے پیش کرتا ہے اور یہی وہ امتیازی فرق ہے، جس کی بنا پر 'مفروضہ' (یا 'اصول موضوعہ') اور 'مصادر ہ' ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، کیونکہ 'مصادرہ' وہ دعویٰ ہے، جو متعلم کی رائے کی ضد ہو اور ہر چند کہ ثبوت طلب ہو، اسے ثابت کیے بغیر ہی مان لیا جائے اور استعمال کیا جائے۔''

ہر چند کہ 'مصادرہ' منطقی اصطلاح ہے، مگر اس کا استعمال زیادہ تر اقلیدسی ہندسہ کے ماہرین نے کیا ہے۔ ان میں سے ایک اہم شخصیت پرقیس (Proches) کی ہے۔ وہ اس (مصادرہ) کی تعریف میں کہتا ہے:

> ''اگر کوئی دعویٰ غیر واضح بالذات ہونے کے ساتھ متعلم کی رضامندی کے بغیر تسلیم کیا گیا ہو، تو وہ 'مصادرہ' کہلاتا ہے۔''

ارسطو کی تصانیف عہد اسلام میں پہلے عربی میں ترجمہ کی گئیں اور پھر حکمائے اسلام نے ان کی مدد سے مستقل کتابیں لکھیں۔ ان حکماء میں اہم ترین شخصیت شیخ بوعلی سینا کی ہے اور اس کی تصانیف میں تین کتابیں خصوصی اہمیت رکھتی ہے: شفا، نجاۃ، اور اشارات۔

''کتاب الشفا'' کا پہلا حصہ منطق پر ہے جو نو 'فنون' پر مشتمل ہے۔ پانچواں فن ارسطو کی 'انالوطیقائے ثانی' کا چربہ ہے۔ اس کے پہلے مقالہ میں بارہ فصلیں ہیں۔ آخری

فصل میں اس نے 'مصادرہ' اور اس کی اخوات 'علوم متعارفہ' (Axiom) اور 'اصول موضوعہ' (Supposition) یا (Hypothesis) کی حقیقت و ماہیت کی توضیح کی ہے:

> '''اصول موضوعہ' وہ مقدمات ہیں جو اپنی ذات میں غیر واضح بالذات ہوتے ہیں۔ مگر کسی دوسرے علم میں ان کی وضاحت کی جاتی ہے اور متعلم انھیں اس بنا پر کہ اسے اپنے استاد کے ساتھ حسن ظن ہے اور اس بات پر اعتماد ہے کہ معلم کی رائے اس باب میں صحیح ہے، تسلیم کر لیتا ہے۔ 'مصادرہ' بھی ایسا ہی (غیر واضح بالذات) مقدمہ ہوتا ہے، لیکن یا تو اس باب میں متعلم کی رائے وہ نہیں ہوتی، جو معلم کی رائے ہے یا پھر سرے سے کوئی رائے نہیں ہوتی۔''

اور اس (مصادرہ) کی بہترین مثال وہ 'اقلیدس کے خطوط متوازی کے مصادرہ' کو بتاتا ہے کہ:

> ''اقلیدس کی کتاب میں جو بیان ہوا ہے کہ اگر ایک خط مستقیم دو دوسرے خطوط مستقیم کو قطع کرے اور خط قاطع کے ایک جانب کے دو داخلہ زاویے مل کر دو قائمہ زاویوں سے کم ہوں تو اس جانب دونوں خط بڑھائے جانے سے آپس میں مل جایں گے۔ ایک 'مصادرہ' ہے۔''

'مصادرہ' کی اسی طرح توضیح ابن سینا نے اپنی دوسری کتابوں ''کتاب النجاۃ'' اور ''کتاب الاشارات والتنبیہات'' میں کی ہے، مگر اس کی تفصیل موجب تطویل ہوگی۔

ساتویں صدی ہجری (تیرہویں صدی مسیحی) میں کاتبی قزوینی نے ''شمسیہ'' کے نام سے منطق کا ایک متن متین لکھا، جس پر بعد میں قطب الدین رازی نے شرح لکھی، جو ان کے نام پر ''قطبی'' کہلاتی ہے۔ اس کے آخر میں انھوں نے ''مصادرہ'' کی جو توضیح کی ہے،

وہ بڑی صاف اور واضح ہے۔ فرماتے ہیں:

''ہر علم کے تین حصے ہوتے ہیں۔ موضوع، مبادی اور مسائل..... مبادی یا تصورات ہوتے ہیں یا تصدیقات..... (تصدیقات کی تین شکلیں ہیں:)

ا۔ یا تو وہ اپنی ذات میں (Per se) واضح بالذات (Self-evident) ہوتی ہیں۔ وہ 'علوم متعارفہ' (Axiom) کہلاتی ہیں یا غیر واضح بالذات ہوتی ہیں۔ (اس حالت میں ان کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔)

۲۔ اگر شاگرد استاد کے ساتھ حسن ظن کی بنا پر انھیں صحیح تسلیم کرتا ہے تو وہ 'اصول موضوعہ' (Hypothesis) کہلاتی ہے، لیکن

۳۔ اگر شاگران کے تئیں انکار اور شک کے ساتھ پیش آئے نہیں تو ''مصادرہ'' کا نام دیا جاتا ہے۔''

آخری زمانہ میں ملا محب اللہ بہاریؒ (المتوفی ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء) نے ''سلّم العلوم'' لکھی، جس کے ذریعہ نہ صرف ہندوستان، بلکہ عالم اسلام کی منطقی عبقریت اپنے ذروہ کمال کو پہنچی۔ بعد میں مختلف علماء نے اسپر شروح لکھیں۔ ان شروح میں اہم ترین شرح مولانا عبدالعلی بحرالعلوم کی ہے۔ اس میں وہ فرماتے ہیں:

''مبادی (First Principles) ان امور کو کہتے ہیں، جن سے دلیل مرکب ہوتی ہے..... اگر یہ امور 'تصورات' کے قبیل سے ہوں، تو انھیں حدود (یا تعریفات کا نام دیا جاتا ہے، اور اگر از قسم قضایا ہوں تو:۔

اگر وہ ضروری ہوں اور بیان وتوضیح سے مستغنی، تو علوم متعارفہ (Axiomis) کہلاتے ہیں اور اگر نظری ہوں.... اور اس انداز کے ہوں کہ متعلم ان کی صحت کو اس وجہ سے تسلیم کرے کہ اسے ان کی صحت کا ظن غالب ہے، یا اس وجہ سے تسلیم کرے کہ اسے اپنے استاد (کی اصابت رائے) کے ساتھ حسن ظن ہے، تو انھیں 'اصول موضوعہ' (Hypothesis) کہا جاتا ہے۔

لیکن اگر وہ امور اس انداز کے ہوں کہ شاگرد انھیں تسلیم تو کرے، مگر دل میں ان کی صحت کا منکر ہو تو انھیں 'مصادرات' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔''

اس تفصیل سے 'مصادرہ' کی حقیقت و ماہیت متحقق ہوگئی ہوگی، جو مغرب میں ارسطو کے زمانہ سے پچھلی صدی تک اور مشرق میں آج کے دن تک عام انداز فکر کا ماحصل ہے، ایک ہی رہی ہے اور جس کی رو سے 'مصادرہ' سے مراد وہ دعاوی یا مقدمات ہوتے ہیں جو:

(الف)۔ نہ تو اتنے ہی بدیہی (واضح بالذات (Self-evident)) ہوں کہ ثبوت ہی سے مستغنی ہوں، اور (ب)۔ نہ ہی انھیں مخاطب (یا متعلم اگر وہ استاد کا مخاطب ہے) ہی بطیب خاطر تسلیم کر لینے کو تیار ہو، بلکہ استاد (یا دعویٰ کے مدعی) کی جلالت قدر سے مرعوب ہو کر وقتی طور پر انھیں تسلیم کر لیتا ہے (حالانکہ اس باب میں اس کی رائے اکثر استاد کی رائے کے مخالف ہوتی ہے)۔

۲۔ اصول اُقلیدس کا خطوط متوازی کا مصادرہ: مصادرہ کی بہترین مثال اقلیدس کا ''خطوط متوازی کا مصادرہ ہے، مگر اس کی تفصیل سے پہلے خود ''اصول اقلیدس'' کا اجمالی تعارف ضروری ہے۔

''اصول اقلیدس'' ہندسہ یا جیومیٹری کی مشہور کتاب ہے۔ 'جیومیٹری' کی ابتدا جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، پیمائش زمین کے سلسلے میں مصر قدیم میں ہوئی۔ بعد میں پروہت طبقہ نے اس پیمائش کے بہت سے قاعدے دریافت کیے اور اس طرح 'جیومیٹری' کے علم کا آغاز ہوا۔

پھر یونانی حکماء جیسے ثالیس (Thalse) اور فیثا غورث وغیرہ مصر پہنچے اور وہاں سے دوسرے علوم کے ساتھ ہندسہ یا جیومیٹری کا علم بھی سیکھ کر آئے۔ خود انھوں نے بھی اپنی دریافتوں سے اس علوم کی ثروت میں اضافہ کیا اور اس طرح ان کی سعی پیہم سے اس علم کا وافر ذخیرہ جمع ہو گیا۔

اس وافر ذخیرہ میں سے بنیادی حیثیت کی اشکال کو منتخب کر کے 'اصول ہندسہ' کا نام

دیا گیا۔ اس قسم کا سب سے پہلا انتخاب بقراط کیوسی (Hippocrates of Chios) نے مرتب کیا۔ پھر اور لوگوں نے بھی اس انداز کی کتابیں مرتب کیں۔ آخری کوشش اقلیدس (۳۰۰ ق م کے قریب) نے کی۔ اس کی 'اصول ہندسہ' (Elements of Geometry) کے سامنے اس موضوع کی سابق تصانیف گوشہ گمنامی میں جا پڑیں۔

بعثت اسلام کے بعد جب یونانی علم و حکمت کی کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں تو سب سے پہلے اقلیدس کی ''اصول الہندسہ'' ہی کا ترجمہ ہوا، مگر اس کا باقاعدہ ترجمہ حجاج بن یوسف بن مطر نے ہارون الرشید کے عہد (۱۷۰ھ۔۱۹۳ھ) میں کیا۔ حجاج ہی نے اس کا دوسری مرتبہ ترجمہ ہارون کے بیٹے مامون کے زمانہ (۱۹۸ھ۔۲۱۸ھ) میں کیا۔ بعد میں اور لوگوں نے بھی ترجمہ کیے، جن میں سب سے مشہور اسحاق بن حنین کا ترجمہ تھا۔ جس پر ثابت بن قرہ نے اصلاح دی۔

تیرہویں صدی مسیحی کے وسط میں خواجہ نصیر الدین طوسی نے حجاج اور ثابت کے ترجموں کو سامنے رکھ کر ''تحریر اصول اقلیدس'' کے نام سے اصول اقلیدس کا ایک نیا ایڈیشن مرتب کیا اور پھر اسی ایڈیشن کو قبول عام نصیب ہوا۔ بعد کے علمائے تدریس ہوں یا تصنیف دونوں ہی نے اسی کے ساتھ اعتناء کیا۔

اقلیدس کی ''اصول الھندسہ'' کی سب سے بڑی خوبی اس کی متناسق ترتیب ہے۔ ہر شکل پچھلی اشکال کی مدد سے ثابت ہوتی ہے اور وہ اپنے سے پہلے کی اشکال سے۔ آخری اساسی شکلوں کی صحت کچھ تمہیدی مقدمات اور چند مصطلحات (حدود یا تعریفات) پر موقوف ہوتی ہے، جنھیں 'مبادی' (First Principles) کہتے ہیں۔ محقق طوسی کے یہاں انھیں 'صدر' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جیسا کہ پچھلی فصل میں مذکور ہوا، ان تمہیدی مقدمات کی تین قسمیں ہیں: علوم متعارفہ، اصول موضوعہ اور مصادرات۔ محقق طوسی کی ''تحریر اصول اقلیدس'' میں پہلی قسم کو 'العلوم المتعارفہ' کا عنوان دیا گیا ہے، لیکن باقی دو قسموں کو ان کے مصطلحہ عنوانات کے تحت

بیان نہیں کیا گیا، بلکہ ایک ہی جماعت میں 'اوضاع' (اَن یُوضَع) کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ انھیں میں حسب ذیل مقدمہ ہے:

"کل خطین مستقیمین وقع علیھما خط مستقیم، و کانت الزادیتا ن الداخلتان فی احد الجھتین اصغر من قائمتین، فانھما یلتقیان فی تلك الجھته ان اُخرجا۔"

[اگر دو خطوط مستقیم کو (تیسرا) خط مستقیم کاٹے اور (خط قاطع) کی ایک جانب کے دونوں داخلہ زاویے دو قائمہ زاویوں (right angles) سے کم ہوں، تو وہ دونوں خط اگر بڑھائے جائیں تو اسی جانب میں (کہیں نہ کہیں جا کر) مل جائیں گے۔]

یہی اقلیدس کا 'خطوط متوازیہ کا مصادر' ہے جو علم ہندسہ کی تاریخ میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ ہندسی

دنیا کی ہنگامہ آرائیاں اسی مصادرہ کے محور پر گردش کرتی رہی ہیں اور اسی کے ثابت کرنے کی کوشش غیر اقلیدسی جیومیٹری (Non-Euclodean Geometry) کے وجود میں آنے پر منتج ہوئی، مگر اس کی تفصیل موضوع زیر بحث سے دور لے جائے گی۔ اس اہمیت سے قطع نظر یہی 'مصادرہ' اقلیدس کا عظیم ترین کارنامہ ہے، کیونکہ اسی کے ذریعہ اس نے خطوط متوازی کے مسئلہ کو پائدار اور مستحکم بنیادوں پر استوار کیا۔

لیکن واقعات کی ستم ظریفی بھی قابل غور ہے کہ اقلیدس کا یہی عظیم کارنامہ کوئی دو ہزار سال سے ہدف تنقید بنا ہوا ہے، کیونکہ اقلیدس کے بعد آنے والے ماہرین علم ہندسہ نے اکثر اسے 'مصادرہ' ماننے سے انکار کیا اور اس بات پر اصرار کیا کہ یہ صرف ایک 'مسئلہ اثباتی' (Theorem) ہے، جسے زیادہ بسیط شکلوں کی مدد سے ثابت کیا جانا چاہیے۔ قدیم ترین ریاضی داں، جس نے اسے ثابت کرنے کی کوشش کی، بطلیموس تھا۔ بعد کے ریاضی دانوں میں برعکس (Proclus) اس حیثیت سے مشہور ہے کہ وہ اس 'مصادرہ' کی مصادراتی

حیثیت کا بڑی شدت سے منکر تھا اور کہتا تھا کہ اس کو مصادرات کی فہرست ہی سے ساقط کر دینا چاہیے، کیونکہ یہ ایک مسئلہ اثباتی (Theorem) ہے۔ جیسے بطلیموس نے اپنی کتاب میں اور خود اقلیدس نے اس کے 'عکس' (Converse) کو عملاً مسئلہ اثباتی کی طرح ثابت کیا ہے۔ ہر قلس کا شاگرد (Simplicius) کہتا ہے کہ بطلیموس اور ہر قلس کے علاوہ اور ریاضی دانوں نے بھی اسے ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔

بہر حال جب ''اصول اقلیدس'' عربی میں ترجمہ ہوئی، تو پھر مسلمان فضلاء نے اس پر شروح لکھیں اور اس کے مشاکل وغوامض کو حل کرنے کی کوشش کی۔ ان مشاکل وغوامض میں سب سے اہم 'خطوط متوازی کا مصادرہ' ہے۔ محقق طوسی نے ''الرسالہ الشافیہ'' میں ان میں سے تین فاضلوں کی کوشش کا تفصیلی طور پر ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس علم کے (یونانی) متبحرین کے بعد متاخرین (فضلائے اسلام) کا زمانہ آیا۔ انھوں نے جب دیدۂ انصاف سے دیکھا تو صورت حال ان پر واضح ہوگئی اور انھوں نے اس (مصادرہ) کی دلیل وحجت تلاش کرنا شروع کی...... کسی نے تو اس 'مصادرہ' کا بدل پیش کیا جو وضوح وغموض میں اقلیدس کے بیان کردہ مصادرہ (کی مشکلات) کے قریب ہے اور وہ ابوعلی ابن الہیثم ہے، جو فنون ریاضیات میں تبحر رکھتا تھا اور کسی نے اس مصادرہ کا ثبوت ایسے مقدمہ کے ذریعے دیا جو اقلیدس کے مصادرہ سے زیادہ واضح نہیں ہے اور وہ حکیم ابوالفتح عمر خیام ہے اور کسی نے اس کی دلیل ایک مغالطہ آمیز مقدمہ پر قائم کی اور وہ فاضل عباس بن سعید الجوہری ہے۔''(۱)

ان فضلا میں سب سے پہلے عباس بن سعید الجوہری نے ''اصول اقلیدس'' کے باقاعدہ ترجمہ کے کوئی تیس سال بعد اس مسئلہ کے ساتھ تعرض کیا۔ اس نے اقلیدس کی کتاب کی اصلاح لکھی اور اس کی اشکال میں تقریباً پچاس شکلوں کا اضافہ کیا۔ ان میں سے چھ شکلیں خطوط متوازی کے مصادرہ کے اثبات میں ہیں، مگر بقول محقق طوسی ان کی اساس ایک ایسے مقدمہ پر ہے جو مغالطہ آمیز ['مغالطیہ' (Fallacious)] ہے۔

چوتھی صدی کے خاتمہ پر ابن الہیثم نے اقلیدس کے خطوط متوازی کے مصادرہ کا بدل دریافت کیا کہ:

''ایک دوسرے کو قطع کرنے والے دو خط مستقیم (بیک وقت) ایک ہی خط مستقیم کے متوازی نہیں ہو سکتے، یا "Two intersecting st. lines cannot be parallel to one and the same St. line."

ابن الہیثم نے یہ بدل اپنی کتاب ''شرح مصادرات اقلیدس'' میں پیش کیا تھا، مگر محقق طوسی کو یہ کتاب نہیں مل سکی۔ خوش قسمتی سے آج دنیا میں اس کے تین نسخے محفوظ ہیں۔ ابن الہیثم نے اس کا حوالہ اپنی ایک اور کتاب ''حل شکوک کتاب اقلیدس'' میں دیا تھا، جو محقق طوسی کو مل گئی تھی۔ فرماتے ہیں:

> ''اور رہا ابن الہیثم تو اس نے اپنی کتاب مسمی بہ ''حل شکوک کتاب اقلیدس'' میں اس مقدمہ (خطوط متوازی کے مصادرہ) کے بجائے ایک دوسرا مقدمہ بیان کیا ہے اور اس کا گمان ہے کہ یہ اقلیدس کے 'مصادرہ' کے مقابلہ میں زیادہ واضح اور ذہن میں جلد راسخ ہو جانے والا ہے۔ اس نے اس مصادرے اور اس جیسے دوسرے مصادرات کے ثبوت کے لیے اپنی ایک اور کتاب کا حوالہ دیا ہے، جس کا نام اس نے ''شرح المصادرات'' بتایا ہے، (مگر) مجھے اس کا نسخہ نہیں ملا۔''

محقق طوسی ابن الہیثم کے مجوزہ بدل کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> "اما المقدمته التی زعم انها ابین عندالحس واوقع فی النفس من هذه المصادرة و استعمالها فی المواضع التی تحتاج فیها الی تلك المصادرة بدلاً عنها فهی ان الخطین مستقمین المتقاطعین لایمکن

ان یواز یا خطاً واحداً مستقیما۔"

(اور وہ مقدمہ جس کے لیے اس (ابن الہیثم) کا گمان ہے کہ وہ (اقلیدس کے) اس مصادرے کے مقابلہ میں زیادہ واضح اور ذہن میں زیادہ راسخ ہو جانے والا ہے اور جسے اس نے ان مقامات پر جہاں اس کی ضرورت پڑتی ہے، اقلیدس کے 'مصادرہ' کے بجائے استعمال کیا ہے، حسب ذیل ہے: "ایک دوسرے کو قطع کرنے والے دو خطوط مستقیم کے لیے ناممکن ہے کہ وہ ایک ہی خط مستقیم کے متوازی ہوں۔")

اور یہ وہی چیز ہے، جسے ابن الہیثم کے کوئی آٹھ سو سال بعد برطانوی ریاضی داں پلے فیر نے اپنا لیا۔ چنانچہ اس نے ۱۷۹۵ء میں "اصول اقلیدس" کا جو ایڈیشن شائع کیا، اس کے دیباچہ میں لکھتا ہے:

"A new axiom is introduced in the room of the 12th for the purpose of demonstrating more easily some of the properties of parallel lines."

(اقلیدس کے بارہویں علوم متعارفہ (خطوط متوازی کے مصادرہ) کے بجائے ایک نیا علوم متعارفہ داخل کیا جا رہا ہے، جس کا مقصد خطوط متوازی کے کچھ خواص کو زیادہ آسان طریقہ سے ثابت کرنا ہے۔)

اور یہ نیا 'علوم متعارفہ' (Axiom) پلے فیر کے لفظوں میں حسب ذیل ہے:

"Two St. lines which interest one another cannot be parallel to the same St. line."

(دو خطوط مستقیم جو ایک دوسرے کو کاٹتے ہیں، ایک ہی خط مستقیم کے متوازی نہیں ہو سکتے۔)

علم وحکمت کی تاریخ میں علمی اور سائنسی قزاقی اور ڈاکہ زنی کی اس سے زیادہ شرمناک مثال شاید ہی مل سکے۔ ع: چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد۔

اور پھر برطانوی ریاضی داں کیلے (Calay) نے اس سائنسی قزاقی پر مہر توثیق ثبت کردی۔ چنانچہ موخر الذکر نے ۱۸۳۲ء میں سائنس دانوں کے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

> "My own view is the Euclid's Twelfth axiom in playfairs form of it does not need demonstration, but is part of our notion of space, of physical space of our experience, which is the representation lying at the bottom of all external experience. "

یہ ہے 'مغرب' کی انصاف پروری کہ مشرق کے گنجہائے زروسیم تو درکنار، اس کے فرزندوں نے جن علمی اور سائنسی اکتشافات کے لیے خون جگر بہایا تھا۔ وہ بھی ان کی دستبرد سے نہ بچ سکے۔ والی اللہ المشتکی۔

ابن الہیثم کے بعد خیام (وفات ۵۲۳ھ/۱۱۲۹ء) کا زمانہ آتا ہے۔ اس نے اس خطوط متوازی کے مصادرہ کو اپنی کتاب "شرح ماا شکل من مصادر ات اقلیدس" میں ثابت کیا ہے۔ اس کی تفصیل اگلی فصل میں آرہی ہے۔

محقق طوسی کو صرف انھیں تین فاضلوں (عباس بن سعید الجوہری، ابن الہیثم اور خیام) کے نام ملے مصادرہ کے سلسلے میں کوشش کی، کہیں زیادہ ہے۔ یوں تو ہر فاضل جس نے "اصول اقلیدس" کی شرح لکھی (اور ان شارحین کی تعداد خاصی طویل ہے)، خطوط متوازی کے مصادرہ پر کچھ نہ کچھ گفتگو ضرور کی ہے (مثال کے طور پر احمد بن عمر الکرابیسی نے اپنی "شرح اقلیدس" میں، جس کا واحد مخطوطہ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ میں محفوظ

ہے)، مگر ابن الندیم نے کچھ اور لوگوں کے تذکرہ میں اس موضوع پر ان کی تصانیف کا ذکر کیا ہے۔ یہ ثابت بن قرہ اور یوحنا القس ہیں، جن کی تصانیف تیرہویں صدی مسیحی تک موجود تھیں، کیونکہ علم الدین قیصر نے محقق طوسی کے "الرسالة الشافیه" پر جو تبصرہ لکھ کر انھیں بھیجا تھا، اس میں ان تصانیف کا ذکر کیا ہے۔

اگلی تیرہویں صدی مسیحی میں جب کہ محقق طوسی نے "الرسالة الشافیه" لکھا، پہلے اثیرالدین البہری نے 'خطوط متوزی کے مصادرہ' کو ثابت کیا۔ اس کی تفصیل قاضی زادہ رومی نے جو الغ بیگ کے استاد اور اس کی رصدگاہ سمرقند کے پہلے متولی تھے، "شرح اشکال التاسیس" میں دی ہے۔ اثیرالدین البہری کے بعد محقق طوسی نے اس مصادرہ کو ثابت کرنے کوشش کی، چنانچہ انھوں ے "الرسالة الشافیه '، میں پچھلے ماہرین علم ہندسہ (الجوہری، ابن الہیثم اور خیام) کی کوششوں کے ذکر کے بعد اپنی کوشش کی تفصیل دی ہے کہ میں نے اسے سات شکلوں کی مدد سے ثابت کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"واما الطریقه التی اتضحت لی بعد مطالعه کلام هؤلاء الافاضل، فهی هذه التی ترتیب فی سبعته اشکال۔"

(بہر حال وہ طریقہ جو سابق فاضلوں کے کلام کے مطالعہ کے بعد میرے خیال میں واضح ہوا ہے، وہ حسب ذیل ہے اور جسے میں نے سات شکلوں میں مرتب کیا ہے۔)

اس کے بعد انھوں نے ان اشکال ہفتگانہ کو ثابت کیا ہے، جس کا اعادہ ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ صرف اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ محقق طوسی کی ان اشکال ہفتگانہ میں سے دوسری اور چوتھی شکل بعینہ وہی ہے، جو خیام نے اپنے تجویز کردہ ثبوت میں دی ہیں۔ ان کی تفصیل آگے آئے گی۔

محقق طوسی نے انھیں اشکال ہفتگانہ کی مدد سے اپنی "تحریر اصول اقلیدس" میں اس مصادرہ کو ثابت کیا ہے۔ چنانچہ پہلے تو کتاب "تحریر اقلیدس" کے دیباچہ میں اس مصادرہ کو

نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ 'قضیہ' (مصادرہ) نہ تو علوم متعارفہ میں داخل ہے اور نہ علم ہندسہ کے علاوہ کسی اور علم میں اس کی وضاحت کی جاتی ہے۔ یہ ایک قابل توضیح وثبوت مسئلہ ہے، جسے مبادی کے بجائے ''مسائل فن'' میں بیان کیا جانا چاہیے۔ لہذا، میں اسے مناسب موقعہ پر بیان کروں گا۔ پھر اٹھائیسویں شکل ثابت کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"هذا موضع بيان القضية التي صادر بها
اقليدس دوعدت بيانها في صدر الكتاب وقد بينتها
بسبعته اشكال۔"

(یہ اس قضیہ (مصادرہ) کی توضیح کے لیے (مناسب) مقام ہے، جو اقلیدس نے بطور مبادی لکھے تھے اور جس کی توضیح کا میں نے دیباچہ میں وعدہ کیا تھا۔ میں نے اس مصادرہ (خطوط متوازی کے مصادرہ) کو سات شکلوں کی مدد سے ثابت کیا ہے۔)

یہ ہے ایک اجمالی جائزہ افاضل ریاضی دانان اسلام کی کوششوں کا، جو انھوں نے خطوط متوازی کے مصادرہ کو ثابت کرنے کے سلسلے میں کی ہیں۔ اسی جائزے میں ایک ممتاز مقام خیام کا ہے، جس نے اس
موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی تھی۔ اسی کا مختصر تعارف آئندہ فصل میں پیش کیا جارہا ہے۔

۳۔ مختصر تعارف "شرح ما اشكل من مصادرات اُقليدس": خیام کے احوال وآثار کا اہم قدیم ترین ماخذ نظامی عروضی سمرقندی کا ''چہار مقالہ'' ہے۔ اسی زمانہ میں بیہقی نے "تتمه صوان الحكمة" لکھی، جس میں خیام کے تفصیلی حالات ملتے ہیں، مگر دونوں میں خیام کی کسی تصنیف کا ذکر نہیں ملتا۔ "الجبرو المقابله" کے علاوہ اس کی اہم ترین ریاضیاتی تصنیف "شرح ما اشكل من مصادرات اقليدس" ہے، جس کا تعارف اس مقالہ کا مقصد ہے۔ خیام کی اس کتاب کا قدیم ترین حوالہ خواجہ نصیر الدین محقق طوسی نے اپنے "الرسالة الشافيه عن الشك في الخطوط المتوازيه" میں دیا ہے۔ نیز اس کا

ایک طویل اقتباس بلفظہٖ نقل کر دیا ہے۔ خوش قسمتی سے یہ اقتباس ہماری اس پیش کش پر مشتمل ہے۔ ویسے خیام کی "شرح ما اشکل من مصادرات اقلیدس" ہنوز موجود ہے۔ مخطوطہ بھی اور مطبوعہ بھی۔ اس کا واحد مخطوطہ لیڈن (ہالینڈ) کے کتب خانۂ مشرقی میں ہے، جس کی فہرست سے براکلمن نے اپنی کتاب ''تاریخ علوم عرب'' میں اس کا حوالہ نقل کیا ہے۔ براکلمن کے حوالہ سے محمد بن عبدالوہاب قزوینی نے ''حواشی چہار مقالہ'' میں اس کا ذکر کیا ہے۔ قزوینی ہی کے حوالہ سے سید سلیمان ندوی نے اپنی مایہ ناز تصنیف ''خیام'' میں اسے خیام کی تصانیف میں بیان کیا ہے۔

اس صدی کے وسط میں "شرح ما اشکل من مصادرات اقلیدس" کو ایک فاضل نے لیڈن کے مخطوطہ نیز محقق طوسی کے ''رسالہ شافیہ'' میں مذکور اس کتاب کے متعلقہ اقتباس کی مدد سے اکٹھا کر کے شائع کیا۔ مطبوعہ کتاب کا غالباً ایک نسخہ ایرانی تاجرِ کتب خاضع کے یہاں بھی آیا، جسے ہم نے منگا لیا تھا، لیکن آج یہ نسخہ میری دسترس میں نہیں ہے۔

مگر غالباً کسی نے بھی مخطوط کے مطالعہ کی زحمت نہیں کی۔ اس عاجز نے بھی مطبوعہ نسخہ کا مطالعہ نہیں کیا۔ میں نہیں بتا سکتا کہ کس فاضل نے اسے کب اور کہاں سے اکٹھا کیا اور اس کے اندر 'خطوط متوازی کے مصادرہ' کے علاوہ جس کی تصدیق محقق طوسی کے "الرسالة الشافیہ" سے ہوتی ہے، 'اصول اقلیدس' کے اور کس کس مصادرہ کے اشکالات کی شرح وتوضیح کی گئی ہے۔

(خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ، شمارۂ مسلسل ۵۴-۵۵، ص ۴۳۶-۴۴۶)

حواشی وحوالہ جات

۱۔ اس اقتباس کا غالباً درست ترجمہ یوں ہوگا:

''اس علم کے (یونانی) تبحرین کے بعد متاخرین (فضلائے اسلام) کا زمانہ آیا۔ انھوں نے جب دیدۂ انصاف سے دیکھا تو صورت حال ان پر واضح ہوگئی اور انھوں نے اس (مصادرہ) کی دلیل وحجت تلاش کرنا شروع کی......جس نے تو اس 'مصادرہ' کا بدل پیش کیا، جو وضوح وغموض میں اقلیدس کے بیان کردہ مصادرہ (کی مشکلات) کے قریب ہے، وہ ابوعلی ابن الھثیم ہے، جو فنون ریاضیات میں تبحر رکھتا تھا اور جس نے اس مصادرہ کا ثبوت ایسے مقدمہ کے ذریعے دیا جو اقلیدس کے مصادرہ سے زیادہ واضح نہیں ہے اور وہ حکیم ابوالفتح عمر خیام ہے اور جس نے اس کی دلیل ایک مغالطہ آمیز مقدمہ پر قائم کی، وہ فاضل عباس بن سعید الجوہری ہے۔'' (مرتب)

☆☆☆

عمر خیام کی بعض کمیاب تحریریں

ڈاکٹر نذیر احمد

عمر خیام ان خوش نصیب مصنفین میں ہے، جس کے متعلق مشرق و مغرب دونوں جگہوں پر بہت کافی لکھا جا چکا ہے اور ہنوز لکھنے کا سلسلہ جاری ہے۔ اردو میں سب سے زیادہ عمیق تحقیقات علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے کی، جسکی زندہ مثال انکی یادگار تصنیف ''خیام''[1] ہے۔ ایران میں حال ہی میں ڈاکٹر محمد معین، استاد دانشگاہ تہران نے تعلیقات چہار مقالہ[2] میں عمر خیام پر نہایت جامع مضمون شامل کیا ہے۔ اس مضمون کا بہترین حصہ وہ ہے، جس میں خیام کے مآخذ تاریخی ترتیب سے پیش ہوئے ہیں[3]۔ ڈاکٹر صاحب نے خیام کے معاصرین سے لیکر دسویں صدی ہجری تک کی کتابوں کے حوالے مع ضروری اقتباسات کے درج کیے ہیں۔ اس کے باوجود آثار خیام کے ذیل میں جو کتابیں اور رسالے درج ہیں، وہ خیام کی تمام تصانیف کو حاوی نہیں۔ ذیل میں بعض ایسی تحریروں کا تعارف کرایا جاتا ہے جو کتاب ''خیام'' میں شامل نہیں اور بعض ڈاکٹر معین کی تعلیمات میں بھی نہیں آسکی ہیں[4]۔

۱۔ رسالۃ'' کتبہا عمر الخیام جواباً لثلث مسائل: خیام نے ایک شخص کے تین سوالوں کے جواب میں یہ رسالہ لکھا تھا۔ اس رسالے کے دو نسخے مجتبیٰ مینوی کو ترکی کے

کتابخانوں میں دستیاب ہوئے۔ پہلا روان کوشکو کے مجموعے (شمارہ ۲۰۴۲) میں اکیسواں ۵ حصہ ہے۔ دوسرا نسخہ کتابخانۂ اسعد آفندی کے ایک مجموعے (شمارہ ۱۹۳۳) میں آٹھواں ۶ جز ہے۔ یہ مجموعہ پروفیسر ریتر کے مطالعے میں بھی رہ چکا تھا اور اس نے اس کے مندرجات پر رسالہ Der-Islam (سال ۲۵، شمارہ۔ ا، ص. ۱۷ بعد) میں ۷ بحث کی ہے۔ پروفیسر بروکلمن نے ''تاریخ ادبیات عرب'' میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ان کے نزدیک یہ وہی رسالہ ہے، جو ''جامع البدائع'' ۸ (چاپ مصر ۹، ۱۳۳۰، ص. ۱۷۰-۱۸۵) اور ''خیام'' (ص. ۳۸۰-۳۹۲) میں چھپ چکا ہے، مگر پروفیسر موصوف کا یہ قیاس صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ یہ رسالہ چھپے ہوئے رسالے سے بالکل مختلف ہے۔ بظاہر التباس کی وجہ یہ ہوئی ہوگی کہ ''جامع البدائع'' اور ''خیام'' میں چھپے ہوئے رسالے کا موضوع زیر بحث رسالے سے بالکل ملتا جلتا ہے اور وہ بھی تین سوالوں کے جواب پر مشتمل ہے۔ روان کوشکو کے مجموعے والے نسخے سے معلوم ہوا کہ خیام سے جس شخص نے تین سوال دریافت کیے تھے، اس کا نام جمال الدین عبدالجبار بن محمد المشکوی تھا، لیکن آفندی کے مجموعے میں ابتدا میں سائل کا صرف لقب ''امین الحضرت'' لکھا ہے۔ البتہ آخر میں ''الشیخ جمال الزمان'' کا فقرہ ملتا ہے، جو بظاہر جمال الدین کے لیے آیا ہوگا۔ اس سے زیادہ جمال الدین بن محمد المشکوی کے متعلق اور کچھ نہیں معلوم ہے۔ رسالے کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

"طلع علی عزیز خطاب سیدنا الشیخ الرئیس
امین الحضرة مبشراً بسعادة ایامه و انتظام
احواله ....اما المسائل التی شرفنی سیدنا بالمباحثه
فیها فلعمری انها مسائل غامضته حسنه ولکن
الشکوك اکثر (کذا) مما لایقف علیها الاالذکی
الفطن البالغ فی الحکمة۔ ولکن لم اجد بداً من أن
اخوض فی شرح الاهم من بعضها قبل

المـلافـات۔"(١٠)

تینوں مسئلے یہ ہیں:

١۔ ان کانت النفوس الناطقه باقية بعد الموت۔فلابد من أن يكون لكل واحد منها (منهما) وجودٌ خاص، باشخاصها۔

٢۔ اذكانت الحوادث الممكنته التى تحدث واحدة باسبابها و كذالك على التسلسل۔

٣۔ قد أثبت وجود الزمان بالحركة وحد بانه مقدار حركة الفلك ثم قرران الحركة غير قائمة بذاتها۔١

دوسرے مسئلے کے جواب کے ضمن میں خیام نے لکھا ہے کہ ۴۷۳ ہجری میں جب میں فارس میں مقیم تھا تو ایک رسالہ اسی موضوع پر قاضی القضاۃ ابوطاہر کے لیے لکھا تھا۔ اس کے نسخے فارس، اصفہان اور بغداد میں تو ہیں، لیکن میرے پاس کوئی نسخہ موجود نہیں، ورنہ بھیج دیتا۔ فی الحال ان امور کے تکرار کی تاب نہیں، کیونکہ وہ بہت زیادہ ہیں۔...... دوبارہ لکھنے سے قاصر ہوں، اس لیے کہ سخت بیمار رہ چکا ہوں۔ خود اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"وقد استوفيت الكلام على هذا المعنى وبعض كلام المخالفين فيه فى رسالة كتبتها الى قاضى قضاةفارس ابى طاهر رحمته الله ابان مقامى بارض فارس سنة ثلث و سبعين ولتلك الرسالة باصفهان وفارس وبغداد نسخ وليست عندى نسخة منها والأنفذ تها الى حضرته والوقت لايتحمل اعاده تلك المعانى والمعلومات لكثرتها........" ص ٢١

خیام نے اس عبارت میں جس رسالے کی طرف اشارہ کیا ہے، بظن غالب وہ وہی ہے، جو "جامع البدائع" اور کتاب "خیام" میں چھپ چکا ہے اور جس کا عنوان "الجواب

عن ثلاث مسائل' ہے، لیکن علامہ ندوی مرحوم نے اسکو ابونصر محمد بن عبدالرحیم نسوی کے تین سوالات کا جواب فرض کیا ہے۔ علامہ موصوف کے نزدیک رسالۂ مذکور رسالہ ''کون وتکلیف''[۱۳] کا تتمہ ہے اور چونکہ ''کون وتکلیف'' ابونصر محمد نسوی کے دو سوالوں کے جواب پر مشتمل ہے، اس لیے یہ تینوں جواب بھی ابونصر ہی کے سوال سے متعلق ہوں گے۔ چنانچہ کتاب ''خیام''[۱۴] میں ہے۔

تین سوالات:

رسالہ کون وتکلیف کا تتمہ

''اسکے بعد اس مجموعے میں خیام کا دوسرا رسالہ ہے، جس کو مصری ناشر[۱۵] نے ایک دوسرا مستقل رسالہ سمجھ کر اس کے سائل کے نام ونشان نہ ملنے پر افسوس کیا ہے، حالانکہ عبارت اور مطالب سے ظاہر ہے کہ اس کا سائل بھی وہی ہے، جس نے کون وتکلیف کا پہلا سوال کیا تھا اور اسی نے خیام کے مذکورۃ الصدر جواب پر تین سوالات کیے اور خیام نے اس تتمے مین ان تینوں کا جواب دیا ہے۔ اس لیے اس رسالے کو مستقل سمجھنے کے بجاے اسی ''رسالۂ کون وتکلیف'' کا تتمہ سمجھنا چاہیے اور اس جوابی رسالہ کی تاریخ بھی وہی ۴۷۳ھ یا اس کے بعد کا سال ہوگا۔''

مگر زیر بحث رسالے میں مسئلہ دوم کے جواب کے سلسلے میں جو عبارت نقل ہوئی ہے، اس میں جس رسالے کی طرف اشارہ ہے، اس کی حسب ذیل چار خصوصیات قابل ذکر ہیں:

۱۔ وہ ۴۷۳ ہجری میں لکھا گیا۔

۲۔ سائل فارس کا قاضی قضاۃ تھا۔

۳۔اس کے مطالب زیر نظر رسالہ کی طرح کائنات کے وجود وغیرہ سے متعلق تھے۔

۴۔قاضی قضاۃ کا نام ابو طاہر تھا۔

ان میں سے پہلی تین باتیں ''رسالۂ کون وتکلیف'' میں موجود ہیں۔اس کا سنہ تالیف ۴۷۳ھ ہے۔وہ قاضی قضاۃ فارس کے سوالات کے جواب میں تھا۔اس کے مطالب زیر غور رسالے سے مشابہ ہیں، لیکن ''رسالۂ کون وتکلیف'' کا سائل ابونصر محمد بن عبدالرحیم نسوی ابوعلی سینا کا شاگرد تھا۔جبکہ منقولہ بالا عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ اشارہ کردہ رسالہ کے سائل کا نام ابو طاہر تھا۔ایسی حالت میں یہ فرض کرنا یقینی ہے کہ ''رسالہ کون وتکلیف'' کے مشابہ مطالب پر مشتمل خیام کا کوئی اور رسالہ یقیناً ہوگا، جو قاضی قضاۃ ابو طاہر کے سوالات کے جواب میں لکھا گیا ہوگا۔چونکہ "الجواب عن ثلاث مسائل'' کے مطالب رسالۂ کون وتکلیف سے اتنے ملتے ہیں کہ علامہ سید سلیمان ندوی نے اسے آخرالذکر کا تتمہ سمجھکر اس کے سائل کا نام بھی احمد نسوی فرض کرلیا ہے۔(حالانکہ اس رسالے کے سائل کا نام مذکور نہیں اور مصری ناشر نے اسکے نام ونشان کے نہ ملنے پر اظہار تاسف کیا ہے)۔اس لیے ظن غالب یہی ہے کہ اس کے سائل کا نام ابو طاہر ہی ہوگا اور اس بنا پر اس کو ''رسالۂ کون و تکلیف'' کا تتمہ سمجھنے کے بجائے الگ رسالہ سمجھنا چاہیے۔البتہ ایک ہی زمانہ میں ایک ہی اطراف میں دو قاضی القضاۃ کی موجودگی کھٹکتی ضرور ہے۔

خیام کی مشہور کتاب ''جبر ومقابلہ''[۱۶] قاضی قضاۃ ابو طاہر کے نام منسوب تھی۔علامہ ندوی مرحوم نے اس کی شخصیت کے تعین میں بڑی کوشش کی اور بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ:

> ''قاضی القضاۃ ابو طاہر سے خیام کی مراد امام ابو طاہر ساری سمرقندی شافعی سے ہے۔یہ اصل میں مازندران کے ایک مقام ساریہ کے رہنے والے تھے، مگر ولادت اصفہان میں ہوئی اور پرورش، نشوونما، تعلیم وتربیت سمرقند میں پائی تھی اور وہاں کے رئیس شافعیہ ہوگئے تھے[۱۷]....یہ غالباً ترکستان

میں ایلک خانی سلطنت کے قاضی القضاۃ تھے یا خیام نے اعزازی طور سے قاضی القضاۃ کہہ دیا ہے۔'' ۱۸

اس کے ساتھ سید صاحب نے مزید یہ بھی قیاس کیا ہے کہ:

''سلجوقی رصد خانے میں پہنچنے کے پہلے (۴۶۷ھ) خیام ابوطاہر سے ترکستان میں روشناس ہوا اور شاید ابوطاہر ہی واسطے سے شمس الملک ۱۹ خاقان بخارا تک پہنچا۔'' ۲۰

ظاہر ہے کہ جو عبارت مسئلہ دوم سے اوپر نقل ہوئی ہے، اس سے ابوطاہر کی شخصیت کا تقریباً تعین ہو گیا۔ ترکستان کے بجائے وہ فارس کا قاضی القضاۃ تھا۔ بظاہر خیام اس سے ابتدا میں متعلق نہیں ہوا تھا، بلکہ سلجوقی رصد خانہ میں پہنچنے کے مدتوں بعد اس سے فارس میں منسلک تھا۔ اس سے ایک بات یہ بھی تقریباً صاف ہو جاتی ہے کہ ''جبر و مقابلہ'' خیام کی ابتدائی تصانیف میں نہیں ہوگی۔ وہ ۴۶۷ھ کے قبل کے بجائے ۴۷۳ھ کے قریب سمرقند میں نہیں، بلکہ فارس میں لکھی گئی ہوگی۔

جمال الدین عبدالجبار بن محمد المشکوی کے سوالات کے جواب میں جو رسالہ لکھا گیا اور جس کی صراحت اس وقت کی جاری ہے، وہ ۴۷۳ ہجری کے کافی بعد مرتب ہوا ہوگا۔ اس لیے کہ مسئلہ ثانی کی جو عبارت نقل ہوئی ہے، اس میں قاضی القضاۃ ابوطاہر کے نام کے ساتھ ''رحمۃ اللہ'' کا فقرہ اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ اس وقت قاضی القضاۃ کا انتقال ہو چکا تھا اور اس وقت تک ابوطاہر کے نام کا رسالہ (جس کو سید سلیمان ندوی مرحوم نے ''تتمۂ'' کون وتکلیف'' قیاس کیا ہے) تمام بلاد فارس، اصفہان اور بغداد میں عام ہو چکا تھا۔

۲۔ رسالۂ در حل یک مسئلۂ جبری: یہ عربی رسالہ جو پانچ ورق پر مشتمل ہے، اس میں الجبرا کے ایک مسئلہ کا حل قطوع مخروطی (علم مثلثات) کے وسیلے سے پیش کیا گیا ہے۔ دراصل یہ ایک سوال کا جواب ہے، جو عمر خیام سے کسی شخص نے اس موضوع پر

کیا تھا۔ اس کا ایک خطی نسخہ ڈاکٹر عباس اقبال آشتیانی مرحوم، استاد دانشگاہ تہران کے ملک میں تھا۔ اس کا تعارف انھوں نے مجلۂ شرق، شمارہ ہشتم [۲۱] میں کرایا تھا۔ اگر چہ اس کا موضوع ریاضی ہے، مگر اس میں بعض تاریخی و حکمی مسائل بھی آ گئے ہیں۔ ڈاکٹر آشتیانی موصوف نے اس کے مطالب کا خلاصہ ان الفاظ میں [۲۲] پیش کیا تھا:

''اما ریاضیون قدیم غیر عربی زبان بچیزے ازیں مقولہ (جبر و مقابلہ) پی نہ بردند و از اطلاعات ایشان دراین باب چیزی بمانہ رسیدہ و بہ زبان ما نقل نہ شدہ ولے از متاخرین آشنا بہ زبان ما اول کسیکہ بنوع ثلاثی ازایں چہاردہ قسم (یعنی چہاردہ قسم معادلہ جبری کہ خیام آنہا را تعداد کردہ) برخوردہ ماہانی [۲۳] مہندس است کہ در حل مقدمہ ای کہ ارشمیدس در کتاب خود آوردہ بہ مسئلۂ مواجہ شدہ و آن را خواستہ است با استعمال اصطلاحات علمای جبر حل کند و چون استخراج آن با قطوع مخروطات ممکن نہ شدہ، آن را ممتنع شمردہ و فاضل مزبور باوجود مقام فضل و تقدم او در این فن در حل این مسئلہ عاجز ماند تا آنکہ ابوجعفر [۲۴] خازن ظہور کرد و راہ آن را یافت و رسالہ ای در آن خصوص نگاشت و ابونصر [۲۵] بن عراق مولی [۲۶] امیر المومنین از مردم خوارزم در حل مقدمہ ای کہ ارشمیدس برای استخراج ضلع مسبع در دایرہ بکار بردہ، نیز اصطلاحات جبریون را استعمال نمودہ و معادلہ ای [۲۷] را کہ ترتیب دادہ با قطوع [۲۸] مخروطات حل کردہ و این مرد از بزرگان طبقہ علمای ریاضی بودہ است و مسئلہ ای کہ ابوسہل کوہی [۲۹] و ابوالوفا بوزجانی [۳۰] و ابوحامد صغانی [۳۱] و جماعتے از رفقاے ایشان کہ در بغداد مقیم

> دربار عضد الدولہ ۳۲ بودند، از حل آن عاجز آمدند این بود کہ عدد را چنان بدو جزء تقسیم کنید کہ مجموع مربع آن دو جز با خارج قسمت جزء بزرگ تر بر جزء کوچکتر معادل ۳۳ ۲/۷ شود۔ حل این مسئلہ بمعادلۂ منجر شود کہ مجہول ۳۴ درجۂ اول یا مجہول درجۂ سوم و دوم و عدد معلوم برابر میگردد و این فضلاء مدتہاے مدید در حل آن مسئلہ متحیر بر ماندند تا ابوالجز آن را استخراج کرد و آن را در کتابخانۂ ملوک سامانی مخزون نمودند۔"

رسالۂ مذکور سے مزید یہ معلوم ہے کہ مساوات جبری کی ۲۱ رقسموں میں سے صرف گیارہ قسمیں خیام کے پہلے کے ریاضی دانوں کو معلوم تھیں، باقی دس قسموں کو خیام نے قطوع مخروطی کے وسیلے سے حل کیا ہے۔ خیام اس رسالے میں وعدہ کرتا ہے کہ اگر فرصت ملے گی تو وہ ایک کتاب انواع معادلات کی تفصیلات میں لکھے گا۔

ڈاکٹر عباس اقبال آشتیانی کا خیال ۳۵ ہے کہ خیام نے جس رسالہ کا ذکر کیا ہے، وہ غالباً اس کا مشہور رسالہ "جبر و مقابلہ" ہے، جو وپکے کے توسط سے ۱۸۵۱ء میں فرنچ ترجمہ کے ساتھ پریس میں طبع ہو چکا ہے۔

مولانا ندوی مرحوم نے رسالہ "جبر و مقابلہ" کی بعض عبارتوں سے استدلال کیا ہے کہ خیام نے "جبر و مقابلہ" کے پہلے ایک رسالہ بعنوان "رسالۂ استخراج اضلاع مربعات و مکعبات" لکھا تھا۔ ملاحظہ ہو:

> "مربع اور مکعب چیزوں کے اضلاع دریافت کرنے کے چند طریقے اہل ہند کو معلوم تھے، جو معمولی استقراء پر مبنی ہیں اور وہ ایک سے لے کر ۹ رتک کے مربعات ہیں، یعنی ایک دو تین کے مربعات اور اسی طرح ان کے مضروبات جیسے دو کو تین میں ضرب دے کر حاصل ضرب نکالا

جائے..... ہماری ایک کتاب اس طریقۂ حساب کے صحیح ہونے
اور اس سے مطلوب حاصل کرنے کی دلیلوں پر ہے اور ہم نے
اس کی بہت سی قسمیں اور اضافہ کی ہیں.....۳۶"

یہ تفصیل ڈاکٹر آشتیانی کے مخطوطہ پر پوری نہیں اترتی۔ البتہ سید سلیمان ۳۷ مرحوم کا خیال ہے کہ مؤلف "گنج دانش" نے ایک کتاب "علم المساحة والمكعبات" کا ذکر کیا ہے۔ ممکن ہے یہ "رسالہ استخراج اضلاع مربعات مکعبات" ہی ہو۔

اس سلسلے میں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ ڈاکٹر آشتیانی نے جو اقتباس درج کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے مطالب مقدمہ "جبر ومقابلہ" کے مطابق ہیں۔ کتاب "خیام" کے حوالے سے ہم اس مقدمہ کا اردو ترجمہ نقل کرتے ہیں:

"اگلے محققین کی کوئی تصنیف اس بارے میں (مشکل
مقدمات جبری) مجھکو نہیں ملی۔ معلوم نہیں کہ تلاش وتحقیق کے
بعد وہ ان کو نہیں سمجھ سکے یا ان کو اپنے اثنائے تحقیق میں ان
مقدمات کی ضرورت ہی پیش نہ آئی یا ہماری زبان میں ان کی
کتاب کا ترجمہ نہیں ہوا.... پچھلے لوگوں میں سے ماہانی اس
مقدمے کا حل جبر ومقابلہ سے کر سکا ہے، جس کو ارشمیدس نے
اپنی کتاب "الکرۃ والاسطوانہ" کے دوسرے مقالے کی چوتھی
شکل میں مسلم مان کر استعمال کیا ہے تو ماہانی کو دوسرے چند
معادل کعاب اموال اور اعداد کی ضرورت پیش آئی، جن کو غور
کے بعد بھی وہ جب حل نہ کر سکا تو اس نے یقین کر لیا کہ ان کا
حل ناممکن ہے۔ یہاں تک کہ ابو جعفر خازن پیدا ہوا اور اس
نے ان مشکلات کو قطوع مخروطیہ سے حل کیا...۳۸"

مطالب کی یکسانیت سے صاف ظاہر ہے کہ یہ رسالہ بھی عمر خیام ہی کی تراوش خامہ کا

نتیجہ ہے، جو ''جبر و مقابلہ'' سے الگ ایک رسالہ ہے اور غالباً اس سے متقدم بھی ہے۔

۳۔ ترجمۂ خطبۂ تمجید یۂ ابی سینا: سعید نفیسی نے مجلّہ شرق۔۸، دورۂ اول میں لکھا ہے:

''در بعضی سفینہاے قدیم خطبہ بتازی از شیخ الرئیس
ابن سینا ثبت است کہ خطبہ ای است در توحید وظاہراً آن
خطبہ را امام عمر خیام در سال ۴۷۲ھ بخواہش بعضے از دوستان
خود در اصفہان ترجمہ کردہ است۔''[۳۹]

سعید نفیسی نے اس ترجمے کے دو نسخے اسی ۴۰ شمارے میں چھاپے ہیں۔ پہلے نسخہ میں جو قدیم ہے، یہ عبارت موجود ہے:

"ترجمة الخطبة لعمر بن ابراهيم النيسا پوری
الخيام الخ"

دوسرا نسخہ بھی خیام کی طرف اس طرح منسوب ہے:

فصل فی شرح الحکیم عمر بن الخیام الخ

معلوم نہیں سعید نفیسی نے کس کتابخانہ سے یہ نسخے حاصل کیے۔ ڈاکٹر عباس اقبال آشتیانی نے مجلّہ شرق کے اسی شمارے میں دو نسخوں کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''در سال ۴۷۲ھ کہ خیام در اصفہان بودہ بدرخواست
جماعتے از دوستان یکے از خطابہ ہای شیخ الرئیس ابو علی سینا را
از عربی بفارسی نقل کردہ واصل این خطابہ وترجمۂ فارسی آن
در مجموعہ از رسایل در تصرف حضرت آقاے حاج سید نصر اللہ
تقوی مدظلہ است..... ونسخہ از آن نیز در کتابخانۂ مدرسۂ
ناصری در جزو مجموعہ از رسایل ہست۔''[۴۱]

غالباً آقاے نفیسی نے کسی اور کتابخانے میں یہ نسخہ دریافت کیا ہے، کیونکہ مدرسۂ ناصری کے مجموعہ والے نسخہ کو عباس علی کیوان قزوینی نے میوۂ زندگی میں ۱۳۴۹ھ میں چھاپ

دیا تھا، جو بقول آقائے نفیسی ''اندک اختلافے با نسخ ما دارد۔'' ۴۲ اس اعتبار سے اس ترجمہ کے کم از کم تین نسخے ایران میں اور ایک ترکی میں دریافت ہو چکے ہیں۔ **تعلیقات** چہار مقالہ ۴۳ سے **معلوم** ہوا کہ خطبۂ تمجید یۂ ابن سینا مع ترجمۂ خیام چند اور رسالوں کے ساتھ عبدالباقی گولپیگاری نے کتابخانۂ رمزی، استنبول کی طرف سے ۱۳۳۲ھ شمسی میں چھاپ دیا ہے۔

اس ترجمے سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ خیام ۴۷۲ھ میں اصفہان میں موجود تھا۔ مجتبیٰ مینوی اس رائے کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''خبر از آنکہ خیام در سال ۴۷۲ ھ در اصفہان بودہ
> از ترجمہ ای کہ از خطبۂ تمجید یۂ ابن سینا نمودہ است الخ'' ۴۴

سعید نفیسی کے دونوں نسخوں میں اتنا اختلاف ہے کہ انھوں نے دونوں کو الگ الگ چھاپ دیا ہے۔ نسخۂ قدیم طویل اور نسخۂ جدید مختصر ہے۔ اول الذکر اس طرح شروع ہوتا ہے:

> ''با کا بادشاہ! دادار ایزد کامگار خداوندے کہ آغاز ہمہ
> چیز ھا از وست و باز گشت و انجام ہمہ چیز ھا بدوست الخ۔''

دوسرے نسخے کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

> ''پاک بادشاہی دادار ایزد کامیاب خود ہست کہ آغاز
> چیز ھا از وست و انجام و باز گشت ہمہ چیز ھا بدوست الخ''

۴۔ قصیدۂ فارسی: خیام کے نام سے گیارہ ابیات کی ایک **مختصر** نظم ''رباب نامہ'' سلطان ولد فرزند مولانا روم کے آخر میں درج ہے۔ یہ نسخہ جس کی کتابت ۷۰۴ھ ۴۵ کے قبل ہوئی تھی، قونیہ کے میوزیم (شمارہ۔ ۲۱۴۳) میں **محفوظ** ہے۔ مجتبیٰ مینوی کے توسط سے اس کی اشاعت ہوگئی ہے۔ عنوان نظم یہ ہے:

> "للخیام تحاوز اللہ عن سئیاتہ و رفع درجاتہ"

پوری نظم یہ ہے:

رہے نمود مرا راست سوے آبحیات — شبے بہ شہر رے اندر مفلسی ز قضات
نخست گفت کہ از کردگار دانش خواہ — اگر بخوانی بر آسمان بہ شب دعوات
حیات خویش بر آن گونہ بیقرار مکن — کہ بر تو زار بگرید پس از حیات ممات
وگر حیات نبات تو جز بقا باشد — پس از حیات نبات تو بہ حیات نبات
وگر ترا عرصاتی نمودہ اند ز دور — محققان حکایات و صادقان روات
تو در تر زدے محشر نشستہ ای و ہنوز — دل تو منتظر حشر و قصۂ عرصات
وگر غرض ز صلات و صیام فرمانست — تو سر مپیچ ز فرمان صوم و وردِ صلات
وگر ز حکمت کار صلات بے خبری — تو گر صلات پرستی بود صلات تولات
براہ حج شتابی و مال صرف کنی — ز راہ دور، ہمی تا برآوری حاجات
نخست قاضی حاجات را طلب پس حج — نخست معرفت نفس جوی پس عرفات
تو مایۂ ہمہ اشیائی گرچہ یک چیزی — چنانکہ صورت آحاد مایۂ عشرات [۴۶]

ڈاکٹر محمد معین نے تعلیقات چہار مقالہ [۴۷] اور ڈاکٹر صفا نے تاریخ ادبیات ایران [۴۸] میں بھی یہ نظم مجتبیٰ مینوی کے حوالے سے نقل کر دی ہے۔

۵۔ تقریر مختصر بعربی: ''میوۂ زندگی'' تالیف عباس علی کیوان قزوینی میں ایک مختصر سا رسالہ ہے، جو بقول پروفیسر سعید نفیسی کے عمر خیام ہی کا رسالہ ہے، ملاحظہ ہو:

> ''پس از آن (ترجمۂ خطبۂ ابن سینا بقلم خیام) تقریر دیگر بعربی انتشار دادہ اند کہ چوں در نسخۂ متعلق بمدرسۂ ناصری کہ آن نسخہ را از آن برداشتہ اند، این تقریر بلافاصلہ آمدہ و بنام دیگرے منسوب نیست و حال آنکہ تمام مندرجات آن مجموعہ کہ در کتابخانہ مدرسۂ ناصری است نام گویندہ و نویسندہ دارد، حدس زدہ اند کہ آن تقریر نیز از عمر خیام باشد و اگر چنین باشد تقریرے دیگر از عمر خیام است بجز آنچہ تاکنون

از آثار وے معروف بود۔'' ۴۹

لیکن مجلۂ شرق، دورۂ اول ہی کے شمارہ۔ ۸ / (۵۰) میں ڈاکٹر عباس اقبال آشتیانی نے اس کی نسبت ''مسلم نیست'' بتائی ہے۔ ملاحظہ ہو:

''رسالۂ عربی کوچک دیگرے کہ نسبت آن بہ خیام مسلم نیست۔''

۶۔ رسالۂ موسیقی عربی: مجتبیٰ مینوی نے اس رسالہ کا ذکر مجلۂ دانشکدۂ ادبیات، سال ۔۴، شمارہ ۔۲ میں اس طرح کیا ہے:

''از یک رسالۂ عربی دیگر از خیام دربارۂ موسیقی کہ آن نیز مشہور نیست بعد از ینہا بحث خواہم کرد۔'' ۵۱

اگرچہ اس وقت تک مجلۂ مذکور کے متعدد شمارے نکل چکے ہیں، مگر اب تک رسالۂ موسیقی پر بحث نہیں ہو سکی ہے۔ البتہ ڈاکٹر محمد معین نے چہار مقالہ ۵۲ کے آخر میں مجتبیٰ مینوی کی یادداشت سے استفادہ کر کے رسالہ کے متعلق حسب ذیل اطلاع بہم پہنچائی ہے:

''مجموعہ ایست در کتابخانۂ عمومی شہر مغنیسا (ترکیہ) بشمارہ۔ ۱۷۰۵ کہ رسالۂ ششم آن در موسیقی است و در ورقہای ۹۳. ب تا ۹۰. ب (پنج صفحہ) آن مجموعہ درج شدہ است۔ آقای مینوی از قراین حدس میزنند کہ نسخہ در قرن ہفتم کتابت شدہ۔ این رسالہ چنین آغاز می شود:

بسم الله الرحمن الرحيم من كلام لفيلسوف عمر الخيامى القول على اجناس الذى بالا ربعة ان نسبة المثل والثلث يقسم بثلاثة انساب فيكون ثلثة ابعاد وينحصر فى اربعة نغمات فلذلك سمى المثل والثلث بالذى بالاربعة...

وچنین پایان می پذیرد:

وان کان ایضاً فی نسبة الزائد جزء الآن النسبة متیٰ صغرت لایحس بائتلافها فی الامسموع ولله الحمد والمنّة نجزت الرسالة بعون الله وحسن توفیقه۔ آقای مینوی در انتساب این رسالہ بخیام شکے ندارند۔"۵۳۔

۲. رسالة فی کلیات الوجود: اگرچہ وجود پر خیال کا یہ رسالہ اتنا کافی مشہور ہے کہ بروکلمن نے بھی اس کا ذکر کیا ہے، مگر اس کے صرف تھوڑے سے نسخے دریافت ہوئے ہیں، اس بنا پر اس کو بھی اس مضمون میں شامل کرلیا گیا ہے۔

یہ مختصر سا رسالہ وجود کی فلسفیانہ بحث پر مشتمل ہے، جس میں الہیات وامور عامہ کے مسائل اور عقل، نفس، افلاک وعناصر کی ترتیبی پیدائش بیان ہوئی ہے۔ بقول علامہ ندوی مرحوم۵۴ کے اس رسالہ سے خیام کے دو اصولی عقیدوں کا پتا چلتا ہے:

۱۔عقول عشرہ اور نفوس فلک سے جو کدورت اور مادیت کے غبار سے پاک ہیں، ایجاد عالم کا آغاز ہوا۔ واجب الوجود سے عقل اول، عقل اول سے نفس اول اور عقل دوم علی ہذا الترتیب پیدا ہوئی۔ خلق کائنات کی تکمیل انسان پر اور انسان کی انتہا عقل ونفس پر ہوتی ہے۔ انسان کی عقل ونفس کا کمال یہ ہے کہ وہ پاکی، طہارت، نزاہت اور مادیت سے بری ہونے میں ان نفوس وعقول کے ساتھ ایسا تشابہ حاصل کرے کہ مادی انسان عالم مجردات کی مثال بن جائے۔

۲۔عمر خیام متکلمین کے مناظروں، حکماء کی دلیلوں، اسماعیلیوں کے باطنی طریقوں کو بے اثر سمجھ کر تصوف کے مشاہدات وانوار سے فیض چاہتا ہے۔ بقول ندوی مرحوم کے خیام نے اختصار کے ساتھ جو کچھ بیان کیا ہے، وہی غزالی کی **"منقذ من الضلال"** میں شرح وتفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔

اس رسالہ کے دیباچہ میں ہے کہ جب خیام، فخر الملک کے دربار میں باریاب ہوا تو اس نے حکیم سے علم کلیات کے بارے میں یادگار کی خواہش کی تو یہ مختصر سا رسالہ مرتب ہوا ، جو ضخیم کتابوں سے زیادہ سودمند ہے۔

فخر الملک کی شخصیت کے باقاعدہ تعین کے سلسلے میں ایک دشواری اس بنا پر ہے کہ اس شخص کا نام مختلف نسخوں میں مختلف طور پر آیا ہے، مثلاً

ا۔ کتابخانہ ملی پیرس ۵۵؎ (مجموعۂ روضۃ القلوب) بحوالۂ کریستنسن فخر الملک بن مؤید الملک

۲۔ نسخۂ موزۂ برطانیہ بحوالۂ سید سلیمان ندوی ۵۶؎ فخر الملک بن مؤید الملک

۳۔ یک صفحہ از نثر فارسی، خواجہ امام عمر خیام در سفینۂ بحوالۂ مجلۂ شرق، دورۂ اول، شمارۂ سوم ۵۷؎ الملک العادل فخر الملک بن مؤید الملک

۴۔ نسخہ ای در مجموعۂ کتابخانۂ مجلس شورای ملی تہران بحوالۂ فہرست کتابخانہ ۵۸؎ ومقالۂ آقاے سعید نفیسی ۵۹؎ فخر الملک

سب سے پہلے میرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی نے تعلیقات چہار مقالہ ۶۰؎ میں عمر خیام کی تصانیف کے ضمن میں اس رسالہ پر بحث کرتے ہوئے فخر الملک بن مؤید کو مشتبہ قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر عباس اقبال آشتیانی نے بھی مجلۂ شرق کے شمارۂ ہفتم ۶۱؎ میں اس طرح لکھا ہے:

> ”رسالۂ وجود فارسی کہ آن را خیام براے فخر الملک بن مؤید الملک نوشتہ و معلوم نشد کہ این فخر الملک کیست؟ پسر ابوبکر مؤید الملک بن خواجہ نظام الملک یا فخر الملک ابوالفتح مظفر پسر نظام الملک و وزیر برکیارق و برادر مؤید الملک کہ باشتباہ او را پسر مؤید الملک ضبط کردہ اند و یک قسمت از این رسالہ را نگارندہ از جنگی خطی در شمارۂ سوم مجلۂ شرق..... درج کردہ

ودر عنوان آن قسمت مسطور است:

"قال الحکیم الکامل ابو الفتح بن ابراھیم
الخیام فی رسالة وضعھا فی علم الکلیات للملك
العادل فخر الملك بن مؤید الملك،،

جزء دوم این عبارت مغشوش است۔ معلوم نشد کہ
چرا فخر الملک را 'الملک العادل' نوشتہ است۔"

گویا اس نام میں دو اشتباہ ہوئے، ایک تو فخر الملک کو مؤید الملک کا بیٹا قرار دیا ہے اور پھر اسے 'ملک عادل' لکھا ہے۔

سید سلیمان ندوی مرحوم نے بھی کتاب "خیام" میں اس طرح ۶۲ شبہ کا اظہار کیا ہے:

"مگر یہ فخر الملک بن مؤید صریح تحریف ہے، کیونکہ فخر
الملک اور مؤید الملک دونوں باپ بیٹے نہیں، بلکہ بھائی بھائی
تھے۔ دونوں نظام الملک کے بیٹے تھے اور دونوں وزیر تھے۔"

ان عالموں کا اشتباہ بالکل بجا تھا۔ یہ شبہ مجلس شورای ملی، تہران کے نسخہ سے رفع ہوگیا، جس میں فخر الملک کے بعد کوئی اور نام نہیں۔ مجلس کی ۶۳ فہرست میں رسالہ کی ابتدائی چند سطریں جلی قلم سے لکھی ہوئی ہیں۔ اس میں اور سعید نفیسی کے شائع کردہ متن ۶۴ میں صراحتاً صرف 'فخر الملک' کے نام میں صریحی تحریف ہوئی ہے۔ وہ نظام الملک کا بیٹا تھا جو پہلے برکیارق کا وزیر مقرر ہوا اور ۵۰۰ھ میں کسی ۶۵ باطنی کے ہاتھوں قتل کر دیا گیا۔ اسی فخر الملک کے نام پر حکیم مظفر اسفزاری نے رسالۂ آثار علوی لکھا تھا، جو بقول آقای قزوینی:

"بزبان سادۂ فارسی بابیانے جزل وشیوا وبا بہترین
اسلوب نگارش جمع وتالیف شدہ است۔" ۶۶

رسالۂ وجود کے جن نسخوں کا ذکر اوپر ہوا ہے، ان میں سے برٹش میوزیم کا نسخہ ناقص ہے۔ چنانچہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے اس نسخہ کی بنیاد پر اس کو طبع کر دیا ہے۔ ۶۷ تھوڑے

سے حصے کا مقابلہ پیرس کے نسخے سے بھی کرلیا ہے، لیکن بقیہ حصہ میں اکثر جگہ عبارت چھوٹ گئی ہے۔ البتہ سوامی رام تیرتھ صاحب حیدر آبادی نے ۱۹۴۱ء میں رباعیات خیام کے انگریزی ترجمہ کے محققانہ وعالمانہ مقدمہ میں اس کو مع چند اور رسالوں کے جن میں عربی رسالہ "الاوصاف والموصوفات" بھی شامل ہے۔ متن اور انگریزی ترجمہ کے ساتھ شائع کردیا ہے۔ راقم حروف کا ارادہ ہے کہ ایرانی نسخہ سے مقابلہ کر کے اس کو دوبارہ شائع کردیا جائے۔ میرے دوست ڈاکٹر مختار الدین احمد (مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) خیام کے دوسرے عربی رسالے "الاوصاف والموصوفات" کو ترتیب دے کر شائع کرنا چاہتے ہیں۔

(اورینٹل کالج میگزین، جلد۔ ۳۵، عدد۔ ۳، عدد مسلسل۔ ۱۳۷، مئی ۱۹۵۹ء، ص۔ ۱۔ ۲۴)

حواشی وحوالہ جات

۱۔ ندوی، سید سلیمان، مطبع معارف، اعظم گڈھ، بار اول، ۱۹۳۳ء

۲۔ معین، ڈاکٹر محمد، تعلیقات چہار مقالہ، کتابفروشی زوار، تہران، ۱۳۳۳۔۱۳۲۷ شمسی

۳۔ ایضاً، ص۔ ۲۹۴۔۳۲۷

۴۔ داتار صاحب حیدر آبادی نے جو بعد میں سوامی رام تیرتھ ہو گئے۔ رباعیات خیام کا انگریزی ترجمہ ۱۹۴۱ء میں شائع کیا اور اس پر جو محققانہ و فاضلانہ مقدمہ لکھا، اس میں خیام کے متعدد رسالے مع انگریزی ترجمے کے شامل کردئے۔ اگر یہ کتاب پہلے مل گئی ہوتی تو بعض نہایت مفید باتوں کا اضافہ ہو گیا ہوتا۔

۵۔ مجلۂ دانشکدۂ ادبیات، تہران، سال۔ ۴، شمارہ۔ ۲، ص۔ ۲۷۔۳۷

۶۔ ایضاً، شمارہ۔ ۳، ص۔ ۸۶

۷۔ عنوان اس طرح لکھا ہے: ''**رسالہ کتبھا عمر الخیام جواباً لثلث مسائل اطلع علی عزیز خطاب سید شیخ الرئیس امین الحضرة**''۔ ریتر نے صرف بروکلمن کا حوالہ دیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ بھی اس کو چھپے ہوئے رسالے کا مترادف خیال کرتا ہے۔

۸۔ بروکلمن تتمہ اول، ص۔ ۸۵۵ پر اس نسخے کے ضمن میں یہ الفاظ لکھے ہیں: Drei

metaphysische Traktata,۔اگر چہ جامع کا حوالہ نہیں، البتہ خیام میں چھپا ہوا رسالہ Nadvi 373/411. ein 4. Asad 1933 f.167/a171/a جامع میں بھی چھپا ہے۔

۹۔ مجتبیٰ مینوی (مجلّہ ۴‘۳،ص۔۸۷) معین (تعلیقات،ص۔۳۲۷ ح)،فہرست مجلس ۔۲،ص۔۳۹۸ پر سال طباعت ۱۳۳۵ش درج ہے۔یہی بروکلمن میں ہے، لیکن کتاب ''خیام''،ص۔۱۵۹‘۱۸۳‘۳۷۳‘۳۹۳ پر ۱۳۳۰ش، مگر ص۔۱۵۹‘۱۸۳ پر مقابل عیسوی سنہ ۱۹۱۷ دیا ہے، جو ۱۳۳۰ش کے بجائے ۱۳۳۵ش کے برابر ہے۔ مجلّہ شرق،ص۔۴۷۹‘۴۸۲ پر بھی ۱۳۳۰ش ہی ہے۔یہ مجموعہ سامنے نہیں ہے، اس لیے اختلاف کی ہے وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔

۱۰۔ مجلّہ دانشکدۂ ادبیات، تہران، سال۔۴و۳،ص۔۸۷

۱۱۔ ایضاً

۱۲۔ ایضاً، سال چہارم، شمارہ۔۲،ص۔۲۷

۱۳۔ یہ رسالہ ''جامع البدائع'' میں چھپا تھا۔سید سلیمان ندوی مرحوم نے کتاب ''خیام'' میں دوبارہ چھاپا۔ملاحظہ ہو ص۔۳۷۳۔۳۸۴

۱۴۔ ندوی، سید سلیمان، خیام،ص۔۱۹۱۔۱۹۲

۱۵۔ علماے مصر میں سے ایک صاحب محی الدین جری کردی نے ۱۳۳۰۔۱۳۳۵ میں مطبع سعادت مصر سے ابن سینا اور خیام کے چند رسائل کا مجموعہ ''جامع البدائع'' کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ اس میں خیام کے تین رسالے رسالہ کون وتکلیف، الجواب عن ثلاث مسائل اور رسالۃ الوجود شامل تھے۔یہ رسالے نورالدین بک مصری کے ایک مجموعے سے حاصل کیے گئے تھے، جس کی کتابت ۶۹۹ ہجری میں ہوئی تھی۔

۱۶۔ ف۔ وپکے کے توسط سے ۱۸۵۱ء میں فرنچ ترجمہ کے ساتھ پیرس سے شائع

ہو گیا ہے۔

۱۷۔ ندوی، سید سلیمان، خیام،ص۔۱۰۰۔۱۰۱

۱۸۔ ایضاً،ص۔۱۰۳

۱۹۔ یہ ایلک خانی خاندان کا گل سرسبد تھا۔اس خاندان نے ۳۸۰ھ سے ۶۰۹ھ تک حکومت کی ہے۔کبھی خودمختار حیثیت سے اور کبھی غزنویہ، سلجوقیہ، قراخطائیہ، خوارزم شاہیہ کے باجگزار کی حیثیت سے۔شمس الملک اپنے باپ طمغاج خان ابراہیم کی وفات پر ۴۶۰ھ میں تخت نشین ہوا اور ۴۷۲ھ میں وفات پائی۔اس نے الپ ارسلاں سلجوقی کی لڑکی سے شادی کی تھی اور خود اپنی چچازاد بہن ترکان خاتون کی شادی ملک شاہ سے کی۔وہ بڑا علم دوست تھا۔عوفی نے ''جوامع الحکایات'' میں خصوصیت کے ساتھ یہ صفت ظاہر کی ہے۔(بحوالہ ندوی، ایضاً،ص۱۰۶۔۱۰۸ اور تاریخ بیہقی، مرتبہ پروفیسر نفیسی، جلد سوم،ص۔۱۱۵۶/بعد۔

۲۰۔ ندوی، سید سلیمان، خیام،ص۔۹۹

۲۱۔ مجلّہ شرق، ش۔۸،ص۔۴۸۰۔۴۸۱

۲۲۔ ایضاً

۲۳۔ ابوعبداللہ محمد عیسیٰ ماہانی تیسری صدی ہجری کا مشہور ریاضی داں۔(دہخدا، لغت نامہ، جلد۔اول،ص۔۶۰۴

۲۴۔ ابوجعفر خازن خراسانی، وفات درمیان ۳۵۰۔۳۶۰ھ۔کارنامے کے لیے ملاحظہ ہو: لغت نامہ، ج۔ا،ص۔۳۹۰۔۳۹۱

۲۵۔ مقتول ۴۰۸ھ' ملاحظہ ہو: چہار مقالہ،ص۔ ۱۱۸۔۱۲۰، تعلیقات، مرتبہ ڈاکٹر معین، ص۔۴۱۹۔۴۲۲

۲۶۔ کذا در آثار الباقیہ (مقدمہ)

۲۷۔ مساوات

۲۸۔ Trigonometry یا علم مثلثات

۲۹۔ متوفی ۴۰۵ھ' عضد الاولہ اور شرف الدولہ کا درباری منجم۔ اس کا پورا نام ابو سہیل بیژن کوہی پسر رستم طبری تھا۔

۳۰۔ پیدائش۔ ۳۲۸ھ، وفات۔ ۳۷۶ھ۔ اس کے کارناموں کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: لغت نامہ دہخدا، جلد اول، ص۔ ۹۲۱

۳۱۔ متوفی۔ ۳۷۹ھ

۳۲۔ ۳۳۸ھ۔ ۳۷۲ھ

۳۳۔ اس کا جواب ۸/ اور ۲/ رہو۔

۳۴۔ مثلاً '۱' یا انگریزی کا 'x' جو الجبرے میں عدد مجہول کے لیے علامت فرض کر لیتے ہیں۔

۳۵۔ رسالۂ شرق، ص۔ ۴۸۲

۳۶۔ ایضاً، ص ۱۶۵۔ ۱۶۷

۳۷۔ ایضاً، ص۔ ۱۶۷

۳۸۔ ایضاً، ص۔ ۱۷۰۔ ۱۷۱

۳۹۔ ایضاً، ص ۴۴۹

۴۰۔ ایضاً، ص ۴۵۲ تا ۴۵۹

۴۱۔ ایضاً، ص۔ ۴۷۰۔ ۴۷۱

۴۲۔ ایضاً، شمارہ۔ ۱۱، ص۔ ۶۶۰

۴۳۔ معین، دکتر محمد، ایضاً، ص ۶۲۴۔ قاضی اختر میاں جونا گڑھی نے اپنے مجموعۂ مقالات انگریزی (طبع۔ ۱۹۴۵) میں ابن سینا کا عربی متن اور خیام کا فارسی ترجمہ چھاپ دیا ہے اور قیاس کیا ہے کہ ان دونوں کا نسخہ کہیں اور نہیں ہے، حالانکہ سعید نفیسی اور ڈاکٹر آشتیانی ربیع الاول ۱۳۵۰ھ (۱۹۳۱ء) میں ان کے نسخے دریافت

کر چکے تھے۔

۴۴۔ مجلۂ دانشکدۂ ادبیات تہران، سال ۔۴، شمارہ ۔۲، ص ۔۳۷

۴۵۔ اس لحاظ سے یہ نسخہ کافی اہم ہے کہ اس کی کتابت خود مصنف کی زندگی ہی میں ہوئی تھی۔ قونیہ کے میوزیم کی موجودگی سے اس کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ ایسے اہم نسخے کے سارے مندرجات درخور اعتناء ہوں گے۔

۴۶۔ مجلۂ دانشکدہ، سال دوم، شمارہ ۔۴، ص ۔۴۷

۴۷۔ تعلیقات چہار مقالہ، مرتبہ ڈاکٹر محمد معین، ص ۔۶۲۳

۴۸۔ ڈاکٹر صفا، ڈاکٹر ذبیح اللہ، تاریخ ادبیات ایران، جلد دوم، ص ۔۵۳۰

۴۹۔ مجلۂ شرق، دورۂ اول، شمارہ ۔۱۱، ص ۔۶۶۰

۵۰۔ ایضاً، ص ۔۴۸۲

۵۱۔ ایضاً، ص ۔۵۷

۵۲۔ ایضاً، ص ۔۶۲۴

۵۳۔ تکملہ ۔۱، ص ۔۸۵۵

۵۴۔ ندوی، ایضاً، ص ۔۲۰۱ ۔۲۰۵

۵۵۔ فہرست بلوشہ، جلد ۔۱، ص ۔۱۰۸، نمرۂ ۔۷

۵۶۔ ندوی، ایضاً، ص ۔۲۰۱، ۲۱۴

۵۷۔ مجلّہ شرق، ایضاً، ص ۔۱۶۷

۵۸۔ فہرست کتابخانۂ مجلس شورای ملی، تہران، ج ۔۲، ص ۔۴۰۶ ۔۴۰۷

۵۹۔ مجلۂ شرق، دورۂ اول، شمارہ ۔۱۱، ص ۔۶۴۱

۶۰۔ میرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی، تعلیقات چہار مقالہ، ص ۔۳۲۷

۶۱۔ مجلّہ شرق، جلد ۔۷، ص ۔۴۸۲

۶۲۔ ندوی، سید سلیمان، خیام، ص ۔۲۰۲

۶۳۔ فہرست کتابخانہ مجلس شورای ملی، تہران، ج۔۲، ص۔۴۰۶۔۴۰۷

۶۴۔ مجلۂ شرق، شمارہ۔۱۱، ص۔۶۴۳

۶۵۔ آقای قزوینی نے تعلیقات چہار مقالہ (راجع بہ ص۔۱۰۱) میں سنجر کے ہاتھوں اس کا قتل ہونا بتایا تھا، لیکن پھر ایک خط میں اس کی تصحیح کر دی۔ (تعلیقات مذکور، مرتبہ ڈاکٹر معین، جلد۔۳، ص۔۳۷۳

۶۶۔ قزوینی، ایضاً ص۔۳۷۳

۶۷۔ خیام، ایضاً ص۔۴۱۴۔۴۲۳

☆☆☆

عمر خیام اور خاقانی

مولانا امتیاز علی خاں عرشی

حکیم افضل الدین خاقانی نے ایک مثنوی لکھی ہے، جس کا نام ''تحفۃ العراقین'' ہے۔ اس کے آخر میں اس نے اپنے والدین، دادا اور چچا کا بھی ذکر کیا ہے۔ چونکہ یہ بچپن میں سایۂ پدری سے محروم ہو گیا تھا اور اس کے چچا نے اس کی تربیت کی تھی، اس لیے خاقانی نے اس کا ذکر بے حد احسان مندانہ کیا ہے۔

''تحفۃ العراقین'' ۱۸۵۵ء میں منشی ابوالحسن مدرس اول فارسی، آگرہ کالج، کے تحشیہ و تصحیح کے ساتھ مطبع مدرسہ آگرہ میں بانتظام پنڈت کدار ناتھ چھپی تھی۔ اس ایڈیشن کے صفحہ ۱۹۷ پر ایک عنوان ہے ''در مدح عم خود عمر خیام کہ در اہتمام و تربیت او بود''۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عمر خیام جو نیشاپور کا باشندہ اور اپنے عہد کا بہت بڑا ریاضی اور ہیئت کا عالم تھا، خاقانی کا چچا تھا۔ لیکن عنوان مذکورہ بالا کے تحت جو اشعار لکھے گئے ہیں، ان کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

بگریختہ ام ز دیوِ خِذلان در سایۂ عُمَرؓ ابن عثمان

ہم صدرم و ہم امام و ہم عم صدر اجل امام اکرم

برہانی و ہندسی مقالش افلاطون و ارسطو عیالش
از علمش دادہ دہر محدت ایک ثلث بہ ہرمس مثلث
آگے چل کر لکھا ہے:
چوں دید کہ در سخن تمام حسان عجم نہاد نامم
چوں پائی دلم بگنج در سوخت سالم در بست و پنج در کوفت
چوں دید کز اہل نطق بیشم از شادی آں بمرد پیشم (۱) اسی کتاب کا ایک اور عنوان ہے، "در بیان نسبت از جانب عم کہ طبیب بود" (۲) اس کے تحت لکھتے ہیں:
وز سوئے عمم طبیب گوہر بقراط سخن بہ ہفت کشور
اپنے والد کے بارے میں جو شعر لکھے ہیں، ان کا عنوان ہے، "در مدح پدر خویش شیخ علی نجار"۔ (۳) اس حصے کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:
از برّ خلاقم سبک بار بر مسائدۂ علیِ نجار
ایک اور موقع پر اپنے باپ کا ذکر اس طرح کیا ہے:
دل در سخنِ محمدی بند اے پورِ علی ز بوعلی چند (۴)
ملک الوزرا جمال الدین موصلی نے خاقانی سے پوچھا ہے کہ تمہارا وطن کون سا شہر ہے، اس کے جواب میں فرماتے ہیں:
گفتم متعلمی سخن داں میلاد من از بلاد شرواں (۵)
ایک قصیدے کا شعر ہے:
عیب شرواں مکن کہ خاقانی ہست ازاں شہر کابتداش شراست (۶)
"تحفتہ العراقین" کے مذکورہ بالا اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ خاقانی علی کا بیٹا اور عمر بن عثمان کا بھتیجا تھا، جس کا یہ مطلب نکلا کہ خاقانی کے دادا کا نام عثمان تھا۔ نیز یہ کہ اس کا مولد و منشا شروان تھا۔ چچا نے اسے 'حسان العجم' کا خطاب دیا تھا۔ اپنے نام کے بارے میں لکھتا ہے:

بدل من آمدم اندر جہاں سنائی را   بدیں دلیل پدر نام من بدیل نہاد (۷)

رشید وطواط نے خاقانی کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا۔ جواب میں خاقانی نے جو قصیدہ لکھا، اس کے شروع میں رشید کے دو شعر دیوان خاقانی میں نقل کیے گئے ہیں۔ ان میں دوسرا شعر یہ ہے:

افضل الدین بوالفضائل بحر فضل   فیلسوف دین فزائے کفر گاہ (۸)

دیوان خاقانی کے مصحح محمد عباسی نے اپنے دیباچہ (ص۔۲۱) میں مجدالدین خلیل کا ایک قطعہ مدحیہ نقل کیا ہے، اس کا پہلا شعر ہے:

افضل الدین امام خاقانی   تاجدار ممالک سخن است

ان حوالوں کے پیش نظر خاقانی کا پورا نام ہم یوں لکھ سکتے ہیں: 'افضل الدین ابوالفضائل بدیل بن علی بن عثمان خاقانی شروانی'۔

دیوان خاقانی میں دو قصیدے ایسے موجود ہیں، جن میں سے ایک اس نے اپنے چچا کی اور دوسرا والد کی مدح میں لکھا ہے۔ پہلے کا عنوان ہے۔ ''در تحسّر و تالّم از مرگ کافی الدین عمر بن عثمان عموی خود سرودہ است''۔ اس کے یہ شعر قابل ملاحظہ ہیں:

زاں عقل بدو گفت کہ اے عمر عثمان   ہم عمر خیامی و ہم عمر خطاب

ادریس قضا بینش و عیسائے شفا بخش   دادہ لقبش در دو ہزو اضع القاب (۹)

ان شعروں میں خاقانی نے اپنے چچا کو ''عمر عثمان'' کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ عمر کی اضافت ابنی ہے، یعنی مراد خاقانی 'عمر بن عثمان' ہے۔ اس کے بعد چچا کو چار عظیم المرتبت اشخاص سے استعارہ کیا ہے، جو یہ ہیں: عمر خیام، عمر بن خطاب، ادریس اور عیسی ۔ علامہ قزوینی نے چہار مقالہ نظامی عروضی کے حاشیہ میں شعر اول کا یہ مطلب لکھا ہے کہ:

> ''یعنی ہم در علم دارای اولین رتبہ مانند عمر خیام و ہم در عدل صاحب نخستین درجہ چون عمر خطاب''۔ (۱۰)

محمد عباسی اپنے دیباچے میں اس شعر کا مطلب یہ لکھتے ہیں:

''فضیلت عمر خیام را بانبوغ عمر خطاب در وجود خویش

جمع داشت۔''(۱۱)

ان دونوں فاضلوں کے بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ عمر عثمان اور عمر خیام کو ایک نہیں دو جداگانہ شخصیتیں مانتے تھے۔

خاقانی نے ''تحفۃ العراقین'' میں اپنے دادا کے مخصوص ہنروں کا ذکر کرنے کے بعد چچا کے بارے میں کہا ہے:

وز سوئے عم طبیب گوہر بقراط سخن بہفت کشور (۱۲)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا چچا طبیب تھا، اور اس درجے کا طبیب تھا کہ اس علم کو اس کا ہنر خاص مانا جاتا تھا۔ قارئین اس بات کو ذہن نشیں رکھیں۔ ایک اور قصیدے کے عنوان میں عمر عثمان کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ ''در مدح عموئ خود کافی الدین شروانی گوید'' (۱۳) یہ نسبت ظاہر کرتی ہے کہ کافی الدین عمر بن عثمان کا وطن شروان تھا۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے۔

خاقانی نے اپنے چچیرے بھائی کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے۔ اس کا عنوان ہے۔ ''در مدح امام الشارع وحید الدین ابوالمفاخر پسر کافی الدین عمر، پسر عم و داماد خاقانی''۔ اس قصیدے کا یہ شعر توجہ چاہتا ہے:

ظاہر است انسابش از 'کافی عمر' در گیر وَرد
می شمر تا قد سلف عثمان و ابراہیم او (۱۴)

جہاں تک اس شعر پر میں نے غور کیا ہے، یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ خاقانی کے چچیرے بھائی کا نام و نسب یہ ہے۔ ''وحید الدین ابوالمفاخر عثمان بن کافی الدین عمر بن عثمان بن ابراہیم شروانی'' اور اگر یہ درست ہے، تو پھر خاقانی کے چچا کا نام کافی الدین عمر بن عثمان بن ابراہیم شروانی طبیب ہونا چاہیے۔

مذکورہ بالا دو قصیدوں میں سے دوسرا خاقانی نے اپنے والد کی مدح میں لکھا ہے۔ اس

کے آخر میں ہے:

ہم بہ ثنائے پدر ختم کنم چوں مقیم نان من از خوان اوست، جاگی از خان او

گر ز قضائے ازل عہد 'عمر' در گذشت تا بہ ابد بگذرد نوبت 'عثمان' او (۱۵)

ظاہر ہے کہ دوسرے شعر میں 'عمر' سے مراد خاقانی کا چچا 'عمر بن عثمان' اور 'عثمان' سے مراد اس کا چچیرا بھائی 'عثمان بن عمر عثمان' ہے۔

اب خیام کی طرف آیئے۔ علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم و مغفور نے اپنی بے نظیر کتاب ''خیام'' میں اس فیلسوف کے متعلق سارا مسالا یک جا کر دیا ہے۔ اس میں جن کتابوں کے حوالے دیے گئے ہیں، ان میں سب سے قدیم تذکرہ نگار ظہیر الدین ابوالحسن علی بن ابی القاسم زید البیہقی ہے۔ یہ تذکرہ نگار بقول خود اپنے والد کے ہمراہ خیام کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور خیام نے، جو اس کے باپ ابوالقاسم زید کا دوست تھا، اس کا امتحان لیا تھا۔ تذکرہ نگار نے اسے ۵۰۷ھ کا واقعہ بتایا ہے۔ (۱۶)

خیام کے داماد محمد بغدادی سے اس تذکرہ نگار کے تعلقات تھے۔ چنانچہ اس کے حوالے سے خیام کی وفات کا یہ قصہ لکھا ہے کہ بوعلی سینا کی مشہور کتاب ''الشفاء'' کا وہ حصہ خیام کے زیرِ مطالعہ تھا، جو الٰہیات سے متعلق ہے۔ دورانِ مطالعہ خیام سونے کا خلال دانتوں میں کرتا جاتا تھا۔ جب ''باب الواحد والکثیر'' پر پہنچا تو خلال ورقوں کے بیچ میں رکھ کر کتاب بند کر دی اور کہا کہ چند سمجھ دار آدمیوں کو بلاؤ، میں وصیت کروں گا۔ یہ کہہ کر اٹھا اور نماز شروع کر دی اور نہ کچھ کھایا نہ پیا، حتیٰ کہ عشاء کی نماز پڑھی۔ اس کے بعد سجدے میں گیا اور یہ دعا مانگی: ''اے اللہ، تو جانتا ہے کہ میں نے اپنے امکان تک تجھے پہچانا۔ اب مجھے بخش دے کہ میرا تجھے پہچاننا تیری بارگاہ میں میرا وسیلہ ہے۔'' یہی دعا کرتے کرتے روح پرواز کر گئی۔ (۱۷)

ایسا تذکرہ نگار جو خیام کے دوست کا بیٹا اور خیام کے داماد کا دوست یا شناسا تھا اور خود اپنے باپ کے ساتھ خیام کی خدمت میں حاضر بھی ہو چکا تھا۔ اپنی کتاب ''تتمہ صوان

الحکمہ'' میں، جو ۵۴۹ ھ کی تالیف ہے، اس عنوان کے تحت خیام کا ذکر کرتا ہے: ''الدستور الفیلسوف حجتہ الحق عمر بن ابراہیم الخیام''۔ (۱۸)

علامہ سید سلیمان ندوی نے مذکورہ بالا کتاب کے آخر میں خیام کے وہ تمام رسائل نقل کردیے ہیں، جو انھیں دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں ایک ان دو خطوں پر مشتمل ہے جو قاضی ابوالنصر محمد بن عبدالرحیم النسوی اور خیام نے ایک دوسرے کو لکھے ہیں۔ اس مراسلت کا آغاز (حمد و نعت کے بعد) اس طرح ہوتا ہے:

"کتب ابو نصر محمد بن عبدالرحیم — سنته ثلاث و سبعین دار بعماته الی السید الاجل حجته الحق، فیلسوف العالم، نصرة الدین سید حکماء المشرق و المغرب ابی الفتح عمر بن ابراهیم الخیامی ...الخ۔" (۱۹)

بیہقی نے خیام کے ذکر کے عنوان میں اور اس مراسلت کے مولف نے اپنے دیباچے میں عمر خیام کے باپ کا نام 'ابراہیم' لکھا ہے، نیز خیام کے مذکورہ بالا رسائل کے مخطوطوں میں اگر خیام کی ولدیت لکھی گئی ہے تو وہ صرف اور فقط 'ابراہیم' ہے۔ کسی ایک شخص نے بھی چاہے وہ خیام کا معاصر ہو یا اس کے بعد کا تذکرہ نگار اس کی ولدیت بجز ابراہیم اور نہیں لکھی۔

اس اتفاق کی پشت پر خود خیام کا اپنا بیان بھی ہے۔ سید صاحب نے اس کا فارسی رسالہ نقل کیا ہے، جس کا عنوان ہے: ''رسالہ بالعجمیہ العمر بن الخیام فی کلیات الوجود۔'' اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

''چنین گوید ابوالفتح عمر بن ابراہیم الخیامی... الخ۔'' (۲۰)

اس کے بعد یہ کہنے کی گنجائش مطلق نہیں رہتی کہ خیام کے باپ کا نام ابراہیم نہیں بلکہ عثمان تھا، اور وہ خاقانی کا چچا تھا، کیوں کہ یہ خود خاقانی کی تصریح کے بھی خلاف ہے اور خیام

کے بیان سے بھی مطابقت نہیں رکھتا۔ اس پر اگر اس حقیقت کا اضافہ کر لیا جائے تو میرے بیان کی مزید تائید ہوگی کہ خیام کا مولد و منشا نیشا پور تھا۔ جو صوبہ خراسان میں واقع ہے اور خاقانی اور اس کے باپ اور چچا شروان کے باشندے تھے، جو صوبہ آذر بائجان کا ایک شہر ہے اور ان دونوں میں بہت بعد ہے۔

یہ امر بھی کم لائق توجہ نہیں کہ خاقانی نے اپنے چچا کے طبیب ہونے کا ذکر شد و مد سے کیا ہے اور خیام کی شہرت طبیب کی حیثیت سے بالکل نہیں۔ (۲۱)

لہذا ہمیں یہ مان لینا چاہیے کہ ''تحفۃ العراقین'' کے مطبوعہ نسخے میں سے جو عنوان آغاز مضمون میں نقل کیا گیا ہے، اس میں لفظ 'عمر خیام' یا تو اس نسخے کے کاتب کی اپج ہے، جو مطبوعہ کا اصل تھا یا اس مطبوعہ کے مصحح کو دھوکہ ہوا۔ خاقانی کا چچا عمر بن عثمان تھا اور خیام کا نام عمر بن ابراہیم الخیام تھا اور یہ دونوں جداگانہ شخصیتیں تھیں۔ (۲۲)

(ماہنامہ برہان، دہلی، فروری ۱۹۷۲ء، ص۔۱۱۳۔۱۱۹)

حواشی و حوالاجات

☆ خیام سے متعلق مولانا عرشی کے دو اور مضامین بعنوان ''عمر خیام کا ایک نادر نسخہ'' اور ''رباعیات خیام مرصاد العباد میں'' مرتب کی ایک دوسری کتاب بعنوان ''مقالات عرشی'' میں ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔

۱۔ تحفۃ العراقین، ص۔۱۸۹

۲۔ ایضاً، ص۔۱۸۹

۳۔ ایضاً، ص۔۱۹۳

۴۔ ایضاً، ص۔۵۲

۵۔ ایضاً، ص۔۳۱

۶۔ دیوان خاقانی، چاپ پیروز، تہران، ۱۳۳۶ش، ص۔۶۲

۷۔ ایضاً، ص۔۷۹۷

۸۔ ایضاً، ص۔۲۶، اصل۔ کفر کاہ۔

۹۔ ایضاً، ص۔۵۳

۱۰۔ چہار مقالہ نظامی، بصحیح علامہ قزوینی، مطبع بریل، ۱۳۲۵ھ، ص۔۴۳

۱۱۔ دیباچہ دیوان خاقانی، ص۔۲۵

۱۲۔ تحفۃ العراقین،ص۔۱۸۹

۱۳۔ دیوان خاقانی،ص۔۷۸

۱۴۔ ایضاً،ص۔۵۹۷

۱۵۔ ایضاً،ص۔۳۳۲

۱۶۔ تتمہ صوان الحکمہ ،لاہور،۱۳۵۱ھ،ص۔۱۱۶

۱۷۔ ایضاً،ص۔۱۱۶

۱۸۔ ایضاً،ص۔۱۱۲

۱۹۔ سید سلیمان ندوی،خیام،دارالمصنفین ،اعظم گڑھ،ص۔۳۷۵

۲۰۔ ایضاً،ص۔۴۱۴

۲۱۔ اس سے پوری طرح اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں کہیں بھی خیام کا ذکر آتا ہے،وہاں منجم،ریاضی داں،فلسفی کے ساتھ طبیب کا ذکر بھی آتا ہے۔ مرتب

۲۲۔ اگرچہ زمانی اعتبار سے اس کا امکان نظر آتا ہے،کیونکہ معتبر منابع کے مطابق خیام کا زمانہ پانچویں چھٹی صدی ہجری (تولد: ۴۱۲ھ مطابق ۲۲ یا ۱۰۲۱ء، وفات ۱۶ یا ۵۱۵ھ مطابق ۱۱۲۲ء) ہے اور افضل الدین بادل (ابراہیم) بن علی خاقانی شروانی کا زمانہ (تولد: ۵۱۵ھ مطابق ۲۱یا۱۱۲۲ء،وفات:۵۲یا۵۵۱ھ مطابق ۱۱۹۹ء) ہے،لیکن جس طرح سے اس نے اپنے چچا کا ذکر کیا ہے،اس سے یہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ ساتھ ہی ریپکا نے ولچیوسکی (Vel'chevsky) کی تصنیف ''خاقانی'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس کے طبیب چچا عمر جو اس کے استاد اور سرپرست بھی تھے،ان کا انتقال ۵۴۵ھ مطابق ۱۱۵۰ میں ہوا تھا،جبکہ عمر خیام کی موت اور خاقانی کی پیدائش ایک ہی سال وقوع پذیر ہوئیں۔ بحوالہ Jan Rypka, History of Iranian Literature, Dordrecht, 1968, P-190& 201-205۔ مرتب

☆☆☆

خیام کا تذکرہ تفسیر کبیر میں

شبیر احمد خاں غوری

بیسویں صدی کے آغاز سے مشرقیین و مستشرقین دونوں کو خیام کے آثار و احوال سے غیر معمولی دلچسپی ہوگئی ہے، چنانچہ آقاے مجتبیٰ مینوی نے ''پانزدہ گفتار'' میں لکھا ہے:

''شک نیست کہ از میان شعرای ایران یکی نیست کہ شہرت او باندازۂ خیام جہانگیر باشد۔''(۱)

اہل مغرب نے تو اس کی یادگار میں ایک مستقل انجمن Omar Khayyam Club کے نام سے سنہ ۱۸۹۲ء سے قائم کر رکھی ہے۔ بعض ادباء نے اس کی رباعیات کے صحیح ترین نسخوں کی تلاش اور منسوب و منحول رباعیات کی چھان بین کے لیے اپنی علمی تحقیقات وقف کر رکھی ہیں۔ بعض فضلاء نے اس کی تصانیف کی دریافت کو اپنی کاوشوں کا موضوع بنایا ہے اور کچھ محققین نے خیام کے احوال و آثار کے مصادر کی دریافت ہی کو موضوع تحقیق بنالیا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی قابل ستائش کوشش روسی مستشرق ژوکووسکی (Zhukovsky) نے کی تھی۔ سنہ ۱۸۹۷ء میں وکٹر روزن کی پروفیسری کی بست و پنج سالہ

یادگار کے موقع پر جو (Presentation Volume) اس کے شاگردوں نے مرتب کی تھی، اس میں ژوکووسکی نے حالات خیام کے مآخذ ومصادر پر ایک مبسوط مقالہ لکھا تھا۔ اس مقالے کی رو سے قدیم ترین کتاب، جس میں خیام کے حالات زندگی ملتے ہیں، شہرزوری کی ''نزہتہ الارواح'' ہے، جس کا سال تصنیف حسب تحقیق ڈاکٹر زخاؤ (Sachau) سنہ ۵۸۶ھ اور ۶۱۱ھ کے درمیان ہے۔

سنہ ۱۸۹۸ء میں ڈینی سن راس (Denison Ross) نے ژوکووسکی کے مقالے کو انگریزی میں منتقل کر کے Journal of the Royal Asiatic Society میں شائع کیا۔ اس سے انگریز محققین میں بھی ''خیامیات'' کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا اور اگلے سال اسی رسالے میں پروفیسر براؤن نے خیام پر ایک مختصر مضمون کے ضمن میں کچھ نئے ماخذوں کی طرف توجہ دلائی۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں فٹز جیرالڈ (Fitzgerald) کے انگریزی ترجمہ رباعیات عمر خیام کا نیا ایڈیشن ڈینی سن راس کے مقدمے کے ساتھ شائع ہوا۔ اس مقدمے میں ڈینی سن راس نے جن مآخذ ومصادر سے استفادہ کیا ہے، ان میں سب سے قدیم نظامی عروضی سمرقندی کا ''چہار مقالہ'' ہے۔

سنہ ۱۹۰۶ء میں پروفیسر براؤن نے Literary History of Persia کی دوسری جلد شائع کی، جس میں خیام کا بھی ذکر کیا۔ جن ماخذوں سے خیام کا ذکر مرتب کیا گیا، ان میں بھی قدیم ترین ''چہار مقالہ'' ہی ہے۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں مرزا محمد قزوینی نے ''چہار مقالہ'' ایڈٹ کیا اور اس کے مقدمے میں براؤن ہی کی رائے کی تائید کی:

> ''مقالۂ سوم بواسطہ اشتمال آن بر بعضی معلومات در خصوص عمر خیام...... دارای اہمیتی مخصوص است زیرا کہ چہار مقالہ اولین کتابی باشد کہ ذکری از عمر خیام دران شدہ۔ وانگہی مصنف خود معاصر او بودہ وباوی ملاقات نمودہ است۔'' (۲)

بعد میں محققین مشرق بالخصوص فضلائے ایران نے قدیم تر حوالوں کی دریافت کو جاری رکھا۔ چنانچہ حال ہی میں ''چہار مقالہ'' کا جو جدید ایڈیشن ڈاکٹر محمد معین کی تعلیقات کے ساتھ شائع ہوا ہے، اس میں انھوں نے لکھا ہے:

> ''محققان معاصر در بارہ اقدم کتب کہ ذکری از خیام کردہ اند، اختلاف دارند۔ علامہ مرحوم محمد قزوینی در تعلیقات کتاب حاضر چہار مقالہ را قدیم ترین نسخہ دانستہ اند۔ وآن بدلائل وقرائنی کہ در ذیل نقل خواہم کرد درست نیست۔'' (۳)
>
> ''چہار مقالہ'' کا سال تصنیف حسب تصریح قزوینی ۵۴۷ھ اور ۵۵۲ھ کے درمیان ہے اور راقم السطور کے خیال میں آخر سنہ ۵۴۷ھ۔ ڈاکٹر کلیم اللہ حسینی نے ''چہار مقالہ'' کی اقدمیت کو چیلنج کر کے ''تتمہ صوان الحکمۃ'' مؤلفہ ظہیر الدین بیہقی کو خیام کا قدیم ترین ماخذ بتایا ہے، (۴) مگر قابل غور بات یہ ہے کہ ''چہار مقالہ'' کا سال تصنیف آخر سنہ ۵۴۷ھ ہے اور ''تتمہ صوان الحکمۃ'' غالباً سنہ ۵۶۰ھ کے بعد تصنیف ہوئی تھی۔ اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ ''چہار مقالہ'' سنہ ۵۵۲ھ ہی کی تصنیف ہے، تو بھی ''تتمہ صوان الحکمۃ'' اس سے بہر صورت مؤخر ہے، (۵) کیونکہ یقیناً یہ سنہ ۵۵۳ھ کے بعد تالیف ہوئی تھی۔ خود ظہیر الدین بیہقی نے اس کتاب میں ابن التلمیذ کے تذکرے میں ابو بکر بن عروہ کا سال وفات سنہ ۵۵۳ ہجری بتایا ہے۔ (۶)

اب تو ''تتمہ صوان الحکمۃ'' کی اقدمیت کا خیال تقویم پارینہ بن چکا ہے (۷) اور محققین نے اس سے کہیں زیادہ قدیم مآخذ ومصادر دریافت کر لیے ہیں، جن میں سے بعض

تو خود خیام کی زندگی ہی میں مرتب ہو چکے تھے۔

اس ضمن میں فضلاے ایران کی مساعی جمیلہ کا استقصا ڈاکٹر محمد معین نے "چہار مقالہ" کے جدید ایڈیشن کی تعلیقات میں کیا ہے اور اس کے لیے ایک مستقل عنوان "مآخذ مربوط بخیام بترتیب تاریخ" کے نام سے قائم کیا ہے۔ اس ذیل میں سب سے پہلے انھوں نے آقاے سعید نفیسی کا ایک افادہ نقل کیا ہے:

> "آقای سعید نفیسی در شرح دیوان منسوب بعلی از آن حسین بن معین الدین میبذی، چاپ ۱۲۸۵ قمری، ص. ۴۹ بدین عبارت برخورده اند: امام فخر الدین در تفسیر کبیر گوید: عمر بن خیام پیش عمر اسری مجسطی می خواند۔ بعضی فقہا گفتند این چیست کہ شامی خوانید؟ گفتند: تفسیر "أولم ینظر والی السماء فوقھم کیف بنیناھا" می گوئیم۔ و جمہور متشرعہ فلک اطلس را عرش می دانند و فلک ثوابت را کرسی۔
>
> وچون تولد و وفات امام فخر رازی (۵۴۳ یا ۵۴۴۔۶۰۶ ھ) است معظم لہ ذکروی را از خیام اقدم منا بعمی دانند ہر چند کہ ایشان در تفسیر کبیر جستجو کردہ اند وچنین مطلبی رانیافتہ اند۔" (۸)

ڈاکٹر محمد معین کا خیال ہے کہ میبذی کے حاشیۂ "دیوان علی" میں جس 'عمر اسری' کا ذکر ہے، اس کا صحیح نام 'عمر الأبہری' ہے اور اگر چہ آقاے سعید نفیسی کو "تفسیر کبیر" میں یہ مقام باوجود تلاش بسیار نہ مل سکا، مگر ڈاکٹر محمد معین نے اسے ڈھونڈ ہی لیا۔ رازی کی اصل عبارت یہ ہے:

> "روی أن عمر بن الحسام کان یقرء کتاب المجسطی علیٰ عمر الأبہری فقال بعض الفقھا یوماً

ما الذی تقرؤنه فقال أفسر آیة من القرآن وهی قوله
تعالی: "افلم ینظروا الی السمآء فوقهم کیف بنیناها"
فانا أفسر کیفیته بنیانها ولقد صدق الأبهری فیما
قال۔" (۹)

اپنی اس دریافت کی بنیاد پر استاذ بدیع الزمان فروز انفر کے مشورے سے ڈاکٹر محمد معین نے یہ رائے قائم کی ہے کہ آقائے سعید نفیسی کی وہ دریافت بیکار ہے کیونکہ ''تفسیر کبیر'' میں 'عمر خیام' کا تذکرہ نہیں ہے، بلکہ 'عمر بن الحسام' کا ذکر ہے، جو محرف ہوکر حاشیہ ''دیوان علی'' میں 'عمر بن خیام' چھپ گیا ہے۔ اسی طرح ان کے استاد کا نام 'عمر الأبہری' ہے جو تحریف ہوکر 'اسری' چھپ گیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

''بنابر انچہ گزشت قول فخر رازی دربارۂ ''عمر بن
الحسام'' بود کہ در شرح میبذی بہ ''عمر بن خیام'' تحریف شدہ
است۔'' (۱۰)

لیکن اس عاجز کا خیال ہے کہ ڈاکٹر معین کا یہ اعتراض صحیح نہیں ہے۔ نہ تو 'اسری'، 'الابھری' کی تحریف ہے اور نہ 'عمر بن خیام'، 'عمر بن الحسام' کی تصحیف ہے۔

ا۔ ابہر میں ایک مشہور فاضل اثیر الدین ابہری گذرے ہیں۔ ان کا نام مفضل بن عمر تھا۔ حمد اللہ مستوفی نے لکھا ہے:

''اثیر الدین ابہری: اسمہ مفضل۔ او پیشتر از عہد ہلاکو
در گزشت۔ سر آمد زمان خود بود۔ کتاب کشف در حکمت و
محصول و اشارات و زبدۂ مومنان و ھدایہ از تصانیف
اوست۔'' (۱۱)

اثیر الدین کے پدر بزرگوار کا نام 'عمر الابہری' ہوگا۔ یہ نہیں معلوم کہ وہ بھی اپنے زمانے کے عالم اور ریاضی و ہیئت میں مرجع انام تھے یا نہیں۔ ویسے اثیر الدین ابہری فلسفہ و

معقولات کے علاوہ ریاضیات میں بھی دستگاہ عالی رکھتے تھے۔ چنانچہ متاخرین ہند میں اسلام میں جن محققین نے اُقلیدس کے پانچویں مصادرے (Parallel Postulate) کے سلسلے میں تحقیق کی ہے، ان میں اثیر الدین ابہری کا نام خصوصیات سے قابل ذکر ہے، مگر نہ تو ان کے اساتذہ کا حال معلوم ہے اور نہ ان کے آباء و اجداد کے بارے ہی میں کوئی تحقیقی بات معلوم ہے۔

مگر ایسا اندیشہ ہوتا ہے کہ ''تفسیر کبیر'' کے ناشر کا ذہن ''عمر الأ نبیری'' پڑھتے وقت ''اثیر الدین ابہری'' کے والد ''عمر الابہری'' سمجھ لیا، لیکن فرض کیجیے اثیر الدین ابہری کے والد بزرگوار 'عمر الانبیری' ریاضیات میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہوں (جس کا کوئی ثبوت نہیں ہے)، تب بھی وہ مطبوعہ ''تفسیر کبیر'' کے مزعوم 'عمر الابہری' (تصحیف عمر الانبیری) نہیں ہوسکتے، کیونکہ اثیر الدین مفضل بن عمر الانبیری کا سال وفات حدود سنہ ۶۶۰ھ ہے اور اس لیے ان کے والد کا زمانہ (بالتخصیص زمانہ درس و تدریس) ساتویں صدی کے آغاز سے پہلے نہیں ہوسکتا۔ حالانکہ ''تفسیر کبیر'' کا سال تصنیف سنہ ۶۰۳ ہجری ہے اور اس لیے اس میں مذکورہ 'عمر الابہری' (یعنی عمر الانبیری) کا زمانہ چھٹی صدی کے آغاز، بلکہ اس سے بھی کہیں پہلے ہونا چاہیے (کیونکہ بعینہ یہی واقعہ ''تتمہ صوان الحکمۃ'' مؤلفہ سنہ ۵۵۳ــ۵۶۰ھ میں مذکور ہے)۔

پھر تاریخ و تراجم کی کتابوں میں کسی اور 'عمر الأ بہری' کا ذکر نہیں ملتا، جو ریاضی و ہیئت میں اس درجہ کمال رکھتا ہو کہ ''مجسطی'' جیسی کتاب کے درس و تدریس کے لیے مرجع انام ہو، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ 'عمر الأ بہری' اور 'عمر اسری' دونوں ''عمر الأ نبیری'' کی تصحیف ہیں۔ مزید تحقیق آگے آرہی ہے۔

۲۔ اسی طرح مطبوعہ ''تفسیر کبیر'' میں مذکور 'عمر بن الحسام' 'عمر خیام' کی تحریف ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

امام رازی نے ''تفسیر کبیر'' میں جس واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے، ظہیر الدین بیہقی

نے ''تتمہ صوان الحکمۃ'' میں اسے بالتفصیل بیان کیا ہے:

"ابو الحسن الأنبیری الحکیم: کان حکیماً والغالب علیہ علم الهندسة و کان الحکیم عمر الخیام یستفید منه و هو یقرء له المحسطی۔ فقال بعض الفقهاء یوماً للأنباری ما تدرس فقال أفسر آیة من کتاب الله تعالیٰ فقال الفقیه و ماتلك الآیة ۔ فقال الانباری قول الله تعالیٰ "أولم یروا الی السمآء فوقهم کیف بنیناها" فانا أفسر کیفیة بناء ها۔" (۱۲)

اب تین صورتیں ہیں:

الف۔ ''تفسیر کبیر'' اور ''تتمہ صوان الحکمۃ'' میں مذکور دو مختلف واقعے ہوں، مگر یہ مفروضہ نا قابل قیاس ہے۔ اتفاقات دنیا میں ضرور ہوتے ہیں، مگر ان کی بھی حدود ہوتی ہیں۔ اتفاق ایک ہی عجیب ہوتا ہے، مگر جب ایک سے زیادہ اتفاقات جمع ہونے لگیں تو پھر استبعاد محال بننے لگتا ہے۔ یہاں دونوں شاگردوں کے نام ایک ہیں، واقعے کی جزئیات ایک ہیں، سوال ایک ہے، جواب ایک ہے، توجیہہ ایک ہے، اس لیے یہ دو الگ الگ واقعے نہیں ہیں بلکہ ایک ہی واقعہ ہے۔

ب۔ اس میں استاد اور شاگرد کے نام 'عمر الابہری' اور 'عمر بن الحسام' ہوں، جیسا کہ مطبوعہ ''تفسیر کبیر'' میں چھپے ہوئے ملتے ہیں اور ''تتمہ صوان الحکمۃ'' میں محرف ہو کر 'عمر الانبیری' اور 'عمر الخیام' منقول ہو گئے ہوں، مگر یہ مفروضہ بھی نا قابل تسلیم ہے بوجوہ ذیل:

اولاً ''تتمہ صوان الحکمۃ'' کا سال تصنیف ''تفسیر کبیر'' سے مقدم ہے۔ جب بیہقی ''تتمہ صوان الحکمۃ'' مرتب کر رہا تھا، امام رازی کی عمر پندرہ سال کے قریب ہوگی، اس لیے ''تتمہ صوان الحکمۃ'' کا بیان ''تفسیر کبیر'' کے بیان پر مرجح ہے۔ پھر ظہیر الدین بیہقی

خیام سے ذاتی واقفیت رکھتا تھا، وہ بچپن میں خیام سے ملاقات کر چکا تھا۔(۱۳) اس کا باپ خیام کے مخلص دوستوں میں سے تھا اور وہ اس سے اپنی زندگی کے اہم واقعات نقل کیا کرتا تھا۔(۱۴) نیز بیہقی نے جو کچھ ''تتمہ'' میں خیام کے متعلق لکھا ہے، وہ یا تو اپنے باپ کے توسط سے لکھا ہے یا خیام کے داماد امام محمد بغدادی کی وساطت سے (۱۵) یا پھر ایسے لوگوں کے ذریعے جو خیام سے براہ راست واقف تھے، اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ بیہقی نے جو کچھ خیام کے بارے میں لکھا ہے، وہ بلا کم و کاست صحیح ہے۔

ثانیاً: اس کا بھی امکان نہیں ہے کہ بیہقی نے ''تتمہ'' میں جو کچھ لکھا تھا (بالخصوص ابوالحسن الأنبیری کے متعلق)، اس کے اندر بعد میں کاتبوں نے تحریف کر دی ہو، کیونکہ ''تتمۂ صوان الحکمۃ'' کے جتنے نسخے مرتب کتاب پروفیسر محمد شفیع کو ملے تھے، کسی میں 'عمر بن الحسام' اور 'عمر الابہری' نہیں ملا۔ کتابخانۂ کوپریلی زادہ کے نسخے میں تو صاف 'الحکیم عمر الخیامی' لکھا ہے اور اسی لقب سے وہ عموماً عربی کتابوں میں مشہور ہے۔ باقی نسخوں میں 'الحکیم عمر الخیام' ہے۔ اسی طرح استاد کی نسبت عنوان میں مخطوطہ کوپریلی زادہ کے اندر 'انبیری' ہے۔ کتب خانۂ ملا مراد کے نسخے میں 'انبری' ہے، جو 'انبیری' اور 'انباری' ہی کی ایک قرآت ہے جیسے 'فریابی'، 'فاریابی' اور 'فیریابی' کی قرآءت ہے (مزید تفصیل آگے آرہی ہے)۔ کتب خانۂ بشیر آغا کے نسخے میں 'الأنباری' ہے، جو 'الأنبیری' کی دوسری قراءت ہے (تفصیل آگے آرہی ہے)۔ صرف برلن کے نسخے میں 'الأنبیری' ہے، جو 'أبہری' کے مقابلے میں 'الأنبیری' کی تصحیف معلوم ہوتی ہے۔ پھر اصل واقعے میں نسخہ کوپریلی زادہ کے اندر اور اسی طرح دوسرے نسخوں میں 'الأنباری' ہے۔ صرف برلن کے مخطوطے میں 'الأنباری'' (بغیر نقطۂ باء موحدہ) ہے۔ دوسری مرتبہ پھر نسخۂ کوپریلی زادہ میں 'الأنباری' ہے اسی طرح نسخۂ کتب خانہ بشیر آغا میں بھی 'الأنباری' ہے۔ نسخۂ ملا مراد میں عنوان کی طرح 'الأنبیری' ہے۔ صرف برلن کے نسخہ میں 'الأنبیری' ہے، جو جیسا کہ اوپر مذکور ہوا 'الأبہری' کے مقابلے میں 'الأنبیری' کی تصحیف ہے۔

''تتمہ صوان الحکمۃ'' کے محتویات کو شہرزوری نے بلاکم وکاست ''نزہت الأرواح و روضتہ الأفراح'' میں نقل کردیا ہے۔ پروفیسر محمد شفیع کو ''نزہتہ الأرواح'' کے جتنے نسخے ملے، ان میں استاد کی نسبت 'الأنبیری' اور شاگرد کا نام 'خیامی' مکتوب ہے۔ صرف برلن کے نسخے میں عنوان کے اندر 'الأنبری' (بغیر نقطۂ نون) جو الأنبری = الأنبیری کی تصحیف ہے اور اصل واقعے میں پہلی مرتبہ 'الأنباری' (نون اور باء موحدہ کے نقطوں کے بغیر) ہے، جو یقیناً 'الأنباری' ہے۔(١٦)

ندوۃ العلماء، لکھنؤ کے نسخہ ''نزہتہ الأرواح'' کی متعلقہ عبارت سید سلیمان ندوی مرحوم نے ''خیام'' میں نقل کی ہے، جو حسب ذیل ہے:

"ابوالحسن الأنبیری کان حکیماً و الغالب علیه الهندسة [و الهیئة] و کان الخیامی یستفید منه و هو یقرء له المجسطی۔"

''تتمہ صوان الحکمۃ'' کا فارسی ترجمہ ''درۃ الأخبار'' ہے۔ اس میں شاگرد کا نام 'عمر بن خیام' ہی مذکور ہے۔

> ''باوجود تبحر در علوم حکمی هندسه بروی غالب بود و حکیم فیلسوف عمر بن خیام از وی استفادت می کرد و مجسطی از وی فرا گرفت۔''(١٧)

اس مبحث کی تحریر کے وقت مولانا سید سلیمان ندوی کے پیش نظر محمد بن یوسف طبیب ہروی کا طبی لغت ''بحر الجواہر'' بھی تھا اور اس میں بھی شاگرد کا نام خیام اور استاد کا نام ابوالحسن الأنباری ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''خیام کے اساتذۂ ہیئت میں ایک نام نمایاں نظر آتا ہے اور وہ نام ابوالحسن الأنباری (یا الأنبیری) کا ہے۔ ابوالحسن بیہقی، شہرزوری اور محمد بن یوسف طبیب ہروی نے اس کی تصریح کی ہے۔''(١٨)

دوسری جگہ انھوں نے شہرزوری ترجمۂ ابوالحسن الأنبیری، ''درۃ الأخبار''، ص.۵۷/ اور'' بحرالجواہر'' (لغت طب) تصنیف محمد بن یوسف طبیب ہروی، فصل. (الف) کے حوالوں کو پڑھ کر لکھا ہے:

''ایک دن ابوالحسن انبیری خیام کو مجسطی پڑھا رہا تھا۔ ایک مولوی صاحب کا سامنے سے گزر ہوا، پوچھا کیا پڑھاتے ہو؟ بولا: قرآن پاک کی ایک آیت کی تفسیر پڑھا رہا ہوں۔ پوچھا کس آیت کی؟ جواب دیا: ''أفلم ینظروا الی السماء فوقھم کیف بنینا ھا'' کی تفسیر کر رہا ہوں''۔(۱۹)

ان شواہد کے بعد کوئی شک نہیں رہتا کہ ''تتمۂ صوان الحکمۃ'' میں استاد کا نام 'ابوالحسن الأنبیری' اور شاگرد کا 'الحکیم عمر الخیام' تھا۔ ایک اور بات جو ''تتمۂ صوان الحکمۃ'' میں تصحیف و تحریف کے عدم امکان کی موید ہے، وہ یہ ہے کہ عنوان میں استاد کی نسبت 'الأنبیری' ہے اور متن میں دو جگہ 'الأنباری'؛ 'أنبیری' اور 'أبہری' ایک دوسرے کی تحریف ہو سکتے ہیں، مگر 'أنباری' یقیناً 'أبہری' کی تحریف نہیں ہوسکتا۔ یہ بھی ناقابل قیاس ہے کہ استاد کی دو نسبتیں ہوں (أبہری اور أنباری) اور وہ بھی یہ کہ ایک ہی عبارت میں وہ ایسے دو شہروں کی طرف منسوب ہو جو ایک دوسرے سے فاصلہ بعیدہ پر واقع ہیں، کیونکہ شہر 'ابہر' ایران کے صوبہ جبال (عراق عجم) کے وسط میں واقع ہے اور 'انبار' یا بغداد مغرب میں واقع تھا (۲۰) یا خراسان کے مشرقی حصے میں (تفصیل آگے آرہی ہے۔) یا پھر وہ مرو کا ایک محلہ تھا۔(۲۱)

یہی اعتراض 'الأنبیری' اور 'الأنباری' پر بھی ہوسکتا ہے اور اسی میں اصل مسئلہ کا حل مضمر ہے۔ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

قرون وسطیٰ میں ایران کا مشرقی صوبہ خراسان تھا۔ عرب جغرافیہ نویس سہولت کے لیے اس وسیع صوبے کو چار ربعوں میں تقسیم کیا کرتے تھے: نیشاپور، مرو، ہرات اور بلخ۔ مشرقی ربع بلخ دارالحکومت شہر بلخ اور اس کے مضافات کے علاوہ دو حصوں میں تقسیم تھا۔

مشرقی حصہ طخارستان اور مغربی جوز جان کہلاتا تھا۔ اسی علاقہ سے ہو کر مروالروذ سے بلخ جانے والی سڑک گزرتی تھی۔ مروالروذ سے تین منزل کے فاصلہ پر طالقان کا شہر تھا، جس کا نام اب نقشہ سے مٹ چکا ہے۔ صرف چاچکتہ کے قریب اس کے کھنڈر رہ گئے ہیں۔ طالقان پر یہ سڑک دو شاہراہوں میں بٹ گئی تھی۔ شمالی شاہراہ سے بلخ پہنچنے کے لیے دو بڑے شہروں فاریاب (ظہیر فاریابی کا وطن) اور شبورقان سے گزرنا ہوتا تھا۔ فاریاب کسی زمانہ میں بڑے درجہ کا شہر تھا، لیکن اب اس کا نشان نہیں ملتا۔ اسے آج کل کے خیرآباد کے قریب سمجھنا چاہیے۔ شبورقان اب بھی موجود ہے۔ تیسری صدی ہجری میں یہ جوز جان کا صدر مقام تھا۔ جنوبی شاہراہ سے بھی بلخ پہنچنے کے لیے دو شہروں سے گزرنا پڑتا تھا۔ میمنہ جو طالقان سے دو منزل آگے جانے والی سڑک پر تھا اور جو قدیم زمانہ میں یہودیہ کہلاتا تھا اور اب بھی ایک بارونق شہر ہے اور دوسرا 'انبار' جو شبورقان کے محاذی جنوب میں ایک دن کی راہ پر واقع تھا۔ چنانچہ یاقوت لکھتا ہے:

"الأنبار بفتح أوله مدينة بقرب بلخ وهى قصبة ناحية جوزجان و بها كان مقام السلطان وهى على الجبل وهى أكبر مروالروذ و بالقرب منها ولها مياه وكروم وبساتين كثيرة و نهار وهموم طين و بينهما وبين شبورقان مرحلة فى نادية الجنوب .... ينسب اليها قوم منهم أبوالحسن على بن محمد الأنبارى".(۲۲)

اسی 'انبار' جوز جان کو 'انبیر' بھی کہتے تھے۔(۲۳) چنانچہ یاقوت 'انبیر' کے ذکر میں لکھتا ہے:

"أنبير بكسر الباء الموحدة و ياء ساكنة وراء۔ مدينة بالجوزجان بين مروالروذ وبلخ من خراسان ۔

بها قتل يحيىٰ بن زيد بن علي بن الحسين بن علي بن
أبي طالب رضي الله عنه ولعلها أنبار المتقدم ذكرها
والله أعلم۔" (٢٤)

یہ بھی واضح رہے کہ اس علاقہ (جوزجان) میں 'انبار' اور 'انبیر' ہی اکیلا ایسا شہر نہیں ہے، جس میں 'الف' اور 'یا' کا ایک دوسرے سے بدل ہو جاتا ہے۔ دوسرے شہر اور بھی ہیں، مثلاً 'فاریاب'، جس سے نسبت 'فاریابی'،
'فیریابی' اور 'فریابی' تینوں طرح آتی ہے۔ (٢٥)

اس لیے یہ بات اب کسی مزید ثبوت کی محتاج نہیں رہی کہ ''تتمہ صوان الحکمۃ'' اور ''تفسیر کبیر'' میں مذکور استاد ابوالحسن (یا عمر) کی نسبت 'الأبہری' نہیں ہے، بلکہ 'الأنبیری' ہے۔ لہذا، ڈاکٹر محمد معین کی یہ تصحیح جو انھوں نے تعلیقات چہار مقالہ میں کی ہے، قرین صواب نہیں۔ (٢٦)

ظاہر ہے جب 'الأنبیری' کے اندر نسخ و کتابت میں یہ تحریف ہو سکتی ہے تو پھر 'الخیام' بھی کاتبوں کے تصرف سے نہیں بچ سکتا۔ اگر 'خ' اور 'ی' کے نقطے اڑ جائیں، تو پھر 'الخیام' کو 'الحسام' پڑھنا بالکل فطری ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ 'عمر بن الحسام' (جیسا کہ مطبوعہ ''تفسیر کبیر'' میں ڈاکٹر محمد معین کو ملا) بالکل غیر معروف نام ہے۔ تاریخ و تراجم کی کتابوں میں اس نام کا کوئی 'مجسطی خواں' نہیں ملتا۔ البتہ عمر خیام بے شک اسلامی ہیئت کی تاریخ کے اندر مشاہیر افاضل میں محسوب ہوتا ہے۔ اتنا بڑا افاضل کہ زیج ملک شاہی کے متولیوں میں گل سر سبد کی حیثیت رکھتا تھا۔ لہذا، آقائے سعید نفیسی پر ڈاکٹر محمد معین کا تعقب اور اس تعقب پر استاد فروزانفر کی تصویب کہ: ''بنا برانچہ گذشت قول فخر رازی دربارۂ عمر بن الحسام بودہ کے در شرح میبذی بہ عمر بن خیام تحریف شدہ است۔'' (٢٧) **یقیناً صحیح نہیں ہے۔ آقائے سعید نفیسی نے ذکر خیام کا ایک اور قدیم ماخذ دریافت کیا ہے، جو ''نزہۃ الأرواح'' کے (جسے ژوکوو سکی نے قدیم ترین ماخذ**

بتایا تھا) تقریباً برابر ہی قدیم ہے اور اگر ڈاکٹر محمد معین استعجال سے کام نہ لیتے تو اس کی صحت وافادیت سے تعلیقات ''چہار مقالہ'' میں انکار نہ فرماتے۔ ہاں آقائے سعید نفیسی کے اس خیال میں کوئی وزن نہیں ہے کہ ''تفسیر کبیر'' ذکر خیام کا قدیم ترین مآخذ ہے، (۲۸) کیونکہ ''چہار مقالہ'' اور ''تتمۂ صوان الحکمۃ'' دونوں ''تفسیر کبیر'' سے اقدم ہیں۔

اور اب تو ''چہار مقالہ'' اور ''تتمۂ صوان الحکمۃ'' سے بھی قدیم تر مآخذ و مصادر دریافت ہو چکے ہیں، یعنی ''مکاتیب حکیم سنائی''، رسالہ ''الزاجر للصغار'' للزمخشری اور ''میزان الحکمۃ'' للخازنی اور ان میں سے بعض تو خیام کی زندگی ہی میں تالیف ہو چکے تھے، مثلاً عبدالرحمٰن الخازنی کی ''میزان الحکمۃ''، جس کے متعلق مؤلف کتاب نے تصریح کی ہے کہ یہ ۵۱۵ھ کی تصنیف ہے:

"وصنفت کتاباً فی میزان الحکمته لخزانة المعمورة فی شهور سنة خمس عشرة و خمسمائة لهجرة نبینا محمد المصطفیٰ علیه السلام ۔" (۲۹)

لیکن ان میں سے قدیم ترین ماخذ کی تحقیق موضوع پیش نظر سے باہر ہے اور ایک مستقل کوشش کی مقتضی ہے۔

[۲۸/۱۲/۱۹۶۰ء]

(مجلۂ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، جلد ۱، نمبر ۲، دسمبر ۱۹۶۰ء، ص ۱۰۰۔۱۱۲)

حواشی وحوالہ جات

۱۔ مجتبیٰ مینوی، پانزدہ گفتار، تہران، ۱۳۳۳، ص.۳۰۰، بحوالۂ چہار مقالہ، ص.۳۳۵ طبع ڈاکٹر محمد معین۔

۲۔ نظامی عروضی، چہار مقالہ، مقدمۂ مصحح، برلین، ۱۹۲۷، ص۔د..ہ۔

۳۔ ایضاً، تعلیقات، طبع ڈاکٹر محمد معین، ص.۲۹۴۔

۴۔ Contribution of Zahiruddin al-Bayhaqi to Arabic and Persian Literature, Islamic Culture, 1960, P-51.

۵۔ اس خیال کی وجہ یہ ہے کہ "تتمۂ صوان الحکمۃ" میں بیہقی نے امین الدولہ ابن التلمیذ کی وفات کا ذکر کیا ہے: "الحکیم ابو الحسن ابن التلمیذ البغدادی ... توفی فی شهور سنه تسع و اربعین و خمسمائة (تتمۂ صوان الحکمۃ: ۱۴۱۔۱۴۳) مرتبہ پروفیسر محمد شفیع، مطبوعہ لاہور۔

اگر چہ یہ سال وفات باتفاق مورخین غلط ہے، تاہم اتنا متحقق ہے کہ یہ کتاب امین الدولہ ابن التلمیذ کی وفات کے بعد تالیف ہوئی۔ بہر حال، امین الدولہ ابن التلمیذ کا سال وفات متفقہ طور پر سنہ ۵۶۰ھ ہے۔ چنانچہ ابن خلقان لکھتا ہے: "ابو الحسن هبة الله بن ابی الغنائم ... المعروف بابن التلمیذ النصرانی الطبیب

الملقب بامین الدولہ البغدادی ... توفی فی صفر سنہ ستین و خمسمائہ و قد نا ھزالمایة من عمرہ" وفیات الأعیان ۲: ۱۹۱۔۱۹۳)۔

ابن القفطی لکھتا ہے: " سلطان الحکماء امین الدولہ ابو الحسن ھبة اللہ بن صاعد الطبیب النصرانی یعرف بابن التلمیذ و توفی ھبة اللہ بن صاعد فی صفر سنة ستین و خمسمائة و قد قارب المائة و ذھنه بحاله" (اخبار العلماء باخبار الحکما: ۲۲۳۔۲۲۴) اسی طرح ابن أبي أصیبعہ بھی، جس نے اطباء کا مستقل تذکرہ لکھا ہے، اس کا سال وفات سنہ ۵۶۰ھ ہے۔ بتاتا ہے:
"و کانت وفاة امین الدولہ ببغداد فی الثامن و العشرین من شھر ربیع الأول سنة ستین و خمسمائہ ولہ من العمر اربع و تسعون سنة" (عیون الأنباء فی طبقات الأطباء ۱: ۲٦٤)

شہرزوری کی "نزھة الأرواح" "تتمہ صوان الحکمۃ" ہی کی نقل ہے اور برلن میں اس کتاب کا جو نسخہ ہے، اس کے اندر جس صفحہ پر ابن التلمیذ کا ترجمہ ہے، اس صفحہ کے حاشیہ پر کسی نے غالباً ذہبی کی "تاریخ الاسلام" کے حسب ذیل عبارت نقل کی ہے:"
وفی تاریخ الکبیر: توفی ھبة اللہ ابن الصاعد یعنی ابن التلمیذ فی صفر سنة ستین و خمسمائة۔"

ان تصریحات کے اس باب میں کوئی شک نہیں رہتا کہ بیہقی سے ابن التلمیذ کا سال وفات ثبت کرنے میں سہو ہوا ہے اور چونکہ ابن التلمیذ کا سال وفات سنہ ۵٦۰ھ ہے، لہذا "تتمہ صوان الحکمۃ" سنہ ۵٦۰ھ سے بعد کی تصنیف ہے۔

٦۔ چنانچہ قزوینی نے جن سے پروفیسر کلیم اللہ کی سنہ ۱۹۳۳ میں پیرس میں ملاقات ہوئی تھی، اس کتاب کے زمانہ تصنیف کے باب میں لکھا ہے:" تاریخ تالیف کتاب۔ تاریخ تالیف تتمہ صوان الحکمۃ تا علی التحقیق راقم السطور تا کنون نتوانستہ ام معلوم نمایم

ولی چون ازطرفی درین کتاب وفات ابوبکر بن عروہ کہ در سنہ پانصد و پنجاہ و سہ واقع شدہ مذکور است (ورق: ۸۰ (ب)) وازطرف دیگر چون وفات خود مولف چنانکہ گزشت در سنہ پانصد شصت وپنج است، پس تالیف این کتاب بالضرور محصور خواہد شد بین دو سنہ مذکورہ یعنی سنہ ۵۵۳۔۵۶۵''۔ (بست مقالہ: ۲: ۱۳۷).

۷۔ خود قزوینی نے دوسری جگہ غیر مبہم الفاظ میں تصریح کی ہے کہ تتمہ صوان الحکمۃ، چہار مقالہ سے بعد میں تالیف ہوا تھا: '' تاریخ تالیف ''تتمہ صوان الحکمۃ'' بطور تحقیق برای راقم سطور معلوم نیست ولی ازینکہ تاریخ وفات ابوبکر بن عروہ را کہ در سنہ ۵۵۳۔۵۶۵ است بدست میدہد (رجوع بفہرست نسخ عربی برلین ۹: ۴۵۷) و ازینکہ وفات خود مولف چنانکہ گزشت در سنہ ۵۶۵ است واضح می شود کہ ''تتمہ صوان الحکمۃ'' مابین سنوات ۵۵۳۔۵۶۵ تالیف شدہ است یعنی فقط چند سالی بعد از تالیف ''چہار مقالہ'' کہ در حدود سنہ ۵۵۰ است'' (بست مقالہ: ۲: ۱۲۰).

۸۔ چہار مقالہ (تعلیقات): ۲۹۵.

۹۔ امام رازی، تفسیر کبیر: ۲: ۸۳.

۱۰۔ ایضاً، : ۲: ۲۹۵.

۱۱۔ تاریخ گزیدہ: ۸۰۱.

۱۲۔ تتمہ صوان الحکمۃ: ۹۲.

۱۳۔ تتمہ صوان الحکمۃ: ۱۱۶، '' دخل الامام (عمر الخیام) فی خدمة و الذی رحمه الله فی سنة سبع و خمسمائة فألنی عن بیت فی الحماسة"۔

۱۴۔ ایضاً: ۱۱۵، '' حکی الامام عمر یوماً او الذی و قال انی کنت یوماً بین یدی السلطان ملکشاه"۔

۱۵۔ ایضاً: ۱۱۶، " حکی لی ختنه الامام محمد البغدادی انه کان یتخلل بخلال من ذهب و کان یتأمل الالهیات من الشفاء"۔

۱۶۔ سید سلیمان ندوی، خیام، ص.۱۸.

۱۷۔ ایضاً، ص.۱۸

۱۸۔ ایضاً، خیام، ص۔۸۰

۱۹۔ ایضاً، خیام، ص۔۸۱

۲۰۔ معجم البلدان (۱:۳۴۱) "الأنبار ایضاً مدینة علی الفرات فی غربی بغداد بینهما عشرة فراسخ"۔ اسی انبار کی طرف ''نزھۃ الألباء'' کے مصنف کمال الدین ابوالبرکات الأنباری منسوب ہیں۔

۲۱۔ ایضاً (۱:۳۴۲) "الأنبار ایضاً سکة الأنبار بمرو فی أعلی البلد۔ ینسب الیها أبوبکر محمد بن عبدویه الأنباری."

۲۲۔ ایضاً، ۱:۳۴۰

۲۳۔ تفصیل کے لیے دیکھئے: Le-Strange, the Lands of the Eastern Caliphate, P-657

۲۴۔ معجم البلدان، ۱:۳۴۳

۲۵۔ سمعانی، کتاب الأنساب، ورق۔۴۱۶.ب۔۴۱۷.الف، ۴۲۶.ب

۲۶۔ چہار مقالہ، (تعلیقات)، ص۔۲۹۵، ''چنین است بجائے عمر الأ بہری کہ بیاید۔''

۲۷۔ ایضاً، (تعلیقات)، ص۔۲۹۵

۲۸۔ ''معظم لہ ذکروی (امام رازی) را از خیام اقدم منابع می دانند۔''

۲۹۔ الخازنی، میزان الحکمۃ، حیدرآباد، ۱۳۵۹ھ، ص۔۹

☆☆☆

رباعیات عمر خیام پر تحقیقی نظر

عبدالباری آسی لکھنوی

حکیم عمر خیام کے علم و فضل کا قایل نہ ہونا ہر تذکرہ نویس نے ایک اخلاقی کفر سمجھا ہے اور اسی وجہ سے تمام محققین کا متفقہ اجماع ہے کہ وہ فلسفہ و حکمت، ریاضی، طب، نجوم ہی پر حاوی نہ تھا بلکہ اس کی عام معلومات علمیہ فقہ، تفسیر، علم تجوید، معنیٰ و بیان میں ایسی ہی دایرو سایر تھیں، جیسی کہ فن خاص ریاضی و نجوم میں۔ اس سے اگر کسی مسئلہ خاص کا کسی بارے میں ذکر آتا تھا تو وہ اپنی ہمہ دانی کے ثبوت میں علوم کے دریا بہا دیتا تھا اور سامع کو اس کا حفظ و ضبط دشوار ہو جاتا تھا۔ ایسے امام فن، ایسے جوہر قابل کے لیے شعر و شاعری کا صحیح ذوق یا خود اس کا شاعر ہونا کوئی ذریعہ افتخار نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کی دون مرتبت کا مترادف ہے اور کیا عجب ہے کہ اسی سبب سے اس کے شاگرد، اس کے معاصرین اس کے شاعرانہ کمال کے بیان کو ضروری چیز نہ سمجھے ہوں۔ جیسا کہ نظامی عروضی اور ابوالحسن بیہقی نے اس کو نظر انداز کر دیا ہے اور نظامی عروضی باوجود شاگرد ہونے کے اس کو صرف نجومی کہہ کر رہ گئے ہیں۔

خیام کی مستقل اور جید تصنیفیں دوسرے فنون میں موجود ہیں، جن کی فہرست

یہ ہے:

عمر خیام کی تصانیف:

۱۔ رسالہ مکعبات، ۲۔ رسالہ جبر و مقابلہ، ۳۔ رسالہ شرح ماأشکل من مصادرات اقلیدس، ۴۔ زیچ ملک شاہی، ۵۔ رسالہ مختصر در طبیعات، ۶۔ میزان الحکم، ۷۔ رسالہ کون و تکلیف، ۸۔ رسالہ فی کلیات الوجود، ۹۔ رسالہ موضوع علم کلی و وجود، ۱۰۔ رسالہ فی کلیات الوجود، ۱۱۔ رسالہ اوصاف یا رسالہ الوجود، ۱۲۔ عربی اشعار۔

مگر یہ سب گم شدہ جواہر کی حیثیت رکھتے تھے اور سوائے اس کے کہ بعض بعض مشہور محققین نے علاحدہ ان کا ذکر اپنے اپنے مصنفات میں کیا۔ مجموعی حیثیت سے کہیں ان کا وجود نہیں تھا۔ علم کی روشنی پھیلنے پر کچھ کتابیں اس زمانہ میں ملیں، جن میں سے کئی ایک چھپ گئی ہیں، جیسا کہ دارالمصنفین، اعظم گڑھ سے رسالے ''خیام'' کے ذیل میں ایک مجلد میں طبع ہو چکے ہیں اور جستہ جستہ اس سے پہلے بعض دوسرے مطابع میں بھی بعض کتابیں شائع ہوئیں۔ بعض آج بھی نایاب ہیں، مگر علم وفن کے اس حادثۂ فاجعہ پر جس قدر بھی ماتم کیا جائے وہ کم ہے کہ خیام کی شہرت ان کی ان معرکہ آرا تصانیف سے وابستہ نہیں ہے، بلکہ رباعیات ان کا سرمایۂ افتخار بنی ہوئی ہیں، جن کے متعلق ابھی تک یہ فیصلہ نہیں ہو سکا کہ وہ اس مجموعہ کا مالک ہے یا نہیں اور ہے تو کس جزو کا۔

عمر خیام کی رباعیات:

رباعیات حکیم خیام کا مطالعہ کرنے والے نقاد دبی زبان سے ہمیشہ اس کے معترف رہے کہ ان کی رباعیات میں آمیزش ہے اور یہ سونا مغشوش ضرور ہو گیا ہے، مگر اس کے ساتھ ہی یہ بتانے والے بہت کم پیدا ہوئے کہ یہ آمیزش کہاں سے ہوئی اور کیوں ہوئی۔ اس پر ہم کو کچھ کہنا اور لکھنا ہے۔

ایک ایسے شخص کو جو رباعیات عمر خیام کے متعلق بحث کرتا ہو، مجبوری ہے کہ وہ یہ بھی بحث کرے کہ رباعی کب شروع ہوئی اور فارسی میں اس کا دور دورہ کب ہوا۔ لہٰذا مختصر طور پر یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ غزل اور قصاید و مثنوی وغیرہ اصناف سخن سے رباعی پہلی چیز ہے۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ کسی صنف سخن کا پتہ ہی نہ تھا، مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ترتیبی شہرت اور کمال دوسری چیزوں کو حاصل نہ ہوا تھا کہ رباعی عالم وجود میں آئی۔

رباعی کی ابتدا:

اس کے وجود میں آنے یا اس وزن کے دریافت ہونے کے متعلق کئی قصے مشہور ہیں ایک یہ کہ غزنین یا بجستان کے کسی شہر میں کچھ بچے اخروٹوں سے گولیوں کا کھیل کھیل رہے تھے۔ ایک اخروٹ یا ایک گولی جو گچی سے دور تھی، لڑھک کر اس کی طرف جانے لگی۔ بچہ خوشی سے اچھل پڑا اور بے ساختہ اس کی زبان سے 'غلطاں غلطاں ہمی رود تا لب گو' نکل گیا۔ دولت شاہ سمرقندی کا بیان ہے کہ یہ لڑکا خاندان صفاریہ کے بانی یعقوب صفار المتوفی ۲۶۵ھ کا بچہ تھا۔ یعقوب خود شعر و شاعری کا ذوق رکھتا تھا۔ وہ کھڑا ہوا اس واقعہ کو دیکھ رہا تھا اور جو کچھ بچے نے کہا، وہ سن رہا تھا۔ اس کو یہ وزن پسند آیا۔ سوچا کہ یہ بحر کون سی ہے، تو اس وجہ سے کہ اس وقت تک یہ وزن رائج نہ تھا، اس لیے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اس لیے اپنے درباری شعراء ابودلف عجلی اور ابن الکعب کو بلا کر پوچھا کہ یہ کون سی بحر ہے۔ انھوں نے غور و فکر کے بعد بتایا کہ یہ بحر ہزج کی ایک شاخ ہے۔ پھر انھوں نے اس پر تین مصرع اور لگا کر پورے دو شعر کر دیے اور دوبیتی نام رکھا۔ اسی طرح اور محققین نے بھی کچھ توجیہات بیان کی ہیں کہ اس کا نام رباعی کیوں ہوا، مگر دولت شاہ سمرقندی نے یہ بھی لکھا ہے ''تا فضلا دوبیتی رانکوندیدند، گفتند کہ ایں چہار مصرعی است رباعی نشاید گفتن'' اور یہی بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ اس کو ترانہ، قول، چہار بیتی وغیرہ بھی کہا گیا، مگر چونکہ یہ مبحث ہمارے مضمون سے دور ہے، اس لیے اس کو طول دینا فضول ہے۔ مقصد صرف اس قدر ہے کہ رباعی کا دور اگر متذکرہ بالا روایت کے مطابق شروع ہوا تو بھی اس کے شروع ہونے کو خیام کے زمانے تک دو سو ڈھائی سو برس ہو چکے تھے اور یوں تو عرب کی شاعری میں بھی رباعی کا نام لیا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ عرب کی شاعری میں رباعی کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ وزن بحر ہزج سے مستخرج ہے اور وہ چار اجزا سے مرکب ہے۔ حالانکہ عرب کی

رباعی فارسی کے مذاق سے بہت دور ہے اور اسے رباعی ماننے کو کم از کم میرا جی تو نہیں چاہتا۔ پھر بھی اگر اس کو مان لیا جائے تو خیام کے زمانے تک رباعی کی پیدائش کی مدت اور دراز ہو جائے گی۔

خیام کا سنہ ولادت اور وفات:

اتفاق کی بات ہے کہ اتنے بڑے مشہور زمانہ حکیم کا صحیح طور پر نہ سنہ ولادت ہی معلوم ہے اور نہ سنہ وفات کا تقرر رہا ہے، مگر قیاسات کی بنا پر مولوی سید سلمان صاحب ندوی نے ان کا سنہ ولادت ۴۴۰ھ یا ۴۴۱ ہجری مقرر کیا ہے(۱) اور سنہ وفات ۵۱۵ر سے ۵۳۰ر تک کوئی سال۔ (۲) اس طرح سے اس کی عمر کم از کم ۷۵ر برس اور زیادہ سے زیادہ ۹۰ر برس کی مانی جاسکتی ہے۔ ۷۵ر برس ہوں یا ۹۰ر برس، بہرحال یہ عمر طویل ہی کہی جائے گی اور اس میں حقیقتاً کام کرنے والا آدمی بہت کچھ کرسکتا ہے۔ چنانچہ خیام نے بھی اپنی قابلیت کی، اپنے مذاق کی بنا پر بہت سی مثالیں اہل عالم کے سامنے پیش کردیں، جن کی ایک فہرست تصانیف ہم اس سے پہلے پیش کرچکے ہیں، مگر افسوس کہ اس کی شاعری کا مسئلہ ان تصانیف اور اس کے فضل و کمال کے شمار و اعداد پیش کرنے کے باوجود بھی ویسا ہی الجھا ہوا رہ گیا، جس پر ایک تفصیلی بحث اور غایر نگاہ کی ضرورت ہے۔

جیسا کہ بیان کیا جاچکا، رباعی خیام سے مدتوں پہلے کی چیز ہے اور کئی ایک شاعر ایسے گزرے جن کی شاعری اگر مستقلاً رباعی کی پابند نہ بھی رہی ہو، پھر بھی یہ صنف اُن کے یہاں اور چیزوں سے زیادہ موجود تھی۔

بایزید بسطامیؒ:

سب سے پہلے حضرت بایزید بسطامی کا نام آتا ہے، جن کے نام سے بعض رباعیاں پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ بعض محققین نے شک کیا ہے کہ حضرت بایزید نہ شاعر نہ تھے نہ انھوں نے رباعیاں کہی ہیں، مگر بہرحال ''مجمع الفصحا'' میں تین رباعیاں ان سے منسوب کی گئی ہیں اور ''تذکرہ حسینی'' میں بھی ان کے نام سے ملتی ہے۔ ''تذکرہ صبح گلشن'' میں بھی دو

رباعیاں ان سے منسوب کی گئی ہیں۔آپ کا زمانہ وفات ۲۳۴ھ یا ۲۶۱ھ یا ۲۶۲ھ ہے اور حسب امید ان کے یہاں جس قدر بھی رباعیاں ہیں، وہ مذاق تصوف میں ہیں یا بعض میں اخلاقی اور واعظانہ انداز ہے۔

رودکی:

دوسرا وہ شاعر جس نے اور اصناف کے ساتھ رباعیاں بھی کہیں، رودکی تھا، جو فارسی شاعری میں 'ابوالآبا' کا درجہ رکھتا ہے اور جس کی بدیعہ نگاری اہل تذکرہ میں مسلم ہے۔اہل تذکرہ متفق ہیں کہ یہ ۳۰۴ھ میں پیوند خاک ہوا، مگر مولوی سید سلیمان صاحب ندوی نے ۳۲۹ھ سال وفات بتاتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ وفات کا سنہ مشہور غلط ہے۔اس کے دیوان مطبوعہ ایران میں رباعیاں اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں اور پھر چونکہ وہ ایک درباری اور دنیا دار شاعر تھا ،اس لیے اس کے کلام میں سبھی قسم کا کلام ہے اور یہی رباعیوں میں ہے۔عشقیہ، حکیمانہ، اخلاقی ،خمریات یہ تمام رنگ ملے جلے ہوئے ہیں۔جیسی ضرورت داعی ہوئی ہے، ویسا کہہ دیا ہے۔کوئی خاص رنگ نہیں۔البتہ مدح گستری کا جال ذرا زیادہ بچھا ہوا ہے۔اتنا کہنا اور رہ گیا کہ پہلے لوگ ہر چار مصرعہ کی چیز کو خواہ وہ قطعہ ہی ہو، رباعی کہہ دیتے تھے۔اس کے دیوان میں بھی یہی ہوا ہے۔رباعیوں کے وزن خاص کی رباعیاں کم تعداد میں ہیں اور قطعے بہت زیادہ۔پھر بھی یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ رباعیوں کے نام سے یہ سب کچھ کہا گیا، اگر چہ اب ان سب کو رباعیات کے تحت میں نہ لایا جاسکے یا پھر چھاپنے والوں نے یہ بدعت کی کہ کچھ کا کچھ لکھ گئے۔رودکی کے بیشتر حصہ کلام کو بھی حکیم قطران کے کلام میں مخلوط بتایا جاتا ہے اور حکیم مذکور کا زمانہ سو برس قریب رودکی کے بعد ہے۔

ابونصر فارابی:

تیسرا شخص ابونصر فارابی المتوفی ۳۳۹ھ ہے۔اس کے ساتھ بھی بعض رباعیاں منسوب ہیں اور تذکروں میں جستہ جستہ پائی جاتی ہیں۔ان کی رباعیاں وہی حکیمانہ رنگ کی

ہیں، جن میں حکمت، فلسفہ، موعظت سب ہی کچھ ہے اور دراصل ایک حکیم یا صوفی یہی کہہ بھی سکتا ہے، مگر چونکہ سوائے بعض تذکروں کے اور کوئی دلیل اس کے رباعی گو ہونے کی نہیں، اس لیے اس کی بھی مشتبہ حالت ہے۔

ابوشکور بلخی:

چوتھی صدی کا ایک شاعر ابوشکور بلخی بھی ہے۔ ''تذکرۂ لباب الالباب'' عوفی میں اس کے نام کی بھی ایک رباعی ملتی ہے۔

شمس المعالی:

شمس المعالی کی بھی بعض رباعیاں ''تذکرۂ لباب لالباب'' عوفی میں درج کی گئی ہیں، جو عشق اور خمریات میں کہی گئی ہیں۔ شمس المعالی قابوس بن وشمگیر المتوفی ۴۰۳ھ دیلمی بادشاہ تھا، جو ۳۶۶ھ میں تخت حکومت پر بیٹھا۔ اس کی بعض تصانیت مصر میں طبع بھی ہوگئی ہیں۔

عنصری:

عنصری المتوفی ۴۴۱ھ کے یہاں بھی رباعیاں ہیں، جو کچھ واقعات حالیہ اور کچھ حسن و عشق کے ہنگاموں پر منحصر ہیں، مگر ان میں استادی ہو تو کوئی خاص مزا اور لطف نہیں ہے۔

عسجدی:

عسجدی، جس نے ۴۳۲ھ میں وفات پائی، بہت سنبھل کر کہنے والا ہے اور ان کی رباعیات میں عشق مجازی و حقیقی کی آمیزش نے ایک حسن خاص پیدا کر دیا ہے، جو اس کے دوسرے معاصرین کے یہاں نہیں۔

شیخ بوعلی سینا:

حکیم شیخ بوعلی سینا کی رباعیاں بھی مشہور ہیں اور بعض بعض سفینوں اور بیاضوں میں ملتی بھی ہیں۔ ڈاکٹر ایتھے (Ethe) نے ۱۸۷۵ء میں ان کی بارہ رباعیاں جمع کر کے چھپوائی تھیں۔ ان میں شاعرانہ اور حکیمانہ و ظریفانہ خیالات کی آمیزش ہے اور کہیں ایسے خیالات

بھی ہیں کہ متشرع لوگ ان کو پسند نہیں کرتے۔

شیخ ابوالحسن خرقانی:

شیخ ابوالحسن خرقانی المتوفی ۴۲۵ھ کی بھی رباعیاں ملتی ہیں، مگر ان کی بعض رباعیوں میں باباطاہر کی طرح پہلوی کی آمیزش ہے اور بعض میں نہیں۔ اس واسطے جن میں یہ آمیزش نہیں ہے ان کو بہ نظر شک دیکھا جاتا ہے اور محققین کو ان کی طرف منسوب کرنے میں باک ہوتا ہے۔ پھر بھی ان کی طرف نسبت دی گئی ہے۔

باباطاہر ہمدانی:

باباطاہر ہمدانی بھی رباعی گو شاعر ہیں، مگر زبان دیہاتی ہے۔ خیال عاشقانہ زیادہ ہیں۔ ان کی رباعیوں کا ایک چھوٹا سا مجموعہ میرے کتب خانہ میں بھی موجود ہے۔ نامانوس زبان کی وجہ سے پڑھتے ہوئے بھی الجھن ہوتی ہے۔ ان کا انتقال ۴۱۰ھ میں ہوا۔

شیخ ابوسعید ابوالخیر:

شیخ ابوسعید ابوالخیر بھی رباعیوں کے بادشاہ تھے۔ ان کی زیادہ رباعیاں عارفانہ ہیں، جن کا چھپا ہوا ایک مجموعہ بھی مل جاتا ہے۔ ان کا انتقال ۴۴۰ھ میں ہوا۔ ان کی رباعیوں میں سوز و ساز کی وہ کیفیت ہے کہ دوسروں کے یہاں نہیں۔

علی بن حسن:

علی بن حسن باخرزی المتوفی ۴۶۷ھ کی رباعیوں کا ایک مجموعہ موجود تھا، جو انھوں نے خود ''طرب نامے'' کے نام سے موسوم کیا تھا۔ ان کی رباعیات میں عاشقانہ واردات، مستانہ کیفیات، رندی ولاابالی پن کے خیالات اور کہیں کہیں اخلاقی اور واعظانہ انداز پایا جاتا ہے۔ اس کا ایک تذکرہ بھی ہے۔ اسی میں بتایا ہے کہ اس کا ایک دوست محمد بن ابی نصر ہے، جس کی رباعیاں فارسی میں موجود ہیں۔

شیخ عبداللہ انصاری:

ابواسماعیل شیخ عبداللہ انصاری المتوفی ۴۸۱ھ مشہور رباعی گو صوفی تھے۔ ان کی

رباعیاں اخلاقی، عارفانہ اور عبرت انگیز ہیں۔

امام محمد غزالیؒ:

امام محمد غزالی کی بھی کچھ رباعیاں تذکروں میں منقول ہیں۔ اگر چہ وہ کچھ زیادہ نہیں ہیں، مگر ان کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور آپ کے علم و فضل کو دیکھتے ہوئے رباعیات کا آپ کے یہاں پایا جانا کچھ تعجب انگیز نہیں۔ ان کی رباعیات میں حکیمانہ، فلسفیانہ، رندانہ انداز ہے۔ آپ کا ۵۰۵ھ میں انتقال ہوا۔

امام احمد غزالی:

امام احمد غزالی کی بھی رباعیاں تذکروں میں موجود ہیں یہ امام محمد کے بھائی تھے۔ آپ کی وفات کا سنہ ۵۲۰ھ ہے۔

یہی وہ رباعی گو، حکیم، صوفی اور شاعر ہیں، جن کا خیام سے پہلے یا خیام کے دور میں پتہ چلتا ہے اور جن میں سے بعض کی زیادہ تعداد میں اور بعض کی کم تعداد میں رباعیاں پائی جاتی ہیں۔ ممکن ہے کہ کچھ اور لوگ بھی باقی ہوں جو حالت گمنامی ہی میں تمام ہو گئے ہوں اور جن کے ساتھ خاک نے ان کے کارناموں کو بھی اپنے دامن میں جگہ دی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کی صرف بعض رباعیاں بہ روئے کار آئی ہوں اور زبانی شہرت دنیا میں پھیل گئی ہو۔ مگر بہت سی کائنات گنج مدفون بن کر رہ گئی ہو۔ اس واسطے کہ اس وقت نہ تو اشاعت کے صحیح سامان تھے، نہ پریس تھے، نہ دوسرے آلات نشر۔ زیادہ سے زیادہ زبانی شہرت پر اعتبار کی بنا تھی۔ ورنہ کتابوں کی نقل جو مصنف کے دور حیات میں دس بیس سے آگے بڑھنا غیر ممکن تھی، کسی کی تصنیف کا نام مشہور ہو جانا ہی بڑا کمال اور بڑا کام تھا۔ اسی لیے بہت سے ماہر اور کامل مصنفوں کی اعلیٰ تصانیف کو تو گوشۂ گمنامی سے نکل کر زبانوں پر آنے کی بھی نوبت نہیں آئی۔

ان سب رباعی گو شعرا کی رباعیوں کو دیکھنے کے بعد ذرا خیام کی رباعیات پر بھی ایک نگاہ ڈال لیجیے کہ آج ہم کو اس کے مجموعے بارہ سو رباعیات سے پانچ ہزار تک پر مشتمل

ملتے ہیں۔ تھوڑی سی تشریح تعداد آپ کو ذیل کے نسخوں کی تشریح اعداد رباعیات سے معلوم ہو سکے گی:

۱۔ فٹز جیرالڈ نے ۵۸۔۱۸۶۰ء میں بے حد کوشش اور چھان بین کے بعد جو نسخہ شائع کیا، اس میں رباعیات کی تعداد صرف ۷۵ تھی اور اسی طرح پیرس کے ایک نسخہ منقولہ میں جو ۹۳۷ھ کے مخطوطہ سے نقل ہوا رباعیوں کی تعداد ۷۵ تھی۔

۲۔ ایک قدیم ترین نسخہ جو باڈلین لائبریری، آکسفورڈ میں محفوظ ہے اور جو ۸۶۵ھ یعنی ۳۴۸ سال بعد وفات مصنف لکھا گیا، اس میں ۱۵۸/رباعیاں ہیں۔ اسی نسخہ کو ایڈورڈ ہیرن ایلن نے ۱۸۹۸ء میں عکس لے کر شائع کیا تھا۔ فریڈرک روزن کے مطبوعہ نسخے میں غلطی سے رباعیوں کی تعداد ۱۸۵/چھپ گئی ہے۔

۳۔ فان ہومر جرمنی کے زبردست مستشرق نے اپنے ایک نسخے کی بابت لکھا ہے کہ اس میں دو سو رباعیاں ہیں۔

۴۔ موسیو نکولس فرانسیسی کانسل مقیم رشت نے ۱۸۶۷ء میں جو نسخہ پیرس سے شائع کیا، اس میں رباعیوں کی تعداد ۴۶۴/ہے۔ یہ نسخہ فٹز جیرالڈ کے نسخے کے ایک سال بعد شائع ہوا۔

۵۔ بائبلوتھک نیشنل کے ایک نسخہ میں جو ۱۵۲۸ء کا لکھا ہوا ہے، رباعیوں کی تعداد ۳۴۹/ہے۔

۶۔ وہائن فیلڈ نے جو نسخہ ۱۸۸۳ء میں شائع کیا، اس میں پانچ سو رباعیاں ہیں۔

۷۔ جان پن کے نسخے میں رباعیوں کی تعداد ۵۴۸/ہے۔

۸۔ کیمبرج یونیورسٹی لائبریری کے نسخے میں ۸۰۱/رباعیاں ہیں۔

۹۔ ڈاکٹر اسپرنگر کا بیان ہے کہ انھوں نے لکھنؤ کے ایک نسخہ میں چار سو رباعیاں دیکھیں۔

۱۰۔ کلکتہ سے جو ایک نسخہ ۱۸۳۶ء میں شائع ہوا، اس میں ۴۳۸/رباعیاں ہیں، مگر

ضمیمہ کے طور پر اس میں ۱۵۴/ رباعیاں اور بھی شامل کی ہیں۔

۱۱۔ ایشیاٹک سوسائٹی کے ایک نسخہ میں ۵۱۶/ رباعیاں ہیں۔

۱۲۔ بانکی پور، پٹنہ کے ایک نسخہ میں ۶۰۴/ تعداد بتائی گئی ہے۔

۱۳۔ بابو گوری پرشاد سکسینہ صاحب سکسینہ، لکھنؤ کو ایک نسخہ دستیاب ہوا، جو ۸۲۶ھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں رباعیات کی تعداد ۲۰۶/ ہے۔

۱۴۔ محمد سلیم صاحب (لاہوری) کے نسخے میں جو ۸۶۸ھ کا لکھا ہوا ہے، رباعیات کی تعداد ۱۴۳/ ہے۔

۱۵۔ سید نجیب اشرف ندوی کا ایک نسخہ جو دیسنہ، پٹنہ کی لائبریری میں محفوظ ہے اور ۹۱۱ھ کا مخطوطہ ہے، اس کا صفحہ اول کم ہے اور مولوی سید سلیمان صاحب ندوی نے اسی سے نقل لے کر ۱۳۵۱ھ میں اپنا نسخہ شائع کیا ہے۔ اس میں ۲۰۶/ رباعیاں ہیں، جس میں سے ۲۰۵/ بوجہ ایک رباعی کے گم ہونے کے، نقل ہو کر شائع ہوئیں۔

۱۶۔ ہالینڈ میں ایک ترجمہ شائع ہوا، مگر اس میں چند رباعیاں تھیں۔ معلوم نہیں نسخۂ منقول عنہ میں اسی قدر رباعیاں تھیں یا بقیہ کو نظر انداز کر دیا تھا۔

۱۷۔ مس۔ جی۔ سی۔ ای۔ کیڈل نے ۱۲۰۰/ رباعیات کا ایک نسخہ جمع کر دیا تھا، افسوس کہ اس کا سنہ معلوم نہیں ہو سکا۔

۱۸۔ محمد شفیع الدین خاں مراد آبادی، ممبر ایشیاٹک سوسائٹی، لندن نے ۱۹۰۷ء میں ایک نسخہ اس دعوے کے ساتھ شائع کیا کہ میرے پاس نہایت معتبر دو انگریزی نسخے موجود ہیں۔ انھی سے رباعیوں کو فارسی ترجمہ کر کے شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں صرف ۱۷۲/ رباعیاں ہیں۔

۱۹۔ منشی جے نرائن ورما نے ۱۹۰۵ء میں لکھنو مطبع جے نرائن ورما سے ایک نسخہ شائع کیا۔ اس میں رباعیات کی تعداد ۵۰۰/ ہے۔

۲۰۔ ڈاکٹر فریڈرک روزن کے نسخے میں ضمیموں کے علاوہ ۳۲۹/ رباعیاں ہیں۔

اس کے علاوہ ایک ضمیمہ ۶۲/رباعیوں کا اور ایک عکسی ضمیمہ میں ۱۲/رباعیاں شامل ہیں۔ یہ نسخہ ۱۳۰۴ شمسی میں کاویانی پریس، برلن سے طبع ہوا۔

۲۱۔''پیام خیام'' میں، جو رباعیات عمر خیام کی شرح ہے اور ڈاکٹر سعید احمد بریلوی ایم. بی. ایس. نے مع مسٹر ظفر قریشی بی. اے. کے مقدمہ کے مصور کرا کے محبوب المطابع برقی پریس سے شائع کیا۔ ۴۵۶/رباعیاں ہیں۔

۲۲۔مولوی جلال الدین صاحب زینبی نے، جو نسخہ مع شرح انوار احمدی پریس، الہ آباد شائع کیا۔ اس میں ۹۰۸/رباعیاں ہیں۔

۲۳۔مطبع نول کشور میں، جو نسخہ ۱۳۳۲ھ میں شائع ہوا، اس میں ۷۷۰/رباعیاں ہیں۔

۲۴۔''تذکرہ رباعیات عمر خیام'' شرح ولی اللہ صاحب بی. اے. میں، جو ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا، اس میں تقریباً چھ سو رباعیاں ہیں۔

اس قدر نسخوں کی تعداد رباعیات کے دیکھنے سے صاف صاف یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس کے کلام میں یقینی دوسروں کا کلام شامل ہو گیا اور وہ خالص نہیں رہا اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے صرف اپنے خیال اور اپنی معلومات کی بنا پر اس کے نام کے نسخے مرتب کیے، ورنہ اگر کوئی نسخہ پہلے سے مرتب ہوتا تو دوسری بڑی بڑی تصنیفوں کی طرح اس قدر تغیر ممکن نہ تھا۔ ہاں، یہ ہوسکتا ہے کہ کچھ لفظی غلطیاں اور آمیزش ہو جاتیں اور اختلاف نسخ یہیں تک رہتا۔ محدثین اور فقہا کی تصانیف اور نسخوں کے اتحاد مضامین اور یکسانیت کو دیکھیے کہ ان میں سوائے معمولی لفظی اختلاف کے کوئی فرق نہیں اور ہر جگہ ایک ہی طرح کے ملتے ہیں۔ حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ ان میں سے بہت سی کتابیں خیام سے بہت پہلے وجود میں آئی تھیں۔ ان پر صدیاں گزر چکی تھیں۔ پھر اگر اس پر یہ عذر پیش کیا جائے کہ ایسی کتابوں کی حفاظت مذہبی ہونے کی حیثیت سے کی گئی تو کہا جائے گا کہ مذہبی کتابوں کے علاوہ بھی خیام سے پہلے کے بہت سے لوگوں کی تصنیفیں محفوظ موجود ہیں، جو من وعن

چلی آتی ہیں۔ پھر آخر خیام کے ساتھ ہی زمانے کو کیا عداوت تھی کہ یہ شعبدہ گری بروئے کار آئی۔

نسخوں کا اختلاف صرف تعداد و شمار رباعیات تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ اس کے ہر نسخے کی ابتدا ایک نئی رباعی سے ہوتی ہے۔ قدیم نسخوں اور جدید مطبوعہ نسخوں میں برابر یہ بوالعجبی کارفرما ہے۔ خود میرے پاس مضمون لکھتے وقت جس قدر نسخے موجود ہیں، انھی سے اندازہ ہو جاتا ہے۔ ''پیام خیام'' یعنی شرح رباعیات خیام ڈاکٹر سعید احمد بریلوی میں:

گویند بہشت و حور عین خواہد بود

نسخہ مرتبہ محمد شفیع الدین خاں مراد آبادی:

زاں پیش کہ از جام اجل مست شوی

نسخۂ کشوری و نسخۂ منشی جے نرائن ورما:

آمد سحرے ندا ز میخانۂ ما

نسخۂ مشرح حافظ مولوی جلال الدین احمد:

ساقی بکرم تو می کنی یاد مرا

نسخۂ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی:

چوں عہدہ نمی شود کسے فردا را

نسخۂ فریڈرک روزن صاحب مطبوعہ، برلن:

تا بتوانی طعنہ مزن مستانرا

اسی پر دوسرے نسخوں کا قیاس کر لیجیے۔ بعض محققین نے اس اختلاف کو ذرا توضیح کے ساتھ دکھایا گیا ہے، مگر نتیجہ یہی نکلتا ہے، جو ہم نے عرض کیا کہ خیام کا کوئی نسخہ ایسا مستند نہیں، جس پر یہ بنیاد خیال قائم کی جا سکے کہ خود خیام کا لکھا ہوا یا اس کے زمانے کا مرتبہ ہے۔

خیام سے پہلے اور خیام کے زمانے تک یہ دستور تھا کہ ہر معمولی سے معمولی اور چھوٹی سے چھوٹی کتاب کا بھی کوئی نام رکھا جاتا تھا، چنانچہ جن حضرات کی رباعیات زیادہ تعداد

میں ہیں، ان کے اگر علاحدہ نسخے مرتب ہوئے ہیں تو ان کے نام بھی موجود ہیں، جیسا کہ ''طرب نامہ''، ''شمس المعالی اور ''مختار نامہ'' عطار۔ یہ رباعیات وغیرہ کے مجموعے ہیں۔ خود خیام کی ہر ایک کتاب کا نام موجود ہے، مگر رباعیات کے نسخے کا کوئی نام نہیں، اس لیے اسوقت اس کے ہاتھ سے کسی نسخے کا مرتب ہونا ہرگز متیقن نہیں۔ اسی وجہ سے خیام کے کلام پر تنقید و تنقیح کرنے والوں نے برابر افسوس کیا ہے کہ اس کے وقت کا کوئی مستند نسخہ دستیاب نہیں ہوا۔

خیام کے زمانے سے پہلے اور اکثر خیام کے زمانے تک اکثر رباعی گو ہوئے، مگر اتفاق وقت سے چندان میں سے متعارف ہیں اور چند گوشۂ گمنامی کے زینت افروز، مگر جو مشہور بھی ہوئے، ان کی رباعیاں بھی تعداد وشمار میں زیادہ نہیں ہیں اور ان میں سے اکثر کی رباعیاں خیام کے مجموعے میں ملی ہوئی ہیں۔

اکثر رباعیاں ایسی ہیں، جو مدتوں سے مشہور ہیں، مگر صحیح طور سے یہ متعین نہیں ہوا کہ کس کی ہیں۔ ان کی ایک فہرست ژوکوفسکی نے مرتب کر کے ان کو' آوارہ گرد رباعیوں' کا خطاب دیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ رباعیاں ان لوگوں کے نام سے منسوب ہیں اور خیام سے بھی منسوب ہیں۔ ان آوارہ رباعیوں کی بہت بڑی تعداد خیام کے مجموعے میں موجود ہے اور ان آوارہ رباعیوں کی نسبت ان تمام مشاہیر سے کی گئی ہے، جن کے نام دنیا کی زبانوں پر ہیں۔ روسی مستشرق ژوکوفسکی نے جس مجموعہ رباعیات خیام کو دیکھا، اس میں کل ۴۶۴ر رباعیات تھیں۔ اس میں سے بیاسی رباعیاں آوارہ فرض کی تھیں، مگر (گریستن زن) نے اس تعداد کو ایک سو ایک تک پہنچایا اور لطف یہ کہ ان ایک سو ایک غیر اصلی رباعیات میں سے ۱۹ر عدد رباعیاں اس مشہور اور مستند علیہ بوڈلین لائبریری کے نسخے میں بھی موجود ہیں، جس کو سب سے قدیم مانا گیا ہے، جس سے یہ صریحی معلوم ہوتا ہے کہ الحاق کی علت اسی زمانے سے پیدا ہو چکی تھی۔

گریستن زن نے ان کے خالص خیام کی رباعیاں ڈھونڈنے کی ایک یہ صورت

نکالی کہ صرف وہ رباعیاں لے لیں، جن میں خیام کا تخلص ہے اوران پر اصلی ہونے کا بھروسا کیا۔ یہ رباعیاں بارہ ہیں اور دراصل یہ ایک بہتر طریقہ تھا، مگر فریڈرک روزن نے اس طریقے کو بھی قابل اطمینان نہیں سمجھا۔ اول تو گریستن زن ہی کو ایک رباعی پر شبہ ہوا کہ اصلی شاعر کا نام نکال کر خیام کا نام ڈال دیا ہے اور اسی پر دوسری رباعیوں کا قیاس کیا۔ اسی طور پر مستشرق جرمنی روزن نے پانچ رباعیوں کو مختلف دلایل سے مسترد کر دیا اور اس مجموعے میں سے چھ رباعیاں باقی رہ گئی ہیں۔

ایک صورت رباعیات خیام کے اصلی ہونے کی یہ بھی تجویز کی ہے کہ جو رباعیات قدیم کتابوں میں مذکور ہیں، ان کو اصلی مانا جائے۔ جیسا کہ ''نزہتہ الارواح'' شہرزوری میں یہ دو رباعیاں پائی جاتی ہیں:

ا۔ گویند بحشر گفتگو خواہد بود	وان یار عزیز تند خو خواہد بود
از خیر محض جز نکوی ناید	خوش باش کہ عاقبت نکو خواہد بود
۲۔ از واقعہ ترا خبر خواہم کرد	وآں را بدو حرف مختصر خواہم کرد
با عشق تو در خاک فرو خواہم شد	با مہر تو سر ز خاک بر خواہم کرد

یا ''فردوس التواریخ'' میں یہ دو رباعیاں ہیں:

ا۔ ہر ذرہ کہ بر روئی زمینی بودہ است	خورشید رخی زہرہ جبینی بودہ است
گرد از رخ نازنین بآرزم فشاں	کاں ہم رخ و زلف نازنینی بودہ است
۲۔ سیر آمدم ای خدائی از ہستیِ خویش	از تنگ دلی و از تہی دستیِ خویش
از نیست چو ہست مے کنی بیرون آر	زین نیستیم بحرمت ہستیِ خویش

مگر ان میں سے بھی پہلی رباعی کو انگریزی مستشرق رسؔ نے حکیم سنائی سے منسوب بتایا ہے۔ پھر بھی یہ رباعی ''تاریخ گزیدہ'' تالیف ۷۳۰ھ حمد اللہ مستوفی میں بھی عمر خیام سے منسوب بتائی ہے اور اسی کے نام سے لکھی گئی ہے۔ الغرض، اگر اس طریقہ کار کو مانا جائے کہ خیام کی وہی رباعیاں مانی جائیں، جو ان کے نام سے قدیم کتب میں موجود ہیں، تو صرف

چند رباعیاں ان کی ملک ٹھہریں گی اور باقی غیروں کا مال ہوگا۔ اس پر بھی اگر طرز کلام پر تنقید کی جائے تو ان رباعیوں کی تعداد اور کم ہو جائے گی۔

اب ذرا ان چیزوں پر بھی نگاہ ڈال لینا چاہیے، جن سے استدلال کیا جاتا ہے کہ خیام رباعی گو شاعر تھا۔ اس بارے میں محققین نے مندرجہ ذیل گواہوں کو پیش کیا ہے:

۱۔ مولف ''قابوس نامہ'' یعنی کیکاؤس بن اسکندر بن قابوس بن وشمگیر رئیس جرجان، جو اپنی کتاب ''قابوس نامہ'' میں، جو ۴۷۵ھ میں خیام کی زندگی میں لکھی گئی، خیام کے دو شعر نقل کرتا ہے۔

۲۔ ''نزہتہ الارواح'' شہرزوری۔ اس میں خیام کی دو رباعیاں بھی لکھی گئی ہیں، جن کو ہم پہلے نقل کر چکے ہیں۔ یہ کتاب ۵۷۶ھ سے ۶۱۱ھ تک کی تصنیف بتائی گئی ہے اور اس میں عربی و فارسی میں اس کے شاعر ہونے کی گواہی بھی ہے۔

۳۔ ''تاریخ الحکما'' قفطی جو ۶۲۴ھ سے ۶۴۶ھ کے درمیان کی تالیف ہے، خیام کے بعض عربی اشعار نقل کیے ہیں۔

۴۔ ''خریدۃ القصر'' جو اس عہد کے عربی شعرا کا تذکرہ اور ۵۷۲ھ کی تالیف ہے، اس میں خیام کے عربی اشعار ہیں۔ عماد الدین اصفہانی کاتب اس کا مؤلف ہے۔

یہ ممکن ہے کہ ان کے علاوہ اور گواہیاں بھی مل سکیں، مگر افسوس کہ وہ ہمارے علم میں نہیں آئیں۔ اب دیکھنا چاہیے کہ یہ گواہیاں کہاں تک درست ہو سکتی ہیں۔ خیام کے لیے شاعر ہونا کوئی بڑی بات نہیں، اس لیے اس کی شاعری سے انکار ایک غلط اور دور از کار بات ہوگی، مگر صرف ''قابوس نامہ'' کے دو شعر اس کی رباعیات کے لیے مفید نہیں اور ان کی بنا پر اس کو رباعیات کا مصنف نہیں مانا جا سکتا۔

شہرزوری کی تصنیف میں دو رباعیاں ہیں۔ ان میں سے بھی ایک رباعی سنائی سے منسوب ہے اور ایک رباعی جو رہ جاتی ہے، اس کو ''تذکرہ آتش کدہ'' میں سلطان ابویزید آل سلطان مظفر برادر شاہ شجاع سے منسوب کیا ہے اور غالباً اسی کی پیروی ''المغنم البارد'' (مجموعہ

رباعیات ،مرتبہ نواب محمد صدیق حسن خاں مرحوم)، مطبوعہ بھوپال، ۱۲۹۹ھ میں کی گئی ہے۔'' کاس الکرام'' شرح رباعیات خیام میر ولی اللہ بی.اے. میں یہ رباعی قطران بن منصور ترمذی کی طرف منسوب ہے۔''شمع انجمن'' میں بھی سلطان ابو یزید کے نام سے ہے اور یہ دونوں قدیم شعرا میں سے ہیں۔ یہاں تک کہ قطران انوری المتوفی ۵۴۷ھ کا استاد ہے۔ایک دیوان اور'' قوس نامہ'' اس کی یادگار ہیں۔'' تاریخ الحکما'' ایک تو خیام کے بہت بعد کی تصنیف ہے اور ۶۲۴ھ سے ۶۴۶ھ تک اس کا عالم وجود میں آنا بتایا جاتا ہے۔اگر خیام کا انتقال ۵۳۰ھ ہی میں مان لیا جائے ،تو بھی ایک صدی کی مدت سے کچھ زیادہ کے قریب کا زمانہ گزر جاتا ہے، جس میں زبانی اور شہرت یافتہ باتوں کی ایک سر بفلک دیوار قائم ہو سکتی ہے۔دوسرے یہ بھی ہے کہ اس میں محض عربی اشعار نقل کیے گئے ہیں۔مولوی سید سلیمان صاحب ندوی کا خیال ہے کہ'' تاریخ الحکما'' کو اس کی شاعرانہ حیثیت سے کوئی کام نہ تھا۔ حالانکہ اس میں عربی اشعار موجود ہیں، مگر شہرزوری نے جو عربی شعر نقل کیے ہیں، اس میں سے بھی تین شعر'' یتیمة الدھر قسم رابع ''میں ابو سہل سعید بن عبدالعزیز نیلی المتوفی ۲۴۰ھ سے منسوب ہیں۔

فارسی کا ایک قطعہ بھی خیام سے منسوب ہے جس کے اشعار یہ ہیں:

دوش با عقل در سخن بودم ــ کشف شد بر دلم خیالے چند

گفتم اے مایۂ ہمہ دانش ــ دارم الحق بہ تو سوالے چند

گفتمش چیست زندگانی دہر ــ گفت خوابیست یا خیالے چند

گفتم از وے چہ حاصل است بگو ــ گفت دردِ سر و وبالے چند

گفتمش نفس رام کے گردد ــ گفت چوں یافت گوشمالے چند

گفتم اہل زماں چہ طائفہ اند ــ گفت گرگ و سگ و شغالے چند

فتمش بحث اہل دنیا چیست ــ گفت بیہودہ قیل و قالے چند

گفتم اہل زمانہ در چہ فن اند ــ گفت در بند جمع مالے چند

گفتمش چیست کتخدائی گفت هفتۂ عیش و غصہ سالے چند
گفتم او را مثال دنیا چیست گفت زالے نہادہ خالے چند
گفتمش چیست گفتہ ہائے خیام گفت پندے وحسب حالے چند

اول تو یہ قطعہ خواہ وہ کتنا ہی نصائح کے بیش بہا جواہرات سے آراستہ ہو، خیام کے طرز کلام کا حاوی ہی نہیں اور ہر وہ شخص جس کو خیام کے بات کہنے کا ڈھنگ معلوم ہے، معاً اس تہہ کو پہنچ جائے گا کہ یہ نسبت درست نہیں۔ اس کے علاوہ میر ولی اللہ بی۔اے۔ نے رباعیات خیام کی شرح کے مقدمے میں اس کو نقل کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ میں نے ایک قدیم دیوان حافظ کے قلمی نسخے میں حافظ کے نام سے یہ قطعہ دیکھا اور گفتہ ہائے خیام کی بجائے گفتۂ حافظ پایا۔ ممکن ہے کہ یہ بھی غلطی ہو اور ہم اس قطعے کو حافظ کی ملکیت بھی ثابت نہ کرسکیں، مگر خیام سے اس کو واسطہ نہیں ہوسکتا اور مقطع میں جس طرح خیام کا لفظ ٹھونس دیا گیا ہے، خیام کے علم وفضل کے لیے وہ ایک توہین سے زیادہ نہیں۔

الغرض، وہ گواہیاں جو خیام کی شاعری کے متعلق دی گئی ہیں، نہایت کمزور ہیں اور ان پر اعتماد نہیں ہوسکتا۔ اب ایک اور بات بھی دیکھیے کہ نظامی عروضی سمرقندی جو خیام کا ایک سربرآوردہ اور مشہور شاگرد تھا۔ اس نے ''چہار مقالہ'' میں خیام کے علم حساب ونجوم کے کمال کا تو ذکر کیا، مگر خیام کی شاعری کا مطلق تذکرہ نہیں۔ حالانکہ اس نے دوسرا مقالہ ''ماہیت علم شعر اور صلاحیت شاعر'' میں لکھا ہے۔ یہ بات کس قدر عجیب ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کا ذکر کرے اور کہیں اپنے استاد کا بھول کر بھی نام نہ لے۔

اسی طرح بیہقی نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا، جو حکیم صاحب کا معاصر ہے۔

یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ ان کے قلم کا یا ان کے زمانے کا لکھا ہوا کوئی نسخہ کم از کم اس وقت تک دستیاب نہیں ہوا۔

یہ مسئلہ بھی صاف ہو گیا ہے کہ ان کی رباعیوں میں الحاق کا بے پایاں طوفان موجزن ہے اور کوئی محقق کسی صورت میں مطمئن نہیں ہے۔ یہ بھی پوشیدہ نہیں کہ رباعیات کے بہت

سے نسخے ہیں اور نہ رباعیات کی ترتیب ہی یکساں ہے، نہ یہی ہے کہ جو رباعیاں ایک نسخے میں ہیں، وہ دوسرے میں بھی ہوں۔ ایک میں کچھ ہیں، دوسرے میں کچھ۔ کسی میں کوئی رباعی ہے، کسی میں نہیں۔

ڈاکٹر فریڈرک روزن نے اپنے نسخے میں آوارہ رباعیوں کی جو مختلف نسخوں میں خیام کے یہاں مختلط ہوگئی ہیں، ایک فہرست دی ہے، جن کی تعداد مجموعی بہت بڑی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رباعیات کے دیباچے میں خیام کے مجموعے کی بڑی تعداد دوسروں کی فرض کی گئی ہے اور یہ حالت ہر نسخے میں ہے، مگر انھوں نے طول کی وجہ سے یا اور کسی سبب سے کوئی رباعی نہیں لکھی، صرف اعداد و شمار پر کفایت کی ہے۔

یہی مستشرق لکھتا ہے:

''عدہ رباعیات را کہ بطور کلی بخیام نسبت دادہ شدہ تا پنجہزار تخمین کردہ اند۔ از ینجا معلوم می گردد کہ بمرور زمان رباعیات و اضافات دیگری داخل گفتہ ہائے عمر شدہ، آنہا را از حالت خلوص خارج نمودہ است، بقسمیکہ امروز تمیز رباعیات خود خیام از میان ایں تودہ اشعار کاریست دشوار۔''

اسی محقق کی طرح دوسرے محقق بھی مُقر ہیں کہ ان رباعیوں میں سے خیام کی خالص رباعیات کا نکالنا اور انتخاب کرنا بہت دشوار اور ناممکن کام ہے۔

خیام کے موجودہ مطبوعہ نسخوں میں جن کی تعداد رباعیات بہت زیادہ ہے۔ مندرجہ ذیل مضامین پائے جاتے ہیں اور یہی مضمون چھوٹے اور بڑے مجموعوں میں مشترک طور پر موجود ہیں۔ کہیں کم اور کہیں زیادہ۔ ان سب کے ثبوت کے لیے ہم صرف ایک ایک رباعی پیش کرتے جائیں گے:

ا۔ متصوفین کا مقولہ اور خیال ہے کہ زندگی میں زندگی کے عقدے کا حل ہونا دشوار ہے، بلکہ اس کو سمجھنا امکان نظر و بشر سے قطعاً خارج ہے اور اسی صورت سے دنیا کے وجود کا راز سمجھنا بھی محالات سے ہے۔ مثلاً:

اسرار ازل را نہ تو دانی و نہ من　　وین حرف معما نہ تو خوانی و نہ من

ہست از پس پردہ گفتگوئی من وتو　　چوں پردہ برافتد نہ تو مانی و نہ من

۲۔کائنات کی ہر چیز مظہر نور ذات ہے اور ہر چیز اسی کا پرتو ہے۔ان کا اصلی مرکز وہی ذات ابدی ہے۔مثلا:

اے دل زغبار جسم اگر پاک شوی　　توروح مجردی بر افلاک شوی

عرش است نشیمن تو شرمت بادا　　کائی و مقیم خطہ خاک شوی

۳۔دنیا فانی ہے۔یہاں کی کسی چیز کا اعتبار نہیں۔اس میں غم ہیں،ہم ہیں اور کہیں شادمانی کا وجود نہیں۔

شادی مطلب کہ حاصل عمر دمی است　　ہر ذرہ زخاک کیقبادی و جمے است

احوال جہاں واصل ایں عمر کہ ہست　　خوابی و خیالی و فریبی و دمی است

۴۔فرصت ہستی کو غنیمت سمجھو اور اس میں جو کچھ جی چاہے وہ کرڈالو۔پھر اس کا میسر آنا دشوار ہے:

می خوردن وشاد بودن آئین منست　　فارغ بودن ز کفر و دین دین منست

گفتم بہ عروس دہر کابین تو چیست　　گفتا دل خرم تو کابین منست

۵۔خمریات۔یہی وہ چیز ہے،جس نے اس ہوسناک اور عیش پرست دور میں خیام کو مشہور یا بدنام کیا۔اس میں ان کی بہت سی رباعیات ہیں،مگر اکثر رباعیاں دوسروں کی ہیں، جو اس کے سرڈال دی گئی ہیں۔چنانچہ ژوکوفسکی کی ۸۲/رباعیوں میں ۳۳/رباعیات جن میں شراب کا بیان ہے،دوسروں کی خیال کی جاتی ہیں۔پھر بھی اس کے یہاں اس قسم کا بہت کافی مسالہ رہ جاتا ہے:

سنت مکن و فریضہ ہا را بہ گزار　　ویں لقمہ کہ داری ز کسان باز مدار

غیبت مکن و دل کسی را مآزار　　در عہدۂ آنجہاں منم بادہ بیار

۶۔ریاکار صوفیا اور مشائخ پیشہ ورکی ہجو اور ان کی ظاہر پرستی سے تنافر و بیزاری۔

پوشیدہ مرقع اند این خامی چند   نا رفتہ رہ صدق و صفا گامی چند
بگرفتہ ز طامات الف لامی چند   بدنام کنندۂ نکو نامی چند

۷۔ رحمت اور طلب آمرزش، دعائیں اور حقوق بندگی کے عدم ادائی کا اظہار، اپنا عجز اور بے بسی، گناہوں سے شرمساری:

بر سینۂ غم پذیر من رحمت کن   بر جان و دل اسیر من رحمت کن
بر پائی خرابات رو من بخشائی   بر دست پیالہ گیر من رحمت کن

۸۔ خداوند کریم آمرز گار حقیقی ہے۔ وہ اپنے کرم سے تمام خطائیں اور گناہ معاف کردے گا۔ وہ خیر محض ہے۔ اس سے خیر ہی ہوسکتی ہے۔

گویند بحشر گفتگو خواہد بود   واں یار عزیز تند خو خواہد بود
از خیر محض جز نکوئی ناید   خوش باش کہ عاقبت نکو خواہد بود

۹۔ معتزلہ جبریہ فرقے کے خیالات، جس کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ چاہا وہ کیا اور جو چاہے گا کرے گا۔ بندہ مجبور محض ہے۔

از رفتہ قلم ہیچ دگرگوں نہ شود   وز خوردن غم بجز جگر خوں نہ شود
گو در ہمہ عمر خویش خونابہ خوری   یک قطرہ ازانکہ ہست افزوں نہ شود

۱۰۔ اخلاق وآداب کے نکات، عام طور سے نیکی کرنا۔

با دشمن و دوست فعل نیکو نیکوست   بد کی کند آنکہ نیکش عادت وخوست
با دوست چو بدکنی شود دشمن تو   با دشمن اگر نیک کنی گردد دوست

۱۱۔ بعض فلاسفہ کا خیال ہے کہ بخشش کا قصہ، روز جزا کا وجود، یہ سب سنی سنائی باتیں ہیں۔ ان کی فکر اور غم محض وہم ہے اور اس جھنجھٹ میں پڑ کر دنیا کے عیش وآرام کو چھوڑنا حماقت پر مبنی ہے۔

تا چند زنم بروئی دریاہا خشت   بیزار شدم ز بت پرستان و کنشت
خیام کہ گفت دوزخی خواہد بود   کہ رفت بہ دوزخ وکہ آمد ز بہشت

۱۲۔ عالم حادث ہے یا قدیم ۔ یہ مسئلہ بھی علمائے اسلام میں مہتم بالشان کا درجہ رکھتا ہے اور اس پر بھی خیام نے کہیں کہیں روشنی ڈالی ہے۔

چوں نیست مقام ما دریں دیر مقیم　　پس بی مئی و معشوق خطائیست عظیم
تا کی ز قدیم و محدث ای مرد سلیم　　چوں من رفتم جهاں چه محدث چه قدیم

۱۳۔ عشق و عاشقی کے مضامین بھی رباعیات میں شامل ہیں۔ اگرچہ بعض محققین خیام کی رباعیوں سے اس جزو کو نسبت نہیں دیتے۔ اس قسم کی رباعیاں بھی اسی بیان میں شامل سمجھنا چاہیے، جن میں عشق کا فلسفہ اور عشق حقیقی و مجازی کا فرق ظاہر کیا ہے۔ مثلاً:

عشقی کہ مجازی بود آبش نہ بود　　چوں آتش نیم مردہ تابش نہ بود
عاشق باید کہ ماہ و سال و شب و روز　　آرام و قرار و خورد و خوابش نہ بود

۱۴۔ ان کے علاوہ متفرق مضامین ہیں، جن میں عبرت، نصیحت، دل خوش کن ترانے، سب ہی چیزیں شامل ہیں اور ان کی مثال کا تعین ناکافی ہوگا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ سب ایسی چیزیں اور ایسے مضمون ہیں کہ جن کا خیام سے پہلے وجود نہ تھا اور ان کو صرف خیام کی ملکیت بہ جبر ماننا پڑے گا۔ ممکن ہے کہ سرسری نظر میں کوئی کہہ دے کہ ایسا ہی ہے، مگر بہ امعان نظر دیکھنے پر یہ تمام چیزیں متقدمین اور معاصرین خیام کے یہاں مل جاتی ہیں۔ دنیا سے بیزاری، ساقی سے بادہ و جام کی خواست گاری، حکمت و فلسفہ کے مسائل تمام چیزیں موجود ہیں اور ان کی مثالوں کے پیش کرنے کی بجائے ہم یہی کہہ کر خاموشی اختیار کرتے ہیں کہ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ کسی کا کلام اٹھائیے، گہری نگاہ ڈالیے اور سب چیزیں دیکھ لیجیے۔ رہے متاخرین، ان کے یہاں تو دریا بہہ رہے ہیں۔ جس کے دیوان کو اٹھائیے، کچھ نہ کچھ مل رہے گا۔ ان تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے اگر یہ کہہ دیا جائے تو کیا غلط ہے کہ خیام نے خود کوئی رباعی نہیں کہی، بلکہ اس نے متقدمین اور معاصرین کے کلام سے ایک مجموعہ جمع کیا اور مختلف صحبتوں میں مختلف لوگوں کے سامنے اس کی رباعیاں حسب موقع پڑھیں، جنھیں لوگوں نے خیام کے نام سے منسوب

کر دیا اور شدہ شدہ وہ ان کی ملک خالص یا مشترک کا درجہ حاصل کر گئیں یا یہ کہ خود اس زمانے کی دیکھا دیکھی انھوں نے بھی کچھ کہا، مگر خدا معلوم وہ کیا تھا اور کس کے یہاں مخلوط ہوا۔

آج پریس نے شہرت کی دشواریوں کو آسان کر دیا ہے۔ ایک معمولی مدت میں شہر بہ شہر ادنیٰ و اعلیٰ تک شہرت پہنچ جاتی ہے، مگر اس زمانے میں یہ سب کچھ نہ تھا۔ نہ ریڈیو، نہ تار، نہ ٹیلیفون۔ مدتوں میں کہیں نسخوں کی نقلیں لی جاتی تھیں اور عمروں میں ایک باکمال کہنے کے قابل ہوتا تھا۔ مکالمہ باہمی اور تبادلۂ گفتگو، ایک روایت کو کچھ کا کچھ بلکہ بیشتر مسخ کر کے پیش کرتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ آج ہم نسخوں میں زیادہ سے زیادہ اختلافات پاتے ہیں۔

ہمارے سامنے ایک قدیم سے قدیم نسخہ ڈاکٹر فریڈرک روزن کا ہے، جس کو ۷۲۱ھ کے مخطوطہ نسخے کی نقل بتایا گیا ہے، مگر دیکھنا چاہیے کہ خیام کی زندگی اور وفات سے اس کو کس قدر بعد ہے اور اتنے دنوں میں دنیا کہاں سے کہاں پہنچ سکتی ہے۔ یقینی یہ مدت نقل کو اصل کر دکھانے کے لیے ناکافی نہیں ہو سکتی۔

آج سے سات آٹھ برس پہلے میرے بعض احباب نے مجھ سے خواہش کی تھی کہ میں محققین کے فیصلے کے مطابق ان رباعیوں کا انتخاب کروں، جو خیام کی طرف منسوب ہو گئی ہیں۔ یہ کام کچھ آسان نہ تھا، مگر تاہم میرے ذوق نے اس کو منظور کیا اور نہ معلوم کس قدر کتابوں کو چھان ڈالا اور ان رباعیوں کو نکالا، جو خیام کے نام سے منسوب ہیں اور ان کی نہیں ہیں۔ اس انتخاب کے لیے میں نے مطبع نول کشور کے ۱۳۳۲ھ والے نسخے کو منتخب کیا، جس میں رباعیوں کی تعداد ۷۷۰ رہے۔ اس کے علاوہ دوسرے نسخے بھی پیش نظر رکھے، جس کے نتیجے میں صرف ایک ہی نسخے سے بہت کافی تعداد ایسی ملی کہ اگر اتنی تعداد میں سے اتنی تعداد منتخبہ نکل جائے تو ہرگز یقین نہیں آتا کہ بقیہ رباعیاں خیام کی ہوں گی۔ چنانچہ ذیل میں پہلے ردیف وار ان رباعیوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد دوسرے بعض نسخوں پر بھی

تنقید کی جاسکے گی۔

۱۔ آمد سحری ندا ز میخانۂ ما کای رند خراباتی دیوانۂ ما
برخیز کہ پر کنیم پیمانہ ز می زاں پیش کہ پر کنند پیمانۂ ما

یہ رباعی خیام کے نام کے ساتھ اس قدر چسپاں ہوگئی ہے کہ ایک ایسا آدمی جس کو اس کے کلام پر عبور کلی نہیں ہے خیام کے نام کے ساتھ نسبت دے کر پڑھ دیتا ہے، مگر ''گلستان مسرت'' میں حیاتی گیلانی کے نام سے لائی گئی ہے اور شراب کے بیان میں جہاں بہت سے اشعار ہیں، وہاں یہ رباعی بھی ہے۔

حیاتی گیلانی المتوفی ۱۰۱۵ھ، ایک آزاد منش درویش وضع شاعر تھا۔ مولانا غلام علی آزاد نے ''ذخیرۃ الخوانین'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ خانخاناں اس کو خزانے میں لے گیا اور حکم دیا کہ جس قدر اشرفیاں اٹھا سکے اٹھا کر لے جائے۔

میں نے ایک قلمی نسخہ ''منتخبات کلام حیاتی'' کا دیکھا اور اس میں اس رباعی کو ڈھونڈا، نہ مل سکی۔ مگر یہ معلوم ہوا کہ وہ نہایت خوش گو اور جذباتی شاعر تھا۔ اس کا ایک یہ شعر:

درمیان کافراں ہم بودہ ام یک میاں شائستہ زنار نیست

سعدی کے نام سے مشہور ہو گیا ہے۔ یہ رباعی بھی نہایت جوش اور جذبات کا اظہار کرتی ہے، مگر افسوس کہ اس کے یہاں اس قسم کی خمریاتی شاعری بہت کم ہے، اس لیے ممکن ہے کہ یہ رباعی اس کی نہ ہو۔ ''تذکرۂ ہفت اقلیم'' امین رازی میں اس کو سلمان ساوجی المتوفی ۷۷۸ھ سے منسوب کیا ہے۔ سلمان ان باکمالوں میں سے ہے، جن کے کلام میں ہر قسم کا رنگ ہے۔ رباعی، قصیدے، غزل میں وہ اپنا آپ ہی جواب ہے۔ حافظ نے سلمان کے کلام سے استفادہ کیا ہے اور اس کی مدح میں کہا ہے:

سر آمد فضلائی زمانہ دانی کیست زراہ صدق و یقین فی زراہ کذب و گماں
شہنشہ فضلا بادشاہ ملک سخن جمال ملت و دین خواجہ جہان سلماں

''تذکرۂ تمنا'' میں بھی یہ رباعی سلمان ہی سے منسوب بتائی گئی ہے۔ نسخہ برلن منقولہ

مخطوطہ ۷۲۱ھ اور نسخہ دار المصنفین منقولہ مخطوطہ ۹۱۱ھ میں یہ رباعی نہیں پائی جاتی:

۲۔ گرمی نہ خوری طعنہ مزن مستاں را　　گر دست دہد توبہ کنم یزداں را
تو فخر بدیں کنی کہ من می نخورم　　صد کار کنی کہ می غلام است آں را

یہ رباعی افضل کاشانی المتوفی ۷۰۷ھ کی ہے۔ چنانچہ رباعیات بابا افضل، مطبوعہ طہران میں موجود ہے اور بجائے 'گرمی نہ خوری' 'تا بہ توانی' ہے۔ افضل کاشانی کے یہاں ایک بڑی تعداد رباعیوں کی موجود ہے، جن میں ہر رنگ پایا جاتا ہے اور وہ ۳۸۲ رباعیاں ہر جذبے پر منقسم کی جا سکتی ہیں۔ یہ رباعی برلن کے نسخے میں موجود ہے، مگر مرتبہ دار المصنفین میں نہیں ہے۔ اس رباعی میں ناصحانہ رنگ ہے اور اس قسم کی نصیحتیں خیام ایسا فلسفی نہیں کر سکتا، نہ یہ اس کی طرز وروش، نہ یہ اس کا طرز بیان۔ وہ ناصحانہ انداز میں کہہ سکتا ہے، مگر اس کا انداز واعظانہ نہیں۔

۳۔ چوں عہدہ نمی شود کسی فردا را　　جائی خوش کن تو این دل سودا را
می نوش نبود ماہ ای ماہ کہ ماہ　　بسیار بہ تا بد و نیابد ما را

یہ رباعی شیخ فریدالدین عطار المتوفی ۶۲۷ھ کی ہے۔ ''مختار نامہ کشوری'' مشمولہ ''کلیات عطار'' مطبوعہ کشوری میں صفحہ ۱۰۰۲ پر موجود ہے۔ عطارؒ نے بہت رباعیاں کہیں، جن میں سے ایک معقول تعداد خود انھوں نے ضائع کر دی اور اب بھی ہزاروں کی تعداد میں ''مختار نامہ'' میں موجود ہیں اور ان میں ہر قسم کے خیالات ہیں۔ ان کی ایک اور رباعی بھی اسی قسم کے خیال کی سنیے:

روزیکہ بود روز ہلاک من و تو　　از تن ببرند جان پاک من و تو
از بسکہ نباشیم دریں طاق کبود　　چہ مہ تابد بر سر خاک من و تو

رباعی کا چوتھا مصرع بجنسہ نقل کر دیا گیا ہے۔ ظاہراً سکتہ سا معلوم ہوتا ہے۔ یہ رباعی بھی فریڈرک روزن کے نسخے میں نہیں ہے۔ مولوی سید سلیمان صاحب کے مطبوعہ نسخے میں موجود ہے۔

۴۔ بت گفت بہ بت پرست کای عابد ما دانی ز چہ روئی کشتہ ساجد ما
بر ما بہ جمال خود تجلی کرد است آں کس کہ ز تست ناظر و شاہد ما

یہ رباعی بھی افضل کاشانی کے ''مجموعہ رباعیات افضل'' مطبوعہ طہران میں بھی موجود ہے۔ نسخہ برلن و دارالمصنفین دونوں میں نہیں پائی جاتی اور حقیقت میں خیام کے طرز گفتار کو جن صورتوں سے منسوب کیا جاتا ہے، وہ اس میں موجود نہیں۔ رمز و کنایہ، شوخی کی بجائے اس میں ایک صاف صاف وحدت وجود اور ہمہ اوست کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔

۵۔ بابط می گفت ماہی در تب و تاب باشد کہ بجوئی رفتہ باز آید آب
بط گفت کہ چوں من و تو گشتیم کباب بود از پس مرگ ما چہ دریا چہ سراب

''تذکرہ آتش کدہ آذر'' اور ''روز روشن'' میں یہ رباعی بندار رازی (مداح مجد الدولہ دیلمی) سے منسوب کی گئی۔ بندار کا کوئی دیوان یا مجموعہ نہیں دیکھا گیا، مگر اس کی بعض رباعیاں تذکروں میں ملتی ہیں اور یہ پانچویں صدی کے اوایل تک یا چوتھی صدی کے آخر کا شاعر ہے، جو خیام کے دور سے پہلا دور ہے۔ ملک قمی کی ایک رباعی بھی اسی قسم کی ہے، جس میں پہلا مصرع تو بالکل متوارد ہو گیا ہے۔ رباعی یہ ہے:

بابط می گفت ماہی در تب و آب می گشت چو در آتش سوزندہ کباب
دردا و دریغا کہ دریں دیر خراب گہ بر سر آتشیم و گہ بر سر آب

۶۔ از بادۂ ناب لعل شد گوہر ما آمد بہ فغاں ز دست ما ساغر ما
از بسکہ ہمی خوریم می بر سر می ما در سر می شدیم و می بر سر ما

یہ رباعی شیخ فخر الدین عراقی المتوفی ۶۸۸ھ کے دیوان میں موجود ہے اور مولانا رومی (۳) المتوفی ۶۷۲ھ یا ۶۶۱ھ کی رباعیات میں بھی شامل ہے۔ مولانا کے یہاں ہر قسم کی رباعیاں پائی جاتی ہیں اور میرے نزدیک زیادہ انھیں سے اس کی نسبت درست ہے۔ دوسرے شعر کے مصرع ثانی میں جو انداز بیان اختیار کیا ہے، اسے خیام سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔ یہ تصنع اور آورد متاخرین کے یہاں ہوتی ہے۔ ابتدائے زبان و شعر میں یہ کوششیں

نہیں ہوتیں۔

۷۔ خرم بہ تو داشتم دل پر غم را   ہجر تو حزیں کرد دل خرم را
من تلخی عالم بہ تو خوش می کردم   با تلخی ہجرت چہ کنم عالم را

یہ رباعی خواجہ مجد الدین ہمگر المتوفی ۶۸۲ ھ کی ہے۔ چنانچہ ''تذکرہ ہفت اقلیم'' امین رازی ذکر مجد الدین ہمگر میں انھی سے منسوب کی گئی ہے۔ خیام سے ایسے فراقیہ مضامین کی نسبت نہیں دی جا سکتی۔ ڈاکٹر فریڈرک روزن اپنے نسخے کے دیباچے میں عشقیہ مضامین کی نسبت لکھتے ہیں:

> ''در اشعار حقیقی خیام مضامین عشق ظاہری خیلے کم است و اگر چیزی دیدہ شود مقصود عشق تصوف است۔ بر خلاف نسخ جدیدہ متن ما ازیں اشعار کم دارد و دریں عدۂ معدود ہم عشق ظاہری ابداً مورد توجہ نیست و بہ کلی زیر پردہ می ماند۔''

۸۔ عاشق ہمہ روز مست و شیدا بادا   دیوانہ و شوریدہ و رسوا بادا
در ہشیاری غصۂ ہر چیز خوریم   چوں مست شدیم ہر چہ بادا بادا

یہ رباعی بھی مولانا رومی سے منسوب ہے اور ان کے مجموعہ رباعیات مطبوعہ اسلامبول، مطبع اختر ۱۳۱۲ھ میں موجود ہے۔ نیز ''المغنم البارد''، مرتبہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم، مطبوعہ ۱۲۹۹ ھ، بھوپال میں بھی مولانا رومی ہی سے منسوب ہے۔ یہ کتاب رباعیات کا ایک مجموعہ ہے اور اس میں ہزار ہا رباعیات متقدمین و متاخرین کی نام بہ نام جمع کی گئی ہیں۔ میرے کتب خانے میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔ رباعیات خیام کے قدیم نسخوں میں یہ رباعی نہیں پائی جاتی۔

۹۔ ساقی قدحی کہ کارساز است خدا   وز رحمت خود بندہ نواز است خدا
می خور بہ بہار و بار طاعت مفروش   کز طاعت خلق بی نیاز است خدا

''ساقی نامہ'' اہلی شیرازی کا ایک قلمی نسخہ میری نگاہ سے گزرا، جس میں یہ رباعی اہلی

شیرازی سے منسوب ہے۔اس میں چوتھا مصرعہ اس طرح پر لکھا تھا:

می خور بہ نیاز و ناز طاعت مفروش

اہلی امیر علی شیر کے مداحوں میں سے تھا اور اس کا ایک دیوان بھی ہے، جو اصناف سخن پر مشتمل ہے۔نہایت خوش گو تھا:

۱۰۔ خواہی ز فراق در فغاں دار مرا　　خواہی ز وصال شادماں دار مرا

من با تو نہ گویم کہ چساں دار مرازا　　نساں کہ دلت خواست چناں دار مرا

یہ رباعی افضل کاشانی کے مجموعہ رباعیات، مطبوعہ آتش کدہ، طہران میں موجود ہے اور انھیں سے منسوب ہے، مگر ''المغنم البارد'' مطبوعہ ۱۲۹۹ھ میں امیر خسرو دہلوی کے نام سے لکھی گئی ہے اور چوتھے مصرعہ میں یہ تغیر ہے:

زآنساں کہ تو خواہی آں چناں دار مرا

یہ بھی عشقیہ اور التجائیہ سی رباعی ہے، جس کی خیام سے امید نہیں کی جاسکتی۔

۱۱۔ اجزائے پیالہ کہ در می پیوست　　بشکستن آں روا نمی دارد دست

چندیں سر و دست نازنین و بر و دست　　از مہر کہ پیوست و بہ کیں کہ شکست

یہ رباعی خواجہ نصیر الدین طوسی المتوفی ۶۷۲ھ سے منسوب ہے۔ مولوی سید سلیمان صاحب ندوی اور ژوکوفسکی نے بھی انھی سے منسوب بتایا ہے۔اسی قسم کی ایک رباعی ''تاریخ نایاب'' میں ذکر شیخ شرف الدین بوعلی شاہ میں اس قصے کے ساتھ لکھی ہے کہ سلطان محمد تغلق نے شیخ شرف الدین بوعلی شاہ قلندر کو یہ رباعی لکھ کر بھیجی:

گہ راست کند صورت مردی و زنی　　گہ بشکند ایں طلسم جانی و تنی

کس نسبت کہ استاد قضا را پرسد　　کز بہر چہ سازی و چرا می شکنی

انھوں نے اس کے جواب میں یہ رباعی لکھ کر بھیجی:

شرطست کہ در امر قضا دم ترنی　　ایں نوع کہ گفتی نہ تو مردی نہ زنی

گل را چہ مجالست کہ پرسد ز کلال　　کز بہر چہ سازی و چرا می شکنی

معلوم ہوتا ہے کہ دونوں رباعیاں اسی ایک رباعی سے نکال لی گئی ہیں، کیوں کہ قصے کی نسبت درست نہیں معلوم ہوتی۔ یہی رباعی مذکورہ بالا افضل کاشانی کے مجموعہ رباعیات میں بھی پائی جاتی ہے اور افضل کی ایک اور رباعی بھی اسی مضمون کی ہے:

از عرش خدا تا بہ ثریٰ ملک خداست　　در ملک خدا ہر چہ کند حکم رواست
کس را نہ رسد کہ پرسد از حضرت حق　　کیں حکم چگونہ بود و آں حکم چراست

۱۲۔ ای چرخ فلک خرابی از کینۂ تست　　بیداد گری عادت دیرینۂ تست
ای خاک اگر سینہ تو بہ شگافند　　بس گوہر قیمتی کہ در سینۂ تست

یہ رباعی بھی افضل کاشانی کے مجموعہ رباعیات میں موجود ہے۔ اس کو مہستی گنجوی شاعرہ دور سنجر بادشاہ سے بھی منسوب کیا ہے۔ مہستی اپنے زمانے کی نہایت زود گو اور مشہور شاعرہ تھی۔ اس کا دیوان مرتب ہو چکا تھا، مگر وہ برباد ہو کر نایاب ہو گیا۔ اس کی کچھ رباعیاں اب بھی تذکروں میں پائی جاتی ہیں۔ بعض نے اس کا وطن نیشاپور بتایا ہے۔ یہ رباعی اس نے غالباً اپنے کسی عزیز یا شوہر کی وفات پر کہی ہے۔ اس کی ایک اور رباعی بھی اس قسم کے غم کا پتا دیتی ہے:

شبہا کہ بہ ناز با تو خفتم ہمہ رفت　　درہا کہ بہ ناز غمزہ سفتم ہمہ رفت
آرام دل و مونس جانم بودی　　رفتی و ہر آنچہ با تو گفتم ہمہ رفت

۱۳۔ ما کافر عشقیم و مسلماں دگر است　　مامور ضعیفم و سلیماں دگر است
از ما رخ زرد و جگر پارہ طلب　　بازارچۂ قصب فروشاں دگر است

یہ رباعی بھی رباعیات مولانا رومی کے مجموعے میں موجود ہے۔ "تذکرہ تنبیہ الجہلا" میں جو شعر کے جواز و عدم جواز کی بحث میں لکھا گیا ہے، اس میں بھی مولانا رومی ہی سے اس کو منسوب کیا گیا ہے۔ مرزا غالب مرحوم کی ایک رباعی جو اسی طرز و روش کے ساتھ کہی گئی ہے ملاحظہ کیجیے:

غالب روش مردم آزاد جداست　　رفتار اسیران رہ و زاد جداست

ما ترک مراد را ارم میدانیم　　واں باغچہ ضبطی شداد جداست

غلام مصطفیٰ بلگرامی کی بھی ایک رباعی ہے:

ما عاشق ذاتیم و صفائی دگر است　　بیرون زجہاتیم و جہاتی دگر است

ما واجبی ایم ذکر واجب گوئیم　　افسانہ نویس ممکناتی دگر است

۱۴۔ چوں ہشیارم زمن طرب پنہان است　　چوں مست شوم در خردم نقصان است

حالیست میان مستی و ہشیاری　　من بندۂ آنکہ زندگانی آن است

یہ رباعی بھی افضل کاشانی سے منسوب ہے اور ان کے مجموعہ رباعیات میں موجود ہے۔ پہلا مصرعہ اس طرح پر ہے:

چوں ہشیارم در طربم نقصان است

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ میانہ روی کے لیے یہ خیام کی بہترین نصیحت ہے، مگر شاید ان حضرات کو یہ خیال نہیں کہ خیام اس قسم کا ناصح شاعر نہیں ہے۔

۱۵۔ ہر سبزہ کہ بر کنار جوئی رستہ است　　گویا زلب فرشتہ خوئی رستہ است

پا بر سر سبزہ تا بخواری نہ نہی　　کان سبزہ زخاک لالہ روئی رستہ است

یہ رباعی شیخ نجم الدین رازی معروف بہ دایہ المتوفی ۶۵۴ ھ سے منسوب ہے۔ ''تذکرہ حسینی'' مطبوعہ نول کشور ۱۲۹۲ھ، صفحہ ۳۴۷، 'ذکر شیخ نجم الدین رازی' اور ''المغنم البارد'' صفحہ ۷۰ میں بھی ایسا ہی ہے۔ ''خیابان عرفان'' جو فارسی رباعیات کا مجموعہ حیدر آباد سے طبع ہوا ہے، اس میں بھی انھیں نجم الدین سے نسبت دی گئی ہے۔ ایک تذکرہ قلمی مولفہ غلام امام شاگرد حکیم مومن میں بھی اسی نسبت کو قائم رکھا گیا ہے، مگر ''آتش کدہ آذر'' میں شیخ مجد الدین المتوفی ۶۱۶ ھ سے منسوب کیا ہے۔ اگر چہ شیخ رحمتہ اللہ علیہ کی اور بھی رباعیات منقول ہیں، مگر یہ نسبت شیخ نجم الدین دایہ کی طرف زیادہ درست ہوسکتی ہے اور انھی کی طرف محققین کی اکثریت بھی ہے۔

اصل یہ ہے کہ یہ خیال اس قدر عام ہے کہ متقدمین اور متاخرین دونوں کے یہاں

پایا جاتا ہے۔ چنانچہ حکیم سنائی کی یہ رباعی:

ہر ذرہ کہ بر روئی زمینی بودہ است — خورشید رخی زہرہ جبینی بودہ است
گرد رخ آستیں بآزرم (۴) فشاں — کانہم رخ خوب نازنینی بودہ است

یا قاضی محمد صادق اختر مؤلف ''تذکرہ آفتاب عالمتاب'' المتوفی ۱۸۵۸ء کی یہ رباعی:

این سبزہ تر سبز نگاری بودہ است — ویں غنچہ گل رشک بہاری بودہ است
گلچیں گل را مچین ز بیدردی ہا — کان عارض شوخ گلعذاری بودہ است

یا شیخ فریدالدین عطار:

ہر میوہ وگل کہ از زمین بیرون است — از خاک یکی سبز خطی گلگون است
ہر نرگس و لالہ کہ در ہامون است — از چشم خوش وو جگر گلگون (۵) است

یا شمس الدولہ محمد بلخی کی یہ رباعی:

ہر لالہ کہ چشم کوہساری بودہ است — صد قطرہ زخون شہریاری بودہ است
مسپر بہ قدم سبزۂ بستان گستاخ — کان وسمہ ابروی نگاری بودہ است

۱۶۔ می برکف من نہ کہ دلم درتاب است — ویں عمر گریز پائی چوں سیماب است
برخیز کہ بیداریٔ دولت خواب است — دریاب کہ آتش جوانی آب است

یہ رباعی اشرف الدین حسن بن ناصرالدین علوی غزنوی سے منسوب ہے۔ 'ہفت اقلیم'، قلمی مخطوطہ، یونیورسٹی لائبریری، لکھنؤ، صفحہ ۱۲۱/ اور اس میں یہ تغیر ہے کہ بجائے 'دریاب' 'بشتاب'، مصرعہ چہارم بجائے مصرعہ سوم اور مصرعہ سوم بجائے چہارم ہے۔

خیام کے مجموعہ میں اسی رباعی سے یہ رباعی یا تراش لی گئی ہے یا ممکن ہے کہ اس سے یہ رباعی لی گئی ہو۔

۱۷۔ دردہ پسر آں می کہ جہاں راتاب است — زاں می کہ گل نشاط را مہتاب است
بشتاب کہ آتش جوانی آب است — دریاب کہ بیداری دولت خواب است

اس میں مصرعہ اولی، مصرعہ ثانی، مصرعہ سوم میں بڑے تکلف کے بعد معنی پیدا ہو سکتے ہیں۔

۱۸۔ ہر چند کہ از گناہ بد بختم وزشت — نومیدنیم چو بت پرستان زکنشت!
اما سحری کہ میرم از مخمور — می خواہم ومعشوق چہ دوزخ چہ بہشت

اسی رباعی کو ردوبدل کرنے کے بعد اہل دل نے یہ رباعی بھی مجموعے میں شامل کردی ہے۔

۱۹۔تاچند زنم بہ روئے دریا ہاخشت — نومیدنیم چو بت پرستان زکنشت
امشب من و سیمبر جوانان کنشت — می خواہم ومعشوق چہ دوزخ چہ بہشت

۲۰۔گرکارتو نیک است بہ تدبیرتو نیست — ورشر برود نیز بہ تقصیر تو نیست
تسلیم و رضا پیش کن و شاد نبری — چوں نیک وبد جہاں بہ تدبیرتو نیست

یہ رباعی ”گلستان مسرت“ میں ”منع شکایت زمانہ ناہنجار وراضی بجان ودل بودن بمرضیات خدا“ کے ذیل میں امینؔ کے نام سے لکھی ہے، لیکن یہ نہیں لکھا کہ یہ کون سے امین ہیں۔ممکن ہے کہ احمد قلی خاں قمی متخلص بہ امین کی ہو، جو عہد اورنگ زیب میں ہندوستان آئے اور ملازمان شاہی میں منسلک تھے۔ یہ رباعیاں کہتے تھے۔ یا پھر خواجہ محمد امین کوچ کاشانی کی ہو کہ وہ بھی رباعیاں کہتے تھے یا مولانا شاہ ولی اللہ صاحب امین محدث دہلوی کی ہو۔ بہر حال، صحیح حال معلوم نہیں ہو سکا۔ ”گلستان مسرت“ میں اسی کے ساتھ سالمؔ کی یہ رباعی بھی لکھی ہے:

یک ذرۂ اختیار در دست تو نیست — لیکن معقول فطرت پست تو نیست!
تدبیر چو کعبتین و تقدیر چو نقش — دردست تو ہست لیک در دست تو نیست

بہرصورت تدبیر وتقدیر کا ایک نزاعی مسئلہ ہمیشہ سے علمائے اسلام میں زیر بحث رہا ہے اور یہ ایک عام بلکہ پیش پا افتادہ مضمون ہے۔اس کے ساتھ ہی یہ رباعی حضرت ابوسعید ابوالخیر المتوفی ۴۴۰ھ کے مجموعہ رباعیات میں بھی شامل ہے اور کچھ عجب نہیں کہ انھی کی ہو۔

مجموعہ رباعیات افضل کاشانی میں بھی پائی جاتی ہے۔

۲۱۔ روزی کہ شود از السماء انشقت وانذم کہ بود اذا النجوم الکدرت

من دامن تو بگیرم اندر عرصات گویم صنما بایِ ذنبٍ قتلت

یہ رباعی بھی رباعیات خیام میں شامل ہے۔ حالانکہ ترکیب نحوی سے اس کا مصرعہ چہارم قطعاً غلط ہے۔ پہلے شعر میں یہ ہے کہ جب آسمان پھٹیں گے اور ستارے دھندلے ہو جائیں گے یعنی قیامت قائم ہوگی تو میں میدان قیامت میں تیرا دامن پکڑوں گا۔ یہاں تک درست، لیکن دامن پکڑ کر ایک مظلوم کو یہ کہنا چاہیے کہ 'بای ذنب قتلتنی' یعنی تو نے مجھے کس گناہ پر قتل کیا تھا، مگر بجائے اس کے مصرعہ موجودہ کے معنی یہ ہیں کہ تو کس گناہ پر قتل کی گئی۔ یہ سوال تو وہ ہے جو دختر مؤددہ سے قیامت میں کیا جائے گا، کیونکہ ایام جاہلیت میں عرب کی رسم تھی کہ وہاں داماد بنانے کی شرم سے زندہ دفن کرا دیتے تھے، اسی لیے قرآن مجید میں خدائے جل شانہ نے ارشاد فرمایا ہے ''واذ الموؤدۃ سئلت بای ذنب قتلت.'' یہاں اس کا کوئی محل ہی نہیں ہے۔ استاد ذوق دہلوی کا ایک اردو کا شعر ملاحظہ فرمائیے:

الٰہی کس بے گنہ کو مارا سمجھ کے قاتل نے کشتنی ہے

کہ آج کوچے میں اس کے شور بایِ ذنبٍ قتلتنی ہے

مجھے تعجب ہے کہ ایک ہندی شاعر تو اس مفہوم کے ادا کرنے کے لیے صحیح الفاظ لائے اور خیام ایسا عربی کا زبردست فاضل یہ غلطی کرے۔ تعجب ہے کہ مولوی سید سلیمان صاحب ندوی نے بھی اس کو اپنے مجموعہ رباعیات میں نقل کیا اور کوئی نوٹ بھی نہیں لکھا۔ مجموعہ ڈاکٹر فریڈرک روزن میں یہ رباعی شامل نہیں ہے۔ اگرچہ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کا نسخہ ۹۱۱ ہجری کے نسخے کی نقل ہے، مگر حیرت کی کوئی حد نہیں رہتی، جب دیکھا جاتا ہے کہ رباعی حکیم مولا بخش صاحب قلق المتوفی ۱۲۹۷ھ کے کلیات مطبوعہ مطبع انصاری، دہلی ۱۲۹۸ھ کے صفحہ ۲۲۸ پر ان کے فارسی کلام میں متفرقات کے ذیل میں دیکھی جاتی ہے۔ میں نہیں کہتا کہ

یہ قلق ہی کی رباعی ہے، مگر خیام کی کسی صورت سے نہیں ہوسکتی۔

۲۲۔ چوں مردن تو مردن یکبارگی است یکبار بمیر ایں چہ بے چارگی است
خونی ونجاستی ومشتی رگ وپوست درکار نبود ایں چہ غمخوارگی است

یہ رباعی بھی شیخ فریدالدین عطار کی ہے۔ چنانچہ ''مختار نامہ'' میں بھی موجود ہے اور 'ہفت اقلیم'' تذکرہ عطار میں بھی انہی سے منسوب کی گئی ہے۔ 'ہفت اقلیم'، قلمی مخطوطہ، یونیورسٹی لائبریری، لکھنؤ، صفحہ ۲۶۵. دوسرے شعر کے مصرعہ ثانی کا بیان بہت الجھا ہوا ہے۔

۲۳۔ چندیں غم مال وحسرت دنیا چیست ہرگز دیدی کسے کہ جاوید بہ زیست
این یک نفسی کہ درتنت عاریت است باعاریتی عاریتی باید زیست

یہ رباعی بھی افضل کاشانی سے منسوب ہے اور ان کے مجموعۂ رباعیات میں موجود ہے۔ خیال عام ہے۔

۲۴۔ گرازپئی شہوت وہواخواہی رفت از من خبری کہ بی نواخواہی رفت
بنگر چہ کسی و از کجا آمدۂ می دان کہ چہ می کنی کجا خواہی رفت

یہ رباعی حضرت شیخ الاسلام عبداللہ انصاری المتوفی ۴۸۱ ھ کی ہے۔ چنانچہ ان کی ''مناجات'' اور'' منازل السائرین'' میں موجود ہے۔ رباعیات مولانائے روم میں بھی شامل ہے اور دوسرا شعر اس طرح ہے:

در درگزری ازیں بہ بنی بہ عیاں کز بہر چہ آمدی کجا خواہی رفت

میرے نزدیک یہ شیخ الاسلام ہی کی رباعی ہے، اس لیے کہ ان کی تصانیف مولانا رومی سے پہلے کی ہیں اور ان میں یہ موجود ہے۔'' المغنم البارد'' میں نجیب الدین جرباذقانی سے منسوب ہے۔ خیام کے مجموعے میں ایک رباعی بالکل اس کے خلاف موجود ہے:

ای آمدہ از عالم روحانی تفتحیر ان شدہ در پنج و چہار وشش وہشت
می خور کہ ندانی ز کجا آمدۂ خوش باش نہ دانی بہ کجا خواہی رفت

۲۵۔ نیکی و بدی کہ در نہاد بشر است   شادی و غمی کہ در قضا و قدر است
با چرخ مکن حوالہ کاندرہ رہ عقل   چرخ از تو ہزار بار بیچارہ تر است

یہ رباعی بھی افضل کاشانی سے منسوب ہے اور مجموعہ رباعیات افضل میں موجود ہے اور پہلا مصرعہ یوں ہے:

شادی و غمی کہ از قضا و قدر است

اور 'عقل' کے بجائے مصرع ثالث میں 'عشق' ہے۔ دوسرا مصرعہ بھی بدلا ہوا ہے۔ ان کے یہاں اسی خیال کی ایک دوسری رباعی بھی موجود ہے۔

در عشق ہر آں کسی کہ مستور تر است   گوئی ز ہمہ مراد ہا دور تر است
آں را کہ تو آسودہ ہمی پنداری   چوں درنگری از ہمہ رنجور تر است

اس کے علاوہ یہ رباعی شیخ اوحد الدین کرمانی المتوفی ۶۳۵ھ سے بھی منسوب ہے۔

۲۶۔ ایں کوزہ چو من عاشق زاری بودہ است   در بند سر زلف نگاری بودہ است
ایں دستہ کہ در گردن او می بینی   دستی است کہ در گردن یاری بودہ است

یہ رباعی بھی افضل کاشانی سے منسوب ہے اور ان کی رباعیات میں موجود ہے، جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں، یہ ایک عام خیال ہے اور فلاسفۂ قدیم نے اس خیال کو کہ دنیا کا کوئی ذرہ ضائع نہیں ہوتا، نہ بے کار جاتا ہے، بلکہ صور ظاہری کا استحالہ ہوتا رہتا ہے، طرح طرح سے ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ افضل کی دوسری رباعی:

پیش از من تو لیل و نہاری بودہ است   گردندہ فلک برائی کاری بودہ است
زنہار قدم بہ خاک آہستہ نہی   کاں مردمک چشم نگاری بودہ است

یا مجموعہ خیام کی یہ دوسری رباعیاں:

خاری کہ بزیر پائی ہر حیوانیست   زلف صنمی و ابروئی جانانیست
ہر خشت کہ بر کنگرہ ایوانی است   انگشت وزیری و سر سلطانی است

☆☆☆

در ہر دشتی کہ لالہ زاری بودہ است　　آں لالہ زخوں شہریاری بودہ است
ہر برگ بنفشہ کہ زمیں می روید　　خامی است کہ برروئے نگاری بودہ است
۲۷۔ ہشدار کہ روزگار شور انگیز است　　ایمن منشیں (۶) کہ تیغ دوراں تیز است
در کام تو گر زمانہ بوزینہ نہد　　زنہار فرو مبر کہ زہر آمیز است

اس رباعی کو بھی مولوی سید سلیمان صاحب ندوی نے افضل کاشانی سے منسوب بتایا ہے، مگر مجھے رباعیات افضل میں نہیں ملی۔ ممکن ہے کہ افضل ہی کی ہو کیوں کہ اسی قسم کی ان کی دوسری رباعی بھی موجود ہے۔

بردہر مکن تکیہ کہ لطفش قہر است　　مستان زجہاں لقمہ کہ نوشش زہراست
دامائی دہر است بہ نزدم ہمہ عیب　　کیں فاحشہ را خون عزیزاں مہراست
۲۸، چوں آب بہ جوئبار و چوں باد بہ دشت　　روز دگر از عمر من و تو بگزشت
تامن باشم غم دو روزہ نہ خورم　　روزی کہ نیامدست و روزی کہ گزشت

یہ رباعی بھی افضل کاشانی کی رباعیات میں موجود ہے اور پہلا شعر یوں ہے:

از عمر ہر آنچہ بہترین بود گزشت　　بہ گزشت خیال کہ بگزرد باد بہ دشت
۲۹، می خوردن من نہ از برائی طرب است　　نے بہر فساد دین و ترک ادب است
خواہم کہ بے خودی بر آرم نفسی　　می خوردن و مست بودنم زیں سبب است

یہ رباعی شیخ علی لالا ابن شیخ سعید پسر عمر شیخ سنائی کی ہے، چنانچہ ذکر شیخ علی لالا میں مؤلف 'ہفت اقلیم' نے یہی لکھا ہے۔ مرزا غالب نے اردو میں اس مضمون کو نہایت عمدہ طور سے کہا ہے:

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو　　اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

سپہری کاشی کی بھی ایک رباعی اسی مضمون کی ہے:

روزم تا شب بہ مے پرستی گزرد　　شب تا روزم بہ خواب مستی گزرد
زیں بے خودی مدام شادم کہ مباد　　بر من نفسی بہ فکر ہستی گزرد

۳۰۔ مے نوش کہ عمر جاودانی ایں است　　خود خاصیت از دور جوانی این است

ہنگام گل و مل است و یاران سرمست　　خوش باش دمے کہ زندگانی این است

یہ رباعی دیوان حافظ کی رباعیات میں شامل ہے۔ دیوان حافظ، مطبع نول کشور ۱۲۸۹ھ نیز مطبوعہ کلکتہ ۱۸۸۱ء میں موجود ہے، مگر کلکتے کے نسخے میں اصل دیوان میں نہیں ہے، بلکہ ضمیمے میں ہے۔ حافظ کی اگر یہ رباعی ہو تو کوئی تعجب نہیں، اس لیے کہ ان کا تمام کلام ہی مستانہ ہے اور رباعیات میں خمریات کی کمی نہیں۔

۳۱۔ دارندہ چو ترکیب طبائع آراست　　از بہر چہ او فگندش اندر کم و کاست

گر نیک آمد شکستن از بہر چہ بود　　ور نیک نیامد ایں صور عیب کراست

یہ رباعی بھی رباعیات افضل میں شامل ہے اور اس میں اس طرح پر ہے:

دارندہ چو ترکیب چنیں خوب آراست　　باز ار چہ سبب فگندش اندر کم و کاست

گر خوب نیامد ایں بگو عیب کراست　　ور خوب آمد خرابی از بہر چہ خاست

اس سے پہلے ایک رباعی:

اجزائے پیالہ کہ درہم پیوست　　بشکستن آں روا نمی دارد دست

چندیں سر و پای نازنین از سر و دست　　از مہر کہ ساخت وز برائی کہ شکست

اسی قسم کی لکھی جا چکی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال اس وقت بھی عام تھا اور اب بھی کہ آخر نیست سے ہست کرنا اور ہست سے پھر نیست کرنا کیوں ہے۔

۳۲۔ پیش از من و تو لیل و نہاری بودہ است　　گردندہ فلک برائے کاری بودہ است

زنہار قدم بہ خاک آہستہ نہی　　کان مردمک چشم نگاری بودہ است

یہ رباعی بھی افضل کاشانی سے منسوب ہے، جیسا کہ ہم اس سے پہلے لکھ چکے ہیں۔ یہ ایک عام خیال ہے۔ ''تذکرہ حسینی کشوری''، صفحہ ۳۰۳، ''تذکرہ مجمع التفاسیر''، ''مجموعہ رباعیات افضل''، اور ''تذکرۂ قلمی غلام امام'' میں افضل سے منسوب ہے۔

۳۳۔ از منزل کفر تا بہ دیں یک نفس است — وز عالم شک تا بہ یقین یک نفس است
ایں یک نفس عزیز را خوش میدار — کز حاصل عمر ما ہمیں یک نفس است

یہ رباعی بھی مجموعہ رباعیات افضل میں موجود ہے اور پہلے مصرعہ میں 'عالم' کی بجائے 'منزل' ہے۔

۳۴۔ آں لعل گراں بہا ز کان دگر است — واں در یگانہ را نشان دگر است
اندیشہ ایں و آں خیال من و تست — افسانۂ عشق را زبان دگر است

مجموعہ رباعیات مولانا رومی میں ایک ایسی ہی رباعی ہے۔ ملاحظہ ہو:

مارا بجز ایں زبان زبان دگر است — جز دوزخ و فردوس مکان دگر است
آزادہ دلاں زندہ بجان دگراند — آں گوہر پاک شان ز کان دگر است

بہت ممکن ہے کہ یہ رباعی اس سے یا یہ اس سے مستخرج ہو۔

۳۵۔ امروز کہ نوبت جوانی من است — می نوشم از انکہ کامرانی من است
عیبش مکنید زانکہ تلخ است خوش است — تلخ است ازاں کہ زندگانی من است

یہ رباعی سراج الدین قمری شاعر دربار خوارزم شاہی کی ہے۔ اس کو فخر رازی کا شاگرد بتایا گیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو خود خیام کو بھی امام فخر الدین رازی سے شاگردی کی نسبت ہے۔ مولوی سید سلیمان صاحب ندوی نے '' آتش کدہ'' اور '' تاریخ گزیدہ'' کے حوالے سے یہ رباعی انھی کے نام منسوب کی ہے، مگر '' تذکرہ روز روشن'' میں لکھا ہے کہ قمر مازندرانی تھا اور سلطان ابوسعید کے عہد کا شاعر تھا۔ پہلے سراجی تخلص کرتا تھا۔ عبید زاکانی کے ساتھ اس کے مشاعرے اور مطارحے ہوتے تھے۔ عبید زاکانی آٹھویں صدی ہجری کا شاعر ہے۔

۳۶۔ گر بر فلکی بہ خاک باز آرندت — ور برسر نازی بہ نیاز آرندت
فی الجملہ بند تو جہل تا بتوانی — آزار مجوئی تا نیاز آرندت

یہ رباعی بھی افضل کاشانی کے مجموعے میں موجود ہے۔ '' المغنم البارد''، صفحہ ۱۵۷ میں بھی انھی سے منسوب کی گئی ہے اور تیسرا مصرعہ اس طرح پر ہے۔ فی الجملہ حدیث مطلق

از من بشنو۔ یہ بھی خالص ناصحانہ انداز ہے، جس سے خیام کو نسبت نہیں۔

۳۷۔ چوں آتش سودائی تو جز دود نہ داشت مسکین دل من امید بہبود نہ داشت

در جستن وصل تو بسی کوشیدم چوں بخت نہ بود کوششم سود نہ داشت

یہ رباعی انوری کی ہے۔ چنانچہ ص ۵۴۴، کلیات انوری، مطبوعہ نول کشور، ۱۸۹۷ء میں موجود ہے اور دراصل اس قسم کا ہجریہ بیان خیام کی رباعیات سے بہت دور ہے۔ یہ رباعی ''مجموعہ رباعیات خیام کشوری'' میں موجود نہیں، مگر دوسرے نسخوں میں موجود ہے۔

۳۸۔ دہ عقل زنہ رواق وز ہشت بہشت ہفت اخترم از ششجہت ایں نامہ نوشت

کز پنج حواس و چار ارکان وسہ روح ایزد بدو عالم چو تو یک کس نہ سرشت

یہ رباعی رباعیات افضل کاشانی میں موجود ہے۔ ''تذکرہ حسینی''، مطبوعہ کشوری، صفحہ ۳۳ میں بھی افضل ہی سے منسوب کی ہے، مگر رباعیات افضل میں بتایا گیا ہے کہ یہ رباعی نظامی گنجوی سے بھی منسوب ہے۔ ان دو میں سے کسی کی بھی ہو، مگر خیام اس قسم کی عاشقانہ مداحی نہیں کرتا۔

۳۹۔ در ہیچ سری نیست کہ اسراری نیست دل را خبر از اندک و بسیاری نیست

ہر طایفہ رُوند راہی در پیش الا رہ عشق را کہ سالاری نیست

افضل کاشانی کی رباعیات میں بھی ایک ایسی رباعی موجود ہے۔ خدا جانے یہ اس سے متخرج ہے یا وہ اس سے، مگر رباعی دیکھنے کے بعد یہ کہنا دشوار ہے کہ ایک کو دوسری سے تعلق نہیں۔ رباعی افضل:

در ہیچ سری نیست کہ اسرار تو نیست کو را خبر از اندک و بسیار تو نیست

ہر طائفہ گرفتہ کاری در دست وانگاہ بدست، ہیچ کس کار تو نیست

۴۰۔ ترکیب طبایع چو بہ کام تو دمی است تو داد کن از ہر چہ کہ ہر دم ستمی است

یا اہل خرد نشین کہ اصل من و تو گردی و شراری و نسیمی و نمی است

یہ رباعی حضرت ابوسعید ابوالخیر کی رباعیات میں بھی شامل ہے۔ ''المغنم البارد''،

صفحہ ۶۹ میں مہدی کوکب میر منشی عہد نادری سے منسوب کی گئی ہے اور اس طرح پر نقل کی ہے:

چوں حاصل عمر تو فریبی و دمی است　　بیداد مکن گرت بہ ہر دم ستمی است
مغرور مشو بہ خود کہ اصل من و تو　　گردی و شراری و نسیمی و نمی است

۴۱۔ دنیا دیدی و ہر چہ دیدی ہیچ است　　واں نیز کہ گفتی و شنیدی ہیچ است
سر تا سر آفاق دویدی ہیچ است　　واں نیز کہ در خانہ خزیدی ہیچ است

یہ رباعی بھی افضل کاشانی سے منسوب اور ان کی رباعیات میں موجود ہے۔ پہلا شعر یوں ہے:

افضل دیدی کہ ہر چہ دیدی ہیچ است　　ہر قصہ کہ دیدی و شنیدی ہیچ است
سر تا سر آفاق دویدی ہیچ است　　واں نیز کہ در کنج خزیدی ہیچ است

مجھے شبہ ہے کہ یہ رباعی کسی ہندی شاعر کی ہے۔ 'در خانہ خزیدن' یا 'در کنج خزیدن' ٹکسالی زبان فارسی نہیں ہو سکتی۔ ایک نسخے میں دوسرا شعر اس طرح ہے:

ہر چند کہ ہر طرف دویدی ہیچ است　　امروز کہ گوشہ گزیدی ہیچ است

لیکن جیسا 'در خانہ خزیدن' اور 'در کنج خزیدن' خلاف محاورہ اہل ایران ہے، اسی طرح 'ہر طرف دویدی' بھی فصیح نہیں۔

۴۲۔ ہیہات کہ این جسم مجسم، ہیچ است　　وین دائرہ سطح مخیم ہیچ است
دریاب کہ در کشاکش موت و حیات　　وابستہ یک دمیم وآں ہم ہیچ است

یہ رباعی "تذکرہ ہفت اقلیم" میں نصیر الدین طوسی المتوفی ۶۷۲ھ سے منسوب کی گئی ہے اور نسخہ مرتبہ مولوی سید سلیمان صاحب ندوی میں بھی محقق طوسی سے منسوب کرتے ہوئے اس طرح پر نقل کی ہے:

اے بے خبر ایں شکل مجسم ہیچ است　　ویں دائرہ سطح مخیم ہیچ است
خوش باش کہ در نشیمن کون و فساد　　وابستہ یک دمیم وآں دم ہیچ است

۴۳۔ در عالم خاک خاک پاشیدم و رفت — صد دشمن و دوست بر تراشیدم و رفت
با چون و چرائی تو مرا کاری نیست — چنداں کہ بداشتی بپاشیدم و رفت

یہ رباعی حضرت شیخ احمد غزالی المتوفی ۶۱۷ ھ کی ہے، جو شیخ ابو بکر نساج کے مرید اور حضرت امام محمد غزالی کے بھائی تھے۔ ''تذکرہ ہفت اقلیم''، ذکر احمد غزالی:

۴۴۔ می خور کہ بزیر گل بسی خواہی خفت — بے مونس و بے حریف و بی ہمدم و جفت
زنہار بہ کس مگو تو ایں راز نہفت — ہر لالہ پژمردہ نہ خواہد بشگفت

''تذکرۂ روز روشن'' میں ایسی ہی رباعی ملا نور الدین خراسانی المتخلص بہ حافظ کے نام سے نقل کی ہے اور ''شمع انجمن'' میں حافظ علی حافظ کے نام سے:

ہنگام سحر کہ نرگس و لالہ شگفت — مرغ سحری بہ نالہ و آہ بہ گفت
می نوش کہ بی نشہ بسی خواہی بود — بر خیز کہ در خاک بسی خواہی خفت

خیام کی رباعی میں 'راز نہفت' بجائے 'راز نہفتہ' درست نہیں معلوم ہوتا۔ اہل زبان کے تصرف کے سوائے اور کیا کہا جائے یا پھر کسی ہندی نے کہہ کر رباعیات خیام میں شامل کر دی ہے۔

۴۵۔ بر چہرۂ گل شبنم نوروز خوش است — در صحن چمن روئے دل افروز خوش است
از دی کہ گزشت ہر چہ گوئی خوش نیست — خوش باش زدی مگو کہ امروز خوش است

یہ رباعی رباعیات عطار میں شامل ہے اور کلیات عطار، مطبوعہ نول کشور میں صفحہ ۱۰۲۹ پر موجود ہے۔ خیام کے رنگ کی رباعیاں عطار کے یہاں زیادہ سے زیادہ ملتی ہیں۔

۴۶۔ ترس اجل و بیم فنا ہستی تست — ورنہ ز فنا شاخ بقا خواہد رست
من از دم عیسوی شدم زندہ بجان — مرگ آمد از وجود من دست بہ شست

یہ رباعی بھی مجموعہ رباعیات افضل کاشانی میں موجود ہے اور یوں بھی اس کا بیان نہایت الجھا ہوا ہے، جو خیام سے تعلق نہیں رکھتا۔

۴۷۔ در خواب بدم مرا خردمندی گفت — کز خواب کسی را گل شادی نہ شگفت

کاری چہ کنی کہ با اجل باشد جفت　　　بر خیز کہ زیر خاک می باید خفت

اسی قسم کی رباعی ابھی آپ نے دیکھی ہے:

می خور کہ بزیر گل بسی خواہی خفت

ممکن ہے کہ وہ اس رباعی سے مستخرج ہو یا یہ اس سے۔

۴۸۔ این کہنہ رباط را کہ عالم نام است　　　آرام گہ ابلق صبح و شام است!

بزمی است کہ واماندۂ صد جمشید است　　　قصریست کہ تکیہ گاہ صد بہرام است

یہ رباعی ''کلیات خاقانی'' میں خاقانی سے منسوب کی گئی ہے۔ خاقانی کے یہاں اس قسم کے عبرت انگیز مضامین کے قصاید اکثر پائے جاتے ہیں، بلکہ اس قسم کے مضامین اس کا خاص حصہ ہیں اور یہی نہیں بلکہ وہ ہر قسم کے مضامین میں استاد کامل ہے۔

۴۹۔ گردوں کمری ز عمر فرسودۂ ماست　　　جیحوں اثری ز چشم پالودۂ ماست

دوزخ شرری ز رنج بیہودۂ ماست　　　فردوس دمی ز وقت آسودۂ ماست

یہی رباعی تین شاعروں سے منسوب ہے۔ سلطان ابوسعید ابوالخیر المتوفی ۴۰۴ھ، حافظ شیرازی المتوفی ۸۹۲ھ اور افضل کاشانی سے۔ افضل کی رباعیات میں دو رباعیاں اور اسی قسم کی موجود ہیں:

حلوائے جہاں غلام کشکینۂ ماست　　　دیبائی جہاں خرقہ پشمینۂ ماست

از جام جہاں نمائی تا کی گوئی　　　صد جام جہاں نمائی در سینۂ ماست

سرتاسر آفاق جہان از گل ماست　　　سرچشمۂ عقل و روح کلی دل ماست

افلاک و عناصر و نبات و حیوان　　　عکسی ز وجود روشن کامل ماست

۵۰۔ آں قصر کہ بہرام در و جام گرفت　　　آہو بچہ کرد و شیر آرام گرفت!

بہرام کہ گور می گرفتی ہمہ عمر　　　بنگر کہ چگونہ گور بہرام گرفت

یہ رباعی بھی ''کلیات خاقانی'' مطبوعہ کشوری میں موجود ہے۔ چونکہ عبرت انگیز ہے اور اس سے پہلے (بہرام است) والی رباعی اس سے منسوب ہے، یہ بھی اسی سے منسوب

ہوسکتی ہے۔

۵۱۔ از باد صبا دلم چو بوئی تو گرفت　　مارا بگزاشت جستجوئی تو گرفت
اکنون ز منش ہیچ نمی آید یاد　　بوئی تو گرفتہ بود خوئی تو گرفت

''رباعیات ابوسعید ابوالخیر''میں ابوسعید ابوالخیر سے منسوب ہے اور'' آتش کدۂ آذر''میں مقصود تیر گر کے نام سے۔ مقصود کا اصل نام یوسف شاہ تھا، جو مقصود درویش تیر گر کے نام سے مشہور تھا۔ اس کی بعض رباعیات اور بھی تذکروں میں پائی جاتی ہیں۔''المغنم البارد''، صفحہ ۱۰۱ پر قلندری کے نام سے لکھی گئی ہے۔

۵۲۔ من بندۂ عاصیم رضائے تو کجاست　　تاریک دلم نور صفائے تو کجاست
مارا تو بہشت اگر بہ طاعت بخشی　　ایں مزد بود، لطف عطائے تو کجاست

یہ رباعی شیخ عبداللہ انصاری کی ہے۔ تذکرہ آتش کدہ، تذکرہ حسینی، تذکرہ صبح گلشن سب اس خیال پر متفق ہیں۔ شیخ علی حزیں نے اسی رباعی سے گوشہ پیدا کر کے کیا خوب رباعی کہی ہے:

اے مطرب عاشقاں نوائی تو کجاست　　اے ساقی جاں آب بقائی تو کجاست
گیرم دل من از نظرت افتاد است　　گیرائی مژگاں رسائی تو کجا است

نیز خیام کے مجموعے میں مندرجہ بالا مضمون کی یہ رباعی بھی پائی جاتی ہے:

یارب تو کریمی و کریمی کرم است　　عاصی زچہ رو بروں ز باغ ارم است
باطاعتم ار بہ بخشی آں نیست کرم　　با معصیتم اگر بہ بخشی کرم است

۵۳۔ تا کے ز چراغ مسجد و دود کنشت　　تا کے ز زیان دوزخ و سود بہشت
رو بر سر لوح بیں کہ استاد قضا　　اندر ازل آنچہ بودنی بود نوشت

یہ رباعی عراقی سے منسوب ہے اور''دیوان عراقی''میں موجود ہے۔

۵۴۔ در مجلس دہر ساز ہستی پست است　　نے چنگ نہ نائے و نہ دلم در دست است
رنداں ہمہ ترک می پرستی کردند　　جز محتسب شہر کہ دایم مست است

''کاس الکرام''شرح رباعیات خیام میں اس رباعی کولسان الغیب کا حوالہ دیتے ہوئے شاہ شجاع سے منسوب کیا گیا ہے۔

۵۵۔امشب کہ حضور یار جان افروز است — بختم بخلاف دشمناں فیروز است

گو شمع بمیرو مہ فرو شو کہ مرا — آں شب کہ تو در کنار باشی روز است

یہ رباعی گومجموعہ رباعیات خیام کشوری میں نہیں ہے، مگرنسخہ مطبوعہ الہ آباد میں موجود ہے۔ یہ سعدی سے منسوب ہے اور ''کلیات سعدی'' نول کشوری میں موجود ہے، مگر ایک نہایت قدیم نسخہ ''کلیات سعدی'' میں نہیں پائی جاتی۔ پھر بھی خواہ یہ رباعی سعدی کی نہ ہو، مگر خیام سے ایسے مضامین اشتیاقیہ اور عشقیہ کا تعلق نہیں۔

۵۶۔ازآتش ایں طایفہ جز دودے نیست — وز ہیچ کسم امید بہبودی نیست

دستی کہ ز دست چرخ بر سردارم — در دامن ہر کہ میزیم سودے نیست

یہ رباعی 'ہفت اقلیم' اور ''تذکرہ حسینی'' میں سراج الدین قمری سے منسوب ہے اور پہلا مصرعہ ''تذکرہ حسینی'' میں اس طرح ہے: ''درآتش اہل عصر جز دودے نیست''۔ ایک رباعی اسی قسم کی لکھی جاچکی ہے: ''چوں آتش سودائی تو جز دود نہ داشت''۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں رباعیوں میں سے ایک دوسری سے نکالی گئی ہے۔ اگر چہ دونوں کے مطالب کے بدلنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۵۷۔بیگانہ اگر وفا کند خویش من است — در خویش جفا کند بداندیش من است

گر زہر موافقت کند تریاق است — در نوش مخالفت کند نیش من است

یہ رباعی ''رباعیات افضل'' میں افضل سے منسوب ہے اور خیام کے رنگ سے منسوب ہونے کی اہلیت نہیں رکھتی۔

۵۸۔ تابہ توانی غم جہاں ہیچ مسنج — بر دل منہ از آمدہ نا آمدہ رنج

خوش می خورودمے بخش دریں دار سپنج — باخود نبری گرچہ بسے داری گنج

یہ رباعی بھی ''مجموعہ رباعیات افضل'' میں موجود ہے اوران کے یہاں اس قسم کی اور

رباعیاں بھی ہیں۔ مثلاً:

بسا دل گفتم متاع دنیا عرض است　　اسباب و زر و سیم سراسر مرض است
گیرم کہ ہمہ ملک جہاں آں تو شد　　باخود چو جوے نمی بری چہ غرض است

۵۹۔ دل گفت مرا علم لدنی ہوس است　　تعلیم کن اگر ترا دسترس است
گفتم کہ الف گفت دگر ہیچ مگوی　　درخانہ اگر کس است یک حرف بس است

یہ رباعی عشقی کاشانی کی بتائی گئی ہے۔ چنانچہ ''کاس الکرام شرح رباعیات خیام'' میں ''آتش کدہ'' کے حوالے سے عشقی سے منسوب کی ہے اور ''المغنم البارد''، صفحہ ۶۲ میں بھی عشقی ہی کے نام سے لائی گئی ہے، مگر ''رباعیات افضل'' میں افضل کاشانی کے نام سے ہے اور افضل کے یہاں اس موضوع پر اور بھی رباعیاں کہی گئی ہیں۔ چنانچہ دو رباعیاں یہ ہیں:

اے خواجہ اگر ہمیں بہشتت ہوس است　　خیرات بکن اگر ترا دسترس است
خیرات چو کردۂ برو ایمن باش　　درخانہ اگر کس است یک حرف بس است

سررشتۂ عمر ما ہمیں یک نفس است　　جز ذکر خدا ہر انچہ گویم ہوس است
غافل ز قضا مباش و ایمن منشیں　　درخانہ اگر کس است یک حرف بس است

۶۰۔ بنگر ز جہاں چو رخت بربستم ہیچ　　وز حاصل عمر چیست در دستم، ہیچ
شمع طربم ولی چو بنشستم ہیچ　　من جام جمم ولی چو بشکستم ہیچ

یہ رباعی ''کلیات خاقانی''، مطبوعہ کشوری میں خاقانی سے منسوب ہے۔ خاقانی کی ملک ہونے کا یقین نہیں کیا جا سکتا، مگر خیام کا طرز گفتار بھی نہیں ہے۔

۶۱۔ آنہا کہ کہن شدند و آنہا کہ نوند　　ہر یک بمراد خویش یک یک برسند
ایں سفلہ جہاں بکس نماند جاوید　　رفتند و روند و دیگر آیند و روند

یہ رباعی ''مجموعہ رباعیات افضل کاشانی'' میں موجود ہے۔ ایک رباعی نصر اللہ بن عبدالحمید کی ''تذکرہ ہفت اقلیم'' میں اس طرح پر نقل کی گئی ہے:

از مسند عز گرچہ ناگہ رفتیم　　حمداً للہ کہ نیک آگہ رفتیم

رفتند و شدند و تیز آیند و شوند　　ما نیز توکلت علی اللہ رفتیم

خود مجموعہ خیام میں ایک اور رباعی ہے، جس کا پہلا شعر یہ ہے:

آنہا کہ فلک دیدہ و دہر آرایند　　آیند و روند و باز با دہر آیند

۶۲. دل چراغی است کہ نوراز رخ دلبر گیرد　　وربمیر دزغمش زندگی از سر گیرد
صفت شمع بہ پروانہ دلی باید گفت　　کیں حدیثی است کہ با سوختگاں در گیرد

یہ رباعی کی بحر نہیں ہے، بلکہ قطعہ ہے اور نہ معلوم کس کا ہے۔ بہر حال، نہ خیام کا رنگ ہے اور نہ اس کی رباعیوں کے مجموعے میں شامل ہونے کے قابل، کیونکہ یہ بالکل متغزلانہ انداز ہے اور بہت ممکن ہے کہ کسی غزل کے دو شعر نقل ہو گئے ہیں۔

۶۳۔ بوسیدہ مرقع اند ایں خامی چند　　نارفتہ رہ صدق و صفا گامی چند
بگرفتہ ز طامات الف لامی چند　　بدنام کنندۂ نکو نامی چند

اسی انداز کی یہ رباعی مجموعے میں موجود ہے۔

۶۴۔ نابردہ بصبح درطلب شامی چند　　بنہادہ بروں ز خویشتن گامی چند
درکسوت خاص آمدہ اند عامی چند　　بدنام کنندہ نکو نامی چند

دوسری رباعی ''تذکرۂ آتشکدہ'' میں مغربی المتوفی ۸۰۹ھ سے منسوب ہے اور پہلی سے دوسری رباعی یا دوسری سے پہلی مستخرج مانی جاسکتی ہے۔ نیز پہلی رباعی ''رباعیات افضل'' میں افضل کاشانی کے نام سے موجود ہے۔

۶۵۔ ایں قافلۂ عمر عجب می گزرد　　دریاب دمی کہ باطرب می گزرد
ساقی غم فردائی حریفاں چہ خوری　　پیش آر پیالہ کہ شب می گزرد

یہ رباعی بھی ''افضل کاشانی'' کے مجموعے میں موجود ہے۔

۶۶۔ برچشم تو ارچہ عاشقاں بکرایند　　مگرائی بدانکہ عاشقاں نہ گرایند
بربائی نصیب خویش کت بربایند　　بسیار چو تو شدند و بسیار آیند

یہ رباعی ''خیام''، مطبوعہ دارالمصنفین، اعظم گڑھ، مولفہ و مرتبہ مولوی سید سلیمان

صاحب ندوی میں ذرا اختلاف کے ساتھ ہے:

گر جملہ جہاں بر تو می آرایند   مگر ای بدر کہ زیرکان نگرایند

شعر دوم مصرعہ دوم مقدم اور مصرعہ اولیٰ موخر ہے، مگر ''مجموعہ منتخبات اشعار''، مطبوعہ دارالمصنفین میں یہ رباعی حکیم سنائی المتوفی ۵۳۰ یا ۵۳۵ھ سے منسوب ہے اور ''رباعیات افضل'' میں افضل کے نام سے۔ مصرعہ اول میں 'بر' کی بجائے 'در' اور 'عاشقاں' کی بجائے 'عالمی' اور دوسرے مصرعہ میں بجائے 'عاشقاں'، 'عاقلاں' ہے۔

۶۷۔ آں کس کہ گنہ بہ نزد او سہل بود   ایں نکتہ بگوید ار کہ او اہل بود

علم ازلی علت عصیاں کردن   نزدیک حکیم، غایت جہل بود

''تاریخ گزیدہ'' مستوفی میں اس آخری رباعی کو سراج قمری کے نام سے منسوب کیا ہے اور اس طریقے سے یہ دونوں رباعیاں خیام کی نہیں، بلکہ وہ رباعی بھی جو محقق طوسی سے منسوب ہے سراج قمری کی نہیں ہو سکتی، کیونکہ نصیر الدین طوسی کی ولادت ۵۹۵ھ اور وفات ۶۷۲ھ میں ہے اور قمری بعد کا شاعر ہے، جس کا زمانہ ۷۰۰ھ یا ۸۰۰ھ تک ہے، کیونکہ اس کے مناظرے اور مشاعرے عبید زاکانی سے ہوئے ہیں۔

۶۸۔ آں مردنیم کز عدمم بیم آید   آں بیم مراخوشتر ازیں سیم آید

جانی است مرا با عاریت دادہ خدا   تسلیم کنم چو وقت تسلیم آید

یہ رباعی امام فخر الدین رازی سے منسوب ہے۔ 'ہفت اقلیم''، قلمی محفوظہ، یونیورسٹی لائبریری، لکھنؤ اور ''رباعیات افضل کاشانی'' میں افضل کے نام سے ہے۔ ردیف بجائے 'آید' کے 'بود' ہے۔

۶۹۔ از واقعہ ترا خبر خواہم کرد   وانرا بدو حرف مختصر خواہم کرد

با عشق تو در خاک فرو خواہم شد   با مہر تو سر ز خاک بر خواہم کرد

''تذکرہ آتشکدہ آذر'' اور ''شمع انجمن'' میں یہ رباعی سلطان ابو یزید آل مظفر برادر شاہ شجاع سے منسوب کی ہے۔ ''المعجم البادرو'' میں بھی اسی کا اتباع کیا گیا ہے، مگر ''کاس

الکرام شرح رباعیات خیام'' میں قطران بن منصور ترمذی کی طرف نسبت کی گئی ہے، جو انوری کا استاد ہے۔ بالکل اسی مضمون کی رباعی شیخ نظام الدین المویدکی ہے، جو''اخبار الاخیار'' شاہ عبدالحق میں منقول ہے:

برعشق تو و بر تو نظر خواہم کرد　　جاں درغم تو زیر و زبر خواہم کرد
پردرد دلے بخاک درخواہم شد بر　　عشق سری ز گور برخواہم کرد

۷۰۔ دو عالم جاں بہ ہوش میباید بود　　در کار جہاں خموش می باید بود
تا چشم و زبان و گوش برجا باشد　　بی چشم و زباں و گوش میباید بود

اس رباعی کے متعلق بھی اس خیال سے کہ یہ رنگ خیام کا نہیں ہے، محققین نے شبہ کیا ہے کہ یہ ناصحانہ انداز اس کا نہیں ہوسکتا۔ اس قسم کی اور رباعیاں بھی ملتی ہیں۔ چنانچہ پہلوان محمود بوریائی کی یہ رباعی:

یاقوت پیل مور می باید بود　　با ملک دوکن عور می باید بود
ایں طرفہ نگر کہ عیب ہر آدمئی　　می باید دیدوکور می باید بود (آتشکدہ)
در بند گرہ کشائی می باید بود　　گمرہ شدہ رہ نمائی می باید بود
یک لحظہ ہزار سال می باید زیست　　یک جائی ہزارجای می باید بود
(المغنم البارد، ص ۱۰۳)

یا در راہ خدا جملہ ادب باید بود　　تاجاں باقی است در طلب باید بود
دریا دریا اگر بکامت ریزند　　کم باید کرد وخشک لب باید بود
(خواجہ باقی باللہ)

ابر خود در مدح و ذم نمی باید زد　　بیروں از حد قدم نمی باید زد
عالم ہمہ آئینہ حسن ازلی است　　میباید دیدودم نمی باید زد (سحابی استرآبادی)

۷۱۔ آنہا کہ محیط فضل و آداب شدند　　در کشف علوم شمع اصحاب شدند
رہ زین شب تاریک نبردند بروں　　گفتند فسانہا و در خواب شدند

یہ رباعی سحابی استر آبادی المتوفی ۱۰۱۰ھ سے منسوب ہے۔ دنیا کے راز کا معلوم نہ ہونا ایک عام خیال ہے۔ حافظ کا ایک شعر اسی مضمون کا ہے۔

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ — چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

کس ندانست کہ منزل گہ مقصود کجاست — ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

خود مجموعہ خیام میں یہ رباعی اسی مضمون کی ہے۔

در چرخ بہ انواع سخن ہا گفتند — ایں بی خبراں گوہر دانش سفتند

واقف چونہ گشتند بر اسرار فلک — اول زیچی زدند و آخر خفتند

۷۲۔ تا بود دلم ز عشق محروم نہ شد — کم بود ز اسرار کہ مفہوم نہ شد

اکنوں کہ ہمی بنگرم از روی خسرو — معلومم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

تذکرہ آتشکدہ، تذکرہ روز روشن، مجموعہ المغنم البارد میں یہ رباعی امام فخر الدین رازی سے منسوب کی گئی ہے اور اس طرح پر نقل کی ہے:

ہرگز دل من ز عشق محروم نہ شد — کم ماند ز اسرار کہ مفہوم نہ شد

ہفتاد و دو سال فکر کردم شب و روز — معلومم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

نیز ''رباعیات افضل'' میں بھی موجود ہے۔

۷۳۔ آں عقل کہ در رہ سعادت پوید — روزی صد بار خود ترا می گوید

دریاب تو ایں یکدمہ صحبت کہ نۂ — آں ترہ کہ بد رند و دیگر روید

یہ رباعی بھی ''مجموعہ رباعیات افضل'' میں موجود ہے اور دوسرا شعر اس طرح ہے:

زنہار نگہدار تو فرصت کہ نۂ — آں ترہ کہ بدردند و دیگر روید

۷۴۔ درد ہر ہر آنکہ نیم نانی دارد — وز بہر نشست آستانی دارد

نے خادم کس بود، نہ مخدوم کسی — گوشاد بزی کہ خوش جہانی دارد

''تذکرہ حسینی'' میں یہ رباعیات غیاث الدین بلخی متخلص بہ ہمتی کے نام سے ہے نیز ''شمع انجمن'' میں ہمتی کے نام سے ہے، مگر اس طرح کہ پہلے مصرعہ میں 'درد ہر' کی بجائے

'درخانه' اور دوسرا مصرعہ اس طرح: ''در گوشه شهر آشیانے دارد''۔ چوتھے میں 'گوشاد بزی' کی جگہ 'انصاف بده' اور ''کلیات خاقانی'' میں خاقانی کے نام سے ہے۔ ''رباعیات افضل'' میں افضل کے نام سے۔

۷۵. روزی که جزائے ہر صفت خواہد بود   قدر تو بقدر معرفت خواہد بود
در حسن صفت کوش که در روز جزا   حشر تو بقدر معرفت خواہد بود

یہ رباعی ''مجموعہ منتخبات''، قلمی، دارالمصنفین میں نصیرالدین طوسی کے نام سے ہے۔ ''المغنم البارد'' میں بھی صفحہ ۲۰۷ پر انھی کے نام سے منسوب کی گئی ہے اور پہلا مصرعہ اس طرح ہے:

فردا که حساب شش جهت خواهد بود

نصیرالدین طوسی کے یہاں ایسی عارفانہ، ناصحانہ اور اخلاقی رباعیاں اور بھی ہیں۔ یہ ''رباعیات افضل'' میں بھی موجود ہیں۔

۷۶۔ گویند بہشت و حور عین خواہد بود   وانجا مئی ناب وانگبیں خواہد بود
گر ما می و معشوق پرستیم رواست   چوں عاقبت کار ہمیں خواہد بود

یہ رباعی ''دیوان حافظ'' میں موجود ہے اور حافظ ہی کا رنگ ہے۔

۷۷۔ آنروز که توسن فلک زیں کردند   آرائش مشتری و پرویں کردند
ایں بود نصیب ما ز دیوان قضا   ما را چه گنه قسمت ما ایں کردند

یہ رباعی مہستی گنجوی کی ہے، جو بقول بعض تذکرہ نویسوں کے، سلطان سنجر کی بزم عیش کی ایک مغنیہ تھی اور سلطان سنجر اس پر فریفتہ تھا اور بقول بعض بابر کی مطلوبہ تھی۔ اس کی ایک رباعی کے ساتھ تذکروں میں یہ قصہ بھی مذکور ہوا ہے کہ سلطان کی محفل عیش گرم تھی۔ مہستی کو کسی ضرورت سے باہر جانا پڑا۔ رات کا وقت تھا اور سردی کا زور شور تھا۔ مہتی باہر گئی تو دیکھا چاروں طرف زمین پر برف جمی ہے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ وہ کانپتی ہوئی واپس ہوئی تو بادشاہ نے پوچھا کہ کیا حال ہے۔ اس نے فی البدیہہ یہ رباعی پڑھی، حالانکہ بوڑلین

لائبریری کے نسخے میں یہ رباعی بھی خیام کے نام سے منسوب ہے۔

شاہا فلکت اسپ سعادت زیں کرد   وز جملۂ خسرواں ترا تحسیں کرد
تادر حرکت سمند زریں نعلت   برگل نہ نہد پائی زمیں سیمیں کرد

غرض کہ یہ نہایت ہی خوش گوشاعرہ تھی۔ شاید اسی قسم کا کوئی اور واقعہ ہوگا، جس پر یہ رباعی کہی گئی ہے۔ بہر حال، یہ رباعی ''مجموعہ رباعیات افضل'' میں افضل کے نام سے اور رسالہ شیخ عبداللہ انصاری میں ان کے نام سے ہے۔ اگر تقدم زمانی اور قدامت کوملحوظ رکھا جائے تو شیخ الاسلام عبداللہ انصاری سے بھی منسوب ہوسکتی ہے اور پھر اس کو تقدیر کے مسئلے پر محمول کیا جائے گا۔ ان کے رسالے میں موجود ہونے سے پورے طور پر خیال ہوتا ہے کہ انھی کی رباعی ہے۔

۷۸۔ عمرت تا کے بہ خود پرستی گزرد   یا در پے نیستی و ہستی گزرد
می خور کہ چنیں عمر کہ غم در پے اوست   آں بہ کہ بخواب یا بہ مستی گزرد

''کاس الکرام شرح رباعیات خیام'' میں ''آتش کدہ آذر'' کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ یہ رباعی بہ ادنیٰ تغیر مجد ہمگر کے یہاں موجود ہے۔

۷۹۔ خواہی کہ ترا رتبت اسرار رسد   مپسند کہ کس را ز تو آزار رسد
از مرگ میندیش و غم رزق مخور   کیں ہر دو بوقت خویش ناچار رسد

یہ رباعی سحابی کی رباعیات میں درج ہے اور شاہ سبحان سے بھی منسوب ہے۔

۸۰۔ گویند ہر آں کساں کہ باپرہیز اند   زانسانکہ بمیرند چناں برخیزند
ما با مئی و معشوق ازانیم مقیم   بو تا کہ بحشر ما چناں انگیزند

یہ رباعی بھی حافظ کے رنگ کی ہے اور ''دیوان حافظ''، مطبوعہ کشوری میں موجود ہے۔

۸۱۔ گویند بہ حشر گفتگو خواہد بود   واں یار عزیز تند خو خواہد بود
از خیر محض جز نکوئی ناید   خوش باش کہ عاقبت نکو خواہد بود

یہ رباعی شاہ قاسم بن شاہ قوام الدین کی ہے، بلکہ اس کا دوسرا شعر انھوں نے اس خط میں بھی لکھا ہے، جو میر غیاث الدین کو لکھا۔ ''تذکرہ ہفت اقلیم'' کشکول بہائی میں اس رباعی کو سبحانی سے منسوب کیا گیا ہے۔

۸۲۔ خوش باش کہ ماہ عید نو خواہد شد — نے کار کسے بہ کار او خواہد شد
اے ساقی اگر بادہ دہی در نہ دہی — می داں کہ سر جملہ فرو خواہد شد

یہ رباعی شیخ فریدالدین عطار کے یہاں اس طرح پر موجود ہے:

ہرگز نہ جفائے کہنہ، نو خواہد شد — نے کار کسے بکام او خواہد شد
اے ساقی اگر مے دہی و در نہ دہی — می داں کہ سر جملہ فرو خواہد شد

۸۳۔ دادم بامید روزگارے برباد — ما بود زروزگار خود روزے شاد
زاں مے ترسم کہ روزگارم نہ دہد — چنداں کہ ز روزگار بستانم داد

یہ رباعی انوری کی ہے۔ چنانچہ ''کلیات انوری''، مطبوعہ نول کشور میں موجود ہے۔

۸۴۔ آنہا کہ بہ فکر در معنی سفتند — در ذات خداوند سخن با گفتند
سررشتہ اسرار نہ دانست کسے — اول زیچے زدند و آخر خفتند

یہ رباعی مجموعے کی اس رباعی سے تراشی ہے یا وہ اس سے۔

۸۵۔ در چرخ بہ انواع سخن با گفتند — ایں بے خبراں گوہر دانش سفتند
واقف چو نہ گشتند براسرار فلک — اول زیچے زدند و آخر خفتند

۸۶۔ فردا الم فراق طے خواہد شد — با طالع سعد قصد مے خواہد شد
معشوقہ موافق است و ایام بہ کام — اکنوں نہ کنم نشاط کے خواہد شد

یہ رباعی بھی شاید اسی رباعی مجموعہ خیام سے تراش کر شامل مجموعہ کی گئی ہے۔

۸۷۔ من دامن زہد و توبہ طے خواہم کرد — باموے سپید قصد مے خواہم کرد
پیمانہ عمر من بہ ہفتاد رسید — اینَدم نہ کنم نشاط کے خواہم کرد

۸۸۔ بامے بہ کنار جوئے می باید بود — وزغصہ کنارہ جوئے می باید بود

ایں نزہت عمر ما چو گل دو روز است　　　　خنداں لب و تازہ روئے می باید بود

یہ رباعی حافظ کی ہے اور صحیح سے صحیح نسخوں میں بھی موجود ہے۔ چونکہ حافظ کے یہاں شراب کی افراط ہے، اس لیے ان سے منسوب ٹھہر سکتی ہے۔ تیسرا مصرعہ اس طرح ہے:

چوں عمر گرانمایۂ مادہ روز است

۸۹. یک نان بہ دو روز گر شود حاصل مرد　　　　وز کوزۂ بشکستہ دم آبے سرد

مامور دگر کسے چرا باید بود　　　　یا خدمت چوں خودے چرا باید کرد

''صبح گلشن'' اور ''المغنم البارد'' میں یہ رباعی ملا شمس الدین نیازی استر آبادی سے منسوب ہے اور مصرعہ سوم میں 'کسے دگر' کی بجائے 'کم از خردے' اور وہی زیادہ صحیح اور موزوں ہے۔

۹۰۔ کس را پس پردہ قضا راہ نہ شد　　　　وز سرّ خدا ہیچ کس آگاہ نہ شد

ہر کس ز سر قیاس چیزے گفتند　　　　معلوم نہ گشت و قصہ کوتاہ نہ شد

یہ رباعی امام محمد غزالی سے بھی منسوب ہے۔ دراصل یہ خیال کہ راز قدرت معلوم ہونا محال ہے، عام خیال ہے۔ چنانچہ اس قسم کی رباعیاں خیام کے مجموعے میں بھی اکثر موجود ہیں۔ ''المغنم البارد'' میں سبھی افضل کاشانی سے منسوب کیگئی ہے۔

۹۱۔ چنداں بردایں رہ کہ دوئی برخیزد　　　　گر نیست دوئی ز رہروی برخیزد

تو او نہ شوی لیک اگر جہد کنی　　　　جائے بر سی کز تو توئی برخیزد

یہ رباعی افضل کاشانی سے منسوب ہے اور ان کے مجموعہ رباعیات میں موجود ہے۔

۹۲ من مے خورم و ہر کہ چو من اہل بود　　　　مے خوردن من بہ نزد او سہل بود

مے خوردن من حق ز ازل می دانست　　　　گر مے نخورم علم خدا جہل بود

یہ رباعی سراج الدین قمری سے منسوب ہے، جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں۔ اگر محقق طوسی کی رباعی اسی کے جواب میں ہے تو پھر قمری سے نسبت غلط ہوگی، ورنہ یہ قصہ ہی غلط ہوگا کہ خیام نے یہ رباعی کہی اور محقق طوسی نے جواب دیا۔ بہرحال، ''تاریخ گزیدہ'' میں یہ رباعی

قمری سے منسوب کی گئی ہے اور تیسرا مصرعہ یوں ہے:

می خوردنم ایزد بہ ازل می دانست

۹۳۔ آنہا کہ جہاں زیر قدم فرسودند ۔۔۔ واندر طلبش ہر دو جہاں پیمودند
آگاہ نمی شوم کہ ایشاں ہرگز ۔۔۔ زیں حال چنانکہ ہست آگہ بودند

۹۴۔ از دفتر عمر پاک می باید شد ۔۔۔ در دست اجل ہلاک می باید شد
ای ساقی خوش لقا تو خوش خوش مارا ۔۔۔ آبی دردہ کہ خاک می باید شد

یہ دونوں رباعیاں افضل کاشانی کے مجموعہ رباعیات میں موجود ہیں اور انہی سے منسوب کی گئی ہیں۔

۹۵۔ مے خوارہ اگر غنی بود عور شد ۔۔۔ وز عربدہ اش جہاں پر از شور شود
در حقہٗ لعل ازاں زمرد ریزم ۔۔۔ تا دیدۂ افعی غمم کور شود

''آتشکدۂ آذر'' میں اس رباعی کو شاہ شجاع المتوفی ۷۷۳ھ سے منسوب کیا ہے، شاہ شجاع کے یہاں خمریاتی رباعیاں اور بھی ہیں۔ یہ رباعی ''مجموعہ رباعیات خیام''، بمبئی میں ہے۔

۹۶۔ خطے کہ زروئے یار برخاستہ شد ۔۔۔ تو ظن نہ بری کہ حسن او کاستہ شد
در باغ رخش بہر تماشا گہ جاں ۔۔۔ گل بود بہ سبزہ نیز آراستہ شد

یہ رباعی عمعق بخاری شاعر دور سلطان سنجر سے منسوب ہے۔ ایسی صفاتی رباعیاں خیام سے منسوب نہیں ہوسکتیں۔ میرے نزدیک یہ رباعی بھی کسی ایسے موقع پر کہی گئی ہے، جیسے کہ عنصری نے ایاز کی زلفوں کے ترشنے اور سلطان محمود کے مکدر ہونے پر فی البدیہہ یہ رباعی کہی تھی:

گر عیب سر زلف بت از کاستن است ۔۔۔ نے جائے بہ غم نشستن وخاستن است
وقت طرب ونشاط ومی خواستن است ۔۔۔ کاراستن سرو ز پیراستن است

۹۷۔ رفتیم ز ما زمانہ آشفتہ بماند ۔۔۔ با آنکہ ز صد گہر یکے سفتہ بماند

افسوس کہ صد ہزار معنئ دقیق — از بے خبرئ خلق ناگفتہ بماند

یہ رباعی ''المغنم البارد'' میں شیخ الرئیس کے نام سے منسوب ہے اور اس طرح نقل ہوئی ہے:

اسرار وجود خام و ناپختہ بماند — واں گوہر بس شریفہ ناسفتہ بماند

ہر کس ز سر قیاس حرفی گفتند — واں نکتہ کہ اصل بود ناگفتہ بماند

''خیام'' میں مولوی سید سلیمان ندوی نے یہ رباعی بہ ادنیٰ تغیر الفاظ معلم ثانی ابونصر فارابی سے منسوب کی ہے۔ نیز ''مختار نامۂ عطار'' میں بھی ملتی ہے۔ اس قسم کی اور رباعیاں بھی ''مجموعہ رباعیات خیام'' میں موجود ہیں، مگر منقولہ رباعی غلط بھی ہے اور مصرعے آپس میں مربوط نہیں۔

۹۸۔ زاں پیش کہ گورے زمن آگندہ شود — واجزائے مرکبم پراگندہ شود

اے بادہ سر از گور صراحی بردار — باشد کہ دل مردۂ من زندہ شود

خیام کے مجموعے کی ایک دوسری رباعی دیکھئے اور نتیجہ نکالیے کہ کیا وہ اس رباعی سے نکالی گئی ہے یا یہ اس سے:

آنگہ کہ نہال عمر برکندہ شود — واجزام ز یکدگر پراگندہ شود

در زانکہ صراحی بہ کنند از گل ما — حالے کہ پر از بادہ کنی زندہ شود

۹۹۔ ساقی علم سیاہ شب صبح ربود — برخیز و مے مغانہ را در دہ زود

بکشائے ز ہم دو نرگس خواب آلود — برخیز کہ خفتنت بسے خواہد بود

یہ رباعی ''کلیات خاقانی''، مطبوعہ نولکشوری میں خاقانی کے نام سے ہے۔ اس قسم کی اور رباعیاں بھی مجموعہ خیام میں آپ نے دیکھی ہیں، جیسے: ''برخیز کہ در خاک بسے خواہی خفت'' یا ''مے خور کہ بزیر گل بسے خواہی خفت''۔

۱۰۰۔ اے دل مطلب وصال معلولے چند — مشغول مشو بہ عشق مشغولے چند

پیر امن آستان درویشاں گرد — باشد کہ شوئ قبول مقبولے چند

یہ رباعی مطبوعہ کشوری میں نہیں ہے، مگر بوڈلین لائبریری کے نسخہ میں موجود ہے اور دوسرے نسخوں میں بھی پائی جاتی ہے، مگر دراصل یہ سیف الدین باخرزی المتوفی ۶۵۸ کی ہے۔ چنانچہ مجموعہ منتخبات دارالمصنفین میں سیف الدین ہی کے نام سے ہے۔

۱۰۱۔ گر بت رخ تست بت پرستی خوشتر　　در بادہ ز جام تست مستی خوشتر
در مستی عشق زاں سبب نیست شدم　　کاں نیستی از ہزار ہستی خوشتر

"کاس الکرام شرح رباعیات خیام" میں مولانا رومی کے دیوان کا حوالہ دیتے ہوئے، اس رباعی کو مولانا سے منسوب کیا ہے "المغنم البارد"، صفحہ ۸۵ میں بھی مولانا رومی ہی کے نام سے لکھی گئی ہے۔

۱۰۲۔ بایار خوشم جام شراب اولے تر　　وز دست غم دیدہ پر آب اولے تر
چوں عالم دوں وفا نخواہد کردن　　در عالم دوں مست وخراب اولے تر

اغلب کہ یہ رباعی حافظ کی اس رباعی کا مثنیٰ ہے:

ایام شباب است شراب اولیٰ تر　　ہر غمزدہ مست مئی ناب اولیٰ تر
عالم ہمہ سربسر خراب است وخراب　　در جائے خراب ہم خراب اولیٰ تر

۱۰۳۔ از چرخ بہ کام سر برافراشتہ گیر　　وز عمر تمام بہرہ برداشتہ گیر
از گنج وگہر ہر چہ مراد دل تست　　برداشتہ گیر و باز با گزاشتہ گیر

اس قسم کی رباعیاں اکثر لوگوں کے یہاں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ خواجہ فریدالدین عطار کے یہاں قریب قریب ایسی ہی رباعی ہے:

از عمر تمام بہرہ برداشتہ گیر　　ہر تخم کہ دل می طلب کاشتہ گیر
اول برخیز و گیر ہر چہ آوردی　　آخر بہ دریغ جملہ بگزاشتہ گیر

کمال الدین اسماعیل اصفہانی المتوفی ۶۳۶ھ کی یہ رباعی بھی ایسی ہی ہے:

ایوان سریر فلک افراشتہ گیر　　ویں زیر زمیں بگنج انباشتہ گیر
ویں سیم کہ جو جو بہمش می آری　　خرمن خرمن بجائے بگزاشتہ گیر

ایک رباعی جو اسی مجموعہ خیام میں شامل ہے، یہ ہے۔ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کس کی ہے:

کار ہمہ عالم بمرادت شدہ گیر — ویں عمر برفتہ و اجل آمدہ گیر
گفتی کہ بکام خویش دستے بزنم — خود نتوانی و گر توانی زدہ گیر

۱۰۴۔ اے دل ہمہ اسباب جہاں خواستہ گیر — ویں خانہ پر از نعمت و آراستہ گیر
خوش باش دریں نشیمن کون و فساد — روز دو سہ بنشستہ و برخاستہ گیر

یہ رباعی بھی اسی قسم کی ہے، جو مجموعہ خیام میں شامل ہے، مگر ''کاس الکرام شرح رباعیات خیام'' میں ''آتش کدہ'' کے حوالے سے شاہی سبزواری سے منسوب کی گئی ہے۔

۱۰۵۔ اے دل ہمہ اسباب جہاں خواستہ گیر — باغ طربت بہ سبزہ آراستہ گیر
وانگاہ براں سبزہ شبے چوں شبنم — نشستہ و بامداد برخاستہ گیر

'ہفت اقلیم' میں یہ رباعی عاکفی گیلانی کی طرف منسوب کی گئی ہے اور ''صبح گلشن'' میں بھی اسی کا اتباع کیا ہے۔ عطار کی ایک دوسری رباعی اسی انداز کی ہے:

ہر رنگ کہ ممکن است آمیختہ گیر — ہر فتنہ کہ ساکن است انگیختہ گیر
ویں روئے چو ماہ آسمانت بدریغ — از صرصر مرگ برزمیں ریختہ گیر

نظام الدین سہیلی کی یہ رباعی بھی اسی مضمون کی ہے:

برخیز و لوائے دولت افراشتہ گیر — دنیا ہمہ در زیر نگیں داشتہ گیر
آفاق از آنِ خویش پنداشتہ گیر — آخر ز جہاں رفتہ و بگزاشتہ گیر

۱۰۶۔ بازے بودم پریدہ از عالم راز — بو تا کہ پرم دمے نشیبے بہ فراز
اینجا کہ نیافتم کسے محرم راز — زاں در کہ در آمدم بروں رفتم باز

یہ رباعی شیخ فریدالدین عطار کی ہے۔ ''تذکرہ دولت شاہ سمرقندی'' میں شیخ فریدالدین عطار کے بیان میں درج ہے اور بجائے 'باز بودم'، 'مرغے بودم' اور دوسرے مصرعہ میں 'زصعب صیدے بہ فراز'۔ تیسرے میں 'چوں ہیچ کسے نیافتم' ہے۔ یہ رباعی ''مجموعہ رباعیات افضل'' میں بھی موجود ہے اور شیخ الاسلام عبداللہ انصاری سے بھی منسوب ہے۔

۱۰۷۔ برروئے گل از ابر نقاب است ہنوز　　در طبع دلم میل شراب است ہنوز

درخواب مرو چہ وقت خواب است ہنوز　　جانا مے خور کہ آفتاب است ہنوز

یہ رباعی بھی شیخ فریدالدین عطار سے منسوب ہے اوران کی رباعیات کے مجموعے ''مختار نامہ'' میں موجود ہے۔

۱۰۸۔ می پرسیدی کہ چیست ای نقش مجازں　　گر بر گویم حقیقتش ہست دراز

نقشے است پدید آمدہ از دریائے　　وانگاہ شدہ بہ قعر آں دریا باز

یہ رباعی بھی شیخ فریدالدین عطار کی ہے۔ ''مختار نامہ'' میں موجود ہے۔ منتخبات دارالمصنفین میں بھی انہی سے منسوب ہے اور حقیقتاً یہ رنگ تصوف انہی کا حصہ ہے۔

۱۰۹۔ اے واقف اسرار ضمیر ہمہ کس　　در حالت عجز دستگر ہمہ کس

یارب تو مرا توبہ دہ و عذر پزیر　　اے توبہ دہ وعذر پزیر ہمہ کس

یہ رباعی شاہ ابوسعید ابوالخیر کی ہے اوران کی اس طرح کی بہت سی رباعیاں ہیں۔ ''المغنم البارد''، صفحہ ۱۰۴۔ مولانا جامی کی اسی قسم کی رباعی سنیے:

اے فضل تو دستگیر من دستم گیر　　سیر آمدہ ام ز خویش دستم گیر

تا چند کنم تو بہ و تا کے شکنم　　اے توبہ دہ توبہ شکن دستم گیر

۱۱۰۔ از حادثہ زمان آئندہ مپرس　　وز ہرچہ رسد چو نیست پایندہ مپرس

ایں یک دم نقد را غنیمت میداں　　از رفتہ میندیش وز آیندہ مپرس

''کاس الکرام شرح رباعیات خیام'' میں اس رباعی کو مولانا رومی سے منسوب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''دیوان مولانا روم'' میں موجود ہے۔ ''المغنم البارد''، صفحہ ۱۸۸ میں یہ رباعی شیخ فریدالدین عطار کے نام سے لکھی گئی ہے:

اے ذرہ ز اندازۂ ذرات مپرس　　یک وقت نگہدار ز اوقات مپرس

قصہ چو کنی دراز در غصہ بسوز　　در صنع نگہ میکن و از ذات مپرس

یہی رباعی افضل کاشانی کی رباعیات میں موجود ہے۔

۱۱۱۔ مرغے دیدم نشستہ بر بارۂ طوس　　در پیش نہادہ کلہ کیکاؤس
باکلہ ہمی گفت کہ افسوس افسوس　　کو بانگ جرس ہا و کجا نالہ کوس

''المغنم البارد''، صفحہ ۱۸۸ میں یہ رباعی شیخ ابوالحسن بلخی کے نام سے اس طور پر درج ہے:

دوشم گزر افتاد بویرانہ طوس　　دیدم چغد نشستہ بر جائے خروس
فتم چہ خبرداری ازیں ویرانہ　　گفتا خبر ایں است کہ افسوس افسوس

۱۱۲۔ باروئے نکوشراب روشن درکش　　بادوست دل از جفائے دشمن درکش
باسادہ رخے نشیں وبگزر از خویش　　پیراہن کبروہستی از تن درکش

''دیوان حافظ'' کے ایک قدیم مطبوعہ نسخے میں یہ رباعی اس طرح پائی جاتی ہے۔ یہ نسخہ ۱۸۸۱ء میں کلکتے میں میجر ایچ.ایس. جیریٹ صاحب بہادر کے اہتمام سے طبع ہوا۔ یہ رباعی نسخہ کشوری میں بھی موجود ہے:

اے دوست دل از جفائے دشمن درکش　　با روئے نکو شراب روشن درکش
بااہل ہنر گوئے گریباں بہ کشائے　　وز نا اہلاں تمام دامن درکش

۱۱۳۔ غم چند خوری زکار نا آمدہ پیش　　رنج است نصیب مردم دور اندیش
خوش باش وجہاں تنگ مکن بردل خویش　　کز خوردن غم قضا نگردد کم وبیش

یہ رباعی ''رباعیات افضل کاشانی'' میں موجود ہے۔ ''المغنم البارد'' میں بھی افضل ہی کے نام سے لکھی گئی ہے۔

۱۱۴۔ اے دل مطلب زدیگراں مرہم خویش　　خودباش بہر دردِ دلی مرہم خویش
تنہا بنشیں وخویشتن خور غم خویش　　از ہمدمت آرزو کند ہمدم خویش

یہ رباعی افضل کاشانی کی رباعیات میں موجود ہے۔ ''تذکرہ ہفت اقلیم'' میں تغیر ذیل کے ساتھ کمال اسماعیل سے منسوب کی گئی ہے۔ دوسرا شعر اس طرح ہے:

تنہا بنشیں وخود ہمی خور غم خویش　　در ہمدمت آرزو کند ہمدم خویش

۱۱۵۔ ایام شباب رفت دخیل وحشمش   تلخ است مرا عیش ولی می چشمش
ایں قامت ہم چو تیر من گشتہ کماں   زہ کردم ام از عصا وخوش می کشمش

''تذکرہ شمع انجمن''، صفحہ ۵۲، مطبوعہ ۱۲۹۳ھ میں یہ رباعی احمد خان بادشاہ گیلان المتوفی ۹۲۰ھ سے منسوب کی گئی ہے:

در کارگہہ کوزہ گرے رفتم دوش   دیدم دو ہزار کوزہ گویا و خموش
ہر یک بزبان حال بامن گفتند   کوکوزہ وکو کوزہ گرو کوزہ فروش

یہ رباعی بھی ''رباعیات افضل'' میں موجود ہے۔ سعدی کا ایک قطعہ کیا خوب ہے:

نرفت از دلم قول آں کاسہ گر   کہ می گفت با کاسۂ پر خطر
ندانم کہ سنگ سپہر قضا   ترا بشکند پیشتر یا مرا

۱۱۶۔ ہاں صبح دمید دامن شب شد چاک   برخیز د صبوح کن چرائی غمناک
مے نوش ہلاکہ صبح بسیار دمد   او روئے ہما کردہ و ما روئے بخاک

یہ رباعی شیخ فریدالدین عطار کی ہے اور ''مختار نامہ'' میں موجود ہے۔ ''مختار نامہ'' میں اس قسم کی رباعیاں بہت ہیں۔ 'ہاں' کی جگہ 'چوں' اور دوسرے شعر کے مصرعہ اولیٰ میں 'ہلا' کی بجائے 'دمے' ہے۔

۱۱۷۔ باسرو قدے تازہ تراز خرمن گل   از دست مدہ جام مے و دامن گل
زاں پیش کہ ناگہ شود از گرگ اجل   پیراہن عمر تو چو پیراہن گل

''آتشکدہ آذر'' میں یہ رباعی کمال اسماعیل اصفہانی کے منتخبات میں نقل کی گئی ہے۔

۱۱۸۔ اسرار حقیقت نہ شود حل بہ سوال   نے نیز بہ در باختن حشمت و مال
تاجاں نہ کنی خوں نخوری پنجہ سال   از قال ترا رہ نہ نماید بہ حال

''نفحات الانس'' مولانا جامی میں یہ رباعی شیخ اوحدالدین حامد الکرمانی المتوفی ۶۳۵ھ کے نام سے لکھی گئی ہے۔ دوسری جگہوں میں بھی انھی سے منسوب ہے، مگر ''المغنم البارد'' میں قلندر کے نام سے ہے اور یہ معلوم نہیں کہ یہ کونسے قلندر ہیں۔

۱۱۹۔از جرم حضیض خاک تا اوج زحل　　کردم ہمہ مشکلات گردوں راحل
بیرون جستم ز بند ہر مکر و حِیَل　　ہر بند کشادہ شد مگر بند اجل

بعض ہم معنی الفاظ کے تغیر کے ساتھ یہ رباعی شیخ بوعلی سینا سے منسوب ہے۔سوانح عمری بوعلی سینا، تذکرہ صبح گلشن، صفحہ ۱۲، مجمع الفصحا، منتخبات دار المصنفین اعظم گڑھ۔

۱۲۰۔گر من گنۂ روئے زمیں کردستم　　عفو تو امید است کہ گیرد دستم
گفتی کہ بروز عجز دستت گیرم　　عاجز تر ازیں مخواہ کاکنوں ہستم

''نفحات الانس'' مولانا جامی میں یہ رباعی اس قصے کے ساتھ شیخ سیف الدین باخرزی المتوفی ۶۵۸ھ سے منسوب کی گئی ہے کہ ایک درویش کا جنازہ جارہا تھا۔شیخ بھی موجود تھے۔لوگوں نے عرض کیا: ''حضرت تلقین میت فرمایئے۔'' آپ میت کے سامنے آئے اور یہ رباعی ارشاد فرمائی۔''تذکرہ حسینی'' میں بھی یہی قصہ بیان کیا گیا ہے۔

۱۲۱۔با نفس ہمیشہ درنبودم چہ کنم　　وز کردۂ خویشتن بہ دردم چہ کنم
گیرم کہ ز من در گزرانی بہ کرم　　آں شرم کہ دیدی کہ چہ کردم چہ کنم

یہ رباعی مولانا فخر الدین عراقی کی ہے اور ان کے دیوان میں موجود ہے۔امیر خسرو دہلوی المتوفی ۷۲۵ھ کی رباعی بھی ایسی ہی ہے:

یارب چو ز عقل خود نباہم چہ کنم　　وز گیسو و زلف رو سیاہم چہ کنم
گیرم بہ کرم گناہ من عفو کنی　　آں شرم کہ دیدۂ گناہم چہ کنم

مرزا غالب نے ایک نیا گوشہ پیدا کر کے یہ شعر خوب کہا ہے:

ہفت دوزخ درنہاد شرمساری مضمراست　　انتقام است اینکہ با مجرم مدارا کردہ

یارب تو گلم سرشتۂ من چہ کنم　　و قصبم تو رشتۂ من چہ کنمپشم
ہر نیک و بدی کہ از من آید　　بہ وجود تو برسر من نوشتہ من چہ کنم

یہ رباعی ''رباعیات افضل'' میں شامل ہے۔شیخ فرید الدین عطار کی ایسی ہی ایک رباعی یہ ہے:

چوں مے نہ رہانیم ز من، من چہ کنم　　سیر آمدہ ام ز جان و تن من چہ کنم
من می خواہم کہ راہ یابم سوئے تو　　رہ تو نہ دہی بخویشتن، من چہ کنم

۱۲۲۔ گویند مرا کہ مے پرستم ہستم　　گویند مرا فاسق و مستم ہستم
در ظاہر من نگاہ بسیار مکن　　کاندر باطن چنانکہ ہستم ہستم

یہ رباعی شیخ ابوالحسن خرقانی سے منسوب ہے۔ ''خیام''، مولوی سید سلیمان صاحب ندوی، صفحہ ۲۴۱۔ اسی رباعی سے غالباً خیام کے مجموعے میں یہ رباعی تراش کر شامل کی گئی ہے:

گر من ز مے مغانہ مستم، ہستم　　گر کافر و گبر و بت پرستم ہستم
ہر طائفہ بہ من گمانے دارند　　من زانِ خودم چنانکہ ہستم ہستم

۱۲۳۔ گفتم کہ دگر چشم بہ دلبر نہ کنم　　صوفی شوم و گوش بہ منکر نہ کنم
دیدم کہ خلاف طبع موزون من است　　توبہ کردم کہ توبہ دیگر نہ کنم

یہ رباعی مجموعہ رباعیات کشوری میں نہیں ہے، مگر مطبوعہ الہ آباد میں ہے۔ یہ ''کلیات سعدی کشوری'' میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ ایک بہت صحیح اور قدیم نسخہ مطبوعہ کلکتہ میں بھی موجود ہے۔

۱۲۴۔ اے چرخ ز گردش تو خرسند نیم　　آزادم کن کہ لائق بند نیم
گر میل تو با بے خرد و نااہل است　　من نیز چناں اہل و خردمند نیم

''آتشکدہ آذر'' میں یہ رباعی اثیرالدین اومانی کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ اثیرالدین کمال اسماعیل کا معاصر اور نہایت جید شاعر تھا۔

۱۲۵۔ ما کز مئے بیخودی طرب ناک شدیم　　وز پایۂ دوں بر سر افلاک شدیم
آخر ہمہ ز آلایش تن پاک شدیم　　از خاک برآمدیم و بر خاک شدیم

الملک لطفی فرزند عرفی کمان گر کے یہاں یہ رباعی پائی جاتی ہے۔ معلوم نہیں کہ وہ رباعی اس سے متخرج ہے یا یہ اس سے:

یک چند پے گردش افلاک شدیم — یک چند پے دانش و ادراک شدیم
آز آمد و رفت خود ہمی فہمیدیم — کز خاک برامدیم و در خاک شدیم

۱۲۶۔ ماخرقۂ زہد در سر خم کردیم — وز خاک خرابات تیمّم کردیم
باشد کہ درون میکدہ دریابیم — عمرے کہ درون مدرسہ گم کردیم

یہ رباعی امام محمد غزالی المتوفی ۵۰۵ھ کی ہے۔ تذکرہ شمع انجمن، مجمع الفصحا، روضات الجنات اور الغزالی مؤلفہ مولانا شبلی میں انہی سے منسوب کی گئی ہے اور مصرعہ اولیٰ میں 'ماخرقہ' کی بجائے 'ماجامہ' ہے۔ نسخہ ''مجموعہ خیام''، جے نرائن ورما، مطبوعہ ۱۹۰۵ء میں اس طرح ہے:

ما جامہ نمازی بہ سر خم کردیم — خود را بمئ لعل چو مردم کردیم
در کوئے خرابات مگر بتواں یافت — آں عمر کہ در صومعہ ہا گم کردیم

۱۲۷۔ من بادہ خورم ولیک مستی نہ کنم — الا بہ قدح دراز دستی نہ کنم
دانی غرضم زی پرستی چہ بود — تاہم چو تو خویشتن پرستی نہ کنم

یہ رباعی کمال اصفہانی کی ہے اور ان کے کلیات میں موجود ہے۔ بجائے 'من بادہ خورم'، 'می باز خورم' ہے۔

۱۲۸۔ چوں نیست مقام مادریں دیر مقیم — پس بے مئے و معشوق عذابی است الیم
تاکے ز قدیم و محدث ای مرد سلیم — چوں من رفتم جہاں چہ محدث چہ قدیم

مجھ سے بعض حضرات نے کہا کہ یہ رباعی سنائی کی ہے۔ تلاش کرنے پر سنائی کے یہاں مجھے نہیں ملی، مگر حکیم سنائی کی ایک ایسی ہی رباعی ''نفحات الانس'' میں میری نگاہ سے گزری، جو یہ ہے:

قایم بہ خودی ازاں شب و روز مقیم — بیمت ز سموم است و امیدت بہ نسیم
با ما نہ ز آب و آتشت باشد بیم — چوں سایہ شدی ترا چہ جیحوں چہ جحیم

۱۲۹۔ ماحاصل عمری بہ دمی بہ فروشیم — صد خرمن شادی بہ غمی بہ فروشیم

دریک دم اگر ہزار جاں دست دہد   در حال بہ خاک قدمی بفروشیم

یہ رباعی ''مجموعہ خیام''، مطبوعہ نول کشور میں موجود نہیں ہے، مگر دوسرے نسخوں میں موجود ہے۔ دراصل یہ رباعی شیخ سعدی کی ہے اور قدیم سے قدیم نسخوں میں بھی موجود ہے۔

۱۳۰۔ یک چند بہ کودکی بہ استاد شدیم   یک چند بہ استادئی خود شاد شدیم
پایان سخن شنو کہ ما را چہ رسید   از خاک برآمدیم و برباد شدیم

یہ رباعی تھوڑے تفاوت اور تغیر سے دیوان مولانا رومی میں موجود ہے۔

۱۳۱۔ برمفرش خاک خفتگان می بینم   در زیر زمیں نہفتگان می بینم
چنداں کہ بصحرائی عدم می نگرم   ناآمدگان و رفتگان می بینم

یہ رباعی شیخ فریدالدین عطار کی ہے جو مجموعہ رباعیات یعنی ''مختار نامہ'' میں موجود ہے اوراسی مضمون کی اکثر رباعیاں ان کے یہاں پائی جاتی ہیں۔

۱۳۲۔ ہرگہ کہ دریں سبزہ طربناک شویم   مانندہ سبز خنگ افلاک شویم
با سبز خطاں سبزہ خورم در سبزہ   زاں پیش کہ زیر سبزہ در خاک شویم

یہ رباعی ''آتش کدہ'' میں شاہ شجاع المتوفی ۷۷۳ھ کے نام سے منسوب کی گئی ہے۔

۱۳۳۔ آں بہ کہ ز جام وبادہ دل شاد کنیم   وز نامدہ و گزشتہ کم یاد کنیم
ایں عاریتی رواق زندانی را   یک لحظہ ز بند عقل آزاد کنیم

یہ رباعی ''دیوان حافظ'' میں موجود ہے اور بھی رباعیاں اس قسم کی ان کے ہاں پائی جاتی ہیں۔

۱۳۴۔ صبح است دمی برمئے گلرنگ زنیم   ویں شیشۂ نام وننگ بر سنگ زنیم
دست از امل دراز خود باز کشیم   در زلف دراز و دامن چنگ زنیم

'ہفت اقلیم'' میں یہ رباعی جمال الدین ابہری کے ساتھ منسوب کی گئی ہے اور 'دمی' کی بجائے 'بیا'، 'خود' کے بجائے 'خوش'، 'دامن' کی بجائے 'حلقہ' ہے۔

۱۳۵۔ گل گفت کہ من یوسف مصر چمنم یاقوت گرانمایۂ بر زر دہنم
گفتم چو تو یوسفی نشانے بنمائے گفتا کہ بخوں غرقہ نگر پیرہنم

'گل' کے متعلق سوال وجواب کی بہت سی رباعیاں "مختار نامہ" عطار میں موجود ہیں۔ اگر چہ تلاش سے یہ رباعی تو مجھے نہیں ملی، مگر میرا یہ خیال یقین کی حد پر ہے کہ یہ رباعی بھی شیخ عطار کی ہے۔ اس کے متعلق ایک جواب موجود ہے، ملاحظہ ہو:

باگل گفتم چو یوسف کنعانی در مصر چمن ترا رسد سلطانی
گل گفت کہ من یک ورقم از ہر باب خود یک ورق است اینکہ تو بر میخوانی

ایک اور رباعی احتیاطاً نقل کی جاتی ہے، ورنہ سب کو نقل کرنا تو بڑا کام ہے:

گل گفت کہ دست زرفشاں آوردم خنداں خنداں گل بجہاں آوردم
پندار سرکیسہ گرفتم رفتم ہر نقد کہ بود بامیاں آوردم

۱۳۶۔ اسرار ازل را نہ تو دانی و نہ من ویں حرف معما نہ تو خوانی و نہ من
ہست از پس پردہ گفتگوئے من وتو چوں پردہ برافتد نہ تو مانی و نہ من

یہ رباعی شیخ ابوالحسن خرقانی کی ہے۔ المغنم البارد، آتشکدہ اور ایک تذکرہ قلمی سب اسی پر متفق ہیں۔ رباعیات عطار میں اس قسم کی رباعیوں کا ایک پورا باب ہے، جن میں سے دو ایک نقل کرتا ہوں:

آں سر عجب کہ نے تو دانی و نہ من حل کردن آں نے تو توانی و نہ من
یک ذرہ گر آشکار گردد آں سر یک ذرہ ہمی نے تو بمانی و نہ من
چیز یکہ در و نہ تو درانی و نہ من کشف است کہ آنرا نہ تو دانی و نہ من
برخیزد اگر پردۂ پندار از پیش او ماند و او، نی تو بمانی و نہ من

۱۳۷۔ برخیز و مخور غم جہانِ گزراں خوش دمی بہ شادمانی گزراں
در طبع جہاں اگر وفائی بودی نوبت بہ تو خود نیامدی از دگراں

آتشکدہ آذر، تذکرہ صبح گلشن اور تذکرہ قلمی میں یہ رباعی کمال اسماعیل اصفہانی سے

منسوب ہے اور کمال کے یہاں اس قسم کی اور رباعیاں بھی موجود ہیں۔

۱۳۸۔ بر سینۂ غم پذیر من رحمت کن بر جان و دل اسیر من رحمت کن
بر پائے خرابات روِ من بخشائے بر دست پیالہ گیر من رحمت کن

مجھے صحیح پتہ نہیں چلا کہ یہ رباعی کس کی ہے، مگر اس قسم کی دوسری رباعیاں دوسرے شاعروں کے یہاں ملیں، جن میں سے قاسم کی یہ رباعیاں نقل کی جاتی ہیں۔ ''المغنم البارد''، صفحہ ۷۵۔

بر دیدہ چوں سحاب من رحمت کن بر سیل سر شک ناب من رحمت کن
بر جان و دل خراب من رحمت کن بر زاری و اضطراب من رحمت کن
بر نالہ و برزاریٔ من رحمت کن بر مفلسی و خواریٔ من رحمت کن
بر گریہ و بیداریٔ من رحمت کن بر فقر نگو ساریٔ من رحمت کن

حکیم مومن خاں مومن دہلوی نے اس مضمون میں ایک نیا گوشہ پیدا کر کے یہ رباعی کہی ہے:

یارب نظرے بچشم خونبارم کن رحمے بہ دل سوختۂ زارم کن
گر در خور آتشم بدوزخ مسپار یک شعلہ ز برق طور درکارم کن

۱۳۹۔ ایں چشم پیالہ بیں بہ جاں آبستن ہمچوں سمنے بہ ارغواں آبستن
نے نے غلطم کہ بادہ از غایت لطف آبے است بآتش رواں آبستن

''آتشکدۂ آذر'' میں یہ رباعی عسجدی المتوفی ۴۳۲ھ سے منسوب کی گئی ہے۔ ''ہفت اقلیم'' میں بہاء الدین قزوینی کے نام سے ہے۔ بجائے 'چشم' کے 'جسم' ہے اور یہی صحیح ہے۔

۱۴۰۔ دوش از سر روح از صفائے دل من در مے کدہ آں روح فزائے دل من
جامے بمن آوردہ کہ بستان و بنوش گفتم نہ خورم گفت برائے دل من

یہ رباعی مولانا لطف اللہ نیشاپوری المتوفی ۷۸۶ھ کی ہے۔ ''خزانہ عامرہ'' میں مولانا آزاد بلگرامی نے اس کے ساتھ یہ واقعہ بھی لکھا ہے کہ وہ وقت وفات تنہا تھا اور یہ رباعی کاغذ

کے ایک پرچے پر لکھی ہوئی اس کے ہاتھ میں پائی گئی۔ ''المغنم البارد'' اور دولت شاہ کے تذکرے میں بھی اسی سے متعلق بتائی ہے۔ ''تذکرہ دولت شاہ'' میں مولانا لطف اللہ کا سال وفات ۸۱۰ھ بتایا گیا ہے۔ ''کاس الکرام'' میں اس رباعی کو ''آتشکدہ'' کے حوالے سے قتالی سے منسوب بتایا گیا ہے، مگر مجھے قتالی کے یہاں نہیں ملی۔ پہلا مصرع اس طرح پر ہے:

دوشینہ پئے صدق وصفائے دل من

۱۴۱۔ جانہا ہمہ آب گشت ودلہا ہمہ خوں   تا چیست حقیقت از پس پردہ بروں
اے باعلمت خرد وز گردوں ہمہ دوں   اے از تو جہاں پر د تو از وے بیروں

یہ رباعی ''نفحات الانس'' مولانا جامی میں حکیم سنائی کی رباعیوں میں لکھی ہے اور چونکہ اس قسم کی اکثر رباعیاں سنائی رحمتہ اللہ علیہ کے یہاں موجود ہیں، لہذا ابہت ممکن ہے کہ یہ بھی انھی کی ہو۔ خیام کے مجموعے میں اس قسم کی صوفیانہ رباعیاں نہیں ہیں اور ہیں تو وہ الحاقی ہیں۔

۱۴۲۔ احوال جہاں بردلم آساں می کن   و افعال بدم ز خلق پنہاں می کن
امروز خوشم بدار و فردا با من   آنچہ از کرم تو می سزد آں می کن

''تذکرہ حسینی'' میں یہ رباعی شیخ ابوسعید ابوالخیر رحمتہ اللہ علیہ کے نام سے لکھی گئی ہے اور ''تذکرہ ہفت اقلیم'' میں شاہ شجاع کے نام سے لائی گئی ہے۔ گمان غالب یہ ہے کہ شیخ ابوسعیدؒ کی ہے، کیونکہ ان کی اکثر رباعیاں اس قسم کی ہیں، جن میں آیات واسما کے افعال وخواص بتائے گئے ہیں۔ چنانچہ مؤلف ''تذکرہ حسینی'' نے اس رباعی کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ ''ایں رباعی جہت اخفائے افعال ذمیمہ وآسانی مشکلات وحصول نعمات دنیوی و اخروی در نصف اللیل بقدر مقدور بخواند اثر اسمِ یا ستار یامسیّر دارد۔'' اسی طرح اور بھی رباعیاں انھوں نے نقل کی ہیں۔

۱۴۳۔ رندے دیدم نشستہ برخنگ زمیں   نے کفر نہ اسلام نہ دنیا و نہ دیں
نے حق نہ حقیقت نہ شریعت نہ یقیں   اندر دوجہاں کرا بود زہرۂ ایں

''تذکرۂ ہفت اقلیم'' ذکر شیخ قطب الدین حیدر میں یہ رباعی خواجہ رکن الدین محمود شاہ سنجان المتوفی ۵۹۷ھ کی بتائی گئی ہے اور لکھا ہے کہ یہ رباعی انھوں نے شیخ قطب الدین حیدر المتوفی ۵۳۷ھ کی مدح میں کہی تھی۔ شیخ قطب الدین حیدر اپنے وقت کے بڑے باکمال صاحب کشف بزرگ تھے اور ان کو شاہ ابدال کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ''نفحات الانس'' مولانا جامی رحمتہ اللہ علیہ میں ان کا نام قطب الدین مودود بتایا گیا ہے اور یہی صحیح ہے۔ ان کے خلف شیخ احمد مودود تھے۔

۱۴۴۔ دارم ز جفائے فلک آئینہ گوں وز گردش روزگار خس پرور دوں
از دیدہ رخے ہم چو پیالہ پر اشک دو سینہ دلے ہم چو صراحی پر خوں

'ہفت اقلیم'' میں یہ رباعی امیر یمین الدین طغرائی فریومدی المتوفی ۷۳۷ھ سے منسوب ہے۔ ''تذکرہ دولت شاہ سمرقندی'' میں یہ قصہ بھی اس کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ یہ رباعی امیر مذکور نے اپنے بیٹے امیر محمود بن یمین کو لکھی تھی اس نے جواب میں یہ رباعی لکھ کر بھیجی:

دارم ز جفائے فلک آئینہ گوں پر آہ دلے کہ سنگ ازو گردد خوں
روزے بہ ہزار غم بشب می آرم تا خود فلک از پردہ چہ آرد بیروں

۱۴۵۔ از آمدن و رفتن ماسودے کو وز تار امید عمر ما پودے کو
در چنبر چرخ جاں چندیں پاکاں مے سوزد و خاک مے شود دودے کو

''تذکرۂ ہفت اقلیم'' میں یہ رباعی افضل الدین محمد افضل سے منسوب ہے، جو سلطان محمود غازی کے زمانے کا شاعر ہے۔ دوسرے مصرعہ میں 'چنبر چرخ' کے بجائے 'روزن عمر' ہے۔ حافظ کے دیوان میں بھی موجود ہے۔

۱۴۶۔ یاقوت لب لعل بدخشانے کو واں راحت روح وراح ریحانے کو
مے گرچہ حرام در مسلمانی شد تو مے خورو غم مخور مسلمانے کو

یہ رباعی ''کاس الکرام شرح رباعیات خیام'' میں ''کلیات سلمان ساوجی''،

مطبوعہ بمبئی کا حوالہ دیتے ہوئے مغربی المتوفی ۸۰۹ھ سے منسوب بتائی گئی ہے۔

۱۴۷۔ در دیدۂ تنگ مور نور است از تو — در پائے ضعیف پشہ زور است از تو
ذات تو سزاست مر خداوندی را — ہر وصف کہ ناسزاست دور است از تو

'ہفت اقلیم' میں یہ رباعی ملک الکلام عمر بن محمد الحرقاباوی کی طرف منسوب کی گئی ہے اور پہلے مصرعہ میں بجائے 'در دیدہ تنگ مور' کے 'دو چشم حقیر مور' ہے۔

۱۴۸۔ روزیکہ بود وقت ہلاک من و تو — از تن برود روان پاک من و تو
از بسکہ نباشیم دریں چرخ کبود — مہ در تابد بر سر خاک من و تو

''مختار نامہ'' میں یہ رباعی شیخ فریدالدین عطار کے یہاں موجود ہے۔ کچھ الفاظ کا تغیر پہلے مصرعہ میں 'وقت' کی بجائے 'روز'، دوسرے میں 'برود' کی بجائے 'برہد'، تیسرے میں 'چرخ' کی بجائے 'طاق'، چوتھے میں 'مہ در تابد' کی بجائے 'چہ مہ تابد'۔ شیخ فریدالدین عطار کے یہاں یوں تو اس مضمون کی رباعیاں بہت سی ہیں، مگر خصوصیت سے یہ رباعی تو قریب قریب ایسی ہی ہے۔

مے خور کہ فلک بہر ہلاک من و تو — قصدے دارد بجان پاک من و تو
بر سبزہ نشیں دمے کہ بسیار نماند — تا سبزہ بروں دمد ز خاک من و تو

چنانچہ اس کو بھی مجموعہ خیام میں اس طرح نقل کیا گیا ہے کہ پہلے مصرعہ میں 'مے خور' کی بجائے 'ایں چرخ' تیسرا مصرعہ یوں ہے: ''بر سبزہ نشیں پیالہ کش دیر نماند''۔ غرض کہ یہ رباعی وہی ہے جو ''مختار نامہ'' عطار میں ہے۔ ''رباعیات افضل کاشانی'' میں بھی مندرجہ بالا رباعی موجود ہے۔

۱۴۹۔ از تن چو برفت جان پاک من و تو — خشتے دو نہند بر مغاک من و تو
وانگہ ز برائے خشت گور دگراں — در کالبدے کشند خاک من و تو

یہ رباعی ''المغنم البارد'' میں فطرت کے نام سے لکھی گئی ہے۔

۱۵۰۔ ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو　　آں کس کہ گنہ نہ کرد چوں زیست بگو
من بدکنم تو بد مکافات دہی　　پس فرق میان من و تو چیست بگو

اس رباعی کے ساتھ یہ قصہ بھی بتایا جاتا ہے کہ خیام کا ظرف شراب ایک مرتبہ کسی طرح ٹوٹ گیا تو اسنے یہ رباعی کہی۔

ابریق مے مرا شکستی ربی　　بر من در عیش را تو بستی ربی
بر خاک بہ ریختی مے ناب مرا　　خاکم بہ دہن مگر تو مستی ربی

اس رباعی کے کہتے ہی خیام کا چہرہ سیاہ یا مسخ ہو گیا۔ دیکھنے والے نے حکیم سے یہ کہا تو حکیم صاحب نے مندرجہ ذیل رباعی کہی اور چہرہ بدستور اپنی حالت اصلی پر آ گیا۔ یہ سب کچھ ہے، مگر مجھے تو یہ رباعی شیخ فریدالدین عراقی کے دیوان میں ملتی ہے اور اس کے پہلے شعر میں یہ تغیر ہے:

آں کیست کہ بے جرم و گنہ زیست بگو　　بے جرم و گناہ در جہاں کیست بگو

تیسرے مصرع میں بجائے 'دہی' کے 'کنی' ہے۔ یہ رباعی ''رباعیات سرمد'' میں بھی موجود ہے۔ ''المغنم البارد'' میں اس کو شیخ اوحدالدین کرمانی کے تحت لکھا گیا ہے۔ ایک شعر مولانا رومی کا قریب قریب اسی مضمون کا ہے:

گر فراق بندہ از بد بندگی است　　چوں تو باید بد کنی پس فرق چیست

۱۵۱۔ اے زندگی و تن و توانم ہمہ تو　　جانی و دلی اے دل و جانم ہمہ تو
تو ہستی من شدی ازانی ہمہ من　　من نیست شدم در تو ازانم ہمہ تو

یہ رباعی بھی ''دیوان فخرالدین عراقی'' میں موجود ہے اور اس قسم کے تصوف کا ''مجموعہ رباعیات خیام'' میں شائبہ بھی نہیں۔ افضل کاشانی کے یہاں بھی موجود ہے۔

۱۵۲۔ اسرار ز ہمہ ناکساں نہاں داری تو　　راز از ہمہ ابلہاں نہاں داری تو
بنگر کہ میان مردمان کار تو چیست　　چشم از ہمہ مردمان نہاں داری تو

رباعی کے قوافی وغیرہ کی غلطی سے قطع نظر کرتے ہوئے، جب غور کیا جاتا ہے تو یہ

مجموعہ خیام کی ایک دوسری رباعی سے تراشی ہوئی معلوم ہوتی ہے، جو یہ ہے:

سراز ہمہ ناکساں نہاں باید داشت   راز از ہمہ ابلہاں نہاں باید داشت
بنگر کہ بجان مرماں مے چہ کنی   چشم از ہمہ مردمان نہاں باید داشت

۱۵۳۔ ہر روز برآنم کہ کنم شب توبہ   از جام و پیالۂ لبالب توبہ
اکنوں کہ رسید وقت گل ترکم دہ   در موسم گل ز توبہ یارب توبہ

یہ رباعی بھی ''مختار نامہ'' شیخ فریدالدین عطار میں موجود ہے۔'ترکم دہ' کی بجائے 'برگم نیست' ہے۔ اس قسم کی رباعیاں بھی اکثر پائی جاتی ہیں، جو مختلف شعرا سے منسوب ہیں۔

۱۵۴۔ آں بادۂ خوشگوار بر دستم نہ   واں ساغر چوں نگار بر دستم نہ
واں مے کہ چوں زنجیر بہ پیچد برخود   دیوانہ شدم بیار بر دستم نہ

یہ رباعی ''دیوان حافظ'' مطبوعہ کشوری وغیرہ میں موجود ہے، مگر ایک قدیم مطبوعہ دیوان میں اس کو ملحقات کے ذیل میں لایا گیا ہے۔ اگرچہ حافظ کے کلام میں اس رباعی کا ہونا مستبعد نہیں ہے۔ ایسی چیزیں بہت سی ان کے یہاں پائی جاتی ہیں۔

۱۵۵۔ ساقی بہ صبوحی مے ناب اندردہ   مستان شراب را شراب اندردہ
مستیم و خراب در خرابات فنا   آوازہ بہ عالم خراب اندردہ

یہ رباعی بھی ''کلیات عطار'' میں موجود ہے۔

۱۵۶۔ مائیم بہ لطف حق تولا کردہ   وز طاعت و معصیت تبرا کردہ
آنجا کہ عنایت تو باشد باشد   ناکردہ چو کردہ، کردہ چوں ناکردہ

''تذکرہ ہفت اقلیم'' میں یہ رباعی شیخ الرئیس بوعلی سینا سے منسوب کی گئی ہے۔ مجموعۂ منتخبات دارالمصنفین میں بھی یہی بتایا گیا ہے۔

۱۵۷۔ اے نیک نہ کردہ و بدی ہا کردہ   آنگاہ بہ لطف حق تولا کردہ
بر عفو مکن تکیہ کہ ہرگز نبود   ناکردہ چو کردہ، کردہ چوں ناکردہ

بعض نسخوں میں یہ رباعی بھی بوعلی سینا سے منسوب بتائی گئی ہے اور ہوسکتا ہے کہ تنوع مضامین کے لحاظ سے دونوں انھوں نے کہی ہوں۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ شاعر ایک ہی مضمون کو طرح طرح سے کہتا ہے، مگر بعض محققین شاعر کی گفتار اس کے کردار سے مطابق کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایسا نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ مولوی سید سلیمان صاحب نے اپنی تصنیف ''خیام'' میں ان دونوں رباعیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دونوں کا مصنف ایک شخص نہیں ہوسکتا۔ ان میں سے پہلی رباعی مجموعہ منتخبات کے حوالے سے شیخ بوعلی سینا کے نام سے منسوب کی ہے اور دوسری محقق طوسی کی، جو اس کے جواب میں کہی گئی ہے، مگر میری تحقیق میں یہ دوسری رباعی شیخ ابوسعید ابوالخیر سے بھی منسوب بتائی جاتی ہے۔

۱۵۸۔ گر دولت و بخت باشد و روز بہی — در پائے تو سر بباز م اے سرو سہی
سہل است کہ من در قدمت خاک شوم — ترسم کہ تو پائے بر سر من نہ نہی

یہ رباعی مجموعہ رباعیات، مطبوعہ مطبع نولکشوری میں نہیں ہے، مگر مطبوعہ الہ آباد میں ہے اور شیخ سعدی کی کلیات میں پائی جاتی ہے۔ علیٰ ہذا، یہ دونوں بھی الہ آباد ہی کے نسخے میں ہیں اور نولکشوری میں نہیں ہیں اور دونوں سعدی ہی سے منسوب ہیں۔

۱۵۹۔ گر کام دل از زمانہ تصویر کنی — بے فائدہ خود را ز غماں پیر کنی
گیرم کہ ز دشمناں بنالی بر دوست — چوں دوست جفا کند چہ تدبیر کنی

۱۶۰۔ گیرم کہ بہ تقویٰ و خردمندی رائے — از دائرہ شرع بروں نہ نہم پائے
با میل کہ طبع می کند چہ تواں کرد — عیبے است کہ در من آفرید ست خدائے

۱۶۱۔ اے دل اگر از غبار تن پاک شوی — تو روح مجسمی بر افلاک شوی
عرش است نشیمن تو شرمت بادا — کائی و مقیم خطۂ خاک شوی

''ہفت اقلیم'' میں یہ آخری رباعی امام فخرالدین رازی سے منسوب کی ہے۔ علاؤالدین عطا ملک جوینی نے ''تاریخ جہاں گشا'' میں ایک بزرگ شیخ احمد بدملی سبزواری کا ذکر کیا ہے، جو ۵۸۲ھ میں موجود تھے۔ انہی سے اس رباعی کو منسوب کیا ہے اور کچھ الفاظ کی

تبدیلی ہے۔ ''مجمع الفصحا'' میں بدیعی سجاوندی کے نام سے لکھی گئی ہے۔ ''تاریخ گزیدہ'' میں امام فخرالدین رازی سے اور غالباً یہ انہی کی ہے۔ یہ رباعی جلال الدین بلخی سے بھی منسوب ہے۔

۱۶۲۔ گر آمدنم بہ خود بدے نامدمے   در نیز شدن بمن شدے کے شدمے
بہ زاں نہ بدے کہ اندریں دیر خراب   نے آمدمے نے شدمے نے بدمے

''مجمع الفصحا'' میں یہ رباعی حکیم سنائی سے منسوب ہے۔ ''رباعیات افضل'' میں افضل کے نام سے ہے۔

۱۶۳۔ بادردقناعت کن و آباد بزی   در بند فزونی مشو آزاد بزی
منگر بہ فزونے ز خود و غصہ مخور   در کم ز خودے نگہ کن و شاد بزی

یہ رباعی افضل الدین محمد افضل شاعر دور محمود غزنوی کی ہے۔ ''تذکرہ ہفت اقلیم'' میں یہ رباعی انہی سے منسوب کرتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ بیشتر رباعی ہی کہتے تھے۔ پہلے مصرعہ میں 'بادرد' کی بجائے 'بابادہ' ہے۔

۱۶۴۔ گر روئے زمیں بہ جملہ آباد کنی   چنداں نبود کہ خاطرے شاد کنی
گر بندہ کنی بہ لطف آزادے را   بہتر کہ ہزار بندہ آزاد کنی

یہ رباعی شیخ ابوسعید ابوالخیر سے منسوب ہے اور ایک قلمی غیر مطبوعہ تذکرے میں بہ ادنیٰ تفاوت شاہ علاؤالدین کے نام سے ہے۔ کسی کی بھی ہو، مگر اس قسم کا ناصحانہ انداز کلام مجموعہ رباعیات خیام سے منسوب نہیں ہوسکتا۔

۱۶۵۔ ای آں کہ خلاصۂ چہار ارکانی   بشنو سخنے ز عالم روحانی
دیوی و ددی و ملک و انسانی   با تست ہر انچہ می نمائی آنی

یہ رباعی افضل الدین کاشانی کی ہے اور ان کے مجموعہ رباعیات میں درج ہے۔

۱۶۶۔ ہنگام سفیدہ دم خروس سحری   دانی کہ چرا ہمی کند نوحہ گری
یعنی کہ نمودند در آئینۂ صبح   کز عمر شبے گزشت و تو بے خبری

''تذکرہ حسینی'' میں یہ رباعی شیخ ابوسعید ابوالخیر سے منسوب ہے اور بہ خلاف اس کے ''المغنم البارد'' میں اس کو شیخ رباعی مشہدی کے نام سے نقل کیا ہے۔ اسی قسم کی ایک رباعی زلالی خوانساری کی بھی ہے:

گریاں کہ نوحہ میکند وقت گری	دانی غرضش چیست ازیں نوحہ گری
یعنی کہ گری گری شود عمر تو کم	پیمانۂ عمر پر شود تا نگری
۱۶۷۔ اے مایۂ درماں نفسے بہ نشینی	تاصورت حال دردمنداں بینی
گر من بہ تو فرہاد صفت شیفتہ ام	عیبم مکن اے جاں کہ تو بس شیرینی
۱۶۸۔ اے بلبل خوش نفس چہ شیریں نفسی	کز دست و زبان خویشتن در قفسی
شاید کہ بہ یاران عریزت نہ رسی	سرمست ہوا و پائے بند ہوسی
۱۶۹۔ فردا کہ بتامۂ سیہ در نگری	بس دست تحسر کہ بدنداں ببری
بفروختہ دیں بہ دنیا از بے خبری	یوسف کہ بہ دہ درم فروشی چہ خری

یہ تینوں رباعیاں مجموعہ مطبوعہ کشوری میں نہیں ہیں، مگر مطبوعہ احمدی پریس، الہ آباد میں موجود ہیں اور یہ تینوں شیخ سعدی کے قدیم سے قدیم کلیات میں بھی موجود ہیں۔ ان رباعیوں کے علاوہ مندرجہ ذیل رباعیاں رباعیات افضل کے مجموعے میں افضل کاشانی کے نام سے جمع کی گئی ہیں۔ یہ رباعیاں خیام سے بھی منسوب ہیں اور بعض دوسرے شعرا سے بھی، مگر ان سب کو تحقیق کرنے پر افضل ہی کا کلام سمجھا گیا ہے۔ یہ سب کچھ ہے، مگر خیام کے مختلف مجموعوں میں ان کو اسی کے نام سے لکھا گیا ہے:

از رفتہ قلم ہیچ دگرگوں نہ شود	وز خوردن غم جز بہ جگر خوں نہ شود
ہاں تا جگر خویش بہ غم خوں نہ کنی	یک ذرہ از انچہ ہست افزوں نہ شود
افسوس کہ کار پختہ خاماں دارند	اسباب تمام ناتماماں دارند
آنانکہ بہ بندگی نمی ارزیدند	امروز کنیزان و غلاماں دارند
اے ذات تو سر دفتر اسرار وجود	نقش رقمت بر در و دیوار وجود

در پردۂ کبریا نہاں گشتہ ز خلق — بہ نشستہ عیاں بر سر بازار وجود
بدخواہ کساں ہیچ بہ مقصد نرسد — یک بد نہ کند تا بہ خوشی صد نرسد
من نیک تو خواہم و تو بدخواہ منی — تو نیک نہ بینی و بمن بد نرسد
پیرے سر و رائے بے صوابی دارد — گلنار رخت برنگ آبی دارد
بام و در و چار رکن دیوار وجود — ویراں شدہ روئے در خرابی دارد
تا زہرہ و مہ برآسمانند پدید — بہتر زمئے لعل کسے ہیچ نہ دید
من در عجم زمے فروشاں کایشاں — بہ زانکہ فروشند چہ خواہند خرید
چوں شاہد روح خامہ پرداز شود — ہرچیز بہ اصل خویشتن باز شود
ایں ساز وجود راچہ ابریشم طبع — از زخمۂ روزگار بے ساز شود
درراہ چناں رو کہ سلامت نہ کنند — باخلق چناں زی کہ قیامت نہ کنند
درمسجد اگر روی چناں رو کہ ترا — در پیش ندارند و امامت نہ کنند

یہ رباعی شاہ سجان سے بھی منسوب ہے:

رازم ہمہ دانائے فلک میداند — کوموئے بموئے یک بیک میداند
گیرم کہ تو اینجاشش وپنجے داری — با او چہ کنی کہ یک بیک میداند
بودی کہ نبودت بہ خور و خواب نیاز — کردند نیازمندت ایں چار انباز
ہریک بہ توانچہ داد بستاند باز — تا بازَ چناں شوی کہ بودی ز آغاز
اے چرخ خسیس خس دوں پرورخس — ہرگز تو نہ گشتی بمراد دل کس
چرخ افلکا ترا ہمیں بادا بس — ناکس کس سازی و توکس را ناکس
پندے وہمت اگر بمن داری گوش — از بہر خدا جامۂ تزویر مپوش
عقبیٰ ہمہ ساعتی است دنیا یک دم — از بہر دمے ملک ابد را مفروش
تاظن نہ بری کہ از جہاں می ترسم — وز مردن و از گشتن جاں می ترسم
مردن چو حقیقت ست زاں باکم نیست — چوں نیک نہ زیستم ازاں می ترسم

در جستن جام جم جہاں پیمودیم　　روزے نہ نشستیم وشبے ناسودیم
زاستاد چو وصف جام جم پرسیدیم　　خود جام جہاں نمائے جم ، ما بودیم

یہ آخری رباعی زین الدین نسوی سے بھی منسوب ہے، مگر ''تذکرہ روز روشن'' میں زین الدین صوفی ہروی کے نام سے درج ہے۔

حق جان جہاں است و جہاں جملہ بدن　　اصناف ملایکہ حواس ایں تن
افلاک و عناصر موالید اعضا　　توحید ہمیں است دگرہا ہمہ فن

یہ رباعی افضل کاشانی کے علاوہ شیخ الدین حموی المتوفی ۶۵۰ ھ سے بھی منسوب ہے۔ ''آتشکدہ'' میں ان کو شیخ نجم الدین کبریٰ کا بھائی اور ''نفحات الانس'' میں ان کے اصحاب میں سے بتایا ہے اور ان کی بہت سی تصانیف اور رباعیاں پائی جاتی ہیں۔

روزے کہ گزشتہ است ازاں یاد مکن　　فردا کہ نیامدہ است فریاد مکن
بر نامدہ و گزشتہ بنیاد مکن　　حالے خویش باش و عمر برباد مکن

ای آں کہ پدید گشتم از قدرت تو　　پرودہ شدم بناز از نعمت تو
صد سال بہ امتحاں گنہ خواہم کرد　　تاجرم من است بیش یا رحمت تو

اے در خم چوگان قضا ہمچوں گو　　چپ میخور و راست مے برو ہیچ مگو
آں کس کہ ترا افگندہ اندر تگ و پو　　او داند و او داند و او داند او

....

دنیا بہ مراد راندہ گیر آخر چہ　　ویں نامۂ عمر خواندہ گیر آخر چہ
گیرم بہ مراد دل بمانی صد سال　　صد سال دگر بماندہ گیر آخر چہ

....

از کبر مدار ہیچ در دل ہوسے　　کز کبر بجائے نہ رسید است کسے
چوں زلف بتاں شکستگی عادت کن　　تا صید کنی ہزار دل در نفسے

یہ رباعی افضل کے علاوہ شیخ اوحد الدین کرمانی سے بھی منسوب ہے:

گر شہرہ شوی بہ شہر، شرّ الناسی   در گوشہ نشیں شوی ، ہمہ وسواسی
آں بہ کہ اگر خضر وگر الیاسی   کس نشناسد ترا توکس نشناسی

کچھ رباعیاں مولوی سید سلیمان صاحب ندوی نے بھی ایسی چنی ہیں، جو الحاقی ہیں۔ ان میں کی زیادہ تر ایسی ہیں، جو میں نے بھی ڈھونڈی ہیں، مگر بعض ایسی رباعیاں بھی ہیں، جو مجھے نہیں مل سکی تھیں، بلکہ وہ خالص سید صاحب کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً:

دردا کہ دلم بہ ہیچ درماں نرسید   جانم بہ لب آمد و بہ جاناں نہ رسید
در بے خبری عمر بہ پایاں آمد   افسانۂ عشق او بہ پایاں نہ رسید

یہ رباعی شیخ الاسلام عبداللہ انصاری کی ''مناجات'' اور'' منازل السائرین'' میں موجود بتائی گئی ہے۔

درد دل خستہ دردمنداں دانند   نے خوش منشاں خیرہ خنداں دانند
از سرّ قلندری تو گر محرومی   سرّ یست دریں شیوہ کہ رنداں دانند

بتایا گیا ہے کہ 'قلندری' کا لفظ خیام کے یہاں کہیں نہیں۔ اس لیے یہ رباعی ان کی نہیں ہوسکتی۔

باایں دوسہ ناداں کہ چنیں می دانند   از جہل ، کہ دانائے جہاں ایشانند
خرباش کہ از خری ایشاں بہ مثل   ہر گونہ خرست کافرش می دانند

یہ رباعی شیخ الرئیس بوعلی سینا کی بتائی گئی ہے۔

زاں مے خواہم کہ خرمی راسبب است   نامش مے وکیمیائے شادی لقب است
سرخ است چو عناب وزآب عنب است   آبے کہ بہ رخ برآتش آرد عجب است

یہ رباعی حسن باخرزی المقتول ۴۶۷ھ کی ملکیت بتائی گئی ہے۔

خیام تنت بہ خیمہ می ماند راست   سلطاں روح است ومنزلش دارفناست
فراش اجل ز بہر دیگر منزل   از پافگند خیمہ کہ سلطاں برخاست

یہ رباعی ڈاکٹر فریڈرک روزن نے دیوان مولانا رومی میں پائی ہے اور اس کا پہلا

مصرعہ اس طرح ہے: ''ایں صورت تن بہ خیمہ می ماند راست''۔

مجھے افسوس ہے کہ ژوکوفسکی نے، جو ۸۲/ رباعیاں اور دوسرے مستشرقوں نے جو اور کچھ رباعیاں زیادہ کر کے شائع کی ہیں، وہ میری نگاہ سے نہیں گزریں، ورنہ ان میں سے شاید اور کچھ ایسی رباعیاں ملتیں، جو میرے دسترس تجسس سے باہر تھیں، مگر پھر بھی ان بیاسی رباعیوں میں سے ۳۳/ رباعیوں کی نقل خیام میں دے دی گئی ہے۔ ان میں سے ۱۴/ رباعیاں ایسی ہیں، جو میری تلاش کردہ رباعیوں کے علاوہ ہیں۔ اگرچہ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ژوکوفسکی نے صرف شبہ اور اپنے معیار تنقید پر انھیں خیام کی ملک نہیں سمجھا یا اور کسی سے منسوب پایا۔ لہذا، بغیر کسی سند و حوالہ کے ہم صرف رباعیاں نقل کیے دیتے ہیں۔

مائیم نہادہ سر بہ فرمان شراب　　جاں کردہ فدائے لب خندان شراب
ہم ساقی ماحلق صراحی در دست　　ہم بر لب ساغر آمدہ جان شراب

....

چوں بلبل مست راہ در دستاں یافت　　روئے گل و جام بادہ را خنداں یافت
آمد بزبان حال در گوشم گفت　　دریاب کہ عمر رفتہ را نتواں یافت

....

ابر آمد و باز بر سر سبزہ گریست　　بے بادۂ ارغواں دمے نتواں زیست
ایں سبزہ کہ امروز تماشا گہہ ماست　　تا سبزۂ خاک ما تماشا گہ کیست

....

مہتاب بہ نور دامن شب بہ شگافت　　مے خور کہ دمے چنیں نہ بتوانی یافت
خوش باش و براندیش کہ مہتاب بسے　　اندر سر خاک یک بیک خواہد تافت

....

حال گل و مل بادہ پرستاں دانند　　نے تنگ دلان و تنگ دستاں دانند
از بے خبری بے خبراں معذور ند　　ذوقے است دریں شیوہ کہ مستاں دانند

....

زاں پیش کہ نام تو زعالم برود
مے خور کہ چو مے رسد، زدل غم برود
بکشائے سر زلف بتے بند ز بند
زاں پیش کہ بند بندت از ہم برود

....

مے خور کہ زدل کثرت وقلت بہ برد
واندیشۂ ہفتاد و دو ملت بہ برد
پرہیز مکن ز کیمیائے کہ ازو
یکمن بہ خوری ہزار علت بہ برد

....

ہاں تانہ نہی برتن خود غصہ و درد
تاجمع کنی سیم سفید و زر زرد
زاں پیش کہ گردد نفس گرم تو سرد
بادوست بخور کہ دشمنت خواہد خورد

....

ایام جوانی و شباب اولیٰ تر
باخوش پسراں جام شراب اولیٰ تر
ایں عالم فانی چوخراب است بہ آب
ازبادہ درو مست وخراب اولیٰ تر

....

آں لعل در آبگینۂ سادہ بیار
واں محرم و مونس ہر آزادہ بیار
چوں میدانی کہ عالمی آمدہ خاک
بادیست کہ زود بگزرد بادہ بیار

....

کردیم دگر شیوۂ رندی آغاز
تکبیر ہمی زنیم برپنج نماز
ہرجا کہ پیالہ ایست ما را بینی
گردن چوصراحی سوئے آں کردہ دراز

....

درپائے اجل چومن سرافگندہ شوم
دردست اجل چو مرغ پرگندہ شوم
زنہار گلم بجز صراحی مکنید
باشد کہ بہ بوئے مے دمے زندہ شوم

....

افتادہ مرا بسامئے و مستی کارے　　خلقم بچہ می کند ملامت بارے
اے کاش کہ ہر کدام مستی کردے　　تا من بہ جہاں نہ دیدمے ہشیارے

....

شمع است و شراب و ماہتاب اے ساقی　　شاہد بنی چو لعل ناب اے ساقی
از خاک بر آرا این دل پر آتش را　　بر باد مدہ بیار آب اے ساقی

جس قدر رباعیاں پیش کی گئی ہیں، وہ اتنی ہیں کہ ایک سات آٹھ سو کے مجموعے میں سے اگر اتنا حصہ نکل جائے تو پھر بقیہ پر کسی صورت سے اعتبار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ اس شخص کی ہیں، جس سے پورا مجموعہ منسوب ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کے بعد اگر یہ کہہ دیا جائے کہ خیام نے اپنے معاصرین یا متقدمین کی رباعیوں پر مشتمل ایک مجموعہ جمع کیا تھا اور اس میں کچھ شاید اپنی رباعیاں بھی شریک کردی تھیں یا اپنی بالکل نہیں تھیں، تو اس پر بحث کرنا ہٹ دھرمی سے زیادہ نہیں۔ اس کے حسب ذیل وجوہ ہو سکتے ہیں:

خیام کے رباعی گو ہونے کے قدیم سے قدیم گواہ بھی جرح میں بیکار ثابت ہوتے ہیں۔ سب سے پہلا گواہ امیر عنصر المعالی کیکاؤس ہے، جس نے اپنے ''قابوس نامہ''، مؤلفہ ۴۷۵ھ میں شراب خوری کے آداب میں یہ کہہ کر کہ ''چنانچہ عمر خیام گفتہ...'' یہ رباعی پیش کی ہے:

اے دل حذر از مستی و مخموری کن　　وز ہمدمی رطل گراں دوری کن
از بادہ شفا خیزد و از مستی رنج　　توبہ ز شفا مکن ز مخموری کن

اس رباعی میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ یہ مروجہ اور موجودہ نسخوں میں نہیں پائی جاتی، نہ کوئی تذکرہ اس کا گواہ ہے۔ اس لحاظ سے گمان ہوتا ہے کہ عنصر المعالی نے کسی سے یہ رباعی خیام کے نام سے سنی اور اپنی کتاب میں درج کردی۔ کسی خاص صورت سے اس نے تحقیق نہیں کی۔ دوسرے یہ کہ شراب پینے کے آداب میں مجموعہ خیام میں اس سے اچھی اچھی رباعیاں موجود ہیں:

گر بادہ خوری تو با خردمنداں خور یا با صنمے سادہ رخے خنداں خور
بسیار مخور، ورد مکن، فاش مساز اندک خور و گہ گاہ خور و پنہاں خور

دوسری گواہی شمس الدین شہرزوری کی کتاب ''نزہتہ الارواح''، مولفہ ۵۸۶ھ۔ ۶۱۱ھ کی ہے۔ اول تو یہ کتاب خیام کی وفات ۵۱۷ھ۔ ۵۳۰ھ کے بہت بعد کی تالیف ہے اور اتنے دن میں ایک غلط بات بھی مشہور ہو سکتی ہے تو خیام جو بجائے خود ایک عالم و فاضل (اور ممکن ہے کہ شاعر) بھی تھا اور اس نے ہمارے خیال کے مطابق ایک مجموعہ رباعیات بھی جمع کیا تھا، اس کے لیے رباعی گو مشہور ہو جانا کون سی بڑی بات تھی۔ دوسرے یہ دو رباعیاں جو ترجمہ فارسی شہرزوری میں دی گئی ہیں:

گویند بہ حشر جست و جو خواہد بود واں یار عزیز تند خو خواہد بود
از خیر (۷) محض جز نکوئی ناید خوش باش کہ عاقبت نکو خواہد بود

....

از واقعۂ ترا خبر خواہم کرد وانرا بہ دو حرف مختصر خواہم کرد
با عشق تو در خاک فرو خواہم شد بامہر تو سر ز خاک بر خواہم کرد

مگر ان دونوں رباعیوں کا یہ حال ہے کہ پہلی رباعی ''تذکرہ ہفت اقلیم'' میں شاہ قاسم بن شاہ قوام الدین سے منسوب ہے اور کشکول بہائی میں سحابی سے نسبت دی ہے اور دوسری رباعی قطران بن منصور ترمذی سے منسوب ہے۔ شاہ قوام الدین کا سن وفات معلوم نہیں ہوا۔ اس پر بھی شہرزوری کی شہادت صرف سماعی ہی ہو سکتی ہے اور غلطی کا امکان کافی ہے۔

''مرصاد العباد'' شیخ نجم الدین دایہ میں بھی دو رباعیاں ہیں۔ یہ کتاب ۶۲۰ھ میں تصنیف ہوئی اور اس وقت خیام کی وفات کو ایک کافی مدت گزر چکی تھی۔ ''مرصاد العباد'' میں جو رباعیاں ہیں، وہ دونوں یہ ہیں۔ ان میں سے بھی ایک رباعی افضل کاشانی کی ہے۔ افضل کاشانی ۵۸۲ و بقولے ۵۹۲ میں پیدا ہوا۔

در دائرۂ کامدن و رفتن ماست انرا نہ بدایت و نہایت پیداست

کس می نزند دمے دریں عالم راست　　کایں آمدن از کجا و رفتن بہ کجاست

....

دارندہ چو ترکیب طبائع آراست　　آنرانہ بدایت نہ نہایت پیداست
گر زشت آمد پس ایں صورت عیب کراست　　ورنیک آمد خرابی از بہر چراست

عطا ملک جوینی نے تاریخ مولفہ ۶۵۸ھ میں یہ رباعی لکھی ہے اور حوالہ دیا ہے کہ سید عزالدین نسابہ نے مرو کے قتل عام کے میدان میں لاشوں کا شمار کرتے ہوئے اس رباعی کو پڑھا:

ترکیب پیالۂ کہ درہم پیوست　　بشکستن آں روا نمی دارد دست
چندیں سرو پائے نازنین از سر دست　　از مہر کہ پیوست وبکین کہ شکست

یہ رباعی بھی خواجہ نصیر الدین طوسی اور افضل کاشی سے منسوب ہے۔ نصیر الدین طوسی کی ولادت ۵۹۷ھ اور وفات ۶۷۲ھ میں واقع ہوئی۔ رہا سید عزالدین نسابہ کا قصہ، اس میں انھوں نے یہ نہیں کہا کہ یہ رباعی خیام کی ہے، بلکہ یہ قول مولف کا ہے کہ یہ رباعی خیام نے پڑھی تھی اور یہ مفید ثبوت نہیں ہے۔ اسی کتاب میں یہ دوسری رباعی بھی دی گئی ہے، جو اب خیام سے منسوب ہے، مگر مولف نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ لہذا، یہ بھی قابل اعتنا نہیں ہے۔

مے خور کہ تمن بسے سا خواہد بود　　خوش زی کہ تہی بسے سہا خواہد دید
زیں یک دم عافیت کہ داری برخور　　می داں کہ چمن چو ما بسا خواہد دید

اسی طرح جن تاریخوں میں حوالہ ہے، وہ خیام کے بعد کی اور بہت بعد کی ہیں، جب کہ ان کا مجموعہ ان کے نام سے سے منسوب ہو چکا تھا اور لوگوں کو یہ خیال بھی نہ تھا کہ یہ دوسری رباعیاں ہیں۔ اس پر یہ بھی قیامت ہے کہ ان کی وہ رباعیاں، جو ان کتب میں مندرج ہیں، دوسرے شعرا سے منسوب ہیں۔

جن رباعیوں کا ہم نے ذکر کیا، ان میں بعض ایسی بھی ہیں کہ وہ کسی دسویں یا

گیارہویں صدی کے شاعر سے منسوب ہیں، مگر لندن کے اس نسخے میں جو مشہور ہے یا برلن وغیرہ کے ان نسخوں میں، جو منسوب الیہ شاعر کے دور سے پہلے کے بتائے جاتے ہیں، موجود ہیں۔ جس سے گمان ہوتا ہے کہ مخطوطہ نسخے تاریخ کتابت کے بعد کے شاعر سے وہ منسوب ہو ہی نہیں سکتی، مگر ہمارے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے کہ ان نسخوں پر جو تاریخیں دے دی گئی ہیں، وہ درست نہیں ہیں اور وہ نسخے مصنوعی ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ خیام کے کلام کی قدردانی دیکھنے کے بعد یہ نسخے قدامت ظاہر کرنے کے لیے بنائے گئے ہوں اور آج ہم ایک تاریکی اور دھوکے میں ہوں۔ یہ نسخے معتبر جب ہو سکتے تھے کہ وہ انہی تاریخوں میں یا ان کے قریب جو ان پر درج ہیں خریدے بھی گئے ہوتے، ورنہ ایسی قلمی تاریخیں کوئی قابل اعتبار و استناد نہیں ہیں۔ خصوصیات سے جب کہ تذکرے ان کی تکذیب کر رہے ہیں۔ چنانچہ فریڈرک روزن کو جو ۷۲۱ھ کا لکھا ہوا نسخہ ملا، وہ اس کا اعتبار نہیں رکھتے اور کہتے ہیں:

> ''دریں کتاب از ہر چیز جالب توجہ تر تاریخ آن ست یعنی در آخر کتاب نوشتہ شدہ 'تمت الرباعیات ۷۲۱'۔ اگر صحت ایں تاریخ ثابت شود، متن ما باندازہ ۱۴۰ سال شمسی و یا ۱۴۴ سال قمری از نسخہ اکسفورڈ قدیم تر خواہد بود۔ ولی خط نستعلیق وخوب ماندن وکتاب صحت ایں تاریخ را مشکوک میکند۔''

اسی طرح اور جگہ بھی شکوک ظاہر کیے ہیں۔ فریڈرک روزن کا شک ایک اصولی، مگر ادنی بات پر مبنی ہے اگر ہم بیسوں تذکروں اور دیوانوں کو مقدم سمجھ کر اس شک کو پختہ کریں اور یقین کا درجہ دیں تو شاید گنجائش نکل آئے گی۔

انقلابات کا طوفان، ہم کو ذرا بھی متعجب نہیں ہونے دیتا، جب ہم دیکھتے ہیں کہ آج ایک مصنف کی مستقل کتاب کسی دوسرے مصنف کے نام سے مشہور ہو رہی ہے۔ اس کی

مثالیں اگر تلاش کی جائیں تو زیادہ تعداد تک پہنچیں گی، مگر دو چار کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ''تذکرہ رشحات'' ملا حسین واعظ کاشفی کے نام سے مشہور ہے، حالانکہ وہ ان کے صاحبزادے علی بن الحسین الواعظ الکاشفی کی ہے۔ مثنوی ''زادالمسافرین'' جو تصوف میں ایک مختصر جامع مثنوی ہے، ملا حسین واعظ کاشفی کے نام سے مطبع نول کشور میں چھپی ہوئی ہے، حالانکہ وہ میر حسینی سادات ہروی، مرید شیخ شہاب الدین سہروردی کی تصنیف ہے۔ 'ہفت بند' ملا محتشم کاشی کے نام سے مشہور ہے، دراں حالیکہ وہ حسن کاشی کا ہے اور ملا محتشم کا صرف مرثیہ ہے۔ مولانا رومی کا دیوان شمس تبریز کے نام سے مع تخلص کے دائر و سائر ہے۔ مخفی رشتی لاہیجانی کا اکثر کلام زیب النسا مخفی دختر شاہ اورنگ زیب عالم گیر سے منسوب ہے۔ چنانچہ یہ غزل تذکروں میں مخفی رشتی کے نام سے ہے، مگر زیب النسا کے دیوان میں بھی موجود ہے:

زسوزِ عشق تو زآنگونہ دوش تن می سوخت — کہ ہر نفس زتف سینہ پیرہن می سوخت

اور یہ بوالعجبی صرف یہیں تک کارفرما نہیں، شاہنامہ جس کو ابن الاثیر نے 'قرآن العجم' کہا ہے، اس میں ایک قول کے مطابق بیس ہزار شعر دقیقی کے شامل ہیں اور سب کا نہیں تو کچھ کا فردوسی نے بھی اعتراف کیا ہے، مگر کیا سوائے محققین کے عام پڑھنے والوں کو معلوم ہے کہ شاہنامے میں دقیقی کا بھی حصہ ہے اور اس کا سنگ بنیاد اسی کا رکھا ہوا ہے۔

میر تقی میر کی غزلیات کلامِ بسمل فیض آبادی میں یا بسمل کی غزلیں کلام میر میں موجود ہیں۔ سودا کے یہاں قائم کی ایک مثنوی ہے اور لیجیے میر کا یہ شہرۂ آفاق مطلع ''مجموعۂ انبساط گلدستہ نشاط'' منولال میں بالمکند حضور کے نام سے موجود ہے (۸) اور ممکن ہے کہ مولچند کے مجموعۂ کلام میں یہ پوری غزل شامل ہو:

یہ جو چشم پر آب ہیں دونوں — ایک خانہ خراب ہیں دونوں

اصل میں یہ شہرت کے اعجاز ہیں اور شہرت نے بیشتر ایسا کیا ہے کہ ایک کے سرمائے کا دوسرے کو مالک بنا دیا۔

ان سب باتوں کے بعد غلط رباعیات کو دیکھا جائے، جن میں بعض معنی سے معرّا،

بعض قوافی سے مبرا ہیں۔ بعض کے مصرعوں میں کوئی ربط نہیں، بعض کے مضامین مکرر ہیں، بعض میں الفاظ کا ادنیٰ تغیر ہے، تو ان کی تعداد بہت زیادہ ہے اور وہ کسی طرح خیام سے منسوب نہیں ہوسکتیں۔ مگر چونکہ ان میں معانی وغیرہ کی تشریح بے ربطیوں کی توضیح کی ضرورت پڑے گی اور اس کی وجہ سے یہ مضمون کم از کم اسی قدر اور ہوگا، اس لیے اس وقت اس کو ملتوی رکھ کر دوسری قسط لکھنے کی ضرورت ہوگی ورنہ یہ مضمون ایک کتاب کی صورت اختیار کر جائے گا۔

آخر مضمون میں یہ کہنا ضروری ہے کہ ابھی تلاش وتفتیش کا سلسلہ جاری ہے اور ہم عنقریب اور رباعیاں ایسی پیش کریں گے، جو دوسرے شعرا کی ہیں۔ فی الحال ہم اتنا بتا کر کہ خیام کے مجموعہ رباعیات میں کسی قسم کی گنجائش نہیں اور کس طرح کی رباعیاں اس کے مجموعے میں نہ ہونا چاہئیں یا بہ الفاظ دیگر خیام اگر رباعی گو تھا بھی تو اس کے طرز کلام سے کس قسم کا کلام مماثل ومشابہ نہیں ہے، وہ حسب ذیل ہے:

۱۔ شراب کا بیان اس کی رباعیوں میں سب سے زیادہ موجود ہے، مگر اس طرح سے کہ زیادہ سے زیادہ ایک مسلمان بھول کر یا از راہ خطا اس کا مرتکب ہو رہا ہے۔ اس کا تفقہ، اس کی ثقاہت، اس کا علم، اس کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ ایک رند لاابالی یا ایک کافر بیباک ہو کر عملاً نہ سہی قولاً ہی شراب کی طلب گاری کرے، جیسا کہ اس کے مجموعے میں اکثر اس قسم کی رباعیاں شامل ہوگئی ہیں۔

ابریق مے مرا شکستی ربی　　برمن در عیش راتو بستی ربی
برخاک بریختی مے ناب مرا　　خاکم بدہن مگر تو مستی ربی

۲۔ خیام ایک ظریف ہونے کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ اس کا بہر صورت اہل ہے، مگر اس کے ساتھ یہ ستم کہ اس کو فحاش بھی بنا دیا جائے گوارا نہیں ہوسکتا۔ ملاحظہ ہو، کیا خیام کی یہی شان ہوسکتی ہے، جو ذیل کی رباعیوں میں پائی جاتی ہے:

اے رفتہ و باز آمدہ بلہم گشتہ　　نامت زمیان نامہا گم گشتہ

ناخن ہمہ جمع آمدہ و سم گشتہ　　ریش از پسِ کون برآمدہ دم گشتہ

....

فاسق خوانند مردمانم پیوست　　من بے گنہم خیال شاں بیں کہ چہ ہست
برمن زخلاف شرع اے اہل صلاح　　جز خمر و لواطت وز ناچیزے ہست

۳۔ نہ وہ مفلس تھا اور نہ مفلسی کے خیالات کو نظم کرتا تھا، نہ اس سے اس کی امید ہو سکتی ہے۔ جیسے:

چوں ز آب و گل آفرید صانع مارا　　کردہ بہ غم زمانہ قالع مارا
پیوستہ ز مے مرا ہمیں منع کنی　　خود دست تہی بس است مانع مارا

۴۔ وہ قصیدہ گو شاعروں کی طرح بھٹئی یعنی مداحی سے اپنے دامن کو آلودہ نہیں کرتا۔ جیسے:

اے کردہ ز لطف و قہر تو صنع خدا　　در عہد ازل بہشت و دوزخ برپا
بزم تو بہشت است و مرا جرمی نیست　　چوں است کہ در بہشت رہ نیست مرا

۵۔ متغزلانہ شاعری اس کا نصب العین نہیں۔ لہذا، وہ فراقیہ رباعیاں نہیں کہتا یا حسن کے خارجی اوصاف کی طرف توجہ بھی نہیں کرتا، جیسے کہ یہ رباعیاں:

آں بت کہ دلم ز بہر او زار شدہ است　　او جائے دگر بہ غم گرفتار شدہ است
من در طلب علاج خود چوں کوشم　　چوں آنکہ طبیب ماست بیمار شدہ است

....

لعل تو مئے مذاب و ساغر کان است　　چشم تو پیالہ و شرابش جان است
آں جام بلوریں کہ ز مے خنداں است　　اشکے است کہ خون دل درو پنہاں است

....

بر روئے تو زلف را اقامت ہوس است　　سر فتنۂ روم را قیامت ہوس است
ابروئے تو محراب نشیں شد چشمت　　آں کافر مست را امامت ہوس است

اور جب یہ نہیں تو پھر حسن کے ظلموں کے گلے کیوں کرنے لگا ہے، جیسے:

روزے کہ بود اذ السماء انشقت   روزے کہ بود اذا النجوم انکدرت
من دامن تو بگیرم اندر عرصات   گویم صنما بای ذنب قتلت

الفاظ کے گورکھ دھندے اس کے مجموعہ رُباعیات کے شایان شان نہیں اور خیام کبھی اس قسم کی رباعیات نہیں کہہ سکتا، کیونکہ وہ متقدمین میں ہے اور متقدمین کے یہاں یہ آورد کی شان، یہ مراعات النظیر، یہ ضلع جگت نہیں ہوتا:

نفست بہ سگ خانہ ہمی ماندراست   جز بانگ میاں تہی از و ہیچ نخاست
و بہ صفت است خواب خرگوش دہد   آشوب پلنگ دارد و گرگ دغا است

اس کے مجموعے میں ناصحانہ رباعیاں بھی ہیں، مگر ان کا ایسا دل نشیں انداز ہے، جو ہر واعظ اور ناصح کے بس کی بات نہیں۔ اس عام انداز بیان کو اس کے طرز بیان میں دخل نہیں ہے:

درکوئے نیاز ہر دلے را دریاب   در کوئے حضور مقبلے را دریاب
صد کعبۂ آب و گل بیک دل نہ رسد   کعبہ چہ روی برود لے را دریاب

....

ہر گہہ کہ غمے ملازم دل شودت   یا قصۂ کارخویش مشکل شودت
حال دل دیگرے بہ باید پرسید   تا خوش دلی تمام حاصل شودت

وہ مذہبی عقائد کا عوام کی طرح ذکر نہیں کرتا اور نہ ان لوگوں کی طرح اپنے گناہوں کی آمرزش اور مغفرت کی دعائیں مانگنا اس کا شعار ہے، بلکہ جب تک حکمت وفلسفہ کی آمیزش اس میں نہیں ہوتی، اس وقت تک وہ کوئی بات منہ سے نہیں نکالتا:

ساقی قدحے کہ ہست عالم ظلمات   جز روئے تو نیست در جہاں آب حیات
از جان و جہاں و ہر چہ در عالم ہست   مقصود توئی و بر محمد صلوات

....

یک یک ہنرم بین وگنہ دہ دہ بخش　　ہر جرم (۹) کہ روزے حسبتہ للّٰلہ بخش
از باد فنا آتش گیتی مفروز　　ما را بسر خاک رسول اللہ بخش

....

اے دل مے ومعشوق مکن درباقی　　سالوس رہا کن و مکن زرّاقی
گر پیر احمدی خوری جام شراب　　زاں خوض کہ مرتضاش باشد ساقی

وہ دعائے مغفرت بھی کرتا ہے، لیکن اس طرح کہ معلوم ہو ایک حکیم اپنے لیے دعا کرتا ہے۔ وہ توبہ بھی کرتا ہے، مگر اس طرح نہیں:

اندیشۂ جرم چوب خاطر گزرد　　از آتش سینہ آبم از سر گزرد
لیکن شرطے است بندہ چوں توبہ کند　　مخدوم بہ لطف از سر آں در گزرد

یہ سب وہ چیزیں ہیں جن کی خیام سے امید نہیں، مگر آج اس کے نام نہاد مجموعے میں اس قسم کی بہت سی رباعیاں شامل ہیں، جن پر ایک مرتبہ گہری نگاہ ڈالی جائے گی۔ اس وقت اسی اختصار پر بس کی جاتی ہے۔

(سہ ماہی اردو، انجمن ترقی اردو، کراچی/اورنگ آباد، اکتوبر ۱۹۴۱، ص۔۹۔)

حواشی وحوالہ جات

۱۔ خیام، مطبوعہ ۱۹۳۳ء، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ص. ۵، ۵۹۔۶۰

۲۔ بعض تذکروں میں ۵۱۸ ہجری پایا گیا ہے۔

۳۔ فاضل مضمون نگار نے ہر جگہ 'مولانا روم' لکھا ہے جیسا کہ عموماً اردو میں رائج ہے، لیکن درست مولانا رومی، بلخی یا صرف مولوی ہے۔ روم وہ دیار جہاں وہ مقیم ہو گئے تھے اور بلخ ان کی جائے پیدائش تھی۔ مرتب

۴۔ اصل۔ بآررم۔

۵۔ ن۔ موزون

۶۔ اصل۔ منیش

۷۔ خیز

۸۔ گلدستہ انبساط، مطبوعہ کلکتہ، تصحیح داتارام برہمن، ص. ۲۹۸

۹۔ اصل۔ حرم

☆☆☆

عمر خیام کا فلسفۂ زندگی

مولوی غلام الثقلین

تعلیم یافتہ شخص بہت کم ایسے نکلیں گے، جو عمر خیام کے نام سے ناواقف ہوں۔ اس کا نام دانایانِ فرنگ میں بھی ایسا ہی مشہور ہے جیسا کہ ایشیا میں، بلکہ شاید یہاں سے زیادہ مشہور ہو۔ مسلمان شعرا میں، بلکہ مصنفین میں سے بھی کسی کے کلام نے براہ راست ایسا اثر یورپ والوں کے خیالات پر نہیں ڈالا جیسا کہ اس شاعر کی بعض رباعیات کے ترجمے نے ڈالا ہے۔ شاید اِس عام دعویٰ سے ابن رشد کے فلسفہ اور تصانیف کو مستثنیٰ کرنا پڑے، مگر ابن رشد کی نسبت خیام کے نام سے تو ہمارے ملک کے باشندے بہت واقف ہو گے۔ تاہم ایسے آدمی کم ملیں گے، جنھوں نے اُس کے کلام کو بغور مطالعہ کرنا تو درکنار اُس کے کچھ حصہ کو بھی دیکھا ہو۔ ادھر اُدھر سے کسی کتاب میں کوئی رباعی دیکھ لی یا کسی اہل مذاق سے برمحل اُس کے چند شعر سُن لیے۔ عموماً یہی انتہا ہماری واقفیت کی ہے، مگر خیام کے کلام کو بلحاظ ایک فلسفہ کے دیکھنا اور اُس پر اِس طور سے نظر ڈالنا کہ وہ انسانی زندگی کی حکمت وغایت اور اِس عالم کے مبدا و جود سے بحث کرتا ہے۔ یہ تو بہت ہی کم لوگ کرتے ہیں، بلکہ اکثر آدمی خیام کے اور دوسرے اساتذہ بلکہ غیر اساتذہ کی رباعیوں میں بھی کوئی بڑا فرق نہیں سمجھتے اور ظاہر

میں نہیں تو دل میں تو ضرور متحیر ہوتے ہیں کہ اہل یورپ میں اُس کی اس قدر کیوں شہرت ہے۔ہم نے بعض اہل ملک کو کہتے سنا اور یہ سن کر اُن کی ناسمجھی پر زہر آمیز تبسم کیا کہ انگریز ''الف لیلہ'' کی اس قدر تعریف کرتے ہیں، ہمارے دیگر قصوں کا ترجمہ سُنیں تو اُن کو معلوم ہو کہ ''الف لیلہ'' کی کچھ بھی حقیقت نہیں۔ جناب وہ دیگر قصے کون سے ہیں؟ جواب ملا کہ سب سے عجیب وغریب کتاب ''بوستانِ خیال'' ہے۔اُس کو غیر قومیں پڑھیں تو ہمارے قصہ نویسوں کا تبحر معلوم ہو۔

خیر ''الف لیلہ'' تو ایشیا میں ایسی کتاب ہے، جس اول کا کوئی ثانی یا ثالث پیدا نہیں ہوا، اس لیے ہم اُس کو خیام کے کلام سے تشبیہ نہیں دے سکتے، کیونکہ ایشیا میں اور خاص کر ایران میں بہت سے وہی خیالات جو خیام کے ہیں، دیگر شعرا نے نہایت آب وتاب اور شاعرانہ لطافت اور لفظی نزاکت سے بیان کیے ہیں اور شاید یہی بڑی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں کے اہل مذاق نے اس شاعر کے روکھے پھیکے کلام کی طرف کم رُخ کیا ہے۔

شاعریت کیا چیز ہے؟ اس کو شاید کوئی ٹھیک طور پر بیان نہیں کر سکتا۔ کہتے ہیں کہ یہ ایک وجدانی امر ہے، مگر میں افسوس کے ساتھ اس امر کا اعتراف کرتا ہوں کہ شاعری کی شعری باریکیوں اور خوبیوں کو سمجھنے کی مجھ میں بہت کم قابلیت ہے۔ میں نے عمر خیام کے کلام کو روکھا پھیکا صرف اس وجہ سے کہہ دیا کہ مجھ کو حافظ اور سعدی کے اشعار سے جو لطف آتا ہے، وہ خیام کی رباعیوں سے میسر نہیں ہوتا۔ یہ خاصہ غالباً رُباعی کا ہے، کیونکہ ان مستند اور بےنظیر شعرا کی رباعیوں میں بھی وہ بات نہیں ہے، جو اُن کی غزلوں یا مثنویوں میں ہوتی ہے۔اسی واسطے کہا جاتا ہے کہ رباعی سے زیادہ مشکل کوئی کلام نہیں ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خیام سے بہتر کسی کی رباعیاں نہیں۔

بہر حال، اس امر کو میں صاف طور پر بیان کرتا ہوں کہ میں نہ تو خیام کی سوانح عمری بیان کروں گا، نہ اُس کی شاعری پر کسی قسم کی رائے دینے کی جرأت کروں گا۔ ہاں، اُس کے خیالات کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اِس شاعر کی سوانح عمری جس قدر کہ معلوم ہے، وہ

دلچسپ ہے اور عام تذکروں میں میسر۔ زٹرنبر کے سلسلۂ کتب میں اُس کی رباعیوں کا جوانگریزی ترجمہ مع اصل کے چھپا ہے، اُس میں جو کچھ بیان ہے، اُس سے زیادہ حالات کہیں میسر آتے معلوم نہیں ہوتے اور اگر ہو سکا تو اُردو میں اُس کے حالات بھی قلمبند کروں گا، مگر میں اس وقت اُس کے فلسفہ پر اُس کی ذات سے علاحدہ نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔

عمر خیام کیا کہتا ہے اور ہم کو زندگی کا کونسا فلسفہ سکھاتا ہے؟ زندگی کے فلسفہ سے کیا مراد ہے؟ آیا زندگی کے مختلف فلسفے ہیں؟ ان سوالات سے پہلے بتانا چاہئے کہ خود فلسفہ کیا چیز ہے؟ فلسفہ حقیقت میں عقلمندی کا نام ہے اور اصطلاح میں ظاہری مظاہرِ فطرت جو ہم کو نظر آتے ہیں، خواہ وہ عالم انسانی میں ہوں یا عالم ملکوتی میں، خواہ جانوروں اور پتھروں کی بابت ہوں یا ہادیانِ دین، بلکہ خود خالق کے افعال کے متعلق ہوں۔ ان مظاہراتِ فطرت کو دیکھ کر ان کی تہہ میں جانے اور جو کچھ حقیقت وہاں ہم کو معلوم ہو یا جو کچھ تہہ میں ہم کو نظر آئے، اس کے بیان کو 'فلسفہ' کہتے ہیں۔

ہم پتھر کو گرتا ہوا دیکھتے ہیں، آدمی کو غضبناک حالت میں مشاہدہ کرتے ہیں۔ ہم رحم کو اور ظلم کو، عقل کو اور بے عقل کو، وحشت کو اور تہذیب کو، اوہام کو اور مذہب کو، جانوروں کی عادات اور انسانوں کی خصلتوں کو، اشیا کی نسبتوں کو یعنی ریاضیات کی شاخوں کو دیکھتے ہیں۔ اُن پر غور کرتے ہیں، پھر غور کر کے اُن سے نتائج نکالتے ہیں۔ علاحدہ علاحدہ مظاہر کو جو ایک قسم کے ہیں، ایک عام خیال کے تحت میں لاتے ہیں۔ مختلف عام خیالات اور وسیع تصورات کو آپس میں وابستہ کر کے ان کی تہہ کو دیکھتے ہیں۔ یہ سب 'فلسفہ' ہے۔

الغرض، اس معنی میں جو ہزاروں علوم ہیں، وہ سب فلسفہ کی شاخیں ہیں اور ہر فعل جس سے علم حاصل ہو یا ادراک وسیع ہو فلسفی فعل ہے، مگر فرق یہ ہے کہ فلسفہ کلیات سے بحث کرتا ہے اور آخر میں جا کر صرف ذہنی اور خیالی اشیا اور مجموعوں سے واسطہ رکھتا ہے۔ میں اس کی ایک مثال عرض کرتا ہوں۔ فرض کیجیے کہ آپ پانی پیتے ہیں۔ یہ ایک مظہر (فنامنا) ہے۔ اب ایک شخص آپ کو ہمیشہ پانی پیتے دیکھ کر یہ سمجھے گا کہ آپ کی زندگی کے لیے پانی پینا

ضروری ہے۔ پھر چند منزلوں کے بعد وہ پوچھے گا کہ ضرورت کس کو کہتے ہیں اور یہ ضرورتِ فطری کو انسان سے (اب آپ کا خیال اس نے چھوڑ دیا) کیا واسطہ ہے؟ انسان ضرورتِ فطری کے ماتحت ہے یا ضرورت انسان کے تحت میں ہے؟ پھر اگر وہ چاہے تو آپ کی زندگی کے متعلق غور کرے کہ زندگی کے لیے پانی ضروری شیے ہے تو زندگی کیا شے ہے؟ اس میں اور غیر زندگی میں کیا فرق ہے؟ زندگی کہاں سے آئی؟ خالص زندگی میں اور منفرد انسان کی زندگی میں کیا تعلق ہے؟ غرض کہ آدمی اسی طرح اپنی عقل اعلیٰ سے کام لیتا ہوا، اغراض میں سے اغراض نکالتا ہوا، اس تنگ زمین سے آسمان اول، بلکہ عرش سے بھی پرے جا سکتا ہے۔ اس قسم کے خیالات کو اولیات ما بعد الطبعیات یا فلسفہ کہتے ہیں۔ فلسفہ سے ایک قدم پیچھے ہٹے تو ہم سائنس یا علم کے دائرے میں آ گئے۔ غرض ہر دماغی فعل سائنس کے حدود میں داخل ہے اور سائنس کی غایت تک پہنچنے کے بعد آگے بڑھ کر (بشرطیکہ آگے بڑھنے سے ہمارے نزدیک کچھ فائدہ ہو اور ہم آگے بڑھنا چاہیں) فلسفہ کی اقلیم ہے۔

فلسفۂ زندگی کیا شے ہے؟ فلسفۂ زندگی وہ نظام خیالات اور نتائج کا ہے، جو ہم نے سب سے اہم عقدے اور سب سے مشکل مسئلہ پر غور کرنے کے بعد قائم کیا ہے۔ یہ عقیدہ ایسا سوال ہے کہ گھاس کھودنے والے سے لے کر شہنشاہ چین تک اور ہاٹنٹاٹ قوم کے وحشی سے لے کر افلاطون تک کے ذہن میں آتا ہے، یعنی یہ سوال جو کبھی نہ کبھی ہم سب کو ستاتا ہے اور جس کو اکثر لوگ تو ناقابل حل پا کر اور اپنے دماغ کو اس کے بار اٹھانے کا متحمل نہ سمجھ کر، نکال باہر کرتے ہیں کہ ہم کیا ہیں؟ کیوں ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کدھر جا رہے ہیں؟ ہم سے کیا فائدہ ہے؟ وہ گنبد لاجوردی اور یہ زندان خاکی، غرض یہ کل عالم کیا ہے؟ ہم جاگ رہے ہیں یا کسی خواب میں ہیں؟ اب جو کچھ گزر رہا ہے، ہمیشہ ایسا ہی رہے گا یا اور کوئی حالت ہوگی؟ غرض وجود عدم اور غایت و مقصد انسانی کے متعلق یہ سب بحثیں فلسفۂ زندگی کی بحثیں ہیں۔

کیا فلسفۂ زندگی ایک ہے یا مختلف ہیں؟ بے شک مختلف ہیں۔ یہاں پر ہم ان کی

تشریح بیان نہ کریں گے۔ کیونکہ ناظرین کو خیام کے خیالات کا زیادہ انتظار کرنا پڑے گا۔ اس لیے اس کے احترام کے لحاظ سے اس کے فلسفہ کا، جو دنیا میں کروڑوں آدمیوں کا ایمان ہے، بیان کیا جاتا ہے۔ ان خیالات کو ایک مسلسل نظام میں مرتب کر کے بیان کرنا تو مشکل ہے اور اس کے لیے بہت فرصت درکار ہے، مگر میں الگ الگ بہت سے سوالات کا، جو فلسفۂ زندگی کے بارے میں ہوتی ہیں، جواب دوں گا۔ بعد میں یہ ظاہر کروں گا کہ یہ سب آپس میں مل کر زندگی کے عقدوں کا ایک متحد الجنس اور مکمل جواب ہیں اور ان جوابات پر عمل کرنے سے آدمی زندگی کے ایک خاص نظام کا پیرو ہو جاتا ہے۔

آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ ''کوئی حل زندگی کے عقدہ کا نہیں ہے، مگر در حقیقت خیام کے سب خیالات کی اور نہ صرف خیام، بلکہ کل شعرائے ایران اور عموماً شعرائے متصوفین اسلام اور نیز بودھ اور شوپن ہیور کے مذہب اور فلسفہ کی ابتدا اسی دعوے سے شروع ہوتی ہے کہ ''زندگی کے عقدہ کا حل اس زندگی میں نہیں ہو سکتا۔ صحیح علم کا حصول محال ہے۔'' چنانچہ خیام اپنے اسکول کے ایک غور کرنے والے حکیم کی، بلکہ خود اپنی تصویر ان الفاظ میں کھینچتا ہے: ''میں نے ایک رند کو دیکھا، جو زمین پر بیٹھا تھا۔ نہ کافر تھا، نہ مسلمان، نہ اس کی دنیا تھی، نہ دین، نہ وہ حق کو جانتا تھا، نہ حقیقت کو، نہ اِس کی کوئی شریعت تھی، نہ کسی بات کا اس کو یقین تھا۔'' یہ کہہ کر وہ اہل ظاہر کی طرف خطاب کرتا ہے اور کچھ غم کے ساتھ پوچھتا ہے: ''دونوں عالم میں کس کا یہ جگر ہو سکتا ہے کہ عالم کے ناقابلِ حل عقدہ کا بوجھ اُس کے دماغ پر پڑے اور وہ اپنے دماغ کو غور و فکر میں مصروف کرے، مگر آخر کار اِس مایوسانہ نتیجہ تک پہنچے کہ کچھ بھی علم نہیں ہو سکتا۔''

رندے دیدم نشستہ برخنگ زمین نہ کفر، نہ اسلام، نہ دنیا و نہ دین
نے حق، نہ حقیقت، نہ شریعت، نہ یقین اندر دو جہاں کرا بود زہرۂ این ؟

اس کے بعد وہ صاف صاف ایک مقام پر کہتا ہے کہ ''ازل کے بھید، نہ تجھ کو معلوم ہیں، نہ مجھ کو۔ یہ دُنیا ایسی پہیلی ہے، جس کو نہ تو بوجھ سکتا ہے، نہ میں بوجھ سکتا ہوں۔ میں اور تم

تو پردے کے پیچھے (انجان پنے میں) باتیں کر رہے ہیں۔ جب پردہ اُٹھ گیا تو اس وقت نہ میں ہوں گا، نہ تو رہے گا:

اسرار ازل را نہ تو دانی و نہ من — این حرف معما، نہ تو خوانی و نہ من
ہست از پسِ پردہ گفتگوے من تو — چون پردہ براُفتد، نہ تو مانی و نہ من

دوسری جگہ کہتا ہے کہ ''جس چکر (زمانہ) میں ہمارا آنا جانا ہے، نہ اس کا آغاز ظاہر ہے، نہ انجام۔ کوئی شخص ٹھیک طور پر اِس بارے میں دعوی نہیں کرسکتا کہ یہ آنا کہاں سے ہے اور یہ جانا کہاں کو ہے۔''

دوری کہ درو آمدن و رفتن ماست — آنرانہ بدایت، نہ نہایت پیداست
کس می نزند دمی درین معنی راست — کین آمدن از کجاست، رفتن بکجاست

قریباً انھیں الفاظ میں طامس کارلائل نے اپنی مشہور کتاب ''سارٹر رسارٹس'' میں زندگی کے راز کے متعلق خیالات ظاہر کیے ہیں۔

> خیام نے اسی زندگی کے لانیحل عقدہ کے متعلق ایک رباعی لکھی، جس کا مطلب یہ ہے کہ ''کل ایک کوزہ، کوزہ گر سے شکایتاً پوچھ رہا تھا کہ مجھے تو کیوں بنایا کرتا اور کس لیے توڑتا ہے؟'' اسی طور پر جو لوگ علم کے مدعی ہیں اور زمین کے نیچے اور آسمان سے پرے کی باتیں بے تکلف بیان کرتے ہیں اور رازِ زندگی کی پوشیدگی ان کے دماغ کو متاثر نہیں کرسکتی۔ ان کے حق میں کہتا ہے کہ ''ایک گروہ شیخی سے دھوکے میں پڑ گیا۔ ایک گروہ حور و قصور کی جستجو میں رہ گیا، لیکن جب پردے اٹھ جائیں گے تو معلوم ہوگا کہ سب کے سب تیری گلی سے کوسوں دور جا پڑے ہیں۔''

قومی ز گزاف در غرور افتادند — قومی ز پے حور و قصور افتادند

معلوم شود چو پردہا بردارند کز کوئے تو جملہ دور دور افتادند

خلقت عالم کی نسبت ایک مسئلہ ہے، جو بہت سے غور کرنے والوں کو نہایت پسندیدہ معلوم ہوا ہے اور جو در حقیقت ایک نہایت خوشنما تھیوری یعنی اصول خیال ہے اور وہ یہ ہے کہ تمام انسان ایک پرتو ہیں۔ کسی نور کے اور قطرہ ہیں، کسی سمندر کے جو وطن سے یعنی ایک غیر فانی دنیا سے نکل کر اس دنیا میں بے سروسامانی میں پڑے ہوئے ہیں، مگر موت کے بعد وہ اسی الٰہی دریائے حیات یا سرچشمۂ نور میں مل جائیں گے۔ اس تھیوری کو بھی خیام تسلیم کرتا ہے، مگر کہتا ہے کہ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتی اور اسی طنز اور تعریض کے ساتھ جو شاعروں کو معاف ہے، خالق کو خطاب کر کے پوچھتا ہے کہ "جب تو نے اول ہی مجھ کو اپنے سے روشناس کیا تھا، تو آخر کار اپنے سے جدا کیوں کر دیا؟ اور اگر شروع سے تیرا یہ مقصد نہ تھا کہ مجھ کو (ہمیشہ کے لیے) چھوڑ دے تو دنیا میں سراسیمہ کیوں پھرایا؟

اول بخودم چو آشنا می کردی آخر ز خودم چرا جدا می کردی

چون ترکِ منت نبود از روزِ نخست سرگشتہ بعالم چرا می کردی

الغرض ان تمام مثالوں سے ثابت ہوا کہ عالم کا وجود اور زندگی کا عقدہ ایک سربستہ راز ہے، جس کے یہاں کھولنے کی توقع ہم کو نہ رکھنی چاہئے اور آئندہ بھی گو امید ہے، مگر علم نہیں کہ یہ عقدہ کھلے گا۔ اپنے فلسفہ میں علم حقیقی کے ناقابلِ حصول ہونے سے پتہ چلتا ہے، الٰہیات اور مابعد الطبعیات میں اس کے خیال یا اصول کا خلاصہ یہ رباعی ہوسکتی ہے:

کس را پسِ پردۂ قضا راہ نشد و از سرِ خدا ہیچ کس آگاہ نشد

ہر کس ز قیاسِ خویش چیزے گفتند معلوم نگشت و قصہ کوتاہ نشد

اب ہم دیکھ چکے ہیں کہ عالم کے راز، خالق کی ماہیتِ علم کے امکان کے متعلق خیام کے فلسفہ کی بنا کیا ہے۔ وہ جہالت محض سے پتہ چلتا ہے۔ یہاں تک سب حکما اور غور کرنے والے اس سے متفق ہیں۔ کنہ حقیقت خدا کی اور مظاہرِ فطرت کی بے شک کوئی نہیں جانتا۔ جن چیزوں کو ہم جانتے ہیں، مثلاً گھڑی کی رفتار، آگ، پانی میز وغیرہ کو۔ ان کی تہ میں اگر

غور کیجیے تو کچھ بھی نہیں کھلتا۔ ہم مادہ کو جانتے ہیں اور بعض کا قول ہے کہ مادہ ہی کو جانتے ہیں اور کسی شیے کو نہیں جانتے۔ اس لیے ان کو 'مادئین' کہتے ہیں۔ مگر ان صفات اور مظاہر کے علاوہ جو ہماری ہی نفس سے بذریعہ حواس کے محسوس ہو سکتے ہیں، آیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ کس طرح بے حس و حرکت مادہ ہیں اور دماغ انسانی میں تعلق پیدا ہو کر ہمارے ارادہ کی وجہ سے مادہ حرکت کرتا ہے۔ مثلاً ہم اپنے ہاتھ کو نقطہ (ا) سے نقطہ (ب) تک لیے جاتے ہیں۔ اس حرکت کو ہم بے شک دیکھتے ہیں، اس کے تعلقات اور نسبتوں اور جہات سے واقف ہیں۔ یہ بھی جانتے ہیں کہ فلاں طریقہ سے بازو کی حرکت قوائے انسانی میں سے آتی ہے، مگر یہ وہ حرکت فی نفسہٖ کس طرح پیدا ہوئی یا اس نے اپنے مبدا یعنی نفس سے نکل کر مادہ پر کس طرح اثر ڈالنا شروع کیا، اس سے ہم محض جاہل ہیں۔ الغرض، مادہ بھی بالکل ایسا ہی نامعلوم ہے جیسے روح یا دیگر اولیات اور مابعد الطبعیات کے مسائل، جن کے ماورائے فہم انسانی ہونے کو خیام نے بیان کیا ہے۔ نہ صرف خیام، بلکہ ماعرفناك حق معرفتك کے عالی رتبہ قائل سے لے کر عام خواندہ آدمی تک، ہر سمجھ دار شخص اس مسئلہ پر غور کرتا ہے تو بھی جواب دیتا ہے۔ الغرض فلسفہ میں علم کی ابتدا، علم کے ناممکن الحصول ہونے سے رکھی جاتی ہے۔ ہم اصل سے ناواقف ہیں۔ صرف اوپر کے رنگ اور مظاہر سے واقف ہیں۔

آورد باضطرابم اول بوجود جز حیرتم از حیات چیزے نفزود
رفتیم باکراہ ندانیم چہ بود زین آمدن و بودن و رفتن مقصود

لیکن گو عالم کا راز ہمارے لیے نہیں کھلا، مگر اس قدر معلوم ہے کہ زندگی ایک عقدہ ہے۔ یہ عالم ایک سربستہ بھید ہے اور ہم کو اس کا علم نہیں کہ کیا ہے۔ یہ منفی علم بھی اگرچہ کچھ نہیں، مگر بہت ہے اور اسی سوال کا پیدا ہونا اور اس ٹوہ کا ہم میں پایا جانا ہی ہمارے اعلیٰ مخلوق اور داناترنوع ہونے کی پوری شہادت ہے۔ گو ہم عالم بالا کے حالات نہیں جانتے، مگر ہماری عقل حواس کے ذریعے سے بیرونی عالم سے ہمیشہ متاثر ہوتی رہتی ہے۔ یہ اثر بے شک ہم کو معلوم ہیں۔ زندگی کو مجموعی نظر سے دیکھا جائے تو سب سے بڑا اثر اس میں تکلیف اور رنج

اوراس کے محسوس کرنے کی قابلیت کا ہے۔حیاتِ انسانی ایک بڑا آلۂ تکلیف ہے۔ یہ خیام کا خیال ہے، یہی بدھ کا خیال ہے، یہی تمام صوفیا اور جرمن کے پیسی مسٹ شوپن ہیور اور اس کے مقلدین کا فلسفہ ہے۔ یہ دنیا ایک مصیبت گاہ ہے، ساتھ ہی اس کے ایک بے وفا ساتھی اور ایک دھوکا ہے۔ کامل آرام اس میں ایک دم میسر نہیں۔ جو چیز خوشی کہلاتی ہے، وہ غم سے مخلوط ہے، بلکہ انجام اس کا یہی غم ہے چنانچہ خیام کہتا ہے، خوشی کی خواہش مت کر کہ اس عمر کا حاصل ایک دم (سانس) ہے۔ خاک کا ایک ذرہ ایک کیقباد اور ایک جمشید ہے۔ زمانہ کے حالات اور اس کی عمر کی اصل جو کچھ ہے، سو یہ ہے کہ وہ ایک خواب ہے، ایک خیال ہے، ایک فریب ہے اور ایک دام ہے:

شادی مطلب کہ حاصل عمر دمی ست　　　ہر ذرہ ز خاک کیقبادے و جمیست

احوال جہان و اصل این عمر کہ ہست　　　خوابے و خیالی و فریبی و دمیست

دوسری جگہ کہتا ہے، تجھ سے پہلے بہت سے مرد اور عورتیں ہوئی ہیں، جن سے زمانہ کی زیبائش تھی۔ جلد آ کہ تیرا تن خاک ہو جائے، کیونکہ تیری خاک پہلے بھی ہزار دفعہ تن رہ چکی ہے:

پیش از تو بسے مرد و بسے زن بودست　　　کافاق ز جملہ شان مزین بودست

زود آ کہ تن تو خاک گردد زیرا　　　خاک تو دگر ہزار رہ تن بودست

پھر اسی افسردہ قصہ کو دوسری طرح سے دہراتا ہے اور کہتا ہے کہ ''عدم کے پانی سے میرے بیج کو بویا ہے اور غم کی آگ سے میری روح کو بھڑکایا ہے۔ ہوا کی طرح جہان کے گرد ہر لحظہ پریشان اور آوارہ پھرتا ہوں۔ معلوم نہیں کہ میری خاک کو کہاں سے اٹھایا ہے:

از آب عدم تخم مرا کاشتہ اند　　　از آتش غم روح من افراشتہ اند

سرگشتہ چو باد دمبدم گرد جہاں　　　تا خاک من از چہ جائے برداشتہ اند

زندگی کی بے ثباتی اور آدمی کے لیے حقیقت ہونے کو اس سے بھی زیادہ غم انگیز طریقہ سے وہ ایک رباعی میں بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ''میں کل ایک کوزہ گر (یعنی کمہار

کے کارخانے میں تھا۔ میں نے دو ہزار کوزوں کو دیکھا کہ گویا بھی تھے اور خموش بھی۔ ان میں سے ہر ایک زبان حال سے مجھ سے کہتا تھا کہ کہاں گئے کوزہ گر اور کوزہ فروش۔ گویا ان کوزوں کی مٹی بار ہا کوزے بن بن کر بک چکی تھی جن کے اب بنانے والے موجود ہیں، نہ خریدنے والے، نہ بیچنے والے:

درکار گہ کوزہ گرے بودم دوش   دیدم دو ہزار کوزہ گویا و خموش
ہریک بزبان حال با من گفتند   کو کوزہ گر و کوزہ خر و کوزہ فروش؟

خیال کرنا چاہئے کہ ایسی باتوں کو سوچنے والے ہمیشہ ان خیالات اور تصورات میں مستغرق رہنے والے کی طبیعت کس قدر غم زدہ ہوگی۔ اس میں شک نہیں کہ جو حقائق خیام یا اس کے ہم مذہب حکما نے اس زندگی کے ایک مجموعۂ آلام و مصائب اور خوشی کی ناپائدار ہونے کے متعلق بتائے ہیں، وہ درست اور صحیح ہیں، مگر صرف ایک حد تک یعنی ان خیالات کو طبیعت میں کہنا اور ان کی طرف دل کو متوجہ کرنا، اسی حد تک جائز ہے، جہاں تک وہ لذات نفسانی میں منہمک ہونے سے مانع ہوں اور جہاں تک کہ وہ طبیعت کو پاک کریں، کیونکہ ہر غم اور غم آلودہ خیال درحقیقت انسانی طبیعت کو اسی طرح پاک کرتا ہے، جیسے آگ لوہے کو، بشرطیکہ اس غم یا سانحہ نے دل میں جگہ کرلی ہو، مگر اس مضمون پر زیادہ اصرار کرنا اور اس کو اس طرح بیان کرنا گویا ہم کو آرام اور خوشی کا حق حاصل ہے، یہ صحیح نہیں ہے "تجھ کو کونسا حق پہنچتا ہے کہ تجھے غم یا تکلیف نہ ہو اور تو ہمیشہ رہے۔ کل تک تجھ کو موجود ہی ہونے کا کون سا حق تھا۔" (کارلائل)

اب جب لوگ اپنی فطرتی غمگین طبیعتوں سے ان حقائق انسانی کو دیکھتے ہیں تو انسان کی زندگی ان کو ایک عجیب مایوسانہ اور افسردہ کرنے والا نظارہ معلوم ہوتا ہے۔ حقائق فطرت یا بے ثباتی عالم کی طرف وہ جتنی زیادہ توجہ کرتے ہیں، اسی قدر عقلی اور اخلاقی مایوسی ان کی فطرتوں کو گھیر لیتی ہے۔ اب جو پیسی مسٹ ہیں، یعنی ہر چیز کو نفرت اور بیزاری کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، جیسے دیو جانسن یا شاپن ہیور وہ دنیا سے گوشہ نشینی کا سبق دیتے ہیں اور جو

زیادہ عملی اور دانش مندانہ طور پر ان چیزوں پر نظر ڈالتے ہیں، جیسے خیام وہ گوشہ نشینی اور جھگڑوں سے علاحدہ رہنے کو پسند تو بے شک کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ زندگی کو بے کار اداسی اور علیحدگی میں بسر کرنے کی بھی نصیحت نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ ستانے والے بھیدوں پر غور مت کرو۔ نامعلوم اور پوشیدہ اور ماورائے عقل امور وعقائد کے متعلق تکرار مت کرو۔ یہ چند روز جو باقی ہیں، ان کو ہنسی خوشی گزار دو۔ غم کو اپنے پاس آنے مت دو۔ قضاوقدر یا دوسرے لفظوں میں نیچر یا نظام عالم جو کچھ مصائب اور تکالیف تم پر ڈالے، تم بے پروائی کو ان کی سپر بناؤ۔ غرض فلسفہ کے ہتھیاروں سے مسلح اور اس کی شراب سے مست رہو تو زندگی کے اکثر رنجوں سے تم بچ جاؤ گے۔ دنیا کا جاہ وجلال، حکومت وعزت، شان و شوکت، ناموری و نیک نامی، سب ہیچ ہیں اور تنگ خیال اور بے وقوف آدمیوں کے اشغال ہیں۔ اصل الاصول یہ ہے کہ جہاں تک ہم کو فرصت اور وسعت ہے، آرام سے بسر کریں۔ آرام سے ان کی مراد جسمانی آرام ہی نہیں، بلکہ عقلی اور روحانی خوشی بھی ہے۔

یہ معلم جنھوں نے خود حقائق قدرت پر بے انتہا غور کیا اور آخر کار اس فکر و خوض کا نتیجہ سوائے سرگردانی کے کچھ نہ دیکھا، اپنے بنی نوع کو نصیحت کرتے ہیں کہ اس گرداب میں پڑنا کچھ بھی سودمند نہیں ہوتا۔ عقل کو اس چکر میں مت ڈالو اور ایسی عقل سے کنارہ کشی ہی کرو تو بہتر ہے۔ جتنے اشعار شراب کی مدح میں اور شراب کی طلب میں اور اس کے کمالات بیان کرنے میں خیام کے یہاں پائے جاتے ہیں، میں ان سب کے بھی معنی سمجھتا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ اکثر جگہ شراب اور مستی کے معنی انانیت اور غرور سے بے خودی کے لیے ہیں اور کہیں کہیں محبت الٰہی یا محبت انسانی کے نشے میں سرشار ہونے کا اشارہ بھی کیا ہے، مگر میرے نزدیک زیادہ تر ان اشعار سے وہی مطلب ہے جو ابھی بیان ہوا۔

اس بارہ میں کہ کسی شیے سے خوف نہ کرنا چاہئے اور جو کچھ مرد کے سامنے آئے جرأت سے اسے قبول کرے کہتا ہے اور خوب کہتا ہے کہ ''میں وہ شخص نہیں کہ فنا سے مجھ کو ڈر لگے دنیا ایک جگہ ہے جو خدا نے عاریتاً مجھ کو دی ہے جب اس کو سونپنے کا وقت آئے گا، میں

سونپ دوں گا:

جائیست مرا بعاریت داد خدا تسلیم کنم چو وقت تسلیم آید

موت کے متعلق جو دلیرانہ خیال ہم میں سے ہر شخص کو رکھنا چاہئے اور جس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں اس کو ان دو مصرعوں میں جس لطافت اور پاکیزگی سے اس نے بیان کیا ہے، اس سے بہتر ممکن نہیں اور حقیقت میں موت کا سچا فلسفہ یہی ہے کہ آدمی مثل ایک سپاہی کے ایک مقام پر متعین ہے، وہاں کھڑا ہے، کام کر رہا ہے۔ حکم ہوا کہ یہ جگہ چھوڑ دو، اس نے چھوڑ دی۔ اس کو اس کی کیا فکر کہ اب کہاں جانا ہوگا۔ پھر کہتا ہے کہ "طمع زمانہ سے کم کر (یعنی نہ کر) اور زمانہ کے نیک و بد سے پیوند توڑ دے، تو اس وقت تک خوش رہ کہ یہ دور آسمان بھی ٹوٹ جائے اور یہ چند روزہ دنیا بھی نہ رہے۔"

خوش باش تو آنچنان کہ این دور فلک هم بگسلد و نماند این روزے چند

پھر کہتا ہے کہ اگر دنیا وفا کرنا نہیں چاہتی تو ایسی کمینی دنیا میں مست و خراب ہی رہنا بہتر ہے:

چون عالمِ دون وفا نخواہد کردن در عالم دون مست و خراب اولیٰ تر

پھر غموں کو بھول جانے اور آئندہ کے افکار سے برکنار رہنے کی بابت ایک جگہ کہتا ہے کہ "بہتر یہ ہے کہ جام و شراب سے ہم دل خوش کریں اور جو زمانہ گزر گیا اور جو نہیں آیا، اس کو یاد نہ کریں۔ اس قید خانہ کی عاریتی زندگی کو ایک لحظہ کے لیے عقل کی قید سے آزاد کریں۔"

آن بہ کہ ز جام و بادہ دل شاد کنیم و از نامدہ و گذشتہ کم یاد کنیم
این عاریتی حیاتِ زندانی را یک لحظہ ز بند عقل آزاد کنیم

دنیا میں سب سے اعلیٰ حالت شکر گزاری کی یہ ہے کہ آدمی ضروری حوائج فطری کو مہیا کر سکتا ہو اور جہان کے غل و شور سے علاحدہ گوشۂ عافیت میں بیٹھا ہوا دنیا کی برائی اور بھلائی سے غافل زندگی کے چند روز گزار دے۔ اس نے اپنی ایک مشہور رباعی میں اسی حالت کی

طرف اشارہ کیا ہے کہ ''دنیا میں جس کے پاس روٹی کا آدھا ٹکڑا کھانے کو اور جھونپڑا رہنے کو ہو، نہ وہ کسی کی خدمت کرتا ہو، نہ کوئی اس کا خدمت گار ہو۔ یہاں غور کرنا چاہئے کہ تعلقات، جو تکلیف کی چیز ہیں، ان سے کیسی بیزاری ظاہر کرتا ہے کہ خادم و مخدوم ہونا، دونوں کو ایک ہی قسم کی مصیبت بتاتا ہے۔ اس سے کہہ دو کہ خوشی ہو کر رہ، تیری دنیا بہت اچھی ہے:

در دہر ہر آنکہ نیم نانے دارد — وز بہر نشست آشیانے دارد
نے خادمِ کس بود، نہ مخدومِ کسے — گو شاد بزی کہ خوش جہانے دارد

موت کے خیال کا اثر خیام پر اسی قدر ہوتا ہے کہ جب دنیا سے آخر کار چل بستا ہے، تو تمام عمر جہاں کی لذتیں چکھنی چاہئیں۔ وہ لذات جہاں کیا ہیں؟ بے خودی، یار دوستوں کے پاس مل کر بیٹھنا اور رنج و فکر کے بغیر زمانہ کو کاٹ دینا:

ہم آخر عمر رحلتت باید کرد — لذات جہان چشیدہ باشی ہمہ عمر

اب اس بات کا فیصلہ ہر شخص کی طبیعت اور خیال اور قوم کی عادت پر ہے کہ لذات جہاں اُن کے نزدیک کیا ہیں۔ عام آدمی لذتوں سے جو مراد لیتے ہیں، بودھ مذہب والے اور جوگی اور اصلی صوفی اور عیسائی اُن کو تکلیف اور رنج کا پیدا کرنے والا سمجھتے ہیں اور رہبانیت اور علاحدگی سے بسر کر دینا، جذبات کو مغلوب کرنا، خواہشوں سے آزاد اور تعلقات سے بری ہو جانا بھی ان کے نزدیک سب سے بڑی لذت ہے اور جسے لوگ 'درد' کہتے ہیں، اسی کا عادی ہونا اور اسی کو اچھا سمجھ لینا، یہ انتہائے کمال انسان کا ہے۔ ''اے دل! جب جہاں کی حقیقت ہی یہ ہے کہ وہ بے حقیقت اور عارضی ہے تو اس دراز رنج سے اتنے عرصہ تک کیوں رنج اٹھاتا ہے۔ اپنے تئیں قضا (یعنی قوانین اور نظام فطرت) کے حوالہ کر دے اور تکلیف سے صلح کر لے، کیونکہ جو قلم چل پڑا (علت و معلول کا سلسلہ جس نہج سے کہ جاری ہے) وہ تیرے واسطے لوٹ کر نہیں آئے گا۔''

اے دل چو حقیقت جہان ست مجاز — چندین چہ بری خواری ازین رنج دراز

تن را بقضا سپارد با درد بساز کین رفتہ قلم ز بہر تو ناید باز

اس مضمون کو خیام نے بار بار کیا ہے کہ موجودہ وقت سے جہاں تک ہو سکے، فائدہ اور لطف اٹھانا چاہئے۔ گذشتہ کا غم کھانا یا آئندہ کی فکر میں گھلنا، نادانی ہے اور یہی بڑا سبق ہے، جو خیام اور اپیکورس کی تعلیم میں مشابہت پیدا کرتا ہے۔ یہی امر ہے، جہاں خیام اور بودھ مت والے اور نیز جوگی اور صوفی بظاہر علاحدہ علاحدہ سڑکیں اختیار کرتے ہیں، مگر خیام کے فلسفہ میں اور اس سبق میں نہایت درجہ مطابقت ہے۔ غمِ عالم بے کراں ہے۔ عقل راز ہائے حیات کو حل نہیں کر سکتی۔ جسمِ ضعیف غم و رنج کے حملوں سے پاش پاش ہوا جاتا ہے۔ دنیا ایک قید خانہ ہے۔ خیام کہتا ہے کہ ان سب باتوں کو تسلیم کرو، مگر تمھاری تھوڑی سی عمر جو کچھ ہے، اس کو برباد مت کرو اور ان حالات پر صبر کرو اور باوجود ان سب نامناسب کیفیات کے اچھی طرح گزار دو اور ہرگز غم میں بسر نہ کرو۔ اس کا یہ کہنا کہ حال میں رہو اور پچھلے فسانے اور صعوبتیں فراموش کر دو۔ آئندہ کے نامعلوم اور فرضی مصائب سے اپنے تئیں پریشان مت کرو اور اس کے فلسفہ کے بالکل مناسب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

ساقی غم فردائے حریفان چہ خوری پیش آر پیالہ کہ شب میگذرد

ایک جگہ کہتا ہے کہ ''جو چیز نہیں آئی ہے، اس کی وجہ سے اپنا چہرہ زرد مت کرو اور جو آ گئی ہے، اس کے سبب سے دہشت زدہ نہ ہو۔ اس پست ہمت دنیا سے اپنا حصہ لے لے، اس سے پہلے کہ زمانہ اپنا خنجر کھینچ کر تجھ کو فنا کر دے:

از نامدہ ہا زرد مکن چہرۂ خویش وز آمدہ ہا آب مکن زہرۂ خویش
بردار ز دنیائے دنی بہرۂ خویش زان پیش کہ دہر برکشد دہرۂ خویش

غرض، دنیا اور انسان خیام کے نزدیک دو مقابل اور دشمن قوتیں ہیں۔ دنیا انسان کی زندگی کو دم بھر چین لینے نہیں دیتی اور اس پر ہر وقت حملہ کرتی رہتی ہے، مگر آدمی کو چاہئے کہ انھیں اگر گرد و پیش کے حالات کو اپنے مطابق بنا کر جس قدر عیش میسر ہو، ان سے حاصل کرے۔ میرے خیال میں اصولِ ارتقاءِ علم (ایوولیوشن) کے ماننے والے بڑے بڑے

مصنفین، جو ہمارے زمانہ میں ہیں، وہ بھی یہی کہتے ہیں جو نیشا پور کے اس خیمہ دوز نے آٹھ سو برس پہلے کہا تھا۔

پہلے جو کچھ بیان ہوا ہے، اس سے خیام کا علمی فلسفہ معلوم ہو گیا۔ اسی سے اس کے مذہبی فلسفہ کا قیاس کر سکتے ہیں اور اس کے اور حافظ کے خیالات میں سر مو فرق نہیں اور نہ صرف حافظ، بلکہ ہزاروں غور کرنے والے ایسے نتیجے تک پہنچے ہیں اور شک اور لاعلمی کو سب نے اپنا اعلیٰ ترین علم قرار دیا ہے۔ کامٹ، خیام، حافظ اور ہربرٹ اسپنسر سب کی رائیں مسائلِ مابعد الطبعیات اور عقائدِ ماورائے فطرت کے متعلق جو کچھ ہیں، ان کے الفاظ میں فرق ہو، مگر ان کے معنی ایک ہیں یعنی جو لوگ دعویٰ کرتے ہیں، ان میں سے کسی کو بھی علم نہیں، صرف ظنی فرضیات بیان کرتے ہیں۔ خیام کے الفاظ یہ ہیں کہ ''ایک قوم، مذہب اور دین میں متفکر ہے۔ ایک جماعت، علم اور یقین کے بارے میں حیرت زدہ ہے کہ یکا یک کمیں گاہ سے ایک ندا آئی کہ اے بے خبرو! راہِ راست نہ یہ ہے، نہ وہ'':

قومی متفکر اند در مذہب و دین ‌‌‌ ‌‌‌ جمعے متحیر اند در علم و یقین

ناگاہ منادے بر آمد ز کمیں ‌‌‌ ‌‌‌ کائے بے خبران، راہ نہ آن ست و نہ این

جس شخص کے ایسے خیالات ہوں گے، اس کے ذہن میں رسمی زہاد اور معمولی فقہا کے، جو اپنی خودی میں ایسے لپٹے ہوئے ہیں اور اپنے ہر لفظ کو آیت منزل من اللہ سمجھتے ہیں، کیا عزت ہو گی۔ ان پر اس نے بارہا اپنے کلام میں سخت سخت چوٹیں کی ہیں۔ ایک جگہ کہتا ہے اور خوب کہتا ہے:

پوشیدہ مرقع اند این خامی چند ‌‌‌ ‌‌‌ نارفتہ رہ صدق و صفا گامی چند

بگرفتہ ز طامات الف لامی چند ‌‌‌ ‌‌‌ بدنام کنندۂ نکو کامی چند

ایک جگہ اس آزادی اور بے ادبی کے ساتھ جو شعرائے اسلام میں عموماً اور شعرائے ایران میں خصوصاً جائز سمجھی گئی ہے، جس کے پردہ میں شعرا اور حکما نے جو فقہا کی تنگ خیالی اور لفظی نزاعوں سے سخت ناراض تھے، ان حضرات کو دل کھول کر صلواتیں سنائیں ہیں، خیام

نے فقہا کی طرف ان ہتک آمیز فقروں میں اشارہ کیا ہے:

اے خواجہ فقیہہ گر ترا ہست خبر — چندین ز حسد منگر بر اہل نظر
انسان ہمہ از صانع و صنعش گویند — تو از دمِ حیض و ز نجاسات دگر

اب تک جس قدر بیان ہوا، اس سے شاید یہ خیال پیدا ہوا کہ خیام کا کل فلسفۂ حیات، جب منفی ہے اور ہر امر کا جواب وہ یہی دیتا ہے کہ کسی کو معلوم نہیں۔ جب زندگی کو وہ ایسی غم انگیز اور دنیا کو ایسی تکلیف دہ شے سمجھتا ہے، تو آیا اس کے سوا بھی اس کے پاس کوئی دستور العمل ہے کہ ''قضا پر صبر کرنا چاہئے اور حتی المقدور زندگی کو آرام سے گزار دینا چاہئے۔'' اس میں شک نہیں کہ مکروہاتِ زمانہ سے برکنار رہنا بہت اچھا ہے، مگر اس سے اخلاق کے لیے کوئی ہادی اصول نہیں ملتا، لیکن اگر غور کرو تو یہ خیال کہ ''خیام کا کل فلسفہ منفی ہے اور اس میں زندگی کا کوئی دستور العمل نہیں'' صحیح نہیں ہے، کیوں کہ اسی نازک بنیاد پر خیام اور اس کے مقلدوں نے اخلاقی برتاؤ کے متعلق مکمل قواعد وضع کر لیے ہیں۔ خیام کا خیال یہ ہے کہ جس طرح آدمی کو لازم ہے کہ اپنی زندگی چین و آرام سے گزارے، اسی طرح وہ دوسروں کو بھی چین و آرام سے اپنے دن کاٹنے دے۔ اگر وہ چاہتا ہے کہ دوسرے اس کے کاموں میں خلل نہ ڈالیں، تو وہ بھی دوسروں کا مخل نہ ہو۔ غرض کہ سب آدمی حتی الامکان ایک دوسرے کا بار ہلکا کرتے ہیں۔ اس کے اخلاقی فلسفہ میں ریا سب سے بڑا گناہ ہے اور صدق و صفا نیکی کی جڑ ہے۔ آدمی کو انسان ہونے کے لیے لازم ہے کہ اپنا ظاہر و باطن یکساں رکھے، بلکہ باطن بہت بہتر رکھے، دل صاف، طبیعت سچی، خیالات پاک اور ایمان مضبوط ہو۔ ظاہری رسموں اور حکموں کی پابندی نہ بھی کرے تو کچھ ہرج نہیں۔ اپنے تئیں کچھ اعلیٰ سمجھنا اور گنہگاروں کو حقارت سے دیکھنا یہ سب سے بڑی حماقت ہے۔ جو کچھ آدمی یہاں کرتا ہے، اس کا سود و زیاں خود اسی کو پہنچتا ہے۔ خدا کی ذات ایسی مستغنی ہے کہ وہ قصوروں کی طرف دیکھتی بھی نہیں۔

وہ کہتا ہے کہ لوگوں کا برا چاہنے والا اپنے مقصد تک نہیں پہنچتا۔ اگر وہ دو دن کے

ساتھ ایک برائی کرتا ہے تو اس کے بدلے میں سو برائیاں اس تک پہنچتی ہیں۔ میں تو تیری بھلائی چاہوں اور تو میری برائی۔ تجھ کو بھلائی میسر نہ آئے گی اور مجھ تک برائی نہ پہنچے گی:

بد خواہ کسان ہیچ بمقصد نرسد　　　یک بد نکند تا بخودش صد نرسد

من نیک تو خواہم تو بخواہی بدمن　　　تو نیک نہ بینی و بہ من بد نرسد

پھر آخرت کی پرستش کے متعلق کہتا ہے کہ ''کل جب نیک بختوں کا حصہ تقسیم کریں گے تو ایک حصہ مجھ پریشان حال رند کو بھی دیں گے۔'' آپ کو باوجود رند ہونے کے کس طرح حصہ مل سکتا ہے؟ اس طرح کہ اگر میں نیک ہوں تو منجملہ ان کے میرا شمار ہو جائے گا اور بد ہوں گا تو ان کے ساتھ مجھ کو بخش دیں گے۔ اصل الاصول اخلاق یعنی دوسروں کو آزار نہ دینا، اس کو وہ نہیں بھولا۔ دوسروں کی تکلیف سے خوشی حاصل کرنا، یہ اس کے نزدیک انتہا درجہ کی حماقت ہے، لیکن وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ مستعدی سے دوسروں کے ساتھ نیکی ہمارا فرض ہے کیوں کہ وہ تو ایک منفی اخلاق اور دنیا سے علاحدہ ہونے کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ ایسی بات کیوں کہے گا، جس سے زندگی کی کشمکش میں پڑنے کی تاکید پائی جائے۔ وہ تو اسی کہنے پر قناعت کرتا ہے کہ ''اگر تو اپنی خوشی اسی میں سمجھتا ہے کہ کسی آرام سے بیٹھے ہوئے آدمی کو غم میں مبتلا کر دے تو اپنی عقل کا ماتم ساری عمر بیٹھ کر کیا کر اور مصیبت میں مبتلا رہ کیوں کہ تو نہایت احمق ہے'':

گر شادی خویشتن درآن می دانی　　　کاسودہ دلی را بغمے بنشانی

در ماتم عقل خویش بنشیں ہمہ عمر　　　پندار مصیبت کہ عجب نادانی

وہ آدمی کو اچھے کام کرنے اور عمر دنیا میں سرمایۂ آخرت جمع کرنے کی اعلیٰ درجہ کی نصیحت بھی کرتا ہے اور انسان کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ ''اے وہ کہ خلاصہ چار عنصر کا ہے، روحانی دنیا کی ایک بات سن لے۔ تو شیطان ہے، حیوان ہے، فرشتہ ہے اور انسان ہے، یہ تیرے اختیار میں ہے کہ جس پہلو کو دکھائے، ویسا ہی ہو جائے'':

اے آنکہ خلاصۂ چہار ار کانی　　　بشنو سخنے ز عالم روحانی

دیوی و ددی و ملک و انسانی　　　باتست هر انچه می نمائی آنی

میں اس کی اخلاقی تعلیم کی کئی مثالیں دے چکا ہوں۔ اب اس کی چند رباعیوں پر ان مثالوں کو ختم کرتا ہوں، جن میں اس نے گویا تمام فلسفۂ حیات کو کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

خواہی کہ ترا رتبت اسرار رسد　　　مپسند کہ کس را ز تو آزار رسد

از مرگ میندیش و غمِ رزق مخور　　　کین ہر دو بوقت خویش ناچار رسد

اس میں وہ آزاروہی خلق کی ممانعت کرتا ہے۔ یہی اخلاق فلسفہ کی جان ہے۔ پھر تیسرے مصرعہ میں کہتا ہے کہ موت سے نہ ڈر اور مثل مسیح کے سمجھتا ہے کہ معاش اور رزق کی پروانہ کر کیوں کہ تقدیر موجود ہے۔ یہ چیزیں اپنے وقت پر خود ہو جائیں گی۔ انکسار اور گوشہ نشینی کی تعلیم، تعریف و ثنا و شہرت سے بے اعتنائی کرنے کا سبق، وہ اس طرح دیتا ہے کہ ''رستے پر اس طرح چل کہ تجھے لوگ سلام نہ کریں۔ خلقت کے ساتھ ایسی سادگی اور خموشی سے بسر کر کہ تیرے لیے کھڑے نہ ہوں۔ اگر مسجد میں تو جاوے تو ایسا جا کہ تجھے آگے نہ بلائیں اور امام نہ بنائیں'':

در راہ چنان رو کہ سلامت نکنند　　　باخلق چنان زی کہ قیامت نکنند

در مسجد اگر روی چنان رو کہ ترا　　　در پیش نہ خوانند و امامت نکنند

ان شعروں کی سب سے بڑی لطافت یہ ہے کہ یہ آدمی کے دل کے چور کو پکڑ لیتے ہیں۔ جن جن چیزوں کی خاموش سے خاموش، پاک سے پاک آدمیوں کے دل میں خواہش ہوتی ہے، ان کو بیان کر کے وہ کہتا ہے کہ ان کی پروا مت کر۔ اس نے ایک بدیہی، مگر نہایت لطیف نکتہ زندگی کا بڑی خوبی سے ذیل کے شعروں میں بیان کیا ہے:

خواہی کہ ہمہ جہان ترا بہ پسندند　　　می باش بہ خوشدلی و خود را مپسند

میں سمجھتا ہوں کہ ایک سرسری واقفیت خیام کے فلسفہ سے ان چند رباعیوں کے پڑھنے سے ناظرین کو ہو گئی ہوگی۔ یہ ایک ناکامل اور سرسری خاکہ ہے اور میں نے مثال کے

طور پر اس کے بعض اشعار عرض کیے ہیں۔ معرفت میں، شراب کی تعریف میں، عشق و محبت میں، ظرافت اور طنز میں اور خالص شاعرانہ مضامین میں جو رباعیاں، اس شاعر کی ہیں، ان کو میں نے ہاتھ نہیں لگایا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس شاعر کے کلام سے خواہ وہ بظاہر کسی دوسرے مضمون کے متعلق ہو، فلسفیت کی بو نہیں جا سکتی۔ چنانچہ ایک جگہ وہ اپنے فلسفی ہونے کا انکار اور پھر آخر کے دو مصرعوں میں لطافت سے اقرار کرتا اور کہتا ہے: ''دشمن مجھے فلسفی غلط کہتے ہیں۔ خدا جانتا ہے کہ جیسا وہ کہتے ہیں، میں ویسا نہیں ہوں، لیکن جب دنیا کے اس غم خانہ میں آیا ہوں تو کیا اتنا بھی نہ جانوں کہ میں کون ہوں'':

دشمن بغلط گفت کہ من فلسفیم　　ایزد داند کہ آنچہ او گفت نیم
لیکن چو درین غم آشیان آمدہ ام　　آخر کم از ان کہ من بدانم کہ کیم

میں نے جو کچھ اس کے کلام سے سمجھا ہے، ممکن ہے کہ وہ غلط ہو۔ اس لیے میں آخر میں صرف ایک مثال اس بات کی دینا چاہتا ہوں کہ بدھ، خیام اور شوپن ہیور کا غم انگیز فلسفۂ حیات ایک ہی ہے۔ بدھ کہتا ہے کہ تمام خواہشات اور جذبات کو مار کر جیتے جی مثل مردہ کے ہو جانا چاہئے۔ نروان یعنی ادراک شخصی کا نہ رہنا اور بے نفس و بے روح ہو جانا، اس کے نزدیک اعلیٰ ترین انسانی معراج ہے۔ شوپن ہیور بھی صاف صاف یہی سبق سکھاتا ہے۔ ایک سال سے کچھ کم ہوا کہ میں نے مدرسۃ العلوم، علی گڑھ کی سوسائٹی ''اخوان الصفا'' کے لیے ایک مضمون شوپن ہیور کے خیالات کے نام سے بھیجا تھا، جس میں میں نے اختصار کے ساتھ اس فلسفہ کے پیدا ہونے کے بعض اسباب بیان کیے تھے۔ اب میں چند الفاظ شوپن ہیور کی کتاب ''کونسلز اینڈ میگزمس'' (Councils & maxims) کے مقدمے سے نقل کر کے یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ پیسی مسٹک (۲)(Pessimestic) فلسفہ جو کہ تصوف اور بودھ مذہب دونوں کی جان ہے، وہ خیام کے فلسفہ میں کس قدر نفوذ کر گیا ہے۔ شوپن ہیور کہتا ہے: ''جس شخص نے دل سے میرے فلسفہ کا مطالعہ کیا ہے اور جو اس وجہ سے جانتا ہے کہ ہماری کل ہستی بہتر تھا کہ نہ ہوتی اور یہ کہ اس سے بریت حاصل کرنا اور بیزاری رکھنا، اعلیٰ

ترین دانش مندی ہے۔ وہ زندگی کی کسی حالت یا کسی شئے سے امیدیں نہ رکھے گا۔ وہ کسی چیز پر اپنے جذبات صرف نہ کرے گا اور اپنے کسی کام میں اس کو ناکامی ہو تو تاسف نہ کرے گا۔ وہ افلاطون کے اس مقولہ کی صداقت محسوس کرے گا کہ اس دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں، جس کے لیے زیادہ تردد کیا جائے۔'' جرمن کے اس زمانہ کے بیزار دل حکیم کا یہ قول نیشاپور کے خیام کے اس قول سے کس قدر مشابہ ہے کہ ''جب اس دور و دراز مقام میں آ کر نتیجہ آدمی کی زندگی کا، سوائے دل کی تکلیف اور جان دینے کے نہیں ہے تو کیسے خوش ہے اس شخص کا دل، جو ایک دم بھی زندہ نہیں تھا اور کیسے آرام سے ہے وہ شخص، جو ماں کے پیٹ ہی سے پیدا نہیں ہوا۔''

یہاں تک پہنچ کر اب میں عمر خیام کے فلسفہ کا خلاصہ بیان کرتا ہوں، جتنا کہ میں نے اب تک عرض کیا ہے:

ا۔ عالم ایک راز سربستہ ہے، جس کی حقیقت ہم کو نہ معلوم ہے، نہ معلوم ہو سکتی ہے۔ جن لوگوں کو علم کا دعویٰ ہے، وہ غلط پر ہیں۔

۲۔ یہ زندگی پر از آلام و مصائب ہے۔ یہ دنیا ہیچ محض ہے۔ اس میں کسی چیز کا اعتبار نہیں۔ اس کے رنج و تکلیف سے آزاد رہنے کے لیے آدمی کو تعلقات کم رکھنے چاہئیں۔

۳۔ زندگی کو جہاں تک ہو سکے باوجود پیش آئے ناملائم حالات کے، ہنسی خوشی سے گزار دینا چاہئے۔ مکروہات سے آنکھیں بند کر لینا ہی سب سے بڑی مصلحت ہے اور غم و رنج کا مقابلہ سب سے بہتر طریقہ پر اس طرح ہو سکتا ہے کہ آدمی تقدیر پر صابر ہو کر حالت موجودہ کو قبول کرے۔

۴۔ اس وقت کو چین سے گزارنا چاہئے۔ گزشتہ اور آئندہ کی یاد اور فکر بے سود ہے اور اس سے مفت کی تکلیف ہوتی ہے۔ بقول حافظ:

ہر وقت خوش کہ دست دہد مغتنم شمار کس را وقوف نیست کہ انجام کار چیست

۵۔ مگر زندگی بسر کرنے میں اس بات کا خیال ہمیشہ رکھنا چاہئے کہ ہم اپنی خوشی کی

تلاش اور لاپروائی کی حالت میں دوسروں کو آزار نہ پہنچائیں۔ ہمیں اوروں کے ساتھ نرمی اور محبت کے ساتھ پیش آنا چاہیے۔

۶۔ برائیوں میں تکبر اور ریا کاری سب سے بدتر اور نیکیوں میں دل کی صفائی اور سچائی اور محبت سب سے اعلیٰ ہیں۔ دل صاف اور نیت اچھی رہے تو گناہ اور قصور بھی معاف ہو جاتے ہیں۔

۷۔ بہرحال، اس مختصر زندگی کو جس پر موت تلوار لیے کھڑی ہوئی ہے، بے کار نہ گزارنا چاہیے اور آرام و آسائش روحانی سے بسر کرنا، یہی اس کا ماحصل ہے۔

اس فلسفہ پر ایک تنقیدی بحث اور مفصل نکتہ چینی وقت اور لیاقت کا کام ہے اور پھر بحث بھی کی تو بقول خیام کے کیا فائدہ؟

آنہا کہ محیط فضل و آداب شدند ‏ در کشف علوم شمع اصحاب شدند
رہ زین شب تاریک نہ بردند برون ‏ گفتند فسانہ و دُر خواب شدند

(ماہوار رسالہ معارف، علی گڑھ، جلد۔۱، شمارہ۔۶، یکم دسمبر ۱۸۹۸ء، صفحات مسلسل۔۱۶۳۔۱۷۲)

حوالہ جات وحواشی

۱۔ یہ غالباً خیام پر اردو میں پہلا مقالہ ہے اور اس وقت شائع ہوا، جب ہندوستان میں خیام سے متعلق شورِ مغرب کا غلغلہ پہنچ رہا تھا۔ اس مضمون کے تمہیدی حصہ سے بھی اس بات کا عندیا ملتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اس مضمون کی ادبی و تاریخی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ مرتب

۲۔ پیسمسٹ اور آپٹمسٹ حکما کے دو گروہ ہیں، جن میں سے پہلا گروہ دنیا کو تکلیف اور برائی سے بھرا ہوا خیال کرتا ہے۔ دوسرا گروہ دنیا کی ہر چیز کو بھلائی اور نیکی پر مبنی سمجھتا ہے۔ صاحب مضمون

☆☆☆

رباعیات عمر خیام

کرنل بھولا ناتھ

زمانہ، ماہ ستمبر ۱۹۱۶ء کی اشاعت میں ایک مضمون بعنوان رباعیات عمر خیام درج تھا، جس میں مضمون نگار صاحب نے لکھا ہے کہ ''مشرق کے سوا مغرب میں بھی عمر خیام کے کلام کی خاص قدر ہوئی ہے اور اہل یورپ ان کی رباعیات اور دیگر کلام کے خاص طور پر مداح ہیں۔ لندن میں ایک خاص کلب عمر خیام کے نام سے قائم ہے اور اس کے ممبروں کا یہی شغل ہے کہ ہفتہ وار جمع ہو کر رباعیات پڑھا کرتے ہیں۔ چند روز ہوئے اس کلب کے ممبروں نے عمر خیام کی قبر کی مرمت کے واسطے یورپ میں چندہ کی اپیل کی تھی''، لیکن رباعیات کے سوا عمر خیام کا اور کوئی دوسرا کلام، نظم یا نثر ایسا موجود نہیں، جس کے مداح مشرق یا مغرب میں کسی جا پر پائے جاتے ہوں۔ البتہ ''زیج ملک شاہی'' اور ''الجبریا'' ان کی دو تصانیف ہارلم اور پیرس کے کتب خانوں میں کہیں کہیں پائی جاتی ہیں۔

مشرق میں خیام کے شاعرانہ شہرت کی یہ کیفیت ہے کہ 'خیام کلب' کی تحریک پر دولت انگلستان کے ایلچی نے ناصر الدین شاہ ایران سے درخواست کی تھی کہ خیام کی قبر کی مرمت کرادی جائے تو بادشاہ نے پوچھا کہ خیام کون تھا اور یہ سن کر اس کو تعجب ہوا کہ خیام

ایران کا ایک مشہور شاعر گزرا ہے۔

ہندوستان میں اساتذۂ قدیم میں خیام کا نام شامل نہیں ہے۔ سعدی، حافظ، جامی، نظامی، حکیم سنائی وغیرہ شعرا کے کے نام سے بچہ بچہ واقف ہے، مگر خیام کو کوئی نہیں جانتا۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ خیام بلند پایہ شاعر نہ تھا، بلکہ یہ کہ وہ مشاہیر شعرا میں نہیں گنا جاتا۔ گو اس گمنامی کی وجہ اور ہے جس کا ذکر بعد میں کیا جاویگا۔

مغرب میں خیام کی شہرت فٹز جیرالڈ (۱) کے ترجمہ کے سبب سے ہوئی ہے، ورنہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ مشہور مغربی مستشرقین میں سے شاذ و نادر کوئی ایسا علامہ ہوگا، جو خیام کے کلام کو کماحقہ سمجھ سکتا ہو۔ چہ جائے کہ معمولی علم دوست اصحاب یکجا ہو کر کوئی کلب بنالیں اور خیام کی رباعیات کو بیٹھ کر پڑھا کریں۔

اس کا ثبوت یہ ہے کہ مغربی علما نے خیام کے فلسفہ کو اپکیورین (Epicurea) قرار دیا ہے، جس کے معنی ہیں 'امروز خوش گذر کن و فکر فردا مکن'، حالانکہ خیام کی تعلیم ہرگز اپکیورین نہیں۔ فٹز جیرالڈ کی رباعیات عمر خیام کا ترجمہ نہیں، بلکہ خود ان کی تصنیف ہیں، جس پر خیام کے خیالات کا بہت گہرا رنگ چڑھا ہوا ہے۔

سب سے پہلے مغربی مستشرقین میں سے چاکاوسکی نامی ایک روسی مصنف نے رباعیات کا ترجمہ کیا ہے۔ اس کے بعد ایلچی دوات فرانس نے اس کا ترجمہ کیا۔ ان ترجموں کو دیکھ کر پروفیسر کاول نے چند رباعیات کا انگریزی ترجمہ کر کے فٹز جیرالڈ کے پاس بھیجا۔ فٹز جیرالڈ کو یہ ترجمہ ایسا پسند آیا کہ اس نے فارسی پڑھنا شروع کر دی اور خیام، حکیم سنائی، مولانا رومی کی تصانیف وغیرہ پڑھ کر اور ان سب کے خیالات کو ملا جلا کر رباعیات لکھیں۔ مسٹر ہیرن ایلن نے نہایت تحقیق کے ساتھ فٹز جیرالڈ کی رباعیات کا مختلف شعرا کی تصانیف میں سراغ نکالا ہے۔

اس مضمون میں حضرت ا۔ ز لکھنوی صاحب فرماتے ہیں کہ: ''خیام نے رباعیات میں مے اور معشوق کا ذکر اکثر ملحوظ رکھا ہے اور بادی النظر میں وہ بالکل رند معلوم ہوتے ہیں،

مگر دراصل ایسا نہیں......تصوف کے دلدادہ حضرات واقف ہیں کہ خیام نے مے اور معشوق کا ذکر بطور استعارہ کیا ہے، مثلاً مے سے مراد حکمت و نصیحت اور معشوق سے مراد حسن ازلی یا پیرومرشد ہے''۔ میری رائے میں عمر خیام کے کلام کی تنقید کرنے بیٹھنا اور اس پر پیرائے قائم کر لینا راستی کا خون کرنا ہے۔ اس قسم کا موازنہ نہ صرف ادھورا اور خام ہے، بلکہ محض غلط ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مضمون نگار موصوف نے خیام کو ایک آنکھ بند کر کے پڑھا ہے اور جہاں پر پڑھا ہے، اس کو اچھی طرح سمجھا نہیں۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں آپنے چند رباعیات پیش کی ہیں، از انجملہ دو ملاحظہ ہو:

ا۔ ہنگام صبوح است و خروش اے ساقی	ما و مے و کوے میفروش اے ساقی
چہ جائے صلاح است خموش اے ساقی	بگذر حدیث زہد و نوش اے ساقی

اس کے معنی آپ یوں کرتے ہیں:

''یہ ہنگام صبح (مراد از پیری) ہے اے ساقی خروش میں آ، یعنی غفلت اور مستی شبینہ (ایام جوانی) پر افسوس کر اور خوب رو۔ دوسرے مصرعہ میں کہتے ہیں: میں ہوں اور میفروش (مرشد) کی گلی۔ مصرعہ ثالث میں فرماتے ہیں کہ خروش سے باز رکھنا صلاحیت کی بات نہیں ہے۔ اے ساقی خاموش رہ (خروش کے مقابل میں خموش کا لطف ملاحظہ ہو)۔ مصرعہ چہارم میں فرماتے ہیں کہ نمایشی زہد سے درگذر اور ایسی مے نوشی کر جس سے خروش پیدا ہو۔'' یہ معنی بالکل غلط ہیں۔ 'صبوح' کے معنی صبح نہیں۔ یہ لفظ 'صبوحی' ہے، جس میں سے 'یائے' ضرورت شعری کے سبب سے گرادی گئی ہے۔ اس کے معنی ہیں 'شراب' جو صبح کے وقت پیا کرتے ہیں، اسے 'خمار شکن' بھی کہتے ہیں، یعنی ایں ہنگام نوشیدن صبوحی است و وقت خروش است (واو عطف واقع ہوتی ہے)، ازیں جہت مارا باید کہ بنوشیم (۲) و بہ کوئے میفروش برویم۔ ایں وقت صلاحیت نیست لہذا صلاحیت مکن و خموش باش۔ از حدیث زہد درگذر و می نوش۔''

اس میں نہ تو کہیں پر پیر ہے نہ مرید اور نہ ہی پیری ہے اور نہ ایام جوانی۔

۲۔ قطرہ بگریست کہ از بحر جدائیم ہمہ	بحر بر قطرہ بہ خندید کہ مائیم ہمہ

در حقیقت دگرے نیست خدائیم ہمہ　　　لیک از گردش یک نقطہ جدائیم ہمہ

اس کے معنی ا.ز. صاحب نے لکھے ہیں کہ: ''قطرہ اس غم میں رو رہا ہے کہ وہ دریا سے جدا ہو گیا ہے (جدائی اس لحاظ سے کہ جب قطرہ میں ہوا بھر جاتی ہے تو وہ سطح آب پر جداگانہ حیثیت سے تیرتا پھرتا ہے)۔ قطرہ کی اس گلہ جدائی پر دریا ہنستا ہے کہ تیری ہستی کہاں ہے، جو کچھ ہیں ہم ہیں۔ مصرعہ ثالث مزید توضیح کے طور پر ہے یعنی دریا میں بجز دریا کے اور کوئی دوسری ہستی نہیں۔ حباب، موج، گرداب کی ہستی بالکل نقش بر آب ہے۔ مصرعہ چہارم مزید ثبوت کے لیے ہے۔'' یہ معنی بالکل لغو ہیں۔

دوسرے مصرعہ میں 'ما' کے معنی پانی ہیں۔ تیسرے مصرعہ میں جدا کی جگہ پر خدا ہونا چاہیے تو معنی یوں ہوں گے: قطرہ از بہ باعث جدائی از بحر گریان است و بحر بر گریہ وزاری قطرہ خندہ میکند و میگوید کہ گریہ تو معنی ندارد و چرا کہ ما ہر دو آب ہستیم یعنی یک جنس ہستیم۔ در حقیقت چیزے دگر نیست ما ہمہ خدا ہستیم، فقط از بہ باعث گردش یک نقطہ بجائے خدا جدا شدہ ایم یعنی نقطہ خائے بجائے بالا بودن از گردش پائین افتادہ است و از خدا جدا شدہ است۔ یہ مطلب معنوی ہے۔ اب اس رباعی کے ظاہری اور شاعرانہ پہلو ملاحظہ ہوں:

۱۔ قطرہ و گریستن کیسا موزوں واقع ہوا ہے۔

۲۔ ما (پانی) بحر اور قطرہ مل کر کیا خوبی دے رہے ہیں۔

۳۔ 'خدا' اور 'جدا' میں صرف ایک نقطہ کا ہیر پھیر ہے، ورنہ دونوں لفظ ایک ہیں:

بہ بین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا!

اب ہم چند اور رباعیات پیش کرتے ہیں، جن میں مے اور معشوق ہے، مگر ان سے حکمت اور نصیحت اور پیر و مرشد سے مراد ہرگز نہیں ہو سکتی:

۱۔ گر بادہ خوری تو با خردمندان خور　　　یا با صنمی سادہ رخے خندان خور

بسیار مخور و رو مکن فاش مساز　　　اندک خور و گہہ گہہ خور و پنہان خور

اس رباعی میں آپ ہدایت فرماتے ہیں کہ شراب کس ڈھنگ سے کس مقدار میں اور

کن کن حالتوں میں پینا چاہیے!!!

۲۔ من می خورم ومخالفاں از چپ وراست   گویند مخور بادہ کہ دین را اعداست

چوں معلوم شد کہ مے عدوے دین است   واللہ بخورم خون عدورا کہ رواست

گویند کہ خوردن مے خلاف دین است یعنی مے عدو دین است۔ من ازین جہت مے میخورم کہ خون خوردن عدو در دینِ مارواست۔

۳۔ یاقوت لب ولعل بدخشانی کو   آن راحت روح و راح روحانی کو

مے گرچہ در اسلام حرام است ولے   تو مے خور و غم مخور مسلمانی کو

اس کے معنی صاف ظاہر ہیں۔

۴۔ آن مے کہ خجستہ خضر دارد پاسش   او آب حیات است ومنم الیاسش

من قوت تن و قوت روحش خوانم   چوں گفت خدا منافع للناسش

اس رباعی میں آیت قرآن کی طرف اشارہ ہے: "ویسئلونك من الخمر والمیسر قل فیھا اثم کبیر ومنافع للناس۔"

۵۔ گویند بہشت وحور وعین خواہد بود   وانجا مے ناب و انگبین خواہد بود

پرکن قدح بادہ و بر دستم نہ   چوں عاقبت کار چنین خواہد بود

اس میں اشارہ ہے: "مثل الجنته التی وعد المتقون فیھا النھر من ماء آسن والنھر من ماءِ آسنِ والنھرٌ من لبن لم یتغیر طعمهٗ والنھر من خمر لذةٍ للشرابین۔"

۶۔ من میخورم وہر کہ چومن اہل بود   مے خوردن من نزد چنین سہل بود

مے خوردن من حق ز ازل میدانست   گر مے نخورم علم خدا جہل بود

اس رباعی میں ازلیہ مذہب کی طرف اشارہ ہے، جو اس بات کے قائل ہیں کہ ہر فرد بشر کے تقدیر میں جو ہوتا ہوتا ہے وہ قسام ازل نے روز اول سے اس کے لوح ناصیہ پر لکھ دیا ہے، جس میں ذرہ بھر بھی کمی بیشی ممکن نہیں تو اس صورت میں چونکہ میری قسمت میں شراب

پینا لکھ دیا ہے تو میں مجبور ہوں۔ اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی ایک اور رباعی ہے:

۷۔ از آتش ما دود کجا بود اینجا از مایۂ ماسود کجا بود اینجا
آنگہ کہ مرا رند خراباتی کرد این گنج خرابات کجا بود اینجا

....

۸۔ از من بر مصطفےٰ رسانید سلام وانگاہ بگوئید بہ تعظیم تمام
اے سید ہاشمی چرا دوغ ترش در شرع حلال است و مے ناب حرام

....

۹۔ از من بر خیام رسانید سلام وانگاہ بگوئید کہ خامی خیام
من کے گفتم کہ مے حرام است و لے بر پختہ حلال است بر خام حرام

مفصلہ بالا رباعیات سے کافی ثبوت مل سکتا ہے کہ 'مے' سے مراد حکمت اور نصیحت نہیں ہے، بلکہ 'مے ناب' ہے، جس سے سرور اور مستی پیدا ہوتی ہے۔

تصوف کے بارے میں عام طور پر مغالطہ کیا جاتا ہے۔ لفظ تصوف یا صوفیہ دو مذہبوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، جن میں آپس میں بعد المشرقین کا فرق ہے۔ اسلام کے اوائل ایام میں ایک فرقہ پیدا ہو گیا تھا، جس کو خلیفہ عمر کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ فاقہ مستی، زہد، تقویٰ، دن رات نماز پڑھنے، تسبیح و استغفار کو اسلام کا عصارہ سمجھتے تھے اور کسی قسم کے عیش و تن آسانی کو جائز اور روا نہیں رکھتے تھے۔ چونکہ یہ لوگ جفاکشی کے خیال سے موٹے کھسوٹے بالوں کی بنے ہوئے کپڑے (صوف) پہنا کرتے تھے، اس لیے ان کو 'صوفی' کہتے تھے۔ ان لوگوں کو اسلام کے جوگی یا بیراگی سمجھنا چاہیے۔ جب کہ صوفیہ کرام کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس فرقہ سے مراد لی جاتی ہے۔ ہمارے ملک میں رکن الدین، سلیم الدین، معین الدین، علاء الدین، محمد غوث داتا گنج بخش وغیرہ فقرائے کرام اسی مشرب کے لوگ گذرے ہیں۔ یہ لوگ پکے مسلمان تھے اور انھوں نے بہت سی تصانیف لکھ کر بڑا خاصہ لٹریچر کا ذخیرہ جمع کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور تصوف ہے، جس کا ذکر فرید الدین عطار،

حافظ، خیام، مولانا رومی، حکیم سنائی وغیرہ شعرا کی تصانیف میں پایا جاتا ہے۔ یہ ایک علاحدہ چیز ہے، جس کے اصولوں اور اسلام کے درمیان بنیادی فرق ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ یہ تصوف اور اسلام ایک دوسرے کے ضدین ہیں۔ نہ صرف اسلام بلکہ اور بہت سے مروجہ مذہب دو ہستیوں کو مانتے ہیں، ایک ہستی وجوب واجب الوجود ہے جو ذات واحد اور قایم بالذات ہے۔ اس ہستی کی نہ تو آغاز ہے نہ انجام۔ منجملہ اور صفات کے اس ہستی میں یہ بھی ایک صفت ہے کہ وہ خالق ہے اور عدم سے موجود پیدا کرتی ہے۔

دوسری ہستی ممکن الوجود ہے، جو نیست سے مخلوق ہو کر ہست بنتا ہے۔ مرور ایام سے پھر نیست ہو جاتا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ سمیٹک (۳) مذاہب یہودیہ، نصاریٰ اور اسلام کے پیرو کائنات کو حادث مانتے ہیں۔ چونکہ خدائے تعالیٰ نے ہم کو خلقت کیا ہے اور معدوم سے موجود کیا ہے، تاکہ نیرنگی کائنات کا تماشا دیکھیں اور لذت دنیوی سے بہرہ اندوز ہوں، اس سے (لیے) ہم پر واجب ہے کہ اس احسان کا شکریہ بطریق عبادت ادا کریں اور اس خالق کو اپنا معبود سمجھیں۔

اس کے برخلاف اصحاب تصوف فقط وحدت الوجود کے قائل ہیں۔ وہ ہستیاں نہیں مانتے تو چونکہ من وتو اور خدا ایک ہی ہستی ہے اور پیدا کیے جانے کا ہم پر احسان نہیں، اس لیے عبادت اور سجدہ ہم پر فرض نہیں اور اسی وجہ سے وہ کائنات کو قدیم بھی مانتے ہیں۔

یہ ایک ایسا بنیادی اصول ہے، جو تصوف کو دوسرے مذہبوں سے علاحدہ کر کے اس کو ان کے ضد میں کھڑا کر دیتا ہے۔ اسی باعث سے متصوفہ شعرا، صوفی اور زاہدان اسلام پر ہمیشہ طنز اور طعنہ کرتے رہتے ہیں۔ خیام لکھتے ہیں:

دل تنگ شوی یک جو کے بسنگ بخور — یا یک منکے بادۂ گلرنگ بخور
صوفی شدۂ ایں نخوری آن نخوری — در خورد تو سنگ است برر سنگ بخور

حافظ کا قول ہے:

صوفیان جملہ حریفند و نظرباز ولے — زین میان حافظ دل سوختہ بدنام افتاد

....

ایں خرقہ کہ من پوشم در رہن شراب اولیٰ — این دفتر بے معنی غرق مے ناب اولیٰ
ہر چند نگہ کردم بس عمر تبہ کردم — افتادہ خراباتی افتادہ خراب اولیٰ
من حال دل زاہد با خلق نخواہم گفت — کین قصہ اگر گویم با چنگ و رباب اولیٰ

وغیرہ۔

صوفی گل بچین و مرقع بخار بخش — این زہد خشک را بمئے خوشگوار بخش

اسلام ایک ایسا مذہب ہے، جو خدا کو واحد اور لاشریک ماننے میں یکتا ہے۔ خدا کی وحدانیت کے ماننے میں اس مذہب میں کسی قسم کی کمی بیشی یا رعایت کی گنجایش نہیں، بلکہ خود خدا کو واحد مانتا ہے اور دوسروں کو منوانا اپنا فرض سمجھتا ہے اور اس بارے میں برہان قاطع شمشیر سے کام لینے میں بھی دریغ نہیں کرتا۔ تو اسلام نے تصوف جیسے علانیہ کفر کو اسلامی دنیا میں کیونکر جیتا رہنے دیا؟ یہ وسعت خیالی اور فراخ دلی کے سبب سے نہیں، کیونکہ شمس تبریز، منصور اور حال میں قرۃ العین کی شہادت اس قسم کی دلیل کو رد کرتی ہے۔ اس کی وجہ ہمیں یہ معلوم ہوتی ہے کہ اول تو اس فرقہ نے علاحدہ طور پر کوئی مذہب قایم نہیں کیا۔ دوم۔ کسی نے علانیہ طور پر اپنے آپ کو اس فرقہ کا پیر یا استاد قرار نہیں دیا۔ سوم۔ اس فرقہ کا کوئی علاحدہ لٹریچر نہیں، جس سے اس کی بالذات ہستی کا ثبوت ملتا ہو، بلکہ علمائے متصوفہ نے اپنے خیالات کو اسلام، عشق، معشوق، مے اور بادہ کے رنگ رلیوں میں اس طور پر ملا جلا کر استعارہ اور کنایہ کی صورت میں بیان کیا ہے کہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اسلامی اصول سے کس مقام پر اس کا اختلاف ہے اور کس جگہ پر اتفاق، بلکہ شمس تبریز اور منصور کی مثال دیکھ کر بعض اصحاب نے بنیادی اصولوں کو بھلا کر اسلام اور تصوف کے درمیان پیر و مرشد کا مسئلہ اختراع کر کے رسول اسلام اور تعظیم قرآن کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا رومی کو اس نئے اسکول کا امام ماننا چاہیے۔

اس خیال سے تصوف کو اگر تحقیق کی نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ شروع میں

ایک سرے پر تو اسلام کھڑا ہے جو دو وجود کو مانتا ہے۔ 'کائن'، جو دائم وقائم بالذات وخالق ہے۔ دوسرا 'مکون'، جو مخلوق اور حادث ہے۔ دوسرے پر تصوف کھڑا ہے، جو فقط ایک ہستی کو مانتا ہے اور خالق ومخلوق، کائن ومکون میں تمیز نہیں کرتا اور کائنات یعنی وجود واحد قدیم مانتا ہے۔ ان دو غایات کے درمیان میں مختلف مدارج کے لوگ ہیں، جو وحدت الوجود کو بھی مانتے ہیں اور مسلمان بھی بنے ہیں۔ یہ لوگ 'صوفیہ' کہلاتے ہیں اور اپنے آپ کو مختلف ناموں سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ اصحاب اپنے دل کو تسلی یوں دے لیتے ہیں کہ وحدت الوجود کے معنی خدا کے ہیں اور اس بات کا علم ہو جانا عرفان ہے اور جس شخص کی ہدایت اور تعلیم سے یہ علم حاصل ہوتا ہے، وہ پیر ومرشد ہے۔ تصوف کے منازل شریعت، طریقت، حقیقت وعرفان انھیں حضرات کے اختراع ہیں۔ تصوف کے دو شعب مانے جاتے ہیں، ایک شعب فقط وحدت الوجود کا قائل ہے اور وجود واحد کے سوا دوسری کسی ہستی کو نہیں مانتا۔ اس کا اصول 'ہمہ اوست' ہے اور سراً وجہاراً اناالحق کہنے سے باز نہیں رہتا اور حق کے اظہار میں دار پر سر رکھنے سے نہیں چوکتا:

حق جان جہان است وجہان جملہ بدن — اصناف ملائیکہ حواسِ این تن
افلاک عناصر و موالید اعضا — توحید ہمین است دگرہا ہمہ فن

....

آن بادہ کہ قابل حیات است بذات — گاہے حیوان می شود گاہے نبات
تاظن نبری کہ ہست گردد معدوم — موصوف بذات اوست گر ہست صفات

دوسرے شعب والے وحدت الوجود کو تو مانتے ہیں، مگر بجائے 'ہمہ اوست' وہ 'ہمہ از وست' کے قائل ہیں۔ یہ فرقہ حلولیہ ہے، جس کے یہ معنی ہیں کہ مبداء فیاض میں سے نکل کر نور کی شعاع (نکل کر) عالم میں حلول کرتی ہے اور ذرات کائنات کو منور کرتی ہے۔ تجلیات ونیرنگیہائے مکونات اسی نور کا پرتو ہے:

عکس روئے تو چو در آئینۂ جام افتاد — عارف از پرتو مے در طمع خام افتاد

جلوۂ کرد رخش روز ازل زیر نقاب — عکسے از پر تو آن برخِ افہام افتاد
ایں ہمہ عکس مے ونقش مخالف کہ نمود — یک فروغ رخ ساقی است کہ در جام افتاد
غیرت عشق زبان ہمہ خاصان ببرید — از کجا سرِ غمش در دہنِ عام افتاد
پاک بین از نظرِ پاک بمقصود رسید — احوال از چشم دو بین در طمع خام افتاد

اب ہم تصوف کے دلدادہ اصحاب کی خاطر چند رباعیات پیش کرتے ہیں، جو مے ومعشوق کی مدد سے مگر پیرومرشد کی ہدایت کے بغیر متصوفانہ خیالات کو ظاہر کر رہی ہیں:

۱۔ دیشب زسر صدق وصفائے دل من — از میکدہ آن روح فزائے دل من
جامے بمن آورد و بگفتار کہ بخور — گفتم نہ حورم گفت برائے دل من

اور یہی حافظ کی زبان میں:

دوش دیدم کہ ملایک در میخانہ زدند — گل آدم بہ سرشتند و بہ پیمانہ زدند
شکر صد شکر میان من و او صلح فتاد — حوریان رقص کناں ساغر شکرانہ زدند
آسمان بار امانت نتوانست کشید — قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

....

۲۔ایں بادہ چو من عاشق زارے بودست — در بند سر زلف نگارے بودست
این دستہ کہ در گردن او مے بینی — دستیست کہ در گردن یارے بودست

....

۳۔در کارگہ کوزہ گرے رفتم دوش — دیدم دو ہزار کوزہ گویا و خموش
ہر یک بزبان حال با من میگفت — کو کوزہ گر و کوزہ خر و کوزہ فروش

....

۴۔ اے سوختۂ سوختۂ سوختنی — اے آتش دوزخ از تو افروختنی
تو کے گوئی کہ بر عمر رحمت کن — حق را تو کجا رحمت آموختنی

....

۵۔ دل گفت مرا علم لدنی ہوس است　　تعلیم مرا کن اگرت دسترس است
گفتم کہ الف گفت دگر ہیچ مگو　　درخانہ کسے ہست یکے حرف بس است

....

۶۔ این چرخ جفا پیشۂ عالی بنیاد　　ہرگز گرۂ کار کسے را نکشاد
ہرجا دلے دید کہ داغے دارد　　یک داغ دگر برسر آن داغ نہاد

....

۷۔ چنداں کہ زخود ہست ترم مست ترم　　ہرچند بلند پایہ ترم پست ترم
این طرفہ کہ اندریں مستی و ہوشیاری　　ہرچند بخود ہست تر مست ترم

....

۸۔ فرزین صنعتا کہ مست غمہات شدم　　از اسپ پیادہ جفاہت شدم
از بازی پیل و اسپ چوں در ماندم　　رخ بر رخ او نہادہ وفات شدم

رباعیات کا ایک اور پہلو ہے، جو عام طور پر پہچانا نہیں جاتا اور وہ یہ ہے کہ عمر خیام اگناسٹک تھا۔ اس کا خیال تھا کہ رازدہر کے رموز نہ تو آج تک کسی نے حل کیے ہیں اور نہ ان کا حل کرنا ممکن ہے، اس لیے ان کی عقدہ کشائی کی کوشش کرنا بے سود اور رایگاں ہے:

آغاز دوان گردن این درین طاس　　انجام خرابی چنین نیک اساس
سنجیدہ نمی شود بمکیال خیال　　پیمودہ نمی شود بمقیاس قیاس

....

تا بود دلم بہ عشق محروم نشد　　کم بود ز اسرار کہ مفہوم نشد
اکنوں کہ ہمی بنگرم از روے خود　　معلوم شد کہ ہیچ معلوم نشد (۴)

....

کس مشکل اسرار ازل را نکشاد　　کس یک قدم از نہاد بیرون نہ نہاد
من می نگرم ز مبتدی تا استاد　　عجز است بدست ہر کہ از مادرزاد

....

اسرار ازل را نہ تو دانی و نہ من   ایں حرف معما نہ تو خوانی و نہ من
ہست از پس پردہ گفتگوے من وتو   چوں پردہ بیفتد نہ تو مانی و نہ من

مگر ملحد اور کافر عمر خیام کو اس وجہ سے نہیں کہا گیا، بلکہ اس وجہ سے کہ رباعیات کے اندر اس نے خدا کو 'من وتو' کی طرح خطاب کیا ہے اور جیسا کہ 'ہمہ اوست' کے ماننے والے کو چاہیے خدا کو اور اپنے آپ کو مساوات سمجھا ہے:

ناکردہ گنہ درجہاں کیست بگو   آنکس کہ گنہ نکرد چوں زیست بگو
من بدکنم و تو بد مکافات دہی   پس فرق میان من و تو چیست بگو

....

ابریق مئے مرا شکستی ربی   بر من در عیش را بہ بستی ربی
برخاک فگندی مئے گلگون مرا   خاکم بدہن مگر تو مستی ربی

عمر خیام کی عدم شہرت کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ اس نے دوسرے شعرا کی طرح پیرومرشد کو لاکر 'ہمہ اوست' کے بلند پایہ مسئلہ کو ذلیل نہیں کیا۔

ہمارے خیال میں عمر خیام کے نقاد کیا مغرب میں کیا مشرق میں، جہاں پر غلطی کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ وہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ عمر خیام نے پہلے دل میں مضمون ٹھان لیا تھا اور پھر بعد میں بیٹھ کر رباعیات لکھ ڈالیں۔ جس طرح پر کہ ملٹن نے ''پیراڈائز لاسٹ'' یا ڈینٹی نے ''الفرنو'' لکھا۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ عمر خیام ایک عالی دماغ شاعر گزرا ہے، مگر شاعر معنی کا خلاق نہیں ہوتا، وہ معنی کو شاعری کا سہانا لباس پہنا کر مرغوب صورت میں پیدا کر دیتا ہے۔

ہر زمانہ میں اس کے مارل، سوشل، پولیٹکل حالتوں کے مطابق خیالات کا ایک بیت المال ذخیرہ پیدا ہو جاتا ہے اور ان مروجہ خیالات کی ایک ہوا بندھ جاتی ہے، جس سے ہر کہ ومہ سانس لیتا ہے۔ اس ہوا سے ہر کسی کے دل ودماغ کی تربیت اور پرورش ہوتی ہے اور جو خیالات دماغ کے اندر پیدا ہوتے ہیں، ان پر اس ہوا کا اثر موجود ہوتا ہے تو ان معنون

شاعر اپنے زمانہ کے خیالات کا ترجمان ہوتا ہے۔ ملٹن اور ڈینٹی کا زمانہ مذہبی زمانہ تھا اور ان شعرا نے مذہبی روایات کو نظم میں پیش کیا ہے۔ ٹینی سن کا زمانہ علمی اور سائنٹفک ترقی کا تھا، جس کا ترجمان ان میموریم ہے تو شاعر کو اپنے زمانہ کا بیرامیٹر سمجھنا چاہیے، جس کے کلام سے ہمیں زمانہ کی پستی اور بلندی خیالات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

شاعر کی طبیعت نازک واقع ہوئی ہے، جو تلاطم زمانہ اور حوادث ایام سے دن بدن اور گھڑی بہ گھڑی متاثر ہوتی رہتی ہے۔ اسی باعث سے کبھی تو وہ بوئے گل اور پیچ سنبل کی یاد میں بلبل نالاں کی طرح نواسنج ہوتا ہے اور کبھی اس کو فلک الافلاک کی سوجھتی ہے اور زحل اور مریخ سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ کبھی وہ ہجر یار میں خون جگر بہاتا ہے اور کبھی وصل کے مزہ اور بوس و کنار کی لذت کو شیریں گفتار اور دل لبھانے والے اشعار میں ادا کرتا ہے۔ یہی راز ہے کہ عمر خیام کی رباعیات کہیں پر تو رندانہ اور مستانہ ہیں اور کہیں پر فلسفیانہ ہیں۔ یہ رباعیات مختلف اوقات میں لکھی گئی ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی طبیعت کن کن اسباب سے متاثر ہوتی رہی ہے۔

بوسیدہ مرقع اند ایں خامے چند نارفتہ رہ صدق و صفا گامے چند
بگرفتہ ز طامات الف لامے چند بدنام کنندۂ نکونامے چند

(ماہنامہ زمانہ، کانپور، مئی ۱۹۱۷ء)

حواشی و حوالہ جات

۱۔ اصل۔ فٹس جیرلڈ
۲۔ اصل۔ می نوشیم
۳۔ اصل۔ سٹیمک، درست سامی ہے، جسے انگریزی میں Semitic کہتے ہیں۔ مرتب
۴۔ اصل۔ معلوم شد۔

☆☆☆

مشرق اور عمر خیام

برہان احمد فاروقی

ا۔ کسی شاعر کے کلام سے اس کے 'فلسفہ زندگی' پر ایک گہری نظر اور درست انداز نظر ڈالنے کے لیے اس کی سوانح کو بھی ایک نظر خواہ سرسری ہی کیوں نہ ہو دیکھتے جانا ضروری ہے۔

۲۔ یہ ایک فطرت انسانی ہے کہ ہر ایک شخص اپنے فلسفہ زندگی سے کسی نہ کسی وقت گریز ضرور کیا کرتا ہے، کیوں کہ یک رنگی مختلف عناصر سے پیدا کی ہوئی ہستی میں ہمیشہ کبھی نہیں رہ سکتی۔ اختلاف جو خمیر میں پڑا ہوا ہے، کسی طرح اپنی سرشت کو بالکل نہیں بھول سکتا۔ اس لیے کسی شاعر کے ہر شعر کو کسی خاص فلسفہ ہی کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہیے اور خصوصاً فلسفۂ لذتیہ اور افادیہ کو جو ہر ایک کا مطمح نظر اور فطرتاً نقطۂ نظر ہے، مگر ہم لوگ 'فلسفہ لذتیہ' سے جو خاص مفہوم سمجھے ہوئے ہیں، وہ کبھی نہ کبھی ضرور اپنے رنگ کو بدل دیا کرتا ہے۔ لہذا، جس کا فلسفہ زندگی 'لذتیہ' ہو، اس کے اشعار کو ایک ہی رنگ میں بیان کرنا تنگ نظری سے موسوم کیا جائے گا۔

۳۔ 'فلسفۂ لذتیہ' کے اپیکورس (Epicureus) نے چار اصول بتائے ہیں، مگر دوسروں کی انگوری بیلوں سے خوشہ چینی کے بجائے یہ بہتر ہوگا کہ اپنے ہی دفینہ سے جواہرات نکالیں۔ اس لیے عمر خیام کے 'فلسفہ لذتیہ' کو اپیکورس کے فلسفہ میں نہ تو جذب کرنا چاہیے نہ اس سے منطبق، بلکہ ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ رکھ کر تساوی توازن یا تساقط پر غور کرنا

چاہیے۔

۴۔ 'فلسفہ لذتیہ' کا یہ لازمی اثر ہے کہ اس پر عمل کرنے والا مادیات میں ڈوب کر اپنے حدود سے تجاوز کرتے ہوئے روحانیت کی ہتک پر اتر آتا ہے یا کم از کم اس کی اہمیت اس کی نظر میں بالکل گم، کم، یا مادیت کے برابر ہو جاتی ہے۔

۵۔ 'فلسفہ لذتیہ' میں غرق ہونے والے کا دامن نگاہ وسیع، خوش منظر بلکہ دل کش ہوتے ہوئے دوسروں کے واسطے جاذب نظر ثابت ہوا کرتا ہے۔ وفیہ تفصیل

۶۔ 'فلسفہ لذتیہ' پر عمل کرنے والا کسی نہ کسی وقت ضرور موجودات کی طرف پرواز کرتا ہے کیوں کہ مادیت کی قید اسے محسوس ہونے لگتی ہے اور دوسرے یہ کہ دنیا و مافیہا کی رنگینیاں چوں کہ نظروں کے سامنے سے بہت گزر چکی ہوتی ہیں، اس لیے ایک بڑی حد تک استغنائیت کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔

دنیا جب سے ترقی کرتے ہوئے ارتقاء کی کڑیاں کافی حد تک طے کر سکی۔ اس وقت سے لے کر آج تک جن اسباق کو اس نے پہلے دن یاد کیا تھا، آج تک بعینہ ان ہی اسباق کو یا تو دہرا رہی ہے یا تفسیر کر رہی ہے اور پھر تفسیر کی شاخوں میں سے بعض شاخوں کو پھونگلوں کے امتیازی نشان سے نواز چکی ہے اور بعض کو نہ ختم ہونے والی شب فرقت کی طرح دراز کرتی جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب تک دنیا کا یہ کارخانہ موجود ہے، کبھی اس کا سرا ہاتھ نہیں آسکتا۔ خیر ہمیں اس پر زیادہ غور کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ ہم بعض ان ہی اسباق پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں، جن کی شاخیں کسی آخری حد پر جا کر ختم ہو گئیں اور وہ دو شاخیں ہیں (بہت ممکن ہے اور بھی اس قسم کی شاخیں ہوں، مگر ہمیں ان سے مطلب نہیں) پہلی، نبوت کیوں کہ وہ اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ ہمارے روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکی۔ دوسری، 'فلسفہ افادیت' کیوں کہ یہ عمر خیام پر اپنے تمام پہلوؤں کو نچھاور کر چکا۔ جہاں تک میری نظر گئی ہے، میں کہہ سکتا ہوں کہ دوسرے محققین نے محض اصول پر فلسفیانہ بحث کرتے ہوئے وقت ضائع کیا ہے، مگر عمر خیام ہی ایک ایسی ہستی تھی، جس نے کسی پہلو کو

رباعیات سے باہر نہ رہنے دیا اور کمال یہ کہ ذوق شعریت کو ہاتھ سے نہ دیتے ہوئے۔ چنانچہ ہم خیال کرتے ہیں کہ اس کے واسطے کسی ثبوت کی ضرورت نہ ہوگی اور اگر ثبوت کی ضرورت ہو تو خود رباعیات پیش کی جاسکتی ہیں۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ ہم مقصد کے عنوان میں (صرف) ان پہلوؤں پر (بھی) روشنی ڈالا کریں گے۔ اس وقت تو ہم صرف دو یا تین باتوں پر غور کرنا چاہتے ہیں:

ا۔ یورپ نے اس کی کیوں قدر کی؟

۲۔ یورپ اس کے فلسفہ کو سمجھنے کی کہاں تک قابلیت رکھتا ہے؟

۳۔ مشرق نے اس کی رباعیات سے کیوں اعتنا نہیں کی؟

۴۔ آج اس کی کیوں قدر و قیمت تسلیم کی جانے لگی؟

ا۔ یہ سوال کہ یورپ نے مشرقی ذوقیات میں سب سے زیادہ اس کو ہی کیوں پسند کیا؟ بالکل صاف بات ہے۔ مادیت کی گہرائیوں میں پوری قوت کے ساتھ ڈوب جانے کی وجہ سے اہل یورپ کے حسیات اور جذبات میں بھی مادیت اور اسفلیت کے کثیر اجزا اس قدر شامل ہو گئے ہیں کہ دنیا کی تمام باتوں کو حتی کہ خدا کو بھی اسی رنگ میں ڈبونا چاہتے ہیں اور 'فلسفہ لذتیہ' بھی چوں کہ اسی سے تعلق رکھتا ہے، اس لیے فطرتاً انھیں اس فلسفہ پر پر تول کر جھک پڑنا ہی چاہیے تھا۔

گو اس میں شک نہیں کہ جس طرح لذت تین قسم کی ہوتی ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ تین درجات رکھتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس، 'فلسفہ لذتیہ' کے بھی تین ہی پہلو نکلنے چاہیے تھے۔ ایک اور صرف ایک پہلو رکھنا واقعی دو پہلوؤں کا خون کرنے کے معنی رکھتا ہے، مگر بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے یہ 'افادیت' دنیا کے سامنے پیش کی اور جو لوگ اس کو دنیائے عمل میں لانا چاہتے تھے (جیسے عمر خیام) یا چاہتے ہیں، وہ سب کے سب مادیت ہی کے شیدا تھے، اس لیے اس فلسفہ کے دونوں پہلو نظری اور عملی مادیت کی 'میٹھی چھری' کے نیچے سے گردن نہ نکال سکے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، اپیکورس (جس نے 'فلسفۂ نظری' کی

بنیاد عملی پہلو پر بھی کچھ دھندلی سی روشنی ڈالی) سے لے کر عمر خیام (جس نے فلسفہ پر عمل کرتے ہوئے جتنی گھاٹیوں کا پیش آنا ضروری تھا بیان کر دیا) تک مادیت سے کوئی بھی بچ کر نہ جا سکا، بلکہ اس سے بھی ترقی کرتے ہوئے میں تو یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ آج اس پر عمل ہی وہ کرتا ہے، جو بڑی حد تک مادیات میں پھنسا ہوا ہو۔ حالاں کہ اس کے اصول جس طرح مادی لذائذ میں تیر بہدف ثابت ہوا کرتے ہیں، اسی طرح روحانیت میں بغیر نشانہ پر پہنچے نہیں رہ سکتے۔

بہر حال، یورپ نے چوں کہ 'فلسفہ لذتیہ' کا اصل مطمح نظر مادیت سمجھا تھا اور عمر خیام نے بھی اس فلسفہ کو ان کی حیوانی تمناؤں ہی کے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کا بڑا حصہ 'خیام کلب' کی طرف اپنی تمام کوششوں کے ساتھ آگے بڑھا اور اسے دنیا کے سامنے مادیت کے پر فضا باغ ارم کے اندر سبز پری اور رقاصہ سبز پری کے سبز لباس میں پیش کیا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ عمر خیام کی رباعیات پر یورپ کی اعتناء اس کے علاوہ کوئی دوسری وجہ نہیں رکھتی اور اگر ہے تو راقم اب تک اس کے سمجھنے سے قاصر ہے۔

۲۔ یورپ اس کے فلسفہ کو سمجھنے کی کہاں تک قابلیت رکھتا ہے؟ اس کا جواب سننے سے پہلے آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ کسی چیز یا کسی مضمون کو سمجھنے کی تین صورتیں ہوا کرتی ہیں:

(الف)۔ عبارت یا کتاب کا نفس ترجمہ یا مطلب سمجھ لینا۔

(ب)۔ مضمون کے چند پہلو پیش نظر ہو جانا۔

(ج)۔ کتاب کی تمام گہرائیوں میں ڈوب کر اس کے تمام وقائق اور تمام پہلوؤں کا روشن ہو جانا۔

(الف)۔ نفس مطلب یا فقط ترجمہ سمجھ لینا کوئی بات ہی نہیں، گو اس کے ساتھ حلوائے بے دود بھی نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ اپنے اس دعوے کی تصدیق کرتے ہوئے ایک رباعی (!) کا لفظ 'جرم' پیش کرتا ہوں، جرم کے عام معنی گناہ کے لیے جاتے ہیں، مگر وقت یہ

ہے کہ اگر ان ہی معنی میں اسے لیا جائے تو مطلب بالکل خبط ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس کے ایک اور معنی یعنی 'کسب و عمل' (۲) لینے پڑے، جس کے بعد مطلب بالکل صاف ہو جاتا ہے۔

(ب)۔ میرے نزدیک صرف چند پہلوؤں کے پیش نظر ہونے کی وجہ، اور وجوہات کے علاوہ ایک اور صرف ایک رنگ میں رنگا ہوا ہونا بھی ہے، کیوں کی قاعدہ ہے کہ جو جس رنگ میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے، اس کے ذہن میں ہر پیدا ہونے والا خیال اسی رنگ میں ڈوبا ہوا ہوگا اور یہ ایک ایسی کھلی ہوئی بات ہے کہ زیادہ غور کرنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔

اگر کوئی شخص مصنف ہی کے رنگ میں رنگا ہوا ہو یا کم از کم وہ اپنے رنگ کو علاوہ ضرورت کے کسی بات پر چڑھانے کی کوشش نہ کرے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس کے بہت سے پہلوؤں کو ان کے حقیقی رنگ و روغن کے لباس میں دیکھ سکے گا۔

(ج)۔ تمام اکثر و قائق کے معلوم ہو جانے کی صرف ایک صورت ہے، جو ابھی آپ کو بتائی جا چکی ہے جب تک کوئی آدمی مصنف ہی کے رنگ میں نہ ہوگا کبھی تمام پہلوؤں کو نہیں سمجھ سکتا۔

یہ معلوم ہو جانے کے بعد اب ہمیں صرف دو باتیں دیکھنا رہ گئیں:

(الف)۔ عمر خیام کا کیا رنگ تھا۔

(ب)۔ یورپ پر کونسا رنگ چڑھا ہوا ہے۔

(الف)۔ عمر خیام ایک مشرقی اور مسلمان شخص تھا۔ اس سے آپ خود خیال فرما سکتے ہیں کہ خواہ 'فلسفہ لذتیہ' کا کسی قدر شیدا کیوں نہ ہو، مگر اس میں سے روحانیت کی جھلک بالکل غائب نہیں ہو سکتی تھی اور خصوصاً جب کہ خود بھی مذہبی علوم میں کامل ہوتے ہوئے اسلامی عروج کی گود میں کھیل رہا ہو اور جب روحانیت کی روشنی بالکل گل نہیں ہو سکتی تھی تو ہمیں یہ سمجھنے کا پورا حق ہے کہ اس کا رنگ وہی رنگ تھا جو ایک روحانیت (خواہ کتنی ہی کم کیوں نہ ہو) رکھنے والے مسلمان اور اس مسلمان کا ہو سکتا ہے جو 'فلسفہ لذتیہ' کا قائل ہو، نہ کہ

اس 'نیچرسٹ' کا جو روحانیت کے لفظ ہی کو بے کار سمجھ کر لغت کی کتابوں سے نکالنا مناسب خیال کرتا ہو۔

لہذا، اگر کوئی دیکھنا چاہے کہ 'فلسفہ لذتیہ' نے اس پر کیا کیا اثرات ڈالے، کس کس قسم کے خیالات اس کے دل میں پیدا کیے، تو ان باتوں کو اس کے رنگ کا لحاظ رکھتے ہوئے دیکھنا چاہیے۔ ورنہ 'اصول فلسفہ' کے علاوہ رباعیات عمر خیام دیکھنے والے کو یہ نہیں معلوم ہوسکتا کہ خود عمر خیام پر اس نے کیا اثر ڈالا اور اگر کسی کو یہ بھی معلوم ہو گیا تو اس کی حقیقی اہمیت اور پوری اہمیت کبھی ذہن نشیں نہیں ہو سکتی اور یہی ایک (صرف) رباعیات پر غور کرنے والے کا نقص ہے۔

(ب) اس میں شک نہیں کہ یورپ نے اس پر بہت کچھ روپیہ کی بوچھار کی ہے، مگر افسوس ہے کہ ہم اپنی مشرقیت سے مجبور ہو کر یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ یورپ نے علاوہ جلد، سرورق، کاغذ، تصاویر تمدن قدیم (۳) اور خاموش چڑیوں کے، جو محض رونق دوبالا کرنے کے واسطے ہر رباعی پر پر تولے ہوئے گر رہی ہیں اور کون سے دقائق کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیا یورپ نے 'فلسفہ لذتیہ' کے کچھ نئے اصول دریافت کیے؟ کیا یورپ نے عمر خیام کے خیالات کا کوئی جدید کتابی فوٹوگراف پیش کیا؟ کیا یورپ رباعیات کے حقایق کو بے نقاب دیکھ سکا؟ کیا یورپ باوجود اس کدوکاوش کے، اہل مشرق جیسے جاہلوں (اپنے خیال میں) کی اس تحقیق تک پہنچ سکا، جو انھوں نے ''مثنوی مولانا روم'' اور ''دیوان حافظ شیراز'' ہی کے متعلق کی تھی اور کر رہے ہیں اور شاید کرتے رہیں گے۔ جب ان باتوں میں سے کوئی بھی نہیں، تو ہم نہیں سمجھتے کہ 'خیام کلب' نے جلد اور کاغذ سے دنیائے حقیقت شناس میں کسی انقلاب کی بنیاد ڈال کر اہل مشرق کو شرم سے اپنی گردنیں نیچی کر لینے پر مجبور کر دیا، بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر مشرق نے تھوڑے سے غور سے کوشش بھی کی تو دو ہی دن میں یورپ سے کہیں آگے نکل جائے گا۔ اس کے بعد میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ آخر یورپ کیوں نہ سمجھ سکا۔

یورپ آج مادی ترقی کرتے ہوئے اس 'بلند مرتبہ پر' پہنچ چکا ہے کہ اس کے ایک نظر انداز نہ ہو سکنے والے گروہ یا دوسرے الفاظ میں وہاں کے محققین کے نزدیک خدا وہی خدا ہو سکتا ہے، جو ہمیں ہماری ہی جیسی مادی اشکال میں نظر آ سکے۔ اس لیے آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ اس میں روحانیت کس حد تک سرایت کیے ہوئے ہوگی اور وہ روحانیت کے صرف مفہوم ہی کو کہاں تک سمجھ سکا ہوگا۔

جب آپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ یورپ روحانیت سے صرف اس قدر واقف ہے جیسے کہ ایک جاہل علم سے یا ایک بے وقوف عقل کے نام سے، تو اب ظاہر ہے کہ جو چیز جس قدر بھی روح سے تعلق رکھتی ہوگی، اسی قدر یورپ اس کی اہمیت سمجھنے سے قاصر ہوگا۔ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر یورپ روحانیت سے واقف نہ ہو یا ہو تو ایسی روحانیت سے واقف ہو، جو تاریکیوں کے سات پردوں میں پوشیدہ ہو تو کم از کم نفسیات انفرادیہ سے تو اچھی طرح واقف ہے۔ چنانچہ سائیکالوجی اسی غرض سے مدون کی گئی ہے تو میں عرض کروں گا اور یقیناً بالکل درست کہ ''چہ نسبت خاک را با عالم پاک''۔ یورپ کی سائیکالوجی اور روحانیت میں کیا تعلق، مگر افسوس ہے کہ میں ابھی ان دونوں کے فرقوں پر غور نہ کرنے پر مجبور ہوں۔ ہاں، اگر کوئی صاحب اس کا یقین کرنا چاہیں تو 'روحانیین' میں سے کسی کے سامنے نفسیات انفرادیہ کے نظریات پیش کر کے تصدیق کر سکتے ہیں، بلکہ میں تو خیال کرتا ہوں کہ اس کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ ہر شخص روح اور روحانیات کی علمی تحقیق کرنے پر بھی نہایت صاف طور پر سمجھ سکتا ہے کہ سائیکالوجی روحانیات سے شاید ایسی ہی نسبت رکھتی ہوگی جیسے کہ 'انسان' کو تشریح اعضاء یا وظائف الاعضاء سے اور ظاہر ہے کہ تشریح اعضا کا ماہر، انسان کی حقیقت 'جوہر فردہ' سے زائد نہیں جان سکتا، تو پھر نفسیات مغرب عمر خیام جیسے روحانی (خواہ کیسی ہی خراب روحانیت کیوں نہ ہو، ہے تو روحانیت اور یورپ کے عقول سے بالاتر روحانیت) شخص کے 'موثرات افادیت'، جو اس کی روح پر چوٹ لگا لگا کر کبھی کسی رنگ کی رباعی قوت متخیلہ کے سامنے پیش کرتے تھے اور کبھی کیسی رباعی۔ یورپ کس طرح ان کی اصلیت

واہمیت کو سمجھ سکتا ہے۔

۳۔ یہ سوال کہ مشرق نے رباعیات عمر خیام پر کیوں اعتناء نہیں کی، ایک ایسا سوال ہے جس کو میرے نزدیک ہر اہل مشرق ذرا سے غور پر سمجھ سکتا ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں میں صرف وہی تصانیف اور افکار دماغی قبول عام کا تمغۂ امتیازی حاصل کر سکتے ہیں، جن کی ترکیب وتقویم میں روحانیت کا عنصر غالب ہو، کیوں کہ مشرق اور خصوصاً مسلمانوں کے نزدیک حقایق اشیائے بسیط 'مجرد' اور روحانی ہیں، اسی لیے جس شے پر جتنا ترکب یا بالفاظ دیگر مادیت غالب ہوگی، اسی قدر اس کی حقیقت اور کنہ کا نظروں سے اوجھل ہو جانا ضروری ہے اور ظاہر ہے کہ فلسفیانہ دماغ ہمیشہ مادیت، عین، حقیقت اور کنہ کی گہرائیوں کو تلاش کرتا ہے۔ بدیں غرض، وہ کبھی ایسے نظریہ کو وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا (جو) سطحیت سے ہم کنار ہوتے ہوئے حقیقی تدبر اور معنی خیز قوت فکریہ کی زد سے باہر ہو چکا ہو۔

چنانچہ حال ہی میں ایک صاحب کا کتب خانہ دیکھتے ہوئے ایک کتاب ''تاج المدائح'' پر نظر پڑی جو سلطان مراد بخش کے حضور میں پیش کرنے کی غرض سے تصنیف کی گئی تھی۔ اس میں ایک موقعہ پر مصنف نے چند مقتدر شعراپر ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے، ہر ایک کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ عمر خیام پر بھی چند سطور سپرد قلم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ چوں کہ اس کی شاعرانہ زندگی کا خیمہ رشتہائے غور وفکر سے نہیں جکڑا گیا، اس لیے نہ قابل اعتماد ہے اور نہ اس کو کبھی قبول شہرت عام کی ڈگری حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ رباعیات عمر خیام کے مقبول نہ ہو سکنے کی اپنے ذہن کے اندر جو علت قرار دیئے ہوئے تھا، وہ کسی حد تک غلط نہیں کہی جا سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ 'فلسفہ لذتیہ' کے دقائق اور اس کے مختلف پہلو پیش کرنے میں عمر خیام کو بہت کچھ کامیابی حاصل ہوئی ہے، مگر ایک مسلمان فلسفی کے نزدیک جب کائنات ہی کوئی ہستی اور کائنات نہیں رکھتی تو پھر اس کی لذت اور پھر وہ بھی محض ذہنی فلسفہ لذت کیونکر وقیع نظروں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ یورپ مادہ پرست ہے، کیوں کہ اس کا ماحول نظری، سوسائٹی دل اور دماغ غرض کہ سب کچھ مادی ہے۔

اس لیے اگر 'فلسفہ لذتیہ' کی قدر کرتے ہوئے رباعیات پر کافی وقت اور توجہ صرف کرنے کی کوشش کرے تو بجا اور بالکل بجا ہے، مگر مشرق اور بلند نظر مشرق کو نہ رباعیات کی پرواہ اور نہ یورپ کے اعتناء سے سروکار۔ ہاں، اگر کچھ سروکار ہے تو اتنا کہ اس کے اضمحلال ذہنی اور نفس انفعالی کی کرشمہ سازیوں پر ایک متاسفانہ نظر ڈالے اور بس۔

مگر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب آج اور کل دونوں کا مشرق ایک ہے، تو پھر اس کی کیا وجہ کہ کل جس چیز کو مشرق اچھی نظر سے نہ دیکھتا تھا، آج وہی مشرق اس کو سر اور آنکھوں پر جگہ دینے کے واسطے تیار ہے۔ ہاں! بالکل درست۔ مگر کیوں؟ اس لیے کہ مشرق اپنی فلسفیانہ ذہنیت کو فراموش کرتے ہوئے مغرب کی برق وش ذہنیت سے متاثر ہوتا جارہا ہے اور نہیں سمجھتا کہ میں کون تھا اور کیا ہوتا جارہا ہوں۔ کاش! وہ اپنی اہمیت کو محسوس کرتا مگر نہیں انقلاب کبھی نچلا نہیں بیٹھتا۔ اس نے اگر ایک طرف دنیائے عمل میں کارگزاریوں سے قوائے اسلامیہ کو شل کر دیا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ کم از کم دنیائے علم ونظر ہی میں اس کو اہل بصیرت کے دوش بدوش کھڑا رہنے دے۔ نہیں، بلکہ انقلاب کی مشین کو دانہ کا ہر پہلو پیس ڈالنا چاہیے، ورنہ اس کے کل پرزوں میں خرابی محسوس کی جائے گی۔ میرا اس سے ہرگز یہ مقصد نہیں کہ مسلمانوں کو رباعیات عمر خیام کی طرف قطعاً توجہ ہی نہیں کرنا چاہیے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ ہر زر سرخ کو اپنے معیار ذہنیت پر پرکھ کر دیکھیں، ممکن ہے کہ دوسرے کی کسوٹی قریب نظر ہو اور آپ اس کے دام میں آکر پیتل کو سونا سمجھتے ہوئے خسارہ میں رہ جائیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ میرا اس قدر کہنا بھی قبل از وقت ہے، کیوں کہ ہنوز مشرق اور خصوصاً ہندوستان نے یورپ کے تتبع میں بھی کہربائیت دماغی کا صرف نہیں کیا ہے، بلکہ حضرت بوزنہ کی طرح بے سمجھے نقالی کی جارہی ہے۔ چنانچہ عمر خیام کی دو شروح جو آج تک ہماری نظروں کے سامنے پیش کی جاچکی ہیں، ان کی حیثیت تراجم اور وہ بھی ناقص تراجم سے زائد نہیں ثابت کی جاسکتی۔ اس لیے میں امید کرتا ہوں کہ ہندوستان کے اہل قلم یا تو رباعیات عمر خیام پر قلم اٹھانے کی تکلیف گوارا ہی نہ کریں گے یا پھر ایسا کچھ لکھیں گے کہ اس کو دیکھ کر

اگر انگلستان نہیں (کیوں کہ وہاں کی ذہنیت خالص مادی ہے) تو کم از کم جرمنی کے فلاسفر کو تو ہندوستان کی فلسفیانہ ذہنیت اور نکتہ سنج دماغ کی داد دینے میں فخر ومباہات محسوس ہو۔ دیکھیے، یہ امید برآتی ہے یا نہیں۔ امید تو نہیں ہے، مگر ہاں خدا کرے۔.....(۴)

۴۔ اخیر میں صرف ایک سوال رہ جاتا ہے کہ آج اسی خیام کی کیوں قدر و قیمت تسلیم کی جانے لگی، جس کو کل تک قابل اعتناء سمجھنا بھی غلط کاری محسوس کیا جاتا تھا، مگر ذرا گہری اور درست انداز نظر ڈالنے پر آپ محسوسکریں گے کہ پچھلے صفحات میں اس سوال کا جواب بھی لپٹا ہوا ہے، لیکن اس کی اجمال انگیزی دیکھتے ہوئے مستقل طور پر روشنی ڈالنا زیادہ بہتر تصور کرتا ہوں۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ کائنات کے تمام زر و جواہر بلکہ تمام اشیاء کی قیمت محض اضافی ہے۔ خود اشیاء کی ذات میں کوئی ایسی قوت مضمر نہیں، جو اس کی قیمت کو ہر وقت اور ہر زمانہ میں یکساں طور پر قایم رکھ سکے۔ اس لیے ہمیں کسی چیز کی قیمت معلوم کرنے کی غرض سے خود اس چیز کی جواہر تابی، خوش وضعی اور آب و رنگ کو دیکھنے کے بجائے اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ موجودہ ماحولی احتیاجات، گرد و پیش کے حالات اور زمانہ کی ضرورتیں اس شے میں ہمارے لیے کس قدر جذب وکشش پیدا کر رہی ہیں، کیوں کہ قیمت طلب سے زیادہ ہوتی ہے نہ کہ طلب قیمت سے۔ پھر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ فلاں چیز کی کیا قیمت ہے اور کیوں۔

چوں کہ یہ قانون دنیا کے ہر ذرہ پر جاری ہے، اس لیے کوئی وجہ نہ تھی کہ رباعیات خیام کے جواہر پارے یا سنگ ریزے اس عام قانون کے تحت نہ آتے۔ چنانچہ آئین فطرت کی کارفرما قوتیں برسر عمل آئیں اور ایک زمانہ کی کس مپرسی کے بعد رباعیات کو بیش بہا موتیوں میں شمار کیا جانے لگا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ پہلے قدر و قیمت تسلیم نہ کرنے کا کیا سبب تھا اور آج کون سی نئی بات پیدا ہوگئی جس نے اس کی وقعت اور حیثیت میں چار چاند لگا دیے۔ حقیقت یہ

ہے کہ دنیا ہمیشہ روحانیت و مادیت کی کش مکش میں غلطاں و پیچاں رہی ہے اور شاید جب تک نظام ملکی قائم ہے، ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ چنانچہ اسی قانون کے تحت جب کبھی دنیا پر روحانیت کا زریں دور زرفشاں ہوا تو صرف وہی علوم و مصنفات جو روحانیت کی گہرائیوں سے ایک گونہ مناسبت رکھتی تھیں، قبول عام کی سند حاصل کر سکیں اور جب کبھی مادیت کی لعنت دنیا پر چھائی تو تمام وہ حقائق نظر انداز کر دیے گئے، جن میں حاسہ مجردہ روحانیہ یا قوت فکریہ انسانیہ کی مضمر طاقتیں صرف کرنا ضروری ہوں اور محض وہی مخترعات وایجادات سائنس قابل قدر ٹھیریں، جو مادی تمدن کو دوبالا اور سیم وزر یا بالفاظ عمومی دولت کا اضافہ کر سکیں۔ چنانچہ اگلے زمانہ میں روحانیت کا چرچا تھا، اس بنا پر محض وہی حقیقت قابل لحاظ تصور کی جاتی تھی، جو پورے غور وفکر کی مرہون ہوتے ہوتے کسی بہترین اور زبردست حقیقت کا پردہ فاش کر رہی ہو اور اس علم یا تصنیف کو قابل پذیرائی نہ سمجھا جاتا تھا، جس کے حدود حقائق مادیہ سے تجاوز نہ کر سکیں اور چوں کہ رباعیات عمر خیام شراب ارغوانی اڑانے اور رنگ رلیاں منانے ہی کے ضوابط وقوانین کا مرقع یا لطیف مگر موالید ثلاثہ ہی کے راز ہائے سربستہ کا مجموعہ تھیں، اس لیے ظاہر ہے کہ روحانیت کے اسرار مکنونہ حل کرنے والے محققین و فلاسفر اس طرف نظر بھر کر دیکھنا بھی گوارا نہ کر سکتے تھے اور نہ ان جرعہ ہائے تلخ کو گوارا چاہیے تھا۔ کیوں کہ اگر روحانیت نواز دماغ مادہ کی پیچیدگیاں سلجھانے میں مصروف ہو جائیں تو حقیقت رسی کی قوت بہت کچھ کمزور پڑ جائے گی اور پھر روحانیت کے دقائق محسوس کرنا، ان کے قابو کا معاملہ نہ رہے گا، جو ایک فلاسفر کے واسطے انتہائی تکلیف دہ اعتراف حقیقت کے معنی رکھتا ہے۔ (۵) مگر آج روحانیت کی فضا مکدر ہو چکی ہے اور اس کو ترقیات مادیہ میں نہ صرف غیر ضروری بلکہ بعض 'خوش فہموں' کے نزدیک رکاوٹ تک خیال کیا جاتا ہے۔ مجھے یہاں پر اس سے بحث نہیں کہ 'نئی روشنی' کے زائیدہ حضرات کی یہ خیال آرائیاں کہاں تک بجا یا بے جا ہیں، کیوں کہ یہ مسئلہ خود ایک مستقل عنوان کا محتاج ہے۔ اس لیے میں اتنی ہی بات پر اکتفا کرتا ہوں کہ آج مغرب میں مخصوص طور پر اور مشرق اس کی غلامی اور زیر اثر واقتدار ہونے

کی بدولت شراب مادیت کا ساغر چھلک رہا ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ کب تک اس کی نظر افروز گلابی بوندیں سرشار کرتی اور صدائے قلقل جذبات کی لہروں کو متموج اور برقی رو کی طرح دل و دماغ میں دوڑاتی رہے گی۔ بہر حال ہمارے زمانہ میں بھی رنگ ہے اور یہی عمر خیام کی رباعیات کو شہرت عام کی عزت سے سرفراز کرنے کا ضامن ہے۔

لہذا، موجودہ قبولیت عامہ کو دیکھتے ہوئے خیال قائم کر لینا چاہیے کہ یہ پچھلے لوگوں کے قوائے دماغیہ کا اضمحلال تھا کہ وہ رباعیات کے محاسن و دقائق کو محسوس نہ کر سکے۔ غلط راہ روی ہے، کیوں کہ ہر شخص اپنی ذہنیت کے معیار پر کسی حسن کو پرکھتا ہے، نہ کہ دوسرے کی ذہنیت کے سانچے پر۔ وہ روحانیت پرست تھے اور رباعیات 'فلسفہ لذتیہ' کا خاکہ لہذا ان کے دل و دماغ اس سے کس طرح متاثر ہو سکتے تھے۔ ہاں آج ذہنیت تبدیل ہوگئی اور اب دنیا رباعیات کے 'فلسفہ لذتیہ' جیسے معمولی فلسفہ کو بھی اپنی سنہری گود میں جگہ دے سکتی ہے، مگر اس قدر و قیمت سے خود اس فلسفہ کی حقیقت شرف وعلو سے لذت آشنا نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ فطرت نے اضافیات کو ماہیت پر اثر اندازی کی قابلیت ہی ودیعت نہیں فرمائی۔ یہی وجہ ہے کہ حقیقی فلاسفہ کبھی دنیا کی تحسین ونفریں پر اعتماد نہیں کرتے، بلکہ صرف حقیقت واقعہ کو پیش نظر رکھتے ہیں۔

لہذا، ہم بھی اتباعاً صرف حقیقت پر نظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ دینے کے مجاز ہیں کہ رباعیات عمر خیام مادہ پرستوں کے لیے ایک عجیب اور قابل فخر کتاب ہے، مگر ضمیر ئین مایہ تعبیر صحیح ترین روحانیین کے نقطۂ نظر سے کسی خاص وقعت کے لائق نہیں۔ خواہ آج دنیا اس کے متعلق کوئی فیصلہ صادر کرے مگر حقیقت ہمیشہ حقیقت ہی رہے گی۔ کسی رائے کا اس پر کوئی اثر مرتب نہیں ہو سکتا۔

شاید بعض تصوف پرست حضرات رباعیات عمر خیام کو روحانیت کی 'زر آلود کنجی' سمجھنے کی بناء پر میری توجیہہ کو درست خیال کرنے کے لیے تیار نہ ہوں، مگر میں ان کو حسن ظن کے عوض غور و تدبر کی دعوت دوں گا، کیوں کہ فقط کسی کے چند اشعار سے اس کی اخلاقی اور نفسیاتی

کیفیت کا اندازہ کرلینا قابل اعتماد و استناد نہیں ہوسکتا۔ اول تو اس کی رباعیات نوے فی صدی مے نوشی، آداب وقوانین مے نوشی اور اسی سے متاثرہ امور پر مشتمل ہیں اور پھر اس کی سوانح حیات متصوفانہ خیالات کی ہم آہنگی نہیں کرتی۔ غالبؔ یا ہمارے زمانہ کے بعض 'ممتاز ترین' شعرا کے متصوفانہ رنگ کو دیکھ کر ان کو صوفی سمجھ لینا اور حالات سے واقفیت رکھتے ہوئے، جس قدر نیک نیتی اور خوش اعتقادی کے جراثیم سے لبریز خیال کیا جانا چاہیے، اتنا ہی خیام کے رندانہ سوانح حیات سے آنکھیں بند کر کے صرف چند رباعیات کے بھروسہ پر 'حقیقت پرست صوفی' کہہ دینا بھی ممکن ہے۔ اگرچہ ادیبانہ طرز تحریر اور فلسفیانہ یا متصوفانہ ادائے خیالات کے انداز سے اخلاق وعادات پر بھی ایک گونہ روشنی پڑتی ہے، مگر نہ اس قدر صاف وشفاف کہ ہر ذرہ چمک اٹھے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم تصنیف کے تمام حصص واجزاء پر جداگانہ بغور مطالعہ کرنے سے پتہ چلا سکتے ہیں کہ مصنف کی زندگی نے کیا رخ اختیار کیا، کس چیز کی تلاش کی، کیا پایا اور کیا نہیں اور اگر غور کیا جاتا تو وہی حقیقت بے نقاب ہوتی، جو میرے سامنے آچکی ہے۔ چنانچہ میں یہی دعویٰ ثابت کرنے کی غرض سے شرح رباعیات کی بنیادوں کو استوار کر رہا ہوں، جس کو یا تو بالکل عنوانات تفسیری سے معرا رکھا جائے گا یا خیامی ترتیب وسلسلہ کو ترک کر کے ایک جدید اسلوب کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی تاکہ اس کا ہر رنگ جداگانہ محسوس کیا جاسکے۔ ابھی یہ خیال ابتدائی مراحل طے کرنے کی وجہ سے بہت دھندلا ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ کب تک اس کے خدوخال واضح ہوسکیں گے۔

(علی گڑھ میگزین، جلد۔ ٦، شمارہ۔ ١١/١٢، جنوری۔ فروری، ١٩٢٩ء، ص۔ ٣٧۔ ٤٧)

حواشی و حوالہ جات

۱۔ رباعی: اے کردہ زلطف و قہر تو صنعِ خدا ‏ ‏ در عہد ازل بہشت و دوزخ برپا
بزم تو بہشت است و مرا اُجرے نیست ‏ ‏ خوبست کہ در بہشت رہ نیست مرا

۲۔ ملاحظہ ہو کشف اصطلاحات الفنون، جلد اول۔

۳۔ امریکن ایڈیشن ملاحظہ ہو۔

۴۔ مضمون نگار موصوف نے مذکورہ دو تراجم کی نشاندہی نہیں کی ہے، البتہ جہاں تک کسی ایسے فنکار کا تعلق ہے، جسے اہل مغرب یا کم از کم اہل جرمنی ہی داد دے سکیں تو میری حقیر رائے میں اقبال اور انا ماری شمل کے نام اس ضمن میں پیش کیے جا سکتے ہیں، اگر چہ یہ دعویٰ میں اب بھی بڑی حد تک درست معلوم ہوتا ہے کہ اب تک کوئی ایسا کارنامہ انجام نہیں دیا جا سکا ہے، جو یورپ کے ذوق کو بھا جائے یا جسے رباعیات خیام کی سی شہرت نصیب ہو جائے۔ مرتب۔

۵۔ یہاں دو باتیں قابل غور ہیں۔ اول یہ کہ روحانیت جو اپنے شدید روپ میں تصوف کے توسط سے اہل شرق کے ذہنوں پر حاوی ہوا اور غیر روحانی چیزوں اور معاملات دنیا سے لوگوں کو بڑی حد تک دور کر دیا اور بالآخر ایک ایسی ذہنی روش کا سبب بنا، جس نے بالعموم اہل شرق اور بالخصوص اہل اسلام کے مادی و فکری زوال کا سبب بنا۔

دوسری بات یہ کہ یہ بڑی حد تک درست ہے کہ فٹز جیرالڈ کے نزدیک خیام کی رباعیات کا مادی پہلو ہی رہا، لیکن عجیب بات ہے کہ اسی ترجمہ کی بنیاد پر جب سوامی یوگانند نے رباعیات خیام کا ترجمہ لکھا تو فلسفہ وروحانیت کی ایک وسیع دنیا بیان کر دی۔ مرتب۔

☆☆☆

صہبائے خیام

حسان ندوی

جو شخص اس فلسفی شاعر کی رباعیات سطحی نظر سے مطالعہ کرتا ہے، وہ معاً یہ حکم لگالیتا ہے کہ عمر خیام کا جامِ حیات بلانوشی اور عالم سکر ہی میں لبریز ہوگیا، کیونکہ یہ شخص کبھی تو شراب کو روح الحیوۃ سے موسوم کرتا ہے اور اس کے بکثرت استعمال کے لیے صلائے عام دیتا ہے اور کبھی اس کو سعادت ازلی سے تعبیر کرتا ہے اور اس کے بکثرت استعمال میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتا۔ وہ برملا کہتا ہے کہ جس بدنصیب نے اپنی دنیوی زندگی جام وصراحی کی مصاحبت کے بغیر بسر کی، اس سے زیادہ اور کون بدنصیب ہوسکتا ہے اور جو ایک لحہ بھی ساقی میکدہ کے فیضان سے محروم رہا، اس کا اس جہاں میں آنا ہی لا حاصل ہے۔ کذا وکذا۔

خیام کا جام و مئے سے یہ توغل دیکھ کر ایک جماعت نے اس کو مے نوش فاسق و فاجر اور دنیا پرست قرار دے دیا تو دوسری جماعت نے اس کو زندیق ولا مذہب ٹھہرایا اور ایک تیسرے گروہ نے عمر خیام کی ان گستاخیوں (۱) کی وجہ سے، جو اس نے شراب کے نشے میں ذات واجب الوجود سے روا رکھیں، اس پر اعلانیہ گمراہی اور کفر کا فتویٰ لگادیا۔ جیسا کہ عرب فیلسوف ابوالعلا المعرّی پر زندیقیت وغیرہ کا حکم لگایا جاچکا ہے۔

مگر یہ احکام وفتویٰ ان ظاہر بیں حضرات سے صادر ہوئے، جو حقیقت سے اکثر اعراض کرتے ہوئے ظاہر ہی پر مکتفی رہنے کے عادی ہیں۔ حکم لگانے سے پہلے ضروری ہے کہ محکوم علیہ کے طرز معاشرت اور اخلاق کو پیش نظر رکھ لیا جائے۔ اس لیے ہم مجبور ہیں کہ اس نادر روزگار شاعر کے متعلق ان اتہامات کو رفع کریں۔ جو دنیا کے کوتاہ بین اور ظاہر پرست حضرات کے تعصب و جہالت کا نتیجہ ہیں۔

جب ہم خیام کے مولفات کی تفحص (۲) کرنے کا تہیہ کرتے ہیں، جن کی رو سے ہم ان الزامات کی حقیقت و بطلان کا صحیح اندازہ کر سکیں تو صرف اس کی رباعیات ہی سامنے آتی ہیں، جن کی بنا پر اس کو اس قدر ملائم ومطاعن کا ہدف بنایا جاتا ہے اور ہمارے تحیّر کی کوئی حد نہیں رہتی، کیونکہ اتہامات کی تاسیس جن بنیادوں پر کی گئی ہے، وہ ان کے مفہوم کے مطالب سے بالکل متغائر و متبائن نظر آتی ہیں۔

فلاسفہ وحکماء کے اقسام اب تک صرف ان دو اقسام تک منحصر ہیں:

(الف) متفائلین،

(ب) متشائمین۔

(الف) متفائلین:

جو فلاسفہ سارے جہاں کو تو اجتماعی زندگی کے فوائد ومنافع کی تلقین کرتے ہیں مگر جب دنیا اور اس کے لذائذ سے دوچار ہوتے ہیں تو خود تلذذ شروع کر دیتے ہیں اور وہ ان بوقلموں فواکہات میں اس قدر محو ہو جاتے ہیں کہ صرف اسی دنیا کو سب کچھ سمجھ کر آخرت سے بے نیازی اختیار کر لیتے ہیں۔ یہی لوگ 'متفائلین' کے نام سے منسوب کیے جاتے ہیں۔

(ب) متشائمین:

اس طبقے میں وہ فلاسفہ شامل ہیں، جو دنیا کے تنعم وتعیش سے اعراض کرتے ہوئے اس کے تکالیف، مصائب، آلام وحوادث کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ جماعت دنیوی زندگی کو طوق وسلاسل اور قید محن سے تعبیر کرتی ہے، ان کو علمائے 'متشائمین' سے موسوم کیا جاتا ہے۔

الضافا ہمیں بھی اس معیار پر خیام کے تشخص کی تنقید کرنی چاہئے، یعنی پہلے گروہ میں شامل تھا یا دوسری جماعت میں۔

عمر خیام نے فلسفہء حیات کی طرف نظر کی اور بغور اس کا مطالعہ شروع کیا، وہ مدتوں اس کی کنہہ کی دریافت میں منہمک رہا۔ آخر کار اس پر بشری زندگی کا ایک پرتو پڑا اور وہ خدوخال کی رعنائی میں محو ہو گیا لیکن ابھی نظارگی ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ اس کو دوسرے رخ کے انعکاس سے دوچار ہونا پڑا، جس کو آلام واحترام نے مسخ کر رکھا تھا اور وہ کلیجہ تھام کر رہ گیا۔

اس نے باور کرلیا کہ انسانی زندگی سحاب باراں کی مانند ہے، جو ادھر سے سر اٹھاتا ہے اور ادھر سے غائب ہو کر ناپید ہو جاتا ہے۔ پھر بھی انسان اس قلیل وقفہ میں گوناگوں آلام و افکار میں گھرا رہتا ہے، جن کا دفعیہ بغیر نشہ شراب اور عیش وطرب کے ممکن نہیں۔

اسی بنا پر متہمین خیام کی یہ رائے ہے کہ جب خیام نے ان کیفیات مخزونہ (۳) کا مطالعہ کیا تو پیر مغاں کی بارگاہ میں لبیک کہتا ہوا پہنچ گیا، جہاں وہ ایک ہاتھ میں صراحی اور دوسرے ہاتھ سے جام لے کر مینوشی میں مصروف ہو گیا اور شراب کی بدمستیوں نے اسے دنیا ومافیہا سے بے نیاز بنا دیا۔ چنانچہ جوش مستی میں وہ یوں مترنم ہوا:

آمد سحرے ندا ز میخانۂ ما — کاے رند خراباتی و دیوانۂ ما
برخیز کہ پر کنیم پیمانہ ز مئے — زان پیش کہ پر کنند پیمانۂ ما

اس رباعی سے صاف ظاہر ہے کہ خیام 'متفائلین' میں سے تھا، جس نے اپنی تمام زندگی عیش پرستی میں گذار دی۔

کیا فی الواقع خیام مے نوش تھا؟ ہم متہمین خیام کے اس الزام دہی کو ایک حد تک تسلیم کرتے ہیں کہ خیام خود بھی پیتا تھا اور دوسروں کو بھی پینے کی تلقین کرتا تھا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ خیام اس شراب کا متوالا تھا، جس کو اس سے پہلے فلاسفہ وحکما استعمال کرتے چلے آئے ہیں، یعنی وہ حقیقی شراب جس کے نشہ کی سرشاریاں کسی صاحب ضمیر باموحد باللہ کو ارتکاب معاصی سے مجتنب رکھتی ہے، نہ یہ خیالی ہے کہ جس کو ظاہر پرست صوفیا

پنجگانہ ادائے صلوۃ کے بعد بصد الحاح (۴) وزاری طلب کرتے نظر آتے ہیں، مگر اس پر بھی ان کے صدق وخلوص کا یہ حال ہے کہ خشوع قلب اور تحفظ ضمیر کو اس سے نسبت نہیں۔

خیام اور اس کے دیگر ہم شرب حکما کا یہ خیال ہے کہ شراب وہ حرام ہے جو انسان کے شعور ہوش پر اس طرح غالب آجائے کہ جس سے وہ کبائر ومنہیات کے ارتکاب سے اصلاً دریغ روا نہ رکھی اور جو شخص خم کے خم چڑھا کر بھی حسنات کے سوا معاصی سے سروکار نہیں رکھتا۔ اس پر مے نوشی کا اہتمام بجائے خود ایک معصیت کبری ہے جیسا حافظ مترنم ہے کہ ؎

حافظا مے خور و رندی کن و خوشباش، ولی
دام تزویر مکن چون دگران قرآن را (۵)

(صاحب مضمون اس شعر کی کیا اچھی شرح کرتے ہیں۔ عربی داں احباب کو ضرور اس سے مستفیض ہونا چاہیے۔)

اے شرب احمرة یا حافظ اعمل ماتشا الّا دنك
کن طیّباً ولا تکن کا الدکران) دھر طیر یرتل کما
یرتل القران مضمضاً الشراب الخمرہ عینیه حتی اذا
دنت مِنه الطیور صادھا۔

(ترجمہ: اے حافظ! شراب پی اور جو کچھ جی میں آئے کر۔ مگر خود کو معاصی سے مجتنب رکھنا اور دوسروں (۶) کی طرح نہ ہو جانا۔ یعنی اس پرندہ کی طرح جو مراقبہ کی صورت بنائے گویا قرأت قرآنی میں مصروف ہے مگر اس عالم میں بھی اس کے نزدیک کوئی چھوٹا پرندہ پر مار جائے تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑتا۔)

اسی مفہوم کو ایک اور فارسی ادیب نے یوں ادا کیا ہے کہ:

مے بخور، منبر بسوز و مردم آزاری مکن

(زمانہ، اپریل ۱۹۲۷ء، جلد۔ ۴۸، ص۔ ۲۱۵۔ ۲۱۸، مقتبس از جریدہ ''الیقین'' بغداد)

حواشی وحوالاجات

☆ حسان ندوی نے بغداد کے ایک عربی جریدہ ''الیقین'' میں شائع ایک مضمون کو بعض اضافوں کے ساتھ اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ مرتب

۱۔ غالباً یہ اشارہ خیام کی اس رباعی کی طرف ہے:

ابریق مے مرا شکستی ربی برمن در توبہ را بہ بستی ربی
برخاک بریختی مے ناب مرا من مست نیم مگر تو مستی ربی

۲۔ اصل۔ تفحص

۳۔ اصل۔ مخزونہ

۴۔ اصل۔ الحاج

۵۔ اصل یوں تھا، جس میں تھوڑی غلطیاں تھیں:

حافظ مے خور و رندی کن و خوشباش ولی
دام تزویر مکن چون دگران قرآن را

۶۔ اصل۔ دگران

☆☆☆

عمر خیام کی رباعیات کا پہلا مترجم

قیصر سرمست

ڈاکٹر ابولیث صدیقی نے ایک مقالہ انگریزی میں لکھا تھا، جسے علامہ نیاز مرحوم نے اردو کا جامہ پہنا کر ''اردو میں ترجموں کی نوعیت واہمیت'' کے زیر عنوان ''نگار'' پاکستان جنوری ۶۳ء میں شائع کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے جہاں بے شمار ترجموں کا ذکر کیا ہے، وہاں عمر خیام کی رباعیات کے ترجموں کا سرسری ذکر بھی نہیں کیا۔ اس کی وجہ سمجھ میں نہ آسکی۔ حالانکہ اس کے ہم عصر حضرت امام غزالیؒ اور بوعلی سینا کے ترجموں ''تفسیر سورۃ البقر'' (مترجمہ بدرالدین فاروقی) اور ''تفسیر سورۃ اخلاص'' (مترجمہ عبدالاحد) کا ذکر تو ملتا ہے، مگر عمر خیام کے پہلے مترجم کا نام کہیں نظر نہیں آتا، جو اسی دیار کا متمکن تھا، جہاں میں نے بھی آنکھ کھولی اور جس کے نام سے حیدرآباد کے ایک محلہ 'مغلپورہ' کی ایک گلی 'کوچہ مکھن لال' کے نام سے آج بھی مشہور ہے۔ نصیرالدین ہاشمی صاحب نے اپنی تصنیف ''آج کا حیدرآباد'' میں ''حیدرآباد کے بعض محلے'' کے تحت کوچہ مکھن لال کا ذکر کیا ہے، لیکن انھوں نے یہ صراحت نہیں فرمائی کہ یہ کوچہ کس مکھن لال کے نام سے مشہور ہے۔

عمر خیام کسی ایک کا نہیں، بلکہ شعروادب، علم ونجوم، فلسفہ ومنطق، ریاضی اور علم

طبعیات کے ماہر کا نام ہے، جو رباعیاں صرف تفریح طبع کے لیے اور ریاضی، فلسفہ اور نجوم وغیرہ کی بے کیفی و خشکی سے ذہن کو نجات دلانے کے لیے کہہ لیا کرتا تھا۔ خیام کی شاعری کو سمجھنے کے لیے علامہ شبلی نعمانی کی اس تحریر کو ایک بار پڑھ لینا میرے خیال میں بہت سودمند ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں:

''خیام کی رباعیاں اگرچہ سینکڑوں ہیں، لیکن قدر مشترک سب میں چند مضامین ہیں۔ دنیا کی بے ثباتی، خوش دلی کی ترغیب، شراب کی تعریف، مسئلہ جبر و قدر، توبہ و استغفار، ان میں سے ایک مضمون کو وہ سو سو دفعہ لکھتا ہے، لیکن ہر دفعہ اس طرح لکھتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نئی چیز ہے۔

اس کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ بے حد سادہ و بے آرائش ہے، ہر قسم کے تکلف و تصنع سے پاک ہے اور مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ از قسم شاعری ان میں سوائے وزن و قافیہ کے کچھ بھی نہیں ہے۔ تاہم فصاحت و بلاغت میں اپنی انتہا کو پہنچا ہوا ہے، الفاظ و معانی ایک ہو گئے ہیں۔ ابتذال یا ناقص انداز بیان کہیں نہیں ہے۔ کہیں کہیں بے حد نازک ظرافت ضرور ہے۔''

یہ اقتباس میں نے صرف اس لیے دیا ہے کہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ خیام کی شاعری کی خصوصیات کیا ہیں، تاکہ اس کے مترجم کی صلاحیت کا صحیح طور پر اندازہ کر سکیں۔ خیام کی رباعیات کا دنیا کی ہر زبان میں ترجمہ ہوا ہے، لیکن راجہ مکھن لال نے ان رباعیات کا ترجمہ رباعیات میں کیا ہے جو توجہ طلب ہے۔

مکھن لال صاحب کے متعلق نصیر الدین ہاشمی صاحب نے اپنی کتاب ''دکن میں اردو'' میں اردو میں ضمناً دوسرے شعراء کے ساتھ لکھا ہے کہ ''راجہ مکھن لال نے ۱۲۶۰ھ میں عمر خیام کی رباعیات کا ترجمہ اردو رباعیات میں کیا ہے۔ صاحب فن خیال کر سکتے ہیں کہ یہ کس قدر دشوار امر تھا، مگر راجہ صاحب نے نہایت آسانی کے ساتھ اس میدان کو طے کیا ہے۔ غالباً اردو میں اس طرح کے سب سے پہلے مترجم یہی ہیں۔''

راجہ مکھن لال صاحب تھے تو ہندو، لیکن مشرب صوفی تھا۔ ان کے جداعلیٰ نظام الملک اولیٰ کے ساتھ شاہجہاں پور سے حیدرآباد دکن آ گئے تھے اور اس کو وطن بنالیا تھا۔ چنانچہ مکھن لال یہیں پیدا ہوئے اور حصول علم بھی مادر وطن کی گود ہی میں کیا۔ ابتدا میں سواروں کی پیشکاری کی خدمت انہیں سونپی گئی تھی۔ آدمی لائق اور ذہین تھے، چند ہی دن بعد ترقی کر کے خدمت وکالت پر مامور ہو گئے۔ اس کے بعد امور خاصہ کے انجام دینے پر مقرر ہوئے، لیکن ناصر الدولہ کے عہد حکومت میں راجہ مکھن لال 'راجگی' کے خطاب اور منصب سے سرفراز ہوئے۔ خدمت وکالت برقرار رہی اور گلزار آباد کی جاگیر بھی عنایت کی گئی تھی۔

راجہ مکھن لال نہ صرف فارسی کے جید عالم تھے، بلکہ ہندو مسلم اتحاد کا بے مثل نمونہ بھی۔ انتہا درجہ کے بے تعصب اور علوم اسلامی اور تصوف سے انہیں بے حد لگاؤ تھا۔ زبان فارسی سے انہیں بے پناہ دلچسپی تھی اور اس زبان کے حصول کے لیے انھوں نے ایک ایرانی نژاد عورت سے شادی بھی کر لی تھی۔ فارسی شعراء میں عمر خیام ان کا سب سے پسندیدہ شاعر تھا۔

عمر خیام کی رباعیات عرصۂ دراز تک گوشۂ گمنامی میں پڑی رہیں اور ان کا ترجمہ دنیا کی دوسری زبانوں میں بہت عرصہ بعد ہوا۔ انگریزی زبان میں خیام کی رباعیات کے ترجمہ کا سہرا فٹز جیرالڈ کے سر ہے، جسکی پہلی اشاعت ۱۸۰۸ء میں ہوئی تھی۔[1]

''نگار'' ہی کی جلد ۵۸ (اکتوبر ۱۹۵۰ء) میں لکھا ہے:

> ''مستشرقین یورپ کا اس میں شک نہیں، یہ بڑا احسان ہے کہ خیام کو دنیا سے روشناس کرانے کے لیے سب سے پہلا قدم انھوں نے اٹھایا، لیکن ان میں کم ایسے تھے جنھوں نے یہ چھان بین کی ہو کہ جن رباعیوں کو خیام سے منسوب کیا جاتا ہے، ان میں سے واقعتاً کتنی خیام کی ہیں اور کتنی الحاقی ہیں۔''

یہاں مجھے اس سے غرض نہیں کہ مستشرقین یوروپ نے عمر خیام کو دنیا سے روشناس

کرایا یا اس کے نام سے دوسرے شعرا کی رباعیوں کو منسوب کر کے اسے ایک طرح سے بدنام کیا۔ یہاں تو مجھے اس جملے ''سب سے پہلا قدم انھوں نے ہی اٹھایا'' پر اعتراض ہے۔ اعتراض کی وجہ بیان کرنے سے پہلے میں آپ کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ روسی مستشرقین میں ژوفسکی کا مقالہ ''خیام کی آوارہ گرد رباعیاں'' کے عنوان سے ۱۸۹۷ء میں شائع ہوا تھا اور ۱۹۰۴ء میں کرسٹنزن نے صرف بارہ رباعیوں کو عمر خیام کی رباعیاں تسلیم کیا تھا، لیکن ۱۹۳۴ء میں شیدر صاحب نے تو حکم صادر فرما دیا تھا کہ خیام نے حقیقت میں کچھ لکھا ہی نہیں۔ لہٰذا اس کا نام تاریخ ادب فارسی سے نکال دینا ہی زیادہ مناسب ہے۔ اس طرح فٹز جیرالڈ وہ پہلا شخص ہوا، جس نے عمر خیام کی رباعیات کا ترجمہ کیا[۲]۔ ۱۲۶۰ھ میں خیام کی رباعیوں کا ترجمہ اسی زبان میں کیا گیا تھا، جس کی ساری ہندوستان میں دھوم ہے اور اس زبان کے چاہنے والے جسے خود سے بھی سوا چاہنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

راجہ مکھن لال نے ۱۲۶۰ھ میں یعنی آج سے ایک سو تینتیس سال قبل عمر خیام کی رباعیات کا ترجمہ کیا تھا۔ جب کہ فٹز جیرالڈ کو ترجمہ کیے ایک سو پندرہ سال ہی ہوئے ہیں۔ اس طرح راجہ مکھن لال نے اس شخص سے اٹھارہ سال پہلے ترجمہ کیا، جسے دنیا رباعیات خیام کا پہلا مترجم مانتی ہے اور ہم اردو دان بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

راجہ مکھن لال کا ترجمہ کیا ہوا نسخہ کتب خانہ آصفیہ (جسے بدل کر سنٹرل اسٹیٹ لائبریری کر دیا گیا ہے) میں آج بھی محفوظ ہے۔ راجہ صاحب نے خود ہی دیباچہ بھی لکھا ہے۔ اس دیباچہ کا اقتباس (تاکہ اندازہ ہو کہ مکھن لال کی نظم ہی نہیں نثر بھی 'اس زمانے کے لحاظ سے' کس پائے کی تھی اور ان کے اندر صوفیانہ رنگ کس درجہ گہرا تھا) اور چند اصل رباعیوں کے ساتھ اس کا ترجمہ پیش کرتے ہوئے اپنا مضمون ختم کرتا ہوں۔ دیباچہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

> ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ دیباچہ کلام نام نامی سے اس پیر مغان کے بجا ہے کہ جس نے مشت خاک آدم سے خمکدۂ معرفت

کو بنا کر بادۂ عرفان سے معمور کیا ہے اور توصیف اس ساقیٔ دوران کو روا کہ جس نے طبیعت میخواران سراپا نشان حقیقت کو جوش وخروش وحدت کا دیکر کشاکش دوئی کفر اور اسلام سے امن بخشا ہے۔ خوش طالعی دردکشاں مست کی کہ میکدہ عشق کو معبد اپنا جان کر اپنے انفاس عزیز یاد مغاں میں صرف کرتے ہیں اور اچھی طرح پاک طینی بادہ کشانِ الست کی کہ اعتقاد اپنا صاف خم دسبو پر رکھ کر جانب نہیں گذرتے ہیں۔ اس نو مشق سخن چین ارباب کمال، راجہ مکھن لال کو مدت سے یہ تمنا تھی کہ عندالفرصت اپنے ترجمہ رباعیات فارسی حضرت عمر خیام کا کرے کہ اس بزرگ کے کلام میں سراسر حقیقت اور معرفت تراوش کرتی۔ خلاصہ اس کا زبان اردو میں موافق اپنے استعداد کے رشتۂ تحریر نظم میں لادے۔ اگر چہ اس راقم آثم کو اتنا سواد اور مواد زبان ریختہ میں نہیں تھا کہ ترجمہ کلام اس بزرگ کا کماحقہٗ کرے، لیکن باعتبار اس کے کہ شاید برکت کلام عارفانہ سے اس بزرگ کے کہ فیض ظاہری اور باطنی اس میں مقصود ہے۔ اس مترجم کو بھی فائدہ نصیب ہو۔ استفادہ کیا اور یہ بھی ثابت ہوا کہ سخن فصیح زادہ افکار صفحہ روزگار پر یادگار رہتا ہے۔ اس واسطے اس کو خلف الصدق کہنا سزاوار ہے۔ اس لیے خیال راقم کا آغاز ماہِ رجب ۱۲۶۰ھ سے طرف کلام عارفانہ و عاشقانہ کے آیا اور اوقات عزیز کو جانب مضمون گل و بلبل کے صرف نہ کیا۔۔۔"

راجہ صاحب کے ترجمہ کا کمال یہ ہے کہ ترجمہ کی ہوئی رباعیاں طبع زاد معلوم ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہر لفظ کا ترجمہ کرکے الفاظ کا ڈھانچہ کھڑا نہیں کرتے، بلکہ نفس

مضمون کو لے لیتے ہیں اور اسے اردو کا قالب دے دیتے ہیں۔ذیل کی رباعیوں کو آپ کیا کہہ سکیں گے''حالانکہ یہ خیام کی رباعیوں کا ترجمہ ہی ہے:

(۱)

عمامہ اتار مئے گساروں کو دیا　　اور تھی جو کتاب عقل یاروں کو دیا
یک خرقۂ تن رہا ہے باقی اپنا　　شجرہ جو بچا تھا دوستداروں کو دیا

(۲)

پہلے غم ہجر گرمئی محفل تھا　　چندے برکاب شوق ہم منزل تھا
اے یار اب آ کے دیکھ تربت کو میری　　یہ مشت غبار کچھ دنوں میں دل تھا

(۳)

جب عشق ہو پستئ و بلندی پھر کیا　　ہے بیخودی تو ہوشمندی پھر کیا
رکھ طاق میں یار تو مریدی پیری　　رندی میں خیال ارجمندی پھر کیا

یہی رنگ ان کی ترجمہ کی ہوئی ہر رباعی سے ظاہر ہوتا ہے۔خیام کی اس مشہور زمانہ رباعی کا کس آزادی سے انھوں نے ترجمہ کیا ہے۔ملاحظہ کیجئے:

(عمر خیام)	(راجہ مکھن لال)
بر جان و دلِ اسیرِ من رحمت کن	عصیاں میں ہوں بس اسیر تو رحمت کر
بر سینۂ غم پذیرِ من رحمت کن	ہوں سینۂ غم پذیر تو رحمت کر
بر پائے خرابات رو من بخشائے	میخانہ میں بیخودی ہے اے رب کریم
بر دستِ پیالہ گیرِ من رحمت کن	ہوں گرچہ پیالہ گیر تو رحمت کر

....

نا کردہ گناہ در جہاں کیست بگو	ہے کون بشر جہاں میں ناکردہ گناہ
آنکس کہ گنہ نکرد چوں زیست بگو	کر مجھ کو تو اے کریم اس سے آگاہ
من بدکنم و تو بدمکافات دہی	تو، ہم سے اگر بدی کا بدلہ چاہے

پس فرق میان من و توچیست بگو　　پھر فرق نہ کچھ رہے گا واللہ واللہ

....

یک جرعۂ مئی زملک کاؤس بہ است　　یک جرعۂ مل ہے ملک کاؤس سے خوش
وز تختِ قباد مملکت طوس بہ است　　اور حشمت روس شوکتِ طوس سے خوش
ہر نالہ کہ رندے سحرگاہ زند　　یہ نالہ جو طائروں سے سنا ہے سحر
ازطاعت زاہدان سالوس بہ است　　ہے نالہ زاہدی میں سالوس سے خوش

....

چنداں بخورم شراب کیں بوئے شراب　　ہم اتنی پئیں غرور مستی سے شراب
آید ز تُراب چوں روم زیر تُراب　　جاری ہو لحد سے اپنے جوئے مئی ناب
تابر سر خاک من رسد مخموری　　گر گذرے سر مرقد اپنے صوفی
ازبوئے تراب من شودمست خراب　　شاید کہ ہو بوئے مے سے وہ مست وخراب

....

آمد سحرے ندا ز میخانۂ ما　　دی باد سحر نوید دیوانہ کو
کے رند خراباتی دیوانہ ما　　یعنی دل میکسار و مستانہ کو
برخیز کہ پر کنیم پیمانہ ز مے　　اٹھ بھر لیں بعشق دوست ساغر اپنا
زاں پیش کہ پر کنند پیمانۂ ما　　ان سے آگے بھریں جو پیمانہ کو

....

گر یار من اند ترک طامات کنند　　گر دوست ہو تم تو یہ عنایات کرو
غم ہائے مرا بمی مکافات کنند　　غم کا مرے جام سے مکافات کرو
چوں درگذرم خاک مرا خشت کنند　　مرجاؤں تو خاک سے بناخشتے چند
در رخنۂ دیوارِ خرابات کنند　　تعمیر خرابۂ خرابات کرو

(دوماہی شیرازہ، سری نگر، جلد۔۱۳، شمارہ۔۴، ۵، ۶، ص۔۸۳۔۸۸)

حواشی وحوالہ جات

۱۔ نگار کی جلد :۷۶/میں شبلی بی کام ''خیام کی صحیح تاریخ ولادت'' کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ ''سوامی گوند تیرتھ نے دو کام بڑے معرکے کے سرانجام دیے۔ایک تو عمر خیام کی اصلی رباعیات کا کھوج نکال کر فٹز جیرالڈ کے ترجمہ کی قلعی کھولی اور بتایا کہ اس نے کس طرح خیام ،حافظ اور ابوالخیر کے اشعار گڈمڈ کر دیے اور دوسرے علم النجوم کی رو سے عمر خیام کی صحیح تاریخ ولادت متعین کردی۔''

۲۔ درحقیقت فٹز جیرالڈ بھی پہلا مترجم نہیں ہے،جس نے عمر خیام کی رباعیات کو انگریزی کا جام پہنایا۔اس لیے کہ ۱۹۱۸ء (۱۸۱۸ء ہونا چاہئے۔)میں وال ہمیر نے عمر خیام کی ۲۵/رباعیوں کا ترجمہ کیا تھا۔

☆☆☆

خیام کی مقبولیت

ضیاء احمد ایم۔اے۔

حکیم عمر بن ابراہیم جو اپنے تخلص 'خیام' سے مشہور ہے، ان چند خوش نصیب ایشیائی شعراء میں ہے جن کے کلام سے یورپ نے ایشیا سے بڑھ کر اعتنا کی ہے۔ لطف یہ ہے کہ خیام کی شاعری کی خود اس کے وطن ایران میں اور نیز ہندوستان میں (جہاں مذاق فارسی ایران کے بعد سب ممالک سے زیادہ رہا ہے) اتنی قدر پہلے کبھی نہیں ہوئی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ خیام پر مغرب میں جس قدر لٹریچر بروئے کار آیا ہے، اگر فراہم کیا جائے تو ایک خاصہ کتب خانہ بن جائے۔ یورپ کے مشہور ملکوں اور زبانوں میں شاید ہی کوئی ملک یا زبان ہو، جس میں اس نامور شاعر کے سوانح، کلام پر انتقادات، تراجم، شروح اور دوسرے مباحث کا کافی ذخیرہ نہ ہو یا اس کی رباعیات کے متعدد مترجم اور مصور ایڈیشن موجود نہ ہوں۔ صرف برٹش میوزیم میں ایسی کتابوں کی تعداد جو خیام کی شاعری پر لکھی گئی ہیں، ڈیڑھ سو سے متجاوز ہے۔ مغرب کی تقلید میں اب ہمارے اہل قلم بھی اس طرف متوجہ ہو چلے ہیں۔ آج کی صحبت میں خیام کی سیرت یا اس کے خصوصیات کلام پر بحث کرنا مقصود نہیں، بلکہ اس کی مقبولیت کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالنا اور اسی سلسلہ میں رباعیات خیام کے ایک تازہ منظوم اردو ترجمہ سے

قارئین کو روشناس کرانا منظور ہے۔ خیام ایک ممتاز حکیم، ایک نامور عالم اور ایک زبردست ادیب تھا اور اپنے زمانہ میں ہیئت، نجوم، فلسفہ، ریاضی، طب، تفسیر، فقہ، اصول، تجوید، لغت، ادب، تاریخ میں نہایت عالی پایہ سمجھا جاتا تھا۔ جیسا کہ اس کی تصانیف اور سوانح سے بھی واضح ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا جامع الکمالات انسان شاعری کو اپنے مرتبہ سے فروتر جانتا ہوگا اور اپنے آپ کو اس شعر کا مصداق سمجھتا ہوگا کہ:

ولولا الشعر بالعلماء یزری

لکنت الیوم اشعر من لبید

مگر خیام کو کیا خبر تھی کہ وہی چیز جو اس کے کمالات کے تاج کا سب سے ہلکا گوہر ہے، اس کے نام کو ایک دن اس قدر چمکائے گی کہ تمام موتیوں کی درخشانی ماند پڑ جائے گی اور لوگ 'امام'، 'علامہ' اور 'حجتہ الحق' خیام کو بھول کر صرف شاعر خیام کا دم بھرنے لگیں گے۔

ممالک فرنگ میں جن بے شمار مستشرقین نے خیام کی شاعری پر قلم اٹھایا، مبسوط شرحیں اور مقالے شائع کیے اور تذکرہ وتنقید کا فرض انجام دیا، ان میں ٹامس ہائڈ، پروفیسر کریستن زن، ایم۔ ایچ۔ بیٹسن، موسیو والن ٹن ژوکوفکی، مسٹر راس، ڈاکٹر فریڈرک روزن، این۔ ایچ۔ ڈول اور مسز کیڈل کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس وقت تک وہاں رباعیات کے بیسیوں دیدہ زیب اور مصور نسخے طبع ہو کر مقبول خاص وعام ہو چکے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ایڈورڈ فٹز جیرالڈ، ای۔ ایچ۔ ون فیلڈ، جے۔ ایچ۔ میکارتھی، ای۔ ایچ۔ ایلن اور جیمس کی مساعی کا ذکر نہ کرنا حق تلفی ہوگا۔ خیام سے متعلق شرق شناسوں کے شغف کا یہ نتیجہ ہوا کہ تقریباً ہر یوروپی زبان میں رباعیات کے متعدد لفظی یا مفہومی ترجمے نظر آنے لگے۔ مستشرقین نے چاہا کہ جس طرح خود بادۂ خیام سے سرشار ہیں، اسی طرح اپنے بامذاق اہل وطن کو بھی سرشار کریں۔ چنانچہ فٹز جیرالڈ نے، جس کو 'مغرب کا عمر خیام' کہا جاتا ہے، اپنے بے نظیر منظوم انگریزی ترجمے سے اس شراب کو دو آتشہ کیا اور مشرقی مے کو مغربی جام میں پیش کر کے مغرب کی علمی فضا کو سرمست بنا دیا۔ ون فیلڈ کا انگریزی ترجمہ بھی

سادگی اور صفائی کے اعتبار سے ایک قابل قدر کارنامہ ہے۔ گارنر کا عالمانہ ترجمہ بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ علاوہ بریں، نکولس کا فرانسیسی اور باڈن سٹیڈ کا جرمن ترجمہ بھی اہل علم میں وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اسی طرح آسٹریا اور ہالینڈ بھی ترجموں کے ذریعہ سے خیام سے روشناس ہو چکے ہیں۔

اہل فرنگ کے ادبی ذوق نے اسی پر بس نہ کی۔ بلکہ ۱۸۹۲ء میں انگلستان میں ایک انجمن ادب کی بنیاد ڈالی، جو اس وقت تک 'عمر خیام کلب' کے نام سے مشہور ہے۔ سنہ مذکور میں تین دوستوں فریڈرک ہڈسن، جارج وہیل اور کلیمنٹ شارٹر نے لندن میں بیٹھ کر اس انجمن کا منصوبہ باندھا اور بالآخر اس کی باضابطہ تشکیل کی۔ اس ادارہ کا فرض خیام سے متعلق تمام لٹریچر کی نشر واشاعت ہے۔ اب تک یہ ادارہ بڑے بڑے اہل قلم کو اپنے حلقہ رکنیت میں داخل اور دنیا کے ممتاز مشاہیر کو اپنی مجالس میں مدعو کر چکا ہے۔

یہاں پر سوال قدرتاً پیدا ہوتا ہے کہ اہل مغرب کو خیام کی شاعری سے اس قدر شغف کیوں ہے اور ان کے یہاں اس کی رباعیات کو اس درجہ مقبولیت کیوں حاصل ہوئی ہے؟ اس کے جواب کے لیے ہمیں رباعیات خیام کے مباحث وموضوعات کا اجمالی تذکرہ اور سرسری تجزیہ کرنا پڑے گا۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، یہاں رباعیوں کی صحیح تعداد (جو ایک متنازع فیہ امر ہے)، ان کی مسلمہ ادبی حیثیت، ان میں اختلاف مضامین کی توجہ پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ اس پر کافی لکھا جا چکا ہے۔ صرف یہ دکھانا ہے کہ رباعیات خیام کے بنیادی موضوعات کیا ہیں۔

رباعیات کا ہر مطالعہ کرنے والا کہہ سکتا ہے کہ خیام کی تمام شاعری کا مرکزی خیال یہ ہے کہ 'دی وفردا' کی بحث چھوڑو اور 'امروز' کے عیش سے منہ نہ موڑو۔ یہی خیال ہے جس کو اس نے حافظ کی طرح بار بار نئے نئے اسالیب سے دہرایا ہے اور اپنی قوت شاعری سے ہر مرتبہ انداز بیان میں خاص ندرت اور دل آویزی پیدا کر دی ہے۔ فرق یہ ہے کہ حافظ کے

یہاں متغزلانہ انداز پایا جاتا ہے اور خیام کے یہاں حکیمانہ۔

اب اس مرکزی خیال کے اجزا کو لو تو معلوم ہوگا کہ اس نے اپنے ادائے مطلب کے لیے ذیل کے چند عناصر سے مدد لی ہے۔ گویا اصلی خیال ایک تخم ہے، جس سے یہ سب برگ وبار پیدا ہوئے ہیں۔ یعنی:

۱۔ گردش فلک کا شکوہ اور ناپائداری حیات کا ماتم،

۲۔ اس غم کو غلط کرنے کے لیے شراب نوشی اور عیش کوشی کی تجویز،

۳۔ گناہ اور غم کے لیے تقدیر پر بلکہ خدا پر الزام،

۴۔ حشر و معاد میں شک، جنت و دوزخ پر استہزا،

۵۔ رندی اور تشکک پر اعتراض کرنے والوں کی تحقیر، ان کی 'ریاکاری' کی پردہ دری اور ان کے عقائد سے استخفاف۔

ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا مرکزی عقیدے اور اس کے اجزائے ترکیبی میں سے چند باتوں کو مغربی افتادِ خیال سے کس قدر مطابقت و مشابہت ہے اور مغرب کا متشکک بلکہ ملحد دماغ ان اصول کو قبول کرنے کے لیے کس قدر آمادہ ہوسکتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ بعض رباعیات میں ایسے مضامین بھی ملتے ہیں جو متذکرہ بالا خیال سے غیر متعلق بلکہ متضاد کہے جاسکتے ہیں۔ مثلاً کئی جگہ اس نے عجز و مناجات، دعا اور طلب مغفرت کے مضمون نہایت لطیف پیرایہ میں ادا کیے ہیں، مگر للحکم الاکثر الکل کی بنا پر ان مسائل کی حیثیت ثانوی رہ گئی اور خیام و خمریات مترادف سمجھے جانے لگے۔

ان خیالات کے نتائج یا خیام کی نیت سے بحث کرنا، اس کے ترجمہ نگار کا فرض ہے۔ کم از کم یہ حقیقت عالم آشکار ہے کہ اس کی رباعیات ادبی نقطۂ خیال سے نہایت بلند پایہ ہیں اور یہ ایسا عقیدہ ہے، جس میں شک کرنا مذہب ادب میں کفر سے کم نہیں۔

ضرورت تھی کہ اردو ادب بھی اس خزنیہ جواہر سے مالا مال ہوتا، چنانچہ اس سلسلہ میں جو مساعی اب تک ہماری نظر سے گذرے ہیں، حسب ذیل ہیں۔ ممکن ہے کہ ایک آدھ

ترجمہ ان کے علاوہ بھی ہوا ہوں:

۱۔ تاج الکلام: یہ ترجمہ منظوم سید لائق حسین قوی امروہوی کی کوشش کا نتیجہ ہے، جو ۱۹۲۴ء میں دہلی سے شائع ہوا ہے۔ یہ ۶۴ ۷ رباعیات کا ترجمہ ہے، مگر یہ التزام نہیں کیا کہ رباعی کا ترجمہ رباعی ہی میں ہو۔ ترجمہ عموماً لفظی اور بے لطف ہے۔

۲۔ خمخانۂ خیام: یہ بھی منظوم ترجمہ ہے اور آغا شاعر قزلباش دہلوی کا اثر خامہ ہے، جو ۱۹۲۷ء میں طبع ہوا۔ رباعیات کی تعداد ۲۰۰ ہے۔ ترجمہ با محاورہ ہے، جیسا کہ خود مترجم نے تحریر فرمایا ہے کہ ''مکھی پر مکھی مارنا مجھے نہیں آتا۔'' تاہم بہر حال ترجمہ ہی معلوم ہوتا ہے اور کیف سخن کی کمی ہے۔ تفصیل آیندہ آئے گی۔

۳۔ مے دو آتشہ (۱):۔ اس ترجمہ کا سہرا سید کاظم علی شوکت بلگرامی کے سر ہے اور یہ ۱۹۳۲ء میں حیدر آباد سے شائع ہوا ہے۔ اس میں صرف ۶۳ / رباعیاں ہیں اور لفظی ترجمہ کے بجائے خیام کا مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی کی نسبت اظہار خیال آیندہ سطور میں کیا جائے گا۔

دنیا جانتی ہے کہ ایک زبان سے دوسری میں ترجمہ کرنے سے اصل کی لطافت خاک میں مل جاتی ہے۔ مترجم دونوں زبانوں پر کتنی ہی قدرت کیوں نہ رکھتا ہو، تاہم اصل کا انداز بیان قائم رکھنا تقریباً محال ہے کیونکہ ہر زبان کے اسالیب دوسری زبان سے یکسر مختلف ہوتے ہیں۔ اسی لیے اکثر ادیبوں کا قول ہے کہ ترجمہ تصنیف سے زیادہ دشوار ہے۔ مثلاً اگر ہم حماسہ کے اس شعر:

الـمـت فـحـيّـت ثم قـامـت فودّعـت
فـلـمـا تـولّـت كـادت النفس تزهق

یا شاہنامہ کی اس بیت:

بہ بالا یکے سرو شاداب بود   تو گوئی ہمہ تخت سہراب بود

کا ترجمہ کرنے بیٹھیں تو یقیناً شعر کی لطافت کا بڑا حصہ ضائع ہو جائے گا۔ ایسا معلوم

ہوتا ہے کہ یہ خیالات و جذبات نہیں ایک کارگاہ شیشہ گری ہے۔ ذرا ٹھیس لگی اور پاش پاش ہوئے۔ پھر ترجمہ اگر منظوم ہے تو اور بھی قیامت ہے۔ بعض اصحاب نے دیوان حافظ، مثنوی معنوی بلکہ قرآن مجید کا منظوم ترجمہ کر ڈالا، مگر للہ انصاف! یہ کسی معنی میں بھی کوئی علمی یا ادبی خدمت کہی جا سکتی ہے۔ غرض منظوم ترجمہ کا تو راقم سطور قائل ہی نہیں ۔ یہ دشواری اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے، جب رباعی کا ترجمہ رباعی ہی میں کرنے کا التزام رکھا جائے اور رباعیات بھی کس کی، خیام کی۔ ظاہر ہے کہ رباعی کا میدان نہایت تنگ ہے۔ بحر مخصوص، مصرعوں کی تعداد محدود، زبان معین، پھر یہ قید کہ مصرع چہارم زور میں سب سے زیادہ ہو۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے مترجم کی مشکلات کی انتہا نہیں رہتی۔ اگرچہ وِن فیلڈ کا یہ خیال صحیح ہے کہ خیام کی رباعیات کا منثور ترجمہ بے کیف رہتا کیونکہ اس نے ایک ہی خیال کو نئے نئے پیرایوں میں یا ایک ہی شراب کو نئے نئے ساغروں میں پیش کیا ہے، مگر اس سے منظوم ترجمہ کی مشکلات کم نہیں ہو جاتیں۔

ترجمہ کی نسبت یہ نظریہ مدت سے ذہن میں تھا، مگر حقیقت یہ ہے کہ شوکت بلگرامی کے ترجمے نے بڑی حد تک اس نظریہ کو مشتبہ کر دیا اور ثابت کر دیا کہ ہر کلیہ میں مستثنیٰ بھی ہوتا ہے، جیسا کہ اوپر دکھایا گیا ہے کہ یہ ترجمہ (مے دو آتشہ) لفظی نہیں اور مترجم نے اپنے الفاظ و تراکیب میں بلکہ اپنے اسلوب و پیرایہ بیان میں خیام کا مفہوم اردو خواں پبلک کے روبرو پیش کیا ہے، جس میں شاعرانہ رنگینی اور ادبی چاشنی ایک ایک قدم پر دل کھینچتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مترجم مرحوم فطری شاعر تھے۔ انھوں نے جس وقت ترجمہ کیا ہوگا تو اپنے اوپر وہ کیفیات بھی طاری کر لی ہونگی جو شاعری کا لازمہ ہیں (یا دوسرے الفاظ میں وہ کیفیات ان پر طاری ہوگئی ہونگی) چونکہ ترجمہ سے کوئی تجارتی مفاد یا ادبی شہرت مقصود نہ تھی، اس لیے جو کچھ لکھا ہے، خوب لکھا ہے۔ جو شخص خیام کے خیالات سے واقف نہ ہوگا، وہ ہرگز اس کو ترجمہ نہیں کہہ سکتا۔ انداز کی لطافت اور زبان کی صفائی کا اندازہ کرنے کے لیے ذیل کی مثالیں کافی ہوں گی:

خیام: ہر چند کہ رنگ و بوئے زیباست مرا — چوں لالہ رخ و چو سرو بالاست مرا
معلوم نہ شد کہ در طرب خانۂ خاک — نقاش من از بہر چہ آراست مرا

شوکت: شمشاد سا قد ہے، پھول سا چہرہ ہے — لیکن اس رنگ و بو سے حاصل کیا ہے
نقاش ازل نے اس نگارستاں میں — تصویر بنا کے مجھ کو کیوں رکھا ہے

حقیقت یہ ہے کہ 'طرب خانۂ خاک' کا ترجمہ 'نگارستان' سے بہتر نہیں ہوسکتا۔ پھر مصرع چہارم تو داد سے مستغنی ہے۔ خصوصاً 'تصویر' کے لفظ سے اپنی حیرت کا اظہار نہایت خوبی سے کیا ہے۔ خیام کے یہاں اس ٹکڑے کی کمی تھی۔

خیام: صد کعبۂ آب وگل بہ یک دل نرسد — کعبہ چہ روی برو، دلے را دریاب

شوکت: دل محرم رازِ کبریا ہے، نہ حرم — پردہ کعبہ کا چھوڑ، دل ہاتھ میں لے

خیام کا دعویٰ محتاج ثبوت تھا۔ ترجمہ میں ''دل محرم راز کبریا ہے'' بڑھا کر یہ کمی پوری کردی۔

خیام: روزے کہ تو بے عشق بسر خواہی برد — ضائع ترا زآں روز ترا روزے نیست

شوکت: ہے حاصل عمر عشق زلف ورخسار — جینا ہے عبث جو یہ شب وروز نہ ہو

زلف ورخسار اور شب وروز کے تقابل نے خیال کو زیادہ شاعرانہ اور مکمل کردیا۔

خیام۔ با چرخ مکن حوالہ کاندر رہ عقل — چرخ از تو ہزار بار بیچارہ تراست

شوکت: کیا چرخ بھلا کسی پہ توڑے گا ستم — برگشتہ نصیب آپ چکّر میں ہے

چرخ کی بیچارگی کی کتنی خوب توجیہ کی ہے۔ ہمارے خیال میں ترجمہ کی اس سے بہتر مثال ملنی دشوار ہے اور سنئے۔

خیام: گل گفت کہ من یوسف مصر چمنم — یاقوت گرانمایہ پُر زر دہنم
گفتم: چو تو یوسفی، نشانے بنما — گفتا کہ بخون عرق نگر پیرہنم

شوکت: گل کہتا ہے میں ہوں یوسف مصر چمن — الفت نے کیا ہے، چاک میرا دامن
کہتا ہوں جو میں دکھا نشاں یوسف کا — کہتا ہے کہ دیکھ خوں بھرا پیراہن

شوکت بلگرامی کے دوسرے مصرع نے حضرت یوسف کی تشبیہ مکمل کردی۔

انداز بیان کی لطافت اور معنی خیزی سے قطع نظر اس ترجمہ میں زبان پر قدرت اور محاورہ کی صفائی کا یہ عالم ہے کہ بے ساختہ داد نکل جاتی ہے۔ خصوصاً یہ پیش نظر رکھتے ہوئے کہ یہ ترجمہ ہے، اس سلاست اور روانی کا منکر سے منکر کو بھی کلمہ پڑھنا پڑتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

خیام: افسوس کہ صد ہزار معنیِ دقیق — از بے خردیِ خلق ناگفتہ بماند

شوکت: جو منہ سے کہا اسے نہ سمجھا کوئی — کہنے کی جو بات تھی وہ ناگفتہ رہی

خیام: این دستہ کہ در گردن او می بینی — دستیست کہ در گردن یارے بودہ است

شوکت: یہ دستہ گردنِ صراحی بھی کبھی — ساقی کے گلے کا ہار رہتا ہوگا

خیام: افسوس کہ نامۂ جوانی طے شد — ویں تازہ بہار شادمانی طے شد

آن مرغ طرب کہ نام او بود شباب — فریاد ندانم کہ کے آمد کے شد

شوکت: افسوس کہ موسم جوانی گذرا — ہنگام بہار شادمانی گذرا

اس وقت کھلا حباب عشرت تھا شباب — جس وقت ہمارے سر سے پانی گذرا

مثالیں کہاں تک دی جائیں۔ مضمون طویل ہوا جارہا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ موازنہ کی غرض سے قوی صاحب اور آغا شاعر صاحب کے بھی بعض ترجمے ساتھ ساتھ دیدیے جائیں تاکہ ہماری ترجیح بلا مرجح نہ سمجھی جائے۔

خیام: بابط می گفت ماہی در تپ و تاب — باشد کہ بہ جوئے رفتہ باز آید آب

بط گفت کہ چوں من و تو گشتیم کباب — دنیا پس مرگِ ما، چہ دریا چہ سراب

قوی: اک بط سے کہا ماہی نے وقت تب وتاب؟ — کیا ہو دریا سے اگر جا کر پھر آجائے وہ آب

تب کہا بط نے یہ ماہی سے جو ہم تم ہوں کباب — بعد مرنے کے ہمارے، پھر چہ دریا چہ سراب

آغا شاعر: اک مچھلی نے بط سے کہا ہو کر بے تاب — شاید کہ یہ ندی ہو دوبارہ پر آب

بط بولی دوانی ہوئے ہم تم جو کباب — یکساں ہے ہمیں کچھ بھی ہو دریا کہ سراب

شوکت: بط سے کہتی تھی ماہی سینہ کباب　　کیا ہو جو تنور سے ابل آئے آب
بط نے جل کر کہا کہ جب ہم نہ رہے　　ہے ایک ہمارے بعد دریا و سراب
خیام: در فصل بہار بابت حور سرشت　　یک کوزۂ مے اگر بود بر لب کشت
ہر چند بہ نزد خلق بد باشد ایں　　از سگ بترم اگر کنم یاد بہشت
قوی: ہو فصل بہار اور بت حور شیم　　بھر کر مجھے مے سے قدح دے، دیکھے قسم
اوروں کے لیے اگر چہ ہے یہ بات بری　　کتے سے برا جو پھر میں لوں نام ارم
آغا شاعر: ہو موسم گل اور بت حور سرشت　　بھر بھر کے مجھے جام پلائے سرکشت
پھر چاہے کسی کو بھی مری بات نہ بھائے　　میں کتے سے بدتر ہوں جو لوں نام بہشت
شوکت: ہو جوش بہار و آبشار ولب کشت　　جام مے و دست ساقی حور سرشت
اس دور نشاط و بیخودی میں شوکت　　دوزخ ہو نصیب یاد آئے جو بہشت
خیام: گویند مرا کہ سور با حور خوش است　　من می گویم کہ آب انگور خوش است
این نقد بگیرد دست ازاں نسیہ بدار　　کاواز دہل شنیدن از دور خوش است
قوی: کہتے ہیں مجھے سور دل حور سے خوش ہے　　میں کہتا ہوں آب مے انگور سے خوش ہے
یہ نقد پکڑ ہاتھ میں اور قرض کو تو چھوڑ　　آواز دہل سن کے تو بس دور سے خوش ہے
آغا شاعر: سب کہتے ہیں یہ کہ حور باسور ہے خوب　　میں کہتا ہوں افسردہ انگور ہے خوب
یہ نقد سنبھال قرض کی توقع چھوڑ؟　　ڈنکے کی صدا سہانی پر دور ہے خوب
شوکت: زاہد دیوانے خلد اور حور کے ہیں　　عاشق میخوار آب انگور کے ہیں
لے جام شراب بول واعظ کے نہ سن　　چھوڑ ان کا خیال ڈھول یہ دور کے ہیں

یقین ہے کہ ہر صاحب نظر اس موازنہ سے صحیح نتیجہ پر پہنچے گا اور اس امر میں ہمارے ساتھ ہم آہنگ ہوگا کہ رباعیات خیام کا ترجمہ جو شوکت بلگرامی نے کیا ہے، درحقیقت اردو کا شاہکار سمجھے جانے کا مستحق ہے۔ یہ اگر کوئی مستقل چیز ہوتی تو بھی قابل قدر تھی، لیکن یہ خیال کر کے اس کی وقعت اور بڑھ جاتی ہے کہ یہ ترجمہ ہے۔ یہی نہیں، بلکہ یہ ترجمہ کہیں کہیں

خیام سے ٹکر کھاتا ہے، بلکہ دو ایک جگہ اصل سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ ہمارا یہ مقصد نہیں کہ شوکت کو خیام پر تقدم ہے، کیونکہ جزوی ترجیح سے مجموعی فیصلہ پر اثر نہیں پڑ سکتا۔ کہنا صرف یہ ہے کہ ''مے دو آتشہ'' اس باب میں ایک کامیاب ترین کوشش ہے، جس میں شاعر کے مفہوم کے ساتھ لطف ادب کو بھی باحسن وجوہ نباہا گیا ہے۔ افسوس کہ مترجم کی عمر نے وفا نہ کی، ورنہ اردو میں نہ معلوم کن کن جواہر پاروں کا اضافہ ہو جاتا۔ خود ان کی حیات میں کتنے ہوں گے، جو ان کے نام سے واقف ہوں گے۔ سچ یہ ہے کہ ہم اپنے باکمالوں کی قدر کرنا نہیں جانتے۔ یہاں پر ہمیں ایک دوسرے باکمال زندہ مترجم کا شعر یاد آتا ہے:

وہ فردوسی ہیں یہ جن کی زبان کھلنے نہیں پائی
وہ رستم ہیں نہیں سہراب کا خوں جن کی گردن پر

(علی گڑھ میگزین، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، جلد۔۱۲، شمارہ۔۱، جنوری ۱۹۳۳ء، ص۔۱۔۸)

حواشی وحوالہ جات

ا۔ "مے دو آتشہ" سید محمد علی بلگرامی، صدر مدرس، مدرسہ فوقانیہ، ناندیڑ، دکن سے طلب کی جا سکتی ہے۔ (صاحب مضمون)۔

البتہ اب تقریباً اسی سال گذر جانے کے بعد اس کی کوئی کاپی یا مذکورہ پتہ کے متعلقات کا سراغ ملنا بھی مشکل امر ہے۔ مرتب

☆☆☆

حکیم غیاث الدین ابوالفتح عمر الخیام

خاقان حسین عارف

انداز بیان میں لطف اور لطف بیان میں تاثیر ازل سے نظم کے حصے میں آئی ہے۔ شاعر اگر باکمال اور نکات زبان و انداز بیان میں مہارت رکھتا ہے تو بے شائبہ ریب وہ سامعین کو ایسا بیتاب کرسکتا ہے کہ خالی باتیں نہیں کرسکتیں۔ قدیم الایام میں ہنگام جنگ و پیکار رجز خوانی کا طریقہ مرد مقابل کے خیال و عقل پر غالب آنے کے واسطے مقرر کیا گیا تھا، اسی مصلحت سے کہ منظوم کا اثر بہت ہوتا ہے، رجز کے مضامین بالعموم منظوم ہوتے تھے۔

مگر یہ عجیب بات ہے کہ کوئی شاعر جملہ اصناف نظم میں ایک انداز خاص سے مطلب ادا نہیں کرسکتا۔ خاقانی شروانی جس کو 'خدائے سخن' کہتے ہیں، فن قصیدہ گوئی میں بے مثل و یکتائے روزگار ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے خیالات شاعرانہ فلسفہ و تصوف وغیرہ علوم متداولہ کی مہارت تامہ سے پختہ ہو گئے تھے اور ان کے اظہار کے واسطے شوکت الفاظ کی ضرورت تھی۔ سو اقصیدے کے غزل وغیرہ میں اچھی طرح ادا نہ کرسکتا تھا۔ سعدی شیرازی و حافظ شیرازی، نظیری نیشاپوری و شیخ علی حزیں گیلانی وغیرہم غزل میں نہایت لطف سے ادائے مطلب کرتے تھے۔ ان کے دل کا درد مجبور کرتا تھا کہ اپنی زبان کے وہ الفاظ استعمال

کریں جو اس کیفیت قلبی کے مطابق واقع ہوئے ہوں۔ قصائد میں جو خیال کے دبدبے کے اظہار کی ضرورت ہوتی ہے، وہ غزلوں میں نامقبول ہے۔ ان شعرائے نامبردہ کے قصائد موجود ہیں مگر استغفر اللہ، وہ بات کہاں جو خاقانی وانوری ومنوچہری دامغانی کے قصائد میں ہے۔ فردوسی ونظامی اور جامی وہاتفی مثنوی کے استاد مسلم الثبوت تھے۔ طبیعت کو عادت ہوگئی تھی کہ ایک سلسلے میں ادائے مطلب ادا کرے۔ ان کی غزلوں میں وہ آمد نہیں ہے جو مثنوی میں ہے۔ ابن امین قطعات کا استاد ہوا ہے، مگر چار مصرعوں میں ادائے مطلب، پھر اس لطف وکیفیت کے ساتھ حکیم غیاث الدین ابوالفتح عمر خیام کے حصے میں آیا تھا۔ جو لطف اس شخص کی رباعیوں میں ہے، وہ آج تک کسی دوسرے شاعر کی رباعیوں میں نظر سے نہیں گزرا۔

زمانہ گزشتہ میں جو شخص ارسطو وغیرہ حکمائے یونان کے کتب فلسفہ یا ان کے ترجمے پڑھ کر خیالات حکیمانہ کا مقلد ہوتا تھا، اس کو 'حکیم' کا لقب دیا جاتا تھا۔ عمر خیام بھی فلسفہ وریاضی کا ماہر تھا، اسی وجہ سے آج تک اس کو حکیم خیام یا حکیم غیاث الدین ابوالفتح کہتے ہیں۔

جس طرح مالک قضاوقدر نے شروان کو خاقانی سے اور شیراز کو سعدی وحافظ وقاآنی سے مشہور آفاق کردیا، اسی طرح نیشاپور کا نام ونمود عمر خیام کی ذات کے ساتھ وابستہ کیا گیا۔ یہ صاحب کمال نیشاپور میں پیدا ہوا تھا اور ۱۱۳۲ء میں وہیں پیوند خاک ہوگیا۔

نجوم وہیئت وفلسفہ میں عمر خیام کو مہارت تامہ حاصل تھی۔ چونکہ حکمائے عرب فقط ارسطوئے الٰہی کے خیالات حکیمانہ کے مقلد ومداح تھے اور فیثاغورث وسقراط کے کتب علمیہ کے قدردان نہ تھے، اس وجہ سے عمر خیام کے مصنفات میں بھی ارسطو کی تقلید کا اثر پایا جاتا ہے۔ (۱) ہیئت ونجوم میں بطلیموس یونانی کی تقلید بلاد اسلام میں رائج ہوچکی تھی۔ یہ حکیم بھی نظام بطلیموس کا مقلد وپیرو تھا اور فن رصد بندی میں یہاں تک شہرت پیدا کی تھی کہ سلطان محمود غزنوی نے بکمال اشتیاق اسکو نیشاپور سے بلا کر زمرۂ ملازمان بااختصاص میں

داخل کیا اور رصد سابق پر نظر ثانی کی درخواست کی۔ اس خدمت مفوضہ کو عمر خیام باحسن وجوہ بجالایا۔ (۲) حالانکہ علوم متذکرۂ بالا میں اس حکیم کی مصنفات سے کتب مبسوطہ موجود ہیں، مگر چونکہ تقدیر الٰہی اور مشیت ایزدی میں رباعیات کے ذریعے سے شہرت کا ہونا جاری ہو چکا تھا۔ آج ان کتابوں کے نام سے کوئی واقف نہیں، جو اس باکمال نے تالیف کی تھیں۔

مذاق صحیح وسلامتیء خیال نے اہل یورپ کو اس شاعر کا والہ وشیفتہ بنادیا۔ بعض تذکروں میں میری نظر سے گزرا ہے کہ اکثر عمائدین واہل کمال بلاد یورپ کے وقت مقرر پر ایک مکان معین میں محض اس نظر سے جمع ہوتے ہیں کہ عمر خیام کی رباعیاں عالم ذوق وشوق میں پڑھیں اور نکات شاعرانہ اور مضامین حکیمانہ پر غور کریں۔ لارڈ کرزن کا یہ ارشاد بالکل صحیح و درست ہے کہ اگر خیام کا وجود نہ ہوتا تو آج کوئی سیاح عالم نوردنیشاپور کی طرف رخ بھی نہ کرتا وہاں کی سیر وسیاحت شئے دیگر ہے۔

مجھے بھی سرزمین نزہت آئین ایران سے دور کی نسبت ہے۔ معہذا ممالک مغرب کی جوہر شناسی نے میری اور زیادہ حوصلہ افزائی کی۔ خیال آیا کہ اس نام برآوردۂ فاضلِ عصر کی رباعیاں بنظر غور وانصاف دیکھوں اور بقدرِ ہمت وحوصلہ جو راز واسرار اس نظم میں موجود ہوں، ان سے اہل خانہ کو واقف کروں۔ میں اور یہ میرا خیال، اہل فہم وادراک میری اس یادہ گوئی اور ہرزہ سرائی کی داددیں۔

چونکہ اس وقت اختصار نویسی مجھ ہرزہ سرا کو مدنظر ہے۔ بناء علیہ چند رباعیوں کی نقل پر قناعت کی جاتی ہے۔

تعلیم سلوک:

گر از پۓ شہوت وہوا خواہی رفت — از من خبرے کہ بینوا خواہی رفت
بنگر چہ کسی و از کجا آمدہ ای — می داں کہ چہ میکنی، کجا خواہی رفت

(شہوت ۔خواہش نفس، ہوا۔ہوس، 'از من خبرے'۔ یہ خلاصہ ہے 'از من بتوخبر برسد' کا۔)

کہتا ہے کہ اگر تمام عمر تو پابند ہوا و ہوس نفسانی رہے گا۔ میری بات یاد رہے کہ اس جہان فانی سے تہی دست جانا ہی نصیب ہوگا، (لہذا) دنیا کے عیش و نشاط سے دست بردار ہو اور غور کر کہ تو کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟ یہ بھی جاننا چاہیے کہ تو کیا کر رہا ہے اور آخر الامر کہاں جائے گا؟

سالکان مسالکِ حقیقت و راہروانِ جادۂ طریقت نے جس امر کی تعلیم میں دفاتر ضخیمہ سیاہ کیے ہیں، وہ مطلب اس شخص نے فقط چار مصرعوں میں ادا کیا ہے۔ اصلاح اعمال و ترک تعلقات دنیوی کی تمہید ایک مصرع میں ہے۔ دوسرے مصرع میں اس نصیحت مشفقانہ پر عمل نہ کرنے کا وہ نتیجہ ظاہر کیا ہے جس کو ہر شخص بے عذر و حجت تسلیم کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک نفس مبتلا ہے، ہوا و ہوس رہے گا۔ زاد راہ آخرت کا ہاتھ آنا معلوم، مگر لذات دنیا کا ترک کرنا بھی بے تعلیم معقول ناممکن ہے۔ تیسرے اور چوتھے مصرع میں وہ طریقہ سکھایا ہے، جس پر بقدر امکان عمل کرنے سے یہ راہ دشوار گزار بآسانی طے ہو سکتی ہے۔ وہ یہ کہ انسان برابر اپنی حقیقت پر غور کرتا رہے کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں اور آخر کار کہاں جانا ہے۔ اس طرح یقیناً دنیا سے دل برداشتگی حاصل ہوگی، جو سالک راہ خدا کا مقصود اصلی ہے۔

نصیحت:

ابر آمد و زار بر سر سبزہ گریست — بے بادۂ گلرنگ نمی شاید زیست

این سبزہ کہ امروز تماشا گہِ ماست — تا سبزۂ خاکِ ما تماشہ گہ کیست

ابر آیا اور (سبزہ نو دمیدہ کے سر پر) بے اختیار ہو کر رویا۔ اس مشاہدے سے میرے دل میں یہ خیال آیا کہ جس طرح یہ سبزہ پیش نظر ہے، اسی طرح کسی دن میری خاک سے بھی سبزہ اگے گا اور خدا جانے کون شخص اس سبزہ نورستہ کا تماشا دیکھے گا (یہ تصور اور اس تصور سے جو افسوس ہوا، وہ عقل کا نتیجہ تھا)۔ اس دلیل سے ثابت ہوا کہ سرمایہ مصیبت عقل ہوتی ہے۔ لہذا، لطف زندگی حاصل کرنے کے واسطے بے فکری کی ضرورت ہے، جو بے کیف

شراب حاصل نہیں ہوسکتی۔ خواہ شراب متعارف ہو، خواہ بادۂ عشق الٰہی۔ لہذا، جس شخص کو ایام زندگی بفارغ البالی گزارنے منظور ہوں، وہ مستی شراب میں زندگی بسر کرے۔ لفظ 'تا' جو مصرع چہارم کی ابتدا میں واقع ہوا ہے، اس کے مفہوم کا مرادف کوئی لفظ اردو میں مجھے نہیں ملا۔

اخلاق:

بر خود درِ عیش و آرزو بربستم — وز منت ہر ناکس و کس وارستم

گر صوفی مسجدم، وگر راہب دہر — من دانم او چنانکہ ہستم، ہستم

کہتا ہے میں نے عیش و آرام دنیا سے کنارہ کشی اختیار کی۔ اب دل میں کوئی حسرت نہیں۔ پھر کیوں کسی کا بندہ احسان ہوں۔ اگر صوفی مسجد یعنی پیر طریقت اہل اسلام ہوں، اپنے واسطے اگر ملت نصاری کا پیشوا ہوں اپنے لیے (لوگ اپنے اپنے قیاس کے مطابق مجھے اچھا برا کیوں کہیں)۔ جو میں فی الواقع ہوں اس کا حال سوا علاّم الغیوب کے اور کوئی نہیں جانتا۔ ماحصل یہ ہے کہ مجھے برا کہہ کر اپنی زبان کا خراب کرنا یا قیاساً مجھے اچھا سمجھ کر میرے قول وفعل کی تقلید کون (سی) دانشمندی کی بات ہے۔

عبرت:

مرغے دیدم نشستہ بر بارۂ طوس — در پیش نہادہ کلۂ کیکاوس

با کلہ ہمی گفت کہ افسوس، افسوس — کو بانگ جرسہا و کجا نالۂ کوس

('بارہ' بیائے موحدہ 'قلعہ' کو کہتے ہیں۔ طوس و کیکاؤس دو بادشاہان ایران کا نام تھا۔) (۳)

ترجمہ۔ میں نے (ایک دن) ایک طائر کو قلعہ شاہ طوس پر بیٹھا ہوا پایا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اس جانور مشت پر کے سامنے کیکاؤس شاہ ایران کا سر رکھا ہوا ہے اور یہ مرغ ہوائی اس سے کہہ رہا ہے۔ افسوس! وہ سامان شاہانہ کہاں گیا؟ یعنی وہ آواز کوس و جرس کہاں ناپید ہوگئی؟

رندانہ:

من بے مئے ناب، زیستن نتوانم　　بے بادہ کشید بارِ تن نتوانم

من بندہٴ آں دم کہ ساقی گوید　　یک جام دگر بگیر و من نتوانم

کہتا ہے کہ بے شراب میری زندگی محال ہے۔ نہ بے نشہ شراب میں اپنے بدن کا بار اٹھا سکتا ہوں۔ مجھے وہ وقت بہت اچھا معلوم ہوتا ہے، جب ساقی باصرار وابرام مجھے جام شراب دے اور میں کہوں، اب میں نہیں پی سکتا۔ اب معاف کر۔

عبرت:

دانی کہ سپیدہ دم خروس سحری　　ہر لحظہ چرا ہمی کند نوحہ گری

یعنے کہ نمودند در آئینہ صبح　　کز عمر شبے گزشت و تو بے خبری

تجھے نہیں معلوم کہ خروس خانگی کا صبح کے وقت نوحہ وفغاں کرنا کس سبب سے ہوتا ہے۔ اس نوحہ گری کا سبب یہ ہوتا ہے کہ اس کو کارکنان قضاوقدر ہر صبح یہ مطلب سمجھاتے ہیں کہ ایک رات تیری عمر کی اور کم ہوگئی اور تجھے کوئی فکر نہیں۔

تعلیم:

رو بیخبری گزین، اگر باخبری　　تا از کف مستانِ ازل بادہ خوری

تو بیخبری، بے خبری کار تو نیست　　ہر بیخبری را نرسد بے خبری

اگر صاحب عقل وہوش ہے دنیا سے بے خبر ہوجا۔ جب بے خبر ہوجائے گا، اس وقت نفوس مقدسہ کے فیض سے مستفیض ہونے کی لیاقت تجھ میں پیدا ہوگی۔ چونکہ تو ان راز واسرار سے آگاہ نہیں ہے، بدینوجہ جو بے خبری میرا مقصود ہے، وہ تجھے حاصل نہیں ہوسکتی۔

اس رباعی میں بے خودی سے مقصود بے خودی شوق ہے، جو عارفان دل آگاہ کو عشق الٰہی میں حاصل ہوتی ہے۔

عشق کامل:

اے بادہٴ ناب واے مئے مینائی　　چندان بخورم ترا منِ شیدائی

کز دور مرا ہر کہ بیند، گوید اے خواجہ شراب! از کجا می آئی

کہتا ہے میرا دل چاہتا ہے کہ کثرت شراب خواری و بادہ نوشی سے میں ہمہ تن شراب ہو جاؤں۔ یہاں تک کہ جو کوئی شخص مجھے دور سے دیکھے، وہ خواجہ شراب کہہ کر مجھ سے خطاب کرے اور پوچھے کہ تو کہاں سے آتا ہے۔

یہاں 'شراب' سے مراد 'بادۂ عشق الٰہی' ہے۔ چاہتا ہے کہ شدت محبت سے خود ہمہ تن محبت ہو جاؤں اور محبوب حقیقی کے ساتھ وہ اتحاد پیدا ہو جائے کہ پھر جدائی وہم و خیال میں بھی نہ گزرے۔ وہ ادب سے اپنا مطلب صراحتاً ظاہر نہیں کرتا۔ کبھی بادۂ ناب کو اپنا مخاطب قرار دیتا ہے، کبھی اپنے کو خواجہ شراب کے لقب سے ملقب کرتا ہے۔ اس رباعی میں "کز دور مرا ہر کہ بیند" اور "از کجا می آئی"، ان دو جملوں کا لطف وجدانی ہے، جو کسی طرح زبان سے ادا نہیں ہو سکتا۔

ناچاری:

نہ سوے وصال تو مرا دست رسے نہ طاقت ہجرانِ تو دارم نفسے

نہ زہرہ کہ باز گویم، این غم بہ کسے مشکل کارے، طرفہ غمی، خوش ہوسے

کہتا ہے کہ یہ میرے دست قدرت سے خارج ہے کہ تجھ تک پہونچ جاؤں۔ اگر نہیں پہنچ سکتا، آلام جدائی کا ایک ساعت تحمل نہیں کر سکتا۔ یہ مجال نہیں کہ دل کا حال کسی شخص کے روبرو بیان کروں۔ یہ محبت عجب مشکل کام ہے اور یہ غم بھی فی الواقع نیا غم ہے اور باایں ہمہ، بے اختیاری، یہ حسرت تقرب در حقیقت عجب حسرت ہے۔)

شوخی:

یزداں! خواہم جہاں دگر گون گندے اکنوں کندی تا نگرم چون کندے

یا نام من از جریدہ ای، بیرون کندے یا روزی من ز غیب افزون کندے

افلاس و تنگدستی سے پریشان ہو کر خیام نے یہ رباعی نظم کی ہے اور مذاق حکیمانہ کے ساتھ شوخی کی داد دی ہے۔ کہتا ہے کہ خدا سے میری یہ تمنا ہے کہ وہ ابھی اس دنیا کو معدوم کرے اور ایک جہان نو پیدا ہو۔ جب دنیائے تازہ پیدا ہوگی، اس وقت میں دفتر

مخلوقات میں موجود رہوں گا یا میرا نام جریدۂ عالم سے خارج کیا جائے گا، مگر جب تک مجھے حسب دلخواہ دولت نہ ملے زندہ نہیں رہ سکتا اور نہ خدا اپنی بندگی سے مجھے آزاد کر سکتا ہے۔ مجبور ہو کر خدا اس کے سوا اور کیا کرے گا کہ بے وجہ ظاہری مجھے دولت دے اور میرے رزق میں افزائش کرے۔

اخلاق:

خواہی کہ پسندیدہ آنام شوی　　مقبولِ قبولِ خاصہ و عام شوی
اندر پے مومن و جہود و ترسا　　بد گوے مباش تا نکو نام شوی

اگر تو چاہتا ہے کہ ہر شخص تجھے اچھا کہے، تعصب کو ترک کر۔ سب کو ایک نظر سے دیکھ۔ بدگوئی سے باز آ، خو بخود نیک نامی حاصل ہو جائے گی۔

شکایت:

اے چرخ چہ کردہ ام ترا راست بگو　　پیوستہ فگندۂ مرا در تگ و پو
نانم نہ دہی تا نہ بری کوے بہ کو　　آبم نہ دہی تا نہ بری آب زرو

اے آسماں! سچ بتا کہ تجھے میرے ساتھ عداوت کی کیا وجہ ہے۔ جب تک گلی کوچہ کی خاک نہیں چھنوالیتا، مجھے روٹی نہیں دیتا۔ اسی طرح جب تک میری آبروریزی نہیں کر لیتا، مجھے ایک جرعہ آب سے بھی محروم رکھتا ہے۔

حق پسندی:

بتخانہ و کعبہ خانہ بندگیست　　ناقوس زدن ترانہ بندگیست
محراب و کلیسا و چہ تسبیح و صلیب　　حقا کہ ہمہ نشانۂ بندگیست

یعنی اہل معرفت ہر جگہ کو عبادت خانہ الٰہی سمجھتے ہیں۔ ناقوس کی آواز سے بھی ترانۂ توحید سمجھ میں آتا ہے۔ مسجد ہو یا یہود و نصاریٰ کا معبد، سبحہ اسلام ہو یا صلیب نصاریٰ ہر چیز اظہار عبودیت کر رہی ہے۔

یہ مضمون واقعہ ذیل سے لیا گیا ہے۔ روایت صحیح ہے کہ ایک روز حضرت علی مرتضیٰ

نے اثنائے سفر میں ایک مقام پر نزول فرمایا۔اس مقام سے کسی نصرانی کا عبادت خانہ قریب تھا اور آواز ناقوس پے درپے آ رہی تھی۔ جو لوگ ہم رکاب تھے،حضرت ممدوح نے ان سے پوچھا:''سمجھے یہ ناقوس کیا کہہ رہا ہے؟'' عرض کیا:''نہیں۔''فرمایا:''یہ کہہ رہا ہے:لا الہ الا اللهُ صدّقا صدّقا لا اله الا الله حقاً حقاً۔''

میلان فطری:

پرخون زفراقت جگری نیست کہ نیست　　شیدائے تو صاحب نظرے نیست کہ نیست
باآنکہ نہ داری سرسودای کسے　　سودائے تو در ہیچ سرے نیست کہ نیست

کہتا ہے کہ با این ہمہ کہ تجھے کسی کی پرواہ نہیں،مگر جس شخص کو دیکھتا ہوں بالطبع تیری طرف راغب ہے۔

زمانۂ حال کے حکماء نے پایۂ تحقیق تک پہنچا دیا ہے کہ ہر ذرۂ مادی میں بھی نفس ناکمل موجود ہے۔اس خیال سے بے تکلف کھسکتے ہیں کہ عالم جمادات سے عالم انسانی تک ہر نفس روبہ ترقی ہے۔ یہ ترقی رفتہ رفتہ ہر نفس ناکمل کو بالطبع پایہ کمال تک پہنچاتی رہتی ہے۔اس خواہش تکمیل کو عمر خیام نے اس رباعی میں عشق ومحبت سے تعبیر کیا ہے۔زبان انگریزی میں اسی استدراج کو(Evolution) کہتے ہیں۔

اظہار خیال:

مئے خوردن وشاد بودن، آئین منست　　فارغ بودن زکفر ودین، دین منست
گفتم بعروس دہر کابین تو چیست　　گفتار دل خورم تو کابین منست

(عروس دہر۔زمانہ،کابین۔مہر۔)

شوخی:

من بندۂ عاصیم ،رضائے تو کجاست　　تاریک دلم، نور صفائے تو کجاست
ما را تو بہشت ار بطاعت بخشی　　این مزد بود،لطف وعطائے تو کجاست

(عاصی۔گنہگار،ار۔مخفف اگر،مزد۔اجرت)

کہتا ہے: میں گنہگار ہوں، خیر ہوں۔ تیری خوشنودی جو تیری صفت ذاتی ہے، وہ کیوں اپنا اثر نہیں دکھاتی۔ اس طرح اگر میرا باطن سیاہ ہو رہا ہے۔ خیر، تیرا نور کیوں میرا باطن روشن نہیں کرتا۔ (مطلب یہ کہ تیری صفت اپنا کام انجام دے، میرے افعال سے کیا مطلب) اگر میں نے تیرے احکام کی تعمیل کی، اس کے عوض میں تو نے مجھے بہشت دی، یہ مزدوری ہوئی۔ مجھے تری اس عنایت کی ضرورت ہے، جو بلا عوض ہوتی ہے۔

عجز بشری:

کس را پس پردۂ قضا راہ نشد وز سرِّ قدر ہیچکس آگاہ نشد
ہفتاد و دو سال فکر کردم شب و روز معلوم نہ گشت و قصہ کوتاہ نشد

آج تک کسی کو اسرار قضا و قدر کی اطلاع نہیں ہوئی۔ مجھے بھی بہتر برس اسی فکر میں گزرے مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ نہ اسرار خداوندی کی کوئی حد معلوم ہوئی، نہ قصہ مختصر ہوا۔

شکایت اہل زمانہ:

نابُردہ بصبح در طلب شامے چند ننہادہ زخویشتن بُرون گامے چند
در کسوت خاص آمدہ عامے چند بدنام کنندۂ نکونامے چند

کہتا ہے: ابنائے زمانہ کا یہ حال ہے کہ نہ کبھی بیداریٔ شب کی زحمت گوارا کرتے ہیں، نہ عشق و محبت الٰہی میں بے خود ہوتے ہیں۔ مگر اہل کمال کا لباس زیب بدن فرما کر عوام الناس کی فریب دہی کے واسطے آمادہ رہتے ہیں۔ ان مردمان دغا پیشہ کے سبب سے وہ لوگ بھی بدنام و بے اعتبار ہو جاتے ہیں، جو فی الواقع اہل دل اور صاحب کمال ہوتے ہیں۔

اس رباعی کا مصرع چہارم زبان زد خاص و عام ہے۔ توحید:

اے در طلب تو عالمے در شر و شور در پیش تو درویش و توانگر ہمہ عور
اے با ہمہ در حدیث و گوش ہمہ کر اے با ہمہ در حضور و چشم ہمہ کور

(عور۔ بظم عین مہملہ برہنہ حدیث گفتگو)

تجھ تک رسائی کی تمنا میں ہر ذرۂ کائنات تکالیف شاقہ کا سامنا کر رہا ہے۔ تیرے نزدیک درویش وتونگر بالکل ایک حکم میں ہیں۔ تو ہر شخص سے گفتگو کر رہا ہے، مگر کوئی سننے والا نہیں۔ تو سب کے روبرو موجود ہے، مگر سب نابینا ہیں۔

(زمانہ، جولائی ۱۹۲۲ء، جلد ۳۹، ص۔ ۳۵۵۔۳۶۲)

حواشی و حوالاجات

۱۔ ان حکمائے یونان کے انگریزی نام یوں ہیں: ارسطو۔ Aristotle، فیثا غورث۔ Pythagoras، سقراط۔ Socrates اور بطلیموس۔ Ptolemy۔ مرتب)

۲۔ تاریخی طور پر یہ بات غلط ہے، کیونکہ عمر خیام (تولد: ۴۱۲ھ مطابق ۲۲ یا ۱۰۲۱ء، وفات: ۱۶ یا ۵۱۵ھ مطابق ۱۱۲۲ء) کا تعلق عہد سلجوقی (۴۲۹ھ مطابق ۱۰۳۸ھ تا ۵۵۲ھ مطابق ۱۱۵۷ء) سے تھا، جبکہ محمود غزنوی کا عہد ۳۸۹ھ مطابق ۹۹۹ء سے ۴۲۱ھ مطابق ۱۰۳۰ء ہے۔ بحوالہ Jan Rypka, History of Iranian Literature, Dordrecht, 1968, P-190& 745۔ مرتب)

۳۔ (طوس قدیم ایران کے پیشدادی بادشاہ نوذر کا بیٹا اور منوچہر کا پوتا تھا اور توران کے خلاف ایرانی سپاہیوں کی کمان سنبھالی تھی۔ اس کا ایک اور معنی یہ ہے کہ یہ 'توس' کا معرب ہے، جو ایران کے صوبہ خراسان کے ایک شہر کا نام ہے۔ بحوالہ زہرای خانلری، فرہنگ ادبیات فارسی دری، انتشارات بنیاد فرہنگ ایران، ۱۳۴۸ش، ص.۳۲۸ و ۵۲۱ و مولوی سید تصدق حسین، لغات کشوری، کراچی، ص.۳۰۸۔ مرتب)

☆☆☆

رباعیات عمر خیام

اکبر حیدری کاشمیری

رباعیات عمر خیام کے متعدد مطبوعہ نسخے مختلف زبانوں میں ہماری نظر سے گزرے ہیں۔ ان تمام میں سب سے خوبصورت اور دیدہ زیب وہ نسخہ ہے، جو شہنشاہ ایران کے بیست و پنجمین سال سلطنت کے جشن کے موقعہ پر ۱۹۶۹ء میں تہران سے شائع ہوا۔ ہندوستان میں یہ ایڈیشن نادر و نایاب ہے۔ راقم کو اس کا ایک نسخہ ڈاکٹر نیر مسعود رضوی، ریڈر، شعبہ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی سے مستعار ملا۔ یہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں بعض ایسی باتوں کا انکشاف کیا گیا ہے جس کے باعث مناسب سمجھا گیا کہ اس پر ایک مفصل ریویو لکھا جائے۔

سب سے پہلے عمر خیام کا ذکر جس کتاب میں ملتا ہے، وہ نظامی عروضی سمرقندی کی ''چہار مقالہ'' ہے۔ مصنف خیام کا ہم عصر اور شاگرد تھا۔ وہ مقالہ سوم ''در علم نجوم.....'' کی ساتویں حکایت میں لکھتا ہے کہ ۵۰۶ھ میں خیام نے مجھ سے کہا کہ میری قبر ایسی جگہ ہوگی جہاں ہمیشہ گلباری ہوتی رہے گی۔ نظامی عروضی کے اصل الفاظ یہ ہیں:

''در سنہ ست و خمسایۃ (۵۰۶ ہجری) در بلخ
درمیان مجلس عشرت از حجۃ الحق عمر شنیدم کہ او گفت.......

گور من در موضع باشد کہ ہر بہارے شمال بر من گل افشان
می کند"۔

پھر ۲۴ سال کے بعد نظامی ۵۳۰ ہجری میں نیشاپور جاتے ہیں، یہاں وہ عمر خیام کی قبر پر فاتحہ خوانی کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ قبر کی گلباری کے بارے میں جو پیشین گوئی خیام نے کی تھی، وہ حرف بحرف صحیح نکلی:

"چوں در سنہ ثلثین (۵۳۰ ہجری) نیشاپور رسیدم۔
چند سال بود تا آن بزرگ روئے در نقاب خاک کشیدہ بود
وعالم سفلی از و یتیم ماندہ و او بر من حق استادی بود۔ آدینہ
بزیارت او رفتم و یکے را با خود بردم کہ خاک او بمن نماید۔
مرا بگورستان حیرہ بیرون آورد و بر دست چپ گشتم در پائین
دیوار باغے خاک او دیدم نہادہ و درختان امرود و زرد آلود
سراز ان باغ بیرون کردہ و چندان برگ شگوفہ بر خاکِ او ریختہ
بود کہ خاک او در زیر گل نہان شدہ بود و مرا یاد آمد آن حکایت کہ
بشہر بلخ از و شنیدہ بودم"۔ (۱)

یہ بات قابل ذکر ہے کہ نظامی خود کو خیام کا شاگرد بتاتے ہیں لیکن انھوں نے چہار مقالہ میں ان کی شاعری کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ وہ اپنے استاد کا خوب احترام کرتے تھے اور انھیں خواجہ امام اور حجتہ الحق کے القاب سے یاد کرتے تھے۔

چہار مقالے کے بعد دوسری کتاب "تاریخ بیہقی" ہے۔ اس کے مصنف ابوالحسن بیہقی ہیں۔ یہ کتاب ۵۶۲ ہجری میں لکھی گئی۔ مصنف کا دعویٰ ہے کہ وہ ۵۰۷ ہجری میں خیام کے حلقہ درس میں مشرف ہوا تھا اور خیام کو وزیر فلسفی اور حجتہ الحق کہتا ہے۔ یہ بھی لکھتا ہے کہ خیام علم وحکمت میں بوعلی کا ثانی تھا لیکن خود وہ (خیام) خشک، بداخلاق اور تنگ نظر شخص تھا۔ کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ خیام، ریاضی، طب، نجوم، لغت، تاریخ اور فقہ میں مہارت

رکھتے تھے۔ بیہقی نے خیام کی شاعری کے بارے میں خاموشی اختیار کی۔

سب سے پہلے جس کتاب میں خیام کا ذکر بحیثیت شاعر کیا گیا ہے۔ وہ ''خرید القصر'' ہے۔ یہ کتاب عربی میں عماد الدین کاتب اصفہانی نے خیام کی وفات کے کم وبیش پچاس سال بعد ۵۷۲ ہجری میں لکھی تھی۔ محققین خیام کو ایک اہم اور معتبر کتاب ''مرصاد العباد'' دستیاب ہوئی۔ اس کے مصنف نجم الدین رازی ہیں۔ یہ کتاب ۶۲۱ ہجری میں تصنیف ہوئی۔ مصنف ایک متعصب صوفی ہے جو خیام کو باطلانہ نقطہ نظر سے دیکھتا ہے اور انھیں فلسفی، دہریہ اور نیچری کہتا ہے کہ نگاہ کا ثمر ایمان ہے اور عمل کا ثمر عرفان، فلسفی دہریہ اور نیچری ان دونوں مقامات سے محروم اور سرگشتہ و متحیر ہیں۔ فضلا میں سے ایک آدمی جو اندھوں کے نزدیک فضل وحکمت اور دانائی کے سبب مشہور ہے، خیام ہے اور اپنی گمراہی کی وجہ سے یہ شعر کہتا ہے:

در دائرہ کامدن ورفتن ماست — آنرا نہ ہدایت، نہ نہایت پیداست
کس می نہ زند دمی درین عالم راست — کین آمدن از کجا و رفتن بکجا ست

....

دارندہ چو ترکیب طبائع آراست — باز از چہ سبب فگندش اندر کم وکاست
گرزشت آمد این صورت عیب کراست؟ — در نیک آمد، خرابی از بہر چہ خواست

رازی یہ بھی کہتے ہیں کہ زندگی کے بعد مارنے اور موت کے بعد زندہ کرنے میں حکمت کیا تھی کہ کوئی اس سر پھرے غافل اور بے ہودہ شخص کا جواب دے۔

ع۔ دارندہ چو ترکیب طبائع آراست

حقیقت یہ ہے کہ خیام نام نہاد اور تنگ نظر ملاؤں کے خلاف تھے جو شریعت کے لباس میں لوگوں کا استحصال کرتے تھے۔ ان کو ڈراتے تھے اور توہمات میں گرفتار کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی رباعیاں عرصہ دراز تک اشاعت نہ پاسکیں۔ ''اخبار العلماء باخبار الحکما'' ۶۴۶ ہجری میں لکھی گئی ہے۔ (۲) اس میں خیام پر سخت الفاظ میں مذمت کی

گئی ہے۔ مصنف کہتا ہے کہ شریعت کے لیے ان شعروں کا باطن زہریلے سانپوں اور گمراہی کی زنجیروں کی طرح تھا۔ جب لوگوں نے اپنے دین کے مطابق اس پر عیب لگایا اور اس کے باطنی خیالات کو ظاہر کیا تو وہ اپنے قتل سے ڈرا اور اس نے اپنی زبان اور قلم کی باگ موڑ لی اور حج کو چلا گیا......اور ناپاک اسرار کا اظہار کیا......اس کے اشعار مشہور ہیں جن کے پردوں میں اس کے دل کی گہرائیوں کا پتہ چلتا ہے اور اس کی باطنی کدورت کا اظہار ہوتا ہے۔

قدماء کی بعض دوسری کتابیں بھی ہیں، جن میں خیام کے بارے میں غلط اور گمراہ کن لوگوں نے ان کے بارے میں تعصب کی بناء پر بعض ایسی خرافات وضع کی ہیں، جن میں کوئی حقیقت نہیں اور اس قسم کے افسانوں کو مقبول صادق ہدایت کے اصلی خیام سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ ان میں نزہت الارواح، تاریخ الحکما، آثار البلاد، فردوس التواریخ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

زیر نظر رباعیات عمر خیام کے ایڈیشن کی تفصیلات درج ذیل ہیں:

سائز:۱۳x۱۸ اس م، صفحات ۲۴۲، کاغذ ولایتی (آرٹ پیپر) کتابت، طباعت، گٹ اپ خوبصورت، ہر صفحے میں داہنی طرف فارسی اور بائیں طرف انگریزی نمبر پڑے ہیں۔ یہ نمبر یکساں نہیں ہے۔ دائیں طرف کے پہلے صفحے میں جہاں فارسی نمبر شروع ہوتا ہے، اسی صفحے پر انگریزی نمبر ختم ہوتا ہے۔ بائیں طرف کالی جلد پر سنہری حروف میں انگریزی میں ''رباعیات حکیم عمر خیام سیکنڈ ایڈیشن از ایڈورڈ فٹز جیرالڈ'' کی عبارت درج ہے۔ بائیں طرف ص۔۳ سے ص۔۲۱ تک علی اکبر کاشانی، مینجنگ ڈائرکٹر، تہران ایران کمپنی کا حیرت انگیز مقدمہ ہے، جس کا ترجمہ انگریزی میں جناب ایم، کے، استوار کیا۔ ص۔۲۳ سے ص۔۵۰ تک صادق ہدایت کا پر مغز اور معرکہ آرا تحقیقی مقالہ انگریزی میں ہے، جو انھوں نے رباعیات عمر خیام کے انتخاب میں ۱۹۳۴ء میں شائع کیا۔ اس کے بعد ایڈورڈ فٹز جیرالڈ کا معلوماتی دیباچہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''انڈیا ہاؤس میں رباعیات خیام کا کوئی قلمی نسخہ موجود نہیں ہے۔ پیرس کے کتب خانے بھی اس سے خالی ہیں۔ انگلستان میں صرف ایک نسخہ نمبر ۱۴۰/ کے تحت باڈلین لائبریری میں محفوظ ہے، جو ۱۴۶۰ء میں شیراز میں لکھا گیا تھا، اس میں ۱۵۸/ رباعیاں ہیں۔ ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ میں ایک نسخہ ہے۔ یہ ناقص اور نامکمل ہے اور اس میں ۵۱۶ رباعیاں ہیں۔ اس کا دوسرا نسخہ فٹز جیرالڈ کے پاس بھی تھا۔ دان ہمیر کی ملکیت میں جو نسخہ تھا، اس میں تقریباً ۲۰۰/ رباعیاں ہیں۔

رباعیات خیام کا ایک نسخہ کلکتہ میں ۱۸۳۶ء میں چھپا تھا، اس میں ۴۳۸/ رباعیاں تھیں۔ یہ نسخہ اب نایاب ہے۔ اس کے آخر میں ۵۴/ رباعیوں کی فہرست بھی تھی۔ لیکن یہ خیام کی ثابت نہیں ہوسکیں۔''

رباعیات خیام کے ایک نسخے کا ذکر ڈاکٹر اشپرنگر نے بھی اودھ کیٹلاگ میں صفحہ ۴۸۷/ میں نمبر ۳۲۴/ کے تحت کیا ہے۔ یہ نسخہ توپ خانے میں تھا۔ اس میں ۳۴/ صفحے تھے اور ہر صفحہ میں ۱۲/ رباعیاں۔ اس طرح لکھنؤ کے اس نسخے میں کم وبیش ۴۰۰/ رباعیاں تھیں۔ ابتدا میں نثر میں کسی کا لکھا ہوا دیباچہ بھی تھا۔ اس کے بعد یہ ذیل کی رباعی سے آغاز ہوتا ہے:

ع۔ اے سوختہ ای سوختہ ای، سوختنی

فٹز جیرالڈ نے ۱۱۰/ رباعیوں کا منظوم انگریزی ترجمہ کیا تھا، جو تہران ایڈیشن میں شامل کیا گیا ہے اور یہ **صفحہ ۶۵/ سے صفحہ ۸۷/ تک ہے۔ ص۔ ۸۸/ میں عمر خیام کی ایک رنگین تصویر ہے، جس کے سامنے کے صفحہ میں لکھا ہے:**

''حکیم عمر خیام ۴۰۷ ہجری قمری مطابق ۳۹۵ ہجری خورشیدی برابر ۱۰۱۶ عیسوی میں پیدا ہوئے اور ۵۱۷ ہجری قمری مطابق ۵۰۵ ہجری خورشیدی برابر ۱۱۲۳ میلادی میں وفات پا گئے۔''

اس کے بعد اس عبارت کا مفہوم انگریزی میں بھی درج ہے۔ صفحہ ۹۰/ میں ایڈورڈ فٹز جیرالڈ کی رنگین تصویر ہے۔ اس کے دائیں طرف لکھا ہے:

''ایڈورڈ فٹز جیرالڈ انگریزی شاعر ۱۸۰۱ء میں بریڈ فیلڈ سوفلک کے شہر میں پیدا ہوا اور ۱۸۸۴ء میں وفات پائی''۔

دوسری طرف عمر خیام کا جدید مقبرہ ہے۔ اس کے سامنے یہ عبارت ہے:

''مقبرہ حکیم عمر خیام، ۱۳۴۱ ہجری خورشیدی میں نیشاپور میں امام زادہ محمد محروق کے مزار کے صحن کے نزدیک۔ عمر خیام کے قدیم مقبرہ کے بجائے نیا مقبرہ بنایا گیا۔ قدیم مقبرہ دسویں صدی میں تعمیر ہوا تھا۔''

صفحہ۔ ۹۴/ اور صفحہ۔ ۹۵/ میں سونے کے تمغے کا عکس ہے۔ اس کے نیچے یہ عبارت ہے:

''بین الاقوامی نمائش گاہ میں جو کہ بروکسل میں ۱۹۵۸ء میں منعقد ہوئی، رباعیات حکیم عمر خیام کو جو پانچ زبانوں میں شائع ہوئی۔ بہترین کتابِ سال قرار دیا گیا اور اس افتخار میں جناب علی اکبر کاشانی کو سونے کا تمغہ مرحمت کیا گیا۔''

صفحہ۔ ۹۶/ میں درج ہے کہ:

''افتخاری ڈپلومہ بین الاقوامی نمائش گاہ میں جو کہ

بروکسل میں ۱۹۵۸ء میں منعقد ہوئی۔ جناب علی اکبر کاشانی کو حکیم عمر خیام کی رباعیات پانچ زبانوں میں چھاپنے پر افتخاری ڈپلومہ دیا گیا۔"

داہنی طرف جلد پر یہ عبارت درج ہے:

"""میخانۂ خیام" یعنی حکیم عمر خیام کی ۵۶۷ رباعیات کا منظوم اردو ترجمہ، اثر خامۂ افسر الشعراء آغا شاعر قزلباش دہلوی"

اس کے بعد دوسرے سرورق کی عبارت یہ ہے:

"کتاب رباعیات حکیم ابوالفتح غیاث الدین ابراہیم خیام نیشاپوری و شاگردان مکتب خیام از انتشارات شرکت سہامی تحریر ایران، برادران کاشانی، تہران، چہار راہ لالہ زار اسلامبول، حق طبع و تقلید مخصوص و محفوظ است۔ شرکت سہامی تحریر ایران، ۱۳۴۳ش مطابق ۱۹۶۹ء"۔

ایک صفحے میں ذیل کی عبارت درج ہے:

"در دوران بیست و پنجمین سال سلطنت پر افتخار اعلیٰ حضرت ہمایون محمد رضا شاہ پہلوی، شہریار عظیم الشان ایران، بمناسبت برگزاری جشن بیست و پنجمین قرن بنیان گزاریٔ شاہنشاہی ایران بدست کورش کبیر بزیور طبع آراستہ گردید۔ شرکت سامی تحریر ایران۔"

اس کے بعد ایک صفحہ میں شہنشاہ ایران کی رنگین اور خوبصورت تصویر ہے۔ داہنی طرف ہی صفحہ۔۲ سے صفحہ۔۵ تک "توضیح دربارہ حروف اختصار محققین مولفین رباعیات خیام" کے عنوان کے تحت ۳۲ ماخذ کتابوں کی تفصیل درج ہے۔ صفحہ۔۶ سے صفحہ۔۲۹ تک

علی اکبر کاشانی کا خیام کے بارے میں ایک بسیط مضمون فارسی میں ہے۔ صفحہ۔۳۰ سے صفحہ۔۸۴ تک صادق ہدایت کے معرکہ آرا مضمون کا اردو ترجمہ ہے۔ جو ڈاکٹر سید محمد اکرم شاہ کے قلم کا نتیجہ ہے۔ صفحہ۔۸۵ رمیں پھر آغا شاعر قزلباش کی کتاب ''میخانۂ خیام'' جس کے ٹائیٹل کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، شائع کیا گیا ہے۔ صفحہ۔۸۶ سے صفحہ۔۱۰۰ تک عمر خیام پر آغا شاعر کا بہت ہی عمدہ اور معلوماتی مضمون ہے، جو ان کے لاہور والے پہلے ایڈیشن سے ماخوذ ہے۔ صفحہ۔۱۰۵ سے رباعیات خیام درج ہیں۔ ابتداء میں خیام کی فارسی رباعی پھر اس کے بعد ڈاکٹر روزن کا منظوم انگریزی ترجمہ اسی رباعی کا۔ پھر آغا شاعر کی منظوم اردو رباعی کا ترجمہ۔ اس کے بعد ترکی شاعر ساہر کی منظوم ترکی رباعی اور آخر میں اسی صفحے میں احمد الصافی عربی شاعر کی منظوم عربی رباعی کا ترجمہ ہے۔ یہ سلسلہ صفحہ۔۵۴۱ تک جاری ہے۔ یعنی ہر صفحے میں پہلے فارسی رباعی ہے پھر اس کے بعد اس کا منظوم انگریزی ترجمہ (روزن) پھر آغا شاعر قزلباش کی اردو منظوم رباعی، اس کے بعد ترکی اور عربی زبانوں میں اس کا منظوم ترجمہ۔ پھر ہر صفحے میں داہنی طرف خیام کی پانچ رباعیات درج ہیں اور ہر رباعی کے نیچے اس کے ماخذ بھی دیے گئے ہیں۔ بائیں طرف کے ہر صفحے میں آغا شاعر کی پانچ منظوم رباعیاں ہیں۔

کتاب میں ۱۱۰ رخوبصورت رنگین تصویریں ہیں۔ ہر تصویر میں آٹھ آٹھ دس رنگ بھر دیے گئے ہیں۔ یہ تصویریں خیام کے فلسفے کی روشنی میں بنائی گئیں۔ یہ ایسی دلآویز اور حسین ہیں کہ دل کے گھر میں رکھنے کے قابل ہیں۔ غرض یہ کہ دل ربا اور دل فریب تصویریں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ تعریفوں سے بے نیاز اور بالاتر ہیں۔

عمر خیام کی وفات کو تقریباً ۹۰۰ سال گزر گئے ہیں۔ ان کی شہرت ایران میں کم اور مغربی ممالک میں زیادہ ہے۔ سینکڑوں برس گزر جانے کے بعد بھی ان کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ان کی یہ مقبولیت فردوسی، محمد زکریا رازی، خواجہ نصیر الدین طوسی، البیرونی، سعدی، حافظ، مولانا رومی، نظامی گنجوی اور دوسرے ایسے ہی علماء اور فضلا کے

مقابلے میں زیادہ ہے۔ مغربی دنیا ان کے نام کی مالا جپتی ہے۔ فرانس، جرمنی، لندن، ڈنمارک، امریکہ، روس اور اٹلی میں خیام بہت ہی مقبول اور ہر دل عزیز ہیں۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ بائبل کے بعد اگر کسی کتاب کی زیادہ اشاعت ہوئی ہے، تو وہ رباعیات خیام ہے۔ مقبولیت کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ لندن کے عالموں اور دانشوروں نے ۱۸۹۳ء میں خیام کے نام سے ایک کلب قائم کیا۔ ممبران کلب خیام کی قبر پر حاضری دینے کے لیے نیشاپور گئے اور وہاں خیام کی قبر سے دو سرخ گلاب کی قلمیں چن لیں۔ پھر بڑی مشکل سے اپنے ہمراہ لندن لے گئے۔ یہاں انھوں نے یہ گلابی قلمیں فٹز جیرالڈ کی قبر پر نصب کیں۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ انگلستان کے ادباء، فضلاء اور دانشور دوبارہ نیشاپور گئے اور یہاں انھوں نے 'جشن عمر خیام' منایا۔ امریکہ اور لندن میں خیام کے نام سے ہوٹل، ریسٹورنٹ اور کلب قائم کیے گئے ہیں۔ ان کی تقلید میں سری نگر کشمیر میں بھی 'خیام ہوٹل' اور 'خیام سنیما' قائم کیے گئے ہیں جو آج تک اسی نام سے مشہور ہیں۔

عرب ممالک، ترکی، ہندوستان، پاکستان اور افغانستان وغیرہ کے علمائے تحقیق نے رباعیات خیام پر کافی کام کیا ہے۔ رباعیات خیام کا ترجمے دنیا کی مختلف ۲۸/ زبانوں میں ہوئے۔ ان میں انگریزی، فرانسیسی، جرمنی، اٹلی، روسی، ہنگری، اسپانیائی، یونانی، ڈنمارکی، آسوری، عربی، عبری، ترکی، جاپانی، ارمنی، گرجی، ازبکستانی، گجراتی، ہندی، اردو، کشمیری اور بنگالی زبانیں قابل ذکر ہیں۔

ایرانی علماء اور محققین نے یہ مہم چلائی تھی کہ رباعیات خیام کے بارے میں کھوج لگایا جائے کہ ان کی اصلیت کیا ہے، یعنی ان میں سے حقیقی معنوں میں کتنی رباعیاں خیام کی ہیں اور کتنی الحاقی۔ ان میں ذکاء الملک فروغی، ڈاکٹر غنی، صادق ہدایت، جناب سعید نفیسی اور جناب اعتصام زادہ قابل ذکر ہیں۔ یہ سب کے سب فارسی زبان وادب کے مانے ہوئے اساتذہ تھے۔ ان حضرات نے خیام کی الحاقی رباعیوں کی تلاش کا بیڑا اٹھایا۔ فروغی اور ڈاکٹر غنی نے علامہ قزوینی کے تعاون سے فرہنگ وزارت تعلیم ایران کے زیر اہتمام صرف

۱۵۸/ رباعیات کا انتخاب کیا، جو ان کی رائے میں خیام کی ہیں۔ اس انتخاب کے بارے میں بھی انھیں شبہ تھا کہ آیا یہ سبھی خیام کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''مدعی نیستیم بطور قطع ویقین (کہ) این رباعیات از خیام است یا این کہ رباعیات خیام منحصر باین ۱۷۸/ رباعی است وبنظر ما اینہا از نوع سخن حکیم نیشاپور است وشائستگی دارد۔ اما حاکم حقیقی درین امر ذوق وسلیقہ مابودہ است نہ سند ودلیل وبرہان۔''

یہ انتخاب وزارت تعلیم ایران کے اہتمام سے ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا تھا۔

صادق ہدایت مرحوم نے بھی خیام کی رباعیات کی چھان بین کی تھی۔ انھوں نے ''ترانۂ خیام'' کے نام سے خیام کی ۱۴۳/ رباعیوں کا انتخاب ۱۹۳۴ء میں شائع کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''ماعجالتہً این ترانہ ہارا باسم ہمان خیام منجم وریاضی دان ذکر می کنیم، چون مدعی دیگری پیدا نکردہ تا ببینیم این اشعار مربوط بہمان خیام منجم وعالم است یا خیام دیگری گفتہ۔''

استاد سعید نفیسی نے ۴۴۵/ رباعیات خیام کا انتخاب ۱۹۳۰ء میں شائع کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''تا بحال نزدیک بہ پنج ہزار رباعی بخیام نسبت دادہ اند ومحققین از میان این عدۂ کثیر فقط ۲۵۰/ تا ۳۰۰/ رباعی را از گفتہ خیام می دانند۔''

ابوالقاسم اعتصام زادہ نے خیام کی ۴۲۸/ رباعیوں کے انتخاب کا فرانسیسی زبان منظوم ترجمہ کیا۔ اس کام کے لیے انھیں فرانس کی اکادمی سے تمغہ بھی ملا تھا۔ یہ انتخاب فرانسیسی اور فارسی میں ۱۹۲۹ء میں فرانس کی 'بروخیم لائبریری' نے شائع کیا۔ اعتصام زادہ

اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ:

''نگارندهٔ این تعداد رباعی را بزبان فرانسه ترجمه نموده، تقدیم فضلائے ایران وارو پامی نماید۔ بدون آنکه آنها را بالتمام متعلق به خیام بداند، تصور می نمایند که ممکن است از آثار حکیم باشد زیرا که قراین فنی و فلسفی تا حدّی ایں حسب ونسب را به ثبوت می رساند، بدیہی است که چون تا کنون ہیچ کس تدقیقات وتفحصات عمیقه را که موجب تشخیص رباعیات خیام باشد به عمل نیاورده است۔ اگرچه از رباعیات مندرج درین کتاب متعلق به خیام باشد۔ البته ارباب فضل وکمال برمترجم خورده نه خواهند گرفت بلکه نظریات خود را مرقوم خواهند داشت که در چاپ دوم بانهایت تشکر اصلاح شود۔''

صادق ہدایت بڑی تحقیق وتلاش کے بعد رباعیات خیام کے مستند اور غیر مستند ہونے کے بارے میں اپنے انتخاب میں مزید لکھتے ہیں:

''بہر حال جب تک ایک ایسا خطی نسخہ جو زمانے اور سندیت کے اعتبار سے ''مونس الاحرار'' کی تیرہ رباعیات کی طرح ہاتھ نہ آئے، اتنی دیر تک خیام کی اصلی رباعیوں کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ دینا مشکل ہے۔ علاوہ ازیں، ایسے شاعر بھی پیدا ہوئے ہیں، جنھوں نے خیام کے مزاج اور ان کے مشرب کے مطابق رباعیاں کہی ہیں اور اس کی پیروی کی کوشش کی ہے، لیکن ان کے کلام کی روانی خواہ کتنی ہی کامل کیوں نہ ہو، اگر ہم ایک مضمون کا بھی خیام کے سلیقے اور عقیدے کے خلاف دیکھیں گے تو نہایت جرأت کے ساتھ

اس کی نسبت کو خیام سے سلب کر سکتے ہیں۔ کیونکہ خیام کی
رباعیاں نہایت واضح، سلیس اور سادہ ہیں۔ تمسخر اور اشارہ
میں وہ بالکل نہیں جھجکتا۔ ان باتوں سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے
کہ ہر پست قسم کا خیال جو ایک مصنوعی اور بے ڈھب سانچے
میں ڈھلا ہوا ہو، وہ خیام کا نہ ہوگا۔ خیام کا خاص مشرب یہ ہے
کہ اس کا مسلک فلسفہ ہے اور طرز بیان آزاد، شیریں اور واضح
ہے اور یہ ایسی خصوصیات ہیں جن کو ہم مذکورہ مسئلہ کا معیار
قرار دے سکتے ہیں۔ چونکہ خیام کی ان رباعیوں کا ابھی تک
کوئی دوسرا مدعی پیدا نہیں ہوا، لہذا ہم سر دست ان رباعیوں کو
اسی ریاضی دان اور منجم خیام سے منسوب کیے دیتے ہیں تاکہ
دیکھیں کہ آیا یہ اشعار اسی منجم اور عالم خیام سے متعلق ہیں یا کسی
دوسرے خیام نے کہے ہیں۔ البتہ اس کام کے لیے ہمیں
دیکھنا چاہیے کہ اس کے فکر اور فلسفے کا انداز کیا تھا۔''

صادق ہدایت نے خیام کی جن الحاقی رباعیوں کی نشاندہی کی ہے، ان میں سے چند
یہ ہیں:

ابریقِ مے مرا شکستی ربی   بر من در عیش را بہ بستی ربی
من مے خورم و تو میکنی بدمستی   خاکم بدہن مگر تو مستی ربی

اس رباعی کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک دفعہ چاندنی رات میں خیام شراب پی
رہے تھے۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آتا ہے اور شراب کا پیالہ زمین پر گر پڑتا ہے اور ٹوٹ جاتا
ہے۔ اس پر خیام نے غصے میں آ کر مذکورہ بالا رباعی کہتا ہے، اس پر خدا کا قہر خیام پر نازل
ہوتا ہے اور فوراً ان کی صورت سیاہ ہو جاتی ہے۔ تب کہتے ہیں:

ناکردہ گناہ در جہاں کیست، بگو   آنکس کہ گنہ نکرد چوں زیست، بگو

من بدکنم و تو بد مکافات دہی — پس فرق میان من و تو چیست، بگو

تو خدا ان کو معاف کر دیتا ہے اور ان کا چہرہ منور اور دل روشن ہو جاتا ہے۔ پھر کہہ اٹھتے ہیں کہ ''اے خدا مجھے اپنی طرف بلا لے'' اس کے بعد طائرِ روح قفسِ بدن سے پرواز کر جاتا ہے۔

ان رباعیوں کے بارے میں صادق ہدایت کہتے ہیں کہ یہ معجزہ نما بے ہودہ کہانی نجم الدین رازی کی گالیوں سے بھی زیادہ خیام کی توہین کرتی ہے۔ یہ ایک بچکانہ افسانہ گھڑ لیا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ خیام کی وفات کے بعد ان کی والدہ درگاہ الٰہی میں خیام کی مغفرت کی دعا مانگتیں۔ اسی عالم میں ایک رات خواب میں خیام کی روح دیکھتی ہے، جو کہتی تھی:

اے سوختۂ سوختۂ سوختنی — اے آتش دوزخ از تو افروختنی

تا کے گوئی کہ بر عمر رحمت کن — حق را تو کجا برحمت آموختنی

بقول صادق ہدایت اس قسم کے افسانے خیام کے متعلق کثرت سے ملتے ہیں، جو قابل ذکر نہیں اور اگر ان سب کو اکٹھا کیا جائے تو ایک بے ہودہ سی افسانوں کی کتاب بن جاتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ خیام جوانی سے لے کر بڑھاپے تک ایک مخصوص فلسفے کے پابند رہے اور ندامت، مغفرت، پشیمانی یا توبہ کو کبھی دل میں نہیں آنے دیا۔ ذیل میں ان کے مخصوص فلسفے کی چند رباعیوں کا منظوم اردو ترجمہ آغا شاعر کی کتاب ''میخانۂ خیام'' سے درج کیا جاتا ہے تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو:

قدرت نے مجھے حسن دیا تھا کیسا — رخ پھول سا، قد سرو سا پیارا پیارا

پر یہ نہ کھلا کہ خاک کرنے کے لیے — نقاش نے یہ نقش سنوارا کیوں تھا

....

یہ آج کے دن کہ نوجوانی ہے مری — مے پینے میں شادمانی ہے مری

کیوں اس کو برا کہو، مجھے بھاتی ہے — تلخ اس لیے ہے کہ زندگانی ہے مری

....

افسوس کہ عالم جوانی گزرا وہ لطف بہار زندگانی گزرا
وہ رات کہ جس کا نام تھا عہد شباب افسوس! کب آیا، کب وہ پانی گزرا

....

اب دامن زہد و توبہ گردانوں گا پیری میں اٹھے گا مے پرستی کا مزا
پیمانے مری عمر کے ستر تو ڈھلکے اب بھی نہ کیا عیش، تو پھر کب ہوگا

صادق ہدایت کی تحقیق کے مطابق خیام کی اصلی رباعیوں کی صرف ایک اہم سند جو موجود ہے، وہ ''مونس الاحرار'' کی تیرہ رباعیاں ہیں جو ۷۴۱ء ہجری میں لکھی گئیں اور جرمنی کے ڈاکٹر روزن کی رباعیات عمر خیام کے آخر میں برلن میں چھپی ہیں۔(۳) یہ رباعیاں تاریخی لحاظ سے پرانی ہونے کے ساتھ ساتھ خیام کی روح، ان کے فلسفے اور ان کے انداز بیان سے پوری پوری تطبیق کرتی ہیں۔ ان رباعیوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کا مصنف ایک مستقل فلسفے، طرز فکر اور مخصوص اسلوب کا مالک ہے۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا واسطہ ایک مادی اور نیچر فلسفی سے ہے۔ لہذا ہم پورے اطمینان کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ رباعیاں خیام کی ہیں اور ان کی دوسری رباعیوں کے پہچاننے کے لیے گویا معیار اور کسوٹی کی حیثیت رکھتی ہیں۔

زیر نظر نسخہ تہران میں اردو کے مشہور و معروف شاعر افسر الشعرا آغا شاعر مظفر علی قزلباش تخلص شاعرؔ، عرف آغا شاعر قزلباش کی کتاب ''میخانۂ خیام'' کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ آغا شاعر نے ۶۴۰ / رباعیات کا منظوم اردو ترجمہ اسی بحر و وزن میں کیا، جن میں خیام کی رباعیاں ہیں۔ کتاب ''میخانۂ خیام'' ایک زمانہ ہوا کہ لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ اب یہ نایاب ہے۔ اس کا ایک نسخہ راقم کے کتب خانے میں موجود ہے۔ ''میخانۂ خیام'' کے بعد ۱۹۲۳ء میں خیام کی ۶۴۷ / رباعیوں کا دوسرا منظوم اردو ترجمہ مختلف اوزان و بحور میں سید محمد لایق حسین قوی امروہوی نے نئی دہلی سے ''تاج الکلام'' کے نام سے شائع کیا۔ یہ نسخہ بھی اب عنقا کے برابر ہے۔ تہران ایڈیشن میں ''تاج الکلام'' سے صرف ۱۰ / رباعیاں آخر میں

آغا شاعر کی منظوم رباعیوں کے ساتھ شامل کی گئی ہیں۔ یہ رباعیاں ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸ اور ۵۵۹ نمبر کے تحت اس لیے درج کی گئی ہیں کہ ''میخانۂ خیام'' میں نہیں ہیں۔ ان کے بارے میں علی اکبر کاشانی کہتے ہیں:

''چوں چند رباعی مسلم از خیام در اشعار قزلباش نبود، آنہا را از کتاب ''تاج الکلام'' سید محمد لایق حسین صاحب قوی امروہوی اقتباس با تصحیح آقای دکتر عرفانی بچاپ رسید۔''

ذیل میں عمر خیام کی چند مستند رباعیوں کا منظوم ترجمہ جو تہران ایڈیشن میں موجود ہے، درج کیا جاتا ہے۔ ان رباعیوں میں عمر خیام کا مخصوص فلسفہ حیات جلوہ گر ہے:

آئی یہ ندا صبح کو میخانے سے اے رند شراب خوار، دیوانے سے
اٹھ جلد، بھریں شراب سے ساغر ہم کم بخت! چھلک جائے نہ پیمانے سے

....

طعنے نہ دے مستوں کو جو ہے مے سے حذر ہم توبہ بھی کرلیں گے مشیت ہے اگر
ہے فخر یہی نا، کہ تو میخوار نہیں سو عیب ہیں اور مے سے بدتر بدتر

....

جب ابر بہاری رخ لالہ دھوئے اٹھو بادہ و جام کا تہیہ کر لے
یہ سبزہ جو ہے آج تمہاری تفریح لہکے گا یوں ہی گور پہ یہ کل تیرے

....

مسجد میں خلوص سے میں آیا تو کیا کچھ قصد نماز سے نہیں یہ حاشا
سجادہ یہاں سے میں چرا بھاگا تھا وہ پھٹ گیا اب اور ہوں لینے آیا

....

خالق نے جو ترکیب طبائع کیں سب پھر ان میں کم و بیش سے کیا تھا مطلب؟
تھیں خوب اگر تو توڑنے کا باعث؟ دل کو نہ لگیں تو اتنی کثرت کا سبب؟

....

یہ دور کہ جس میں ہے یہ آنا جانا آغاز نہ انجام ٹھکانا نہ پتا
صد حیف کسی نے بھی نہ یہ بتلایا آئے ہیں کہاں سے اور کہاں ہے جانا

....

ہے صبح کا وقت جاگ اے ماہ لقا! پی چسکیاں لے لے کے، ذرا چنگ بجا
جو زندہ ہیں پائیں گے نہ وہ عمر دراز جو مرگئے پھر ان کو نہیں ہے جینا

....

خیام زمانہ اس سے رکھتا ہے ننگ دنیا کے جو غم میں بیٹھا ہے دل تنگ
دلی ساغر بلور میں اور چنگ بجا قبل اس کے آپس میں ملیں شیشہ و سنگ

....

ہے چرخ فلک کو تاک، میری تیری لے لے گا یہ جانِ پاک، میری تیری
اس وقت تلک سبزے پہ مے نوشی کر تا سبزہ اگائے خاک، میری تیری

....

ہے بادہ کہنہ یار دیرین مرا بے دختر رز نہ عیش آئین مرا
کہتے ہیں شرابی کا کوئی دین نہیں اس مے کی قسم یہ مے ہے خود دین مرا

....

مینائے شراب کی یہ قلقل آہا قمری کی صدا نوائے بلبل آہا
پہلو میں پری ہو، سر میں مے کا سرور بے فکر جہاں بھر سے بالکل آہا

....

اک غل ہے کہ جنت میں ہے حوروں کا پرا شہد اور شراب کے بہیں گے دریا
جائز ہے جو ہم ہیں مے و معشوق پرست انجام کو جب یہی وہاں بھی ہوگا

....

یہ دفتر عمر پاک ہونا ہے، ضرور مرنے کے لیے قبر کا کونا ہے، ضرور

ہاں! ساقی مہ لقا تیری خیر رہے دے آبِ عنب کہ خاک ہونا ہے، ضرور

....

لا جام شراب دے لبالب بالکل کس وقت مگر جب ہوں چہکتے بلبل
بے نغمہ اگر شراب ہوتی جائز سنتے نہ کبھی شیشہ کے منھ سے قلقل

....

ساقی ہو، شراب ناب (کی) سرسبز ہو کشت یہ سب ہوں تو پھر مجھے تجھے یہیں ہے بہشت
واہی ہے نہ سن بہشت و دوزخ کا ذکر دوزخ گیا کون؟ کس نے دیکھا ہے بہشت

....

سبزہ ہو جہاں کنار جو سے لہکا گویا ہے لب فرشتہ خو سے لہکا
ذلت سے کبھی نہ رکھنا سبزے پہ قدم یہ سبزہ ہے خاک لالہ رو سے لہکا

....

صحرا میں جہاں لالۂ رنگین ہے کھلا سلطاں کا خون، (یا) ہے کسی قیصر کا
جو پتی بنفشہ کی زمیں سے پھوٹی تل ہے جو کسی چاند سے رخسار پہ تھا

....

وہ جس نے مری خاک کا پتلا ڈھالا واقف تھا عمل سے مرے جو کچھ ہوگا
بے حکم نہیں اس کے، مرا کوئی گناہ پھر حشر میں یہ جلنا جلانا کیسا؟

....

قسمت میں جو رزق لکھ دیا ہے تیرا ذرہ نہ گھٹے گا نہ بڑھے گا اصلا
جو چیز میسر ہے، یوں ہی تھی ملنی جس چیز کا داغ رہ گیا، رہنا تھا

....

سو دو سو کی ہو عمر تیری یا کہ ہزار اس ٹوٹے کھنڈر سے لے چلیں گے لاچار
سلطان ہو تو کوئی (یا) بازاری فقیر ہے ایک ہی بھاؤ دونوں کا آخرکار (۴)

....

جو خار بزیر قدم حیواں ہے وہ زلف صنم ہے، ابروئے جاناں ہے
ہر اینٹ جو ہے قصر کے کنگورے پر انگلی ہے وزیر کی، سر سلطاں ہے

....

میخانہ ہے آباد مرے پینے سے خون دو ہزار توبہ ہے سر پہ مرے
بے جرم رہوں میں تو ہے رحمت بیکار رحمت کی تو زینت ہے گناہوں سے مرے

(ماہنامہ شیرازہ، سری نگر، جلد۔۲۴، شمارہ۔۶۔۷، ص۔۵۔۱۸)

حواشی وحوالاجات

۱۔ چہار مقالہ۔ص ۸۳، لاہور ایڈیشن)

۲۔ (جمال الدین قفطی کی یہ کتاب ۶۲۴ھ سے ۶۴۶ھ کے درمیان تالیف ہوئی۔
بحوالہ سید سلیمان ندوی، خیام، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۸۸ء، ص ۲۳ و ۳۱۔
مرتب)

۳۔ (نسخہ تہران میں ان کے نمبر آغا شاعر دہلوی کے منظوم اردو ترجمہ کے تحت یہ ہیں۔
۱۸۹۔۲۲۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۹۰، ۴۲۵، ۴۷۰، ۵۵۰، ۵۵۱، ۱، ۲، ۳، ۴۔ مضمون نگار)

۴۔ قوس میں دیے گئے الفاظ بعد میں اضافہ کیے گئے ہیں۔ مرتب

☆☆☆

مترجم خیام: ایڈورڈ فٹز جیرالڈ

محمد اسحاق صاحب ایم۔ اے۔

ایڈورڈ فٹز جیرالڈ کی شہرت تمام وکمال عمر خیام کی رباعیات کے ترجمہ کی بدولت ہوئی ہے۔ اس نے بہت سی کتابیں لکھیں، لیکن سب طاق نسیان کے سپرد ہوگئیں، مگر عمر خیام کی رباعیات کے بے بہا ترجمے نے اس کے نام کو زندہ جاوید کردیا۔ فیز جیرالڈ نے فارسی نظموں کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ اس کے ایک دوست کو بوڈلین کی مشہور لائبریری (Bodlien Library) میں عمر خیام کی رباعیوں کا خودنوشت نسخہ دستیاب ہوا، جو سفید کھال پر سیاہ روشنائی سے لکھی ہوئی تھیں اور اس پر کچھ طلائی کام بھی تھا، جس کی وجہ سے فٹز جیرالڈ کی توجہ اس نسخہ کی طرف مبذول ہوئی۔ (۱)

فٹز جیرالڈ اور عمر خیام دونوں فطرتاً ہم مذاق تھے۔ فیٹز جیرالڈ کا بیان ہے کہ عمر کی رباعیات سے مجھے بڑی تسکین حاصل ہوتی ہے۔ عمر خیام فوری جذبات کا آدمی تھا، حسن و عشق سے اسے دلی لگاؤ تھا وہ خوبصورتی کا دلداہ تھا۔ یہی حال، فٹز جیرالڈ کا تھا۔ عمر کے خیالات پر ایک خاص طرز کی موہوم فلسفہ کا تسلط تھا۔ اس کا فلسفہ انسان کی روحانی کشمکش کے مخمصوں میں الجھا ہوا تھا۔ فٹز جیرالڈ بھی اسی عقدۂ لاینحل کی بھول بھلیاں میں بھٹک رہا تھا۔

آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ فیز جیرالڈ نے جو اس وقت تک ایک کہنہ مشق پختہ کار اور کامل شاعر ہو چکا تھا، قدرے غور و فکر اور اصلاح و ترمیم کے بعد خیام کے خیالات کو ایسے لفظوں میں انگریزی میں پیش کیا، جو علم و معرفت سے بھرپور تھے۔ اس نے متین سنجیدہ اور شاندار الفاظ میں خیام کے شاعرانہ جذبات کی ترجمانی کی۔ اس کا طرز بیان فلسفیانہ ہونے کے باوجود لطافت کے لحاظ سے فطرت کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا اور اس میں ایک خاص قسم کا سوز و گداز بھی تھا، جو پڑھنے والوں کو سرشار کر دیتا تھا۔

عمر خیام حقیقی معنوں میں شاعر تھا، اس کا علمی مذاق قابل قدر تھا اور سلطان کے وزیر کی طرف سے اسے وظیفہ بھی ملتا تھا۔ مغرب میں وہ صرف منجم اور مہندس کی حیثیت سے مشہور تھا۔ یہاں تک کہ فٹز جیرالڈ نے اس کی رباعیات کا انگریزی میں ترجمہ کر کے، اسے شاعر کا خطاب دیا۔ اگرچہ بعض نقادفن اسے ایسا صوفی بتاتے رہے، جو معبود برحق کو اپنے مبہم الفاظ میں ظاہر کرتا ہے، لیکن فٹز جیرالڈ نے اسے ایسے شاعر کی حیثیت سے پیش کیا ہے، جو دراصل ملحد ہے، لیکن جس نے زندگی و موت کے اہم مسائل کو اپنا موضوع بنایا۔ اس کے جذبات ہرگز روحانی یا وجدانی نہیں ہیں۔ وہ صرف گذشتہ زندگی اور جوانی کی امنگ کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا اور ایام عیش و عشرت پر نظر کرتا ہے۔ زندگی کی خوشی اور دنیوی لذتیں اسے وجد میں لاتی ہیں۔ اس کا عقیدہ یہ نہیں ہے کہ دنیا کی لذتیں اور خوشیاں چند روز ہیں، اس لیے ان سے پرہیز کیا جائے، بلکہ وہ ان لذائذ میں سرتاپا غرق رہنا چاہتا ہے۔ عالم سفلی کی خوبصورت اور لذیذ چیزیں کس طرح اس قدر جلد زوال پذیر ہو سکتی ہیں؟ یہ عمر خیام اور فٹز جیرالڈ دونوں کے لیے ایک معمہ ہے۔ کسی لذت کو کیوں ترک کیا جائے یا اس کو کسی دوسرے نادیدہ دور کی امید میں کیوں خیرباد کہا جائے، خیالات کو واقعیت کا جامہ کیوں نہ پہنایا جائے، اپنی امیدوں اور آرزوؤں سے اپنے لیے عیش و نشاط کی محفل کیوں نہ آراستہ کی جائے۔ یہی ان دونوں کا فلسفۂ زندگی ہے۔

ایڈورڈ فٹز جیرالڈ ۱۸۰۹ء میں وڈ برج (Wood Bridge) کے قریب سفوک

(Suffolk) میں پیدا ہوا۔ یہیں اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گذارا۔ معاش کی طرف سے وہ بے فکر تھا، بلکہ اس کی زندگی عیش و آرام میں بسر ہوئی، جو اسے خود بھی بہت پسند تھی، لیکن وہ ہمیشہ اس سے مزید آسائش کا جویا رہتا تھا۔ لوگوں نے اسے وہمی کا خطاب دے رکھا تھا۔ طالب علمی کے زمانہ میں وہ آوارہ گردی کرتا رہا۔ نامور مصنفین کی کتابوں کو جنہیں وہ خود پسند کرتا، بے ترتیبی کے ساتھ مطالعہ کرتا رہا۔ اس کا انہماک تصویر سازی، راگ، رنگ اور تغزل کی طرف تھا۔ اسے سیاسی اور سماجی معاملات سے کوئی دلچسپی نہ تھی، جو اس کے دوسرے ساتھیوں کو مرغوب تھیں، اسے پسند نہ تھیں۔ وہ چلتا پھرتا باتیں کرتا اور اپنے احباب کے کمروں میں گشت لگاتا، سگار پیتا، گیت گاتا تھا اور اپنی تحریریں تھیکرے (Thackeray) کو دکھاتا۔ وہ مالدار تھا، لیکن سلیقہ سے خرچ کرنے سے ناواقف تھا۔ اس کی عادت تھی کہ جب کسی کتاب کا کوئی خاص حصہ اسے پسند آتا تو پھاڑ کر اسے رکھ لیتا اور باقی کتاب کو پھینک دیتا۔ اس طرح اس کے پاس مکمل کتابوں کی جلدیں بہت ہی کم تھیں۔ اپنے ذاتی رکھ رکھاؤ اور لباس سے وہ اس درجہ بے فکر تھا کہ ایک مرتبہ جب اس کی ماں اپنی چار گھوڑوں کی بگھی میں سوار ہو کر شہزادی کی طرح کیمبرج پہنچی اور اپنے بیٹے سے ملاقات کے لیے کہلا بھیجا تو اس وقت اس کے پاس کوئی جوتا بھی نہ تھا۔

اکیس سال کی عمر میں اس نے ڈگری حاصل کی، جس کے بعد وہ ایک طرح کی خود فراموشی اور آرام و آسایش کی زندگی بسر کرنے لگا، جو اس کی موت کے ساتھ ختم ہوئی۔ وہ خلوت پسند واقع ہوا تھا اور اس کی سرشت غم پسند تھی۔ چنانچہ تمام عمر ایسی ہی کیفیت قائم رہی۔ وہ سماجی قیود سے بالکل آزاد اور دنیوی بندشوں سے متنفر رہنا چاہتا تھا۔

تیس سال کی عمر میں اسے اپنا گھر بنانے کا شوق ہوا، گو اس کا پرانا گھر بہت بڑا تھا لیکن اب وہ ایک چھپر کے جھونپڑے میں رہنے لگا، جس میں صرف دو کمرے تھے۔ یہ جھونپڑا اس کے گھر کی عمارت کے دروازے پر بنا تھا۔ یہاں شیکسپیئر کی تصویر، ایک بلی، ایک کتا اور ایک طوطے کے ساتھ رابن سن کروسو (Robinson Crusoe) کی زندگی بسر کرتا

تھا۔ اس کے خادم دو میاں بیوی تھے، جو اسی کی ریاست میں ملازم تھے۔ جھونپڑی بے ترتیبی کی زندہ مثال تھی۔ اس میں تصویریں اور کتابیں بکھری ہوئی پڑی تھیں۔ ایک میز یا Piano کی متعدد لاٹھیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف بیر کا پیپا، جو اس کے عیش وعشرت کا واحد ذریعہ تھا، لڑھکا پڑا تھا۔ فٹز جیرالڈ یہیں بیٹھتا۔ اس کے بال بکھرے رہتے تھے، داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ اسی جھونپڑی میں وہ خواب کے لباس میں جوتیاں پہنے ہوئے ملتا یا باغ میں گشت لگاتا نظر آیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ پڑوس میں چکر لگا کر اپنے دوستوں سے ملتا۔ گرچا وہ شاذونادر ہی جاتا تھا، تاہم نہایت بے لوث زندگی بسر کرتا تھا اور ہر وقت ادبی جوش میں سرشار رہتا تھا۔

فٹز جیرالڈ ہر وقت مصروف رہتا تھا۔ طبیعت خوش کرنے کو وہ عمر خیام کی رباعیات پر طبع آزمائی کرنے لگتا تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا، وہ ٹینی سن، کارلائل، تھیکرے اور جارج براؤن کا دلدادہ ہوتا گیا۔ کہتے ہیں کہ جب ٹینی سن سے پوچھا گیا کہ وہ اپنے دوستوں میں سے کس کو سب سے زیادہ عزیز رکھتا ہے تو اس نے کہا کہ ''یقیناً میں فٹز جیرالڈ کو بہت چاہتا ہوں۔''

درحقیقت فٹز جیرالڈ کے سبھی دوست اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس کی تنقیدی قابلیت کے معترف تھے۔ وہ نہایت ذہین آدمی تھا۔ اس کی طبیعت میں انسانی ہمدردی اور محبت بھری ہوئی تھی۔ گو وہ عزلت پسند تھا، تاہم اپنے وقت کا بیشتر حصہ ملاحوں کے ساتھ وہیں Deben ندی میں اپنی کشتی پر گزارتا تھا۔ زندگی کے تمام ضروری کاموں سے بے تعلق سا رہتا۔ رسمی چیزوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا۔ مزاج میں چڑچڑاپن آ گیا تھا۔ اس کی شادی ادھیڑ عمر میں ہوئی، مگر یہ اس کے حق میں کامیاب ثابت نہ ہوئی۔ اس نے مس بارٹن سے کسی وعدہ کی بنا پر بیاہ تو کر لیا، لیکن چھ ماہ کی قلیل مدت میں اس نے علاحدہ ہو کر اپنا راستہ علاحدہ اختیار کر لیا اور غوروخوض کی تفکرانہ زندگی بسر کرنے لگا اور اس کی بیوی نے اپنی سابق زندگی اختیار کر لی۔ تھوڑے دنوں تک تو وہ خط وکتابت کرتی رہی، لیکن پھر کبھی یکجا نہ

ہوئے۔

عمر خیام کی رباعیات کا ترجمہ فٹز جیرالڈ نے سب سے پہلے فریزر میگزین (Fraser Magezine) میں چھپنے کے لیے بھیجا تھا، لیکن جب دو سال تک نظمیں شائع نہ ہوئیں تو فیٹز جیرالڈ نے انھیں واپس لے لیا اور اس مجموعہ کو خود اپنے خرچ سے شائع کرایا، لیکن کتاب فروخت نہ ہوئی اور کتب فروش کوارچ نے کتب خانہ کے باہر ایک پیسہ والے طاق میں رکھ دیا۔ خوش قسمتی سے اسے راسیٹی نے مول لیا اور اپنے دوستوں سے بھی اس کے خریدنے کی استدعا کی اور اس طرح اس کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔

اس محنت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں، جو فٹز جیرالڈ نے عمر خیام کی رباعیات کو انگریزی کا جامہ پہنانے میں اٹھائی۔ اس نے رباعیات کی بار بار ترمیم اور اصلاح کی۔ اس کی زندگی میں اس کے چار ایڈیشن شائع ہوئے۔ فٹز جیرالڈ اور عمر خیام فطرت کے ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اس کی خوشی کی تمام گھڑیاں اس خیال سے منغض تھیں کہ ہر چیز فانی اور آنی ہے۔ یہ خیال اس کے دل پر بری طرح مسلط تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ اگر کوئی نظم فطرت کی سچی ترجمان ہو تو وہ ضرور مقبول ہوگی۔

آخر ایام میں فٹز جیرالڈ غم واندوہ کا ایک پتلا نظر آتا تھا۔ ۱۸۸۳ء میں چوہتر سال کی عمر میں نارفوک میں وہ اپنے ایک دوست سے ملنے گیا تو اچانک اس کا انتقال ہو گیا۔ وہ رات کو اچھا خاصا سویا تھا، صبح کو گھر کا ایک خادم اسے اٹھانے کے لیے گیا تو معلوم ہوا کہ رات کو اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ بہر حال:

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

(ماہنامہ زمانہ، کانپور، جلد۔ ٦۵، جولائی۔ دسمبر ۱۹۳۵ء، ص۔ ۲۹۔ ۳۲)

حواشی

۱۔ بوڈلین لائبریری کا نسخہ ۸۶۵ھ کا ہے، اس طرح اس کا خیام کا خود نوشتہ ہونا ممکن نہیں۔ مرتب۔

☆☆☆

بچّن — ہندی کا خیام

محمود واجد

''کھاؤ پیو اور خوش رہو''۔ یہ قول ایک کہاوت کی طرح مشہور ہو گیا ہے۔ ادب کی تاریخ میں ایسا تصور رکھنے والے کم نہیں۔ عربی شاعر ابونواس کا کلام شراب میں ڈوبا ہوا ہے۔ فارسی کے عمر خیام کی رباعیاں مئے گلگوں سے غسل کر کے نکلی ہیں۔ انگریزی کے براؤننگ کے سانیٹ نشے میں سرمست ہیں۔ اردو کے ریاض، واعظ کو بھی شیشے میں اتارنے پر تلے ہوئے ہیں۔ مگر ان سب میں اور سب سے جدا خیام کا نظریہ ہے۔ کل کی فکر فضول ہے، آج کو اپناؤ اور جینے کا حق ادا کرو۔ یہاں تک کہ وہ اس مستی میں خدا کو بھی نہیں بخشتا۔

ابریق مئے مرا شکستی ربّا　　برمن در عیش را بہ بستی ربّا
برخاک فگندی مئے گلگون مرا　　خاکم بدہن کہ تخت مستی ربّا

(اے خدا تو نے میری شراب کی صراحی توڑ دی۔ مجھ پر عیش کا دروازہ بند کر دیا۔ میری سرخ شراب کو خاک پر گرا دیا۔ خاکم بدہن تو بھی مست ہے، اے رب!)۔ وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ:

چوں فوت شوم ببادہ شوئید مرا　　تلقین زشراب و جام گوئید مرا

خواہید کہ روزِ حشر یابید مرا   از خاک درمیکدہ جوئید مرا

(جب میں مروں تو شراب سے مجھے غسل دو اور (بوقت مرگ) جام و شراب ہی تلقین کرو۔ اگر چاہتے ہو کہ قیامت کے دن مجھے پاؤ تو درمیکدہ کی مٹی میں مجھے تلاش کرو۔)

ہندی شاعر بچن بھی کم و بیش یہی تخیل رکھتا ہے:

میرے ادھروں پر ہو انتم بستو نہ تلسی دَل پیالا   میری جِھیا پر ہو انتم بستو نہ گنگا جل ہالا

میرے شو کے پیچھے چلنے والوں یاد اسے رکھنا   ''رام نام ہے ستیہ'' نہ کہنا، کہنا سچی مدھوشالا

(میرے ہونٹوں پر آخری وقت تلسی کی پتی نہ ہو، بلکہ جام ہو اور میری زبان پر آخری شئے گنگا جل نہ ہو، بلکہ شراب ہو۔ اے میرے جنازہ کے پیچھے چلنے والو! یاد رکھو کہ ''رام نام ستیہ (سچ) ہے'' نہ کہنا، بلکہ کہنا کہ میخانہ کا نام سچا ہے۔)

ذہنی طور سے تو دنیا کی مختلف زبانوں کے سبھی بڑے شاعر ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ غالب نے کہا تھا:

مئے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو   اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

اور یہ بیخودی محض غم سے نجات پانے کی راہ ہے۔ بچن بھی اسی دور سے گزرے اور بے اختیار پکار اٹھے:

یاد نہ آئے دکھ میں جیون اس سے پی لیتا ہالا   جگ چنتاؤں سے رہنے کو مکت اٹھالیتا پیالا

شوق سادھ کے اور سواد کے ستیو پیا جگ کرتا ہے   پر میں وہ ردگی ہوں جس کی ایک دوا ہے مدھوشالا

(میں شراب اس لیے پیتا ہوں کہ دکھ بھری زندگی یاد نہ آئے۔ دنیا کی فکر سے نجات پانے کو جام اٹھاتا ہوں۔ لوگ شوق، لگاؤ اور مزے کے لیے پیتے ہیں، لیکن میں وہ بیمار ہوں، جس کی دوا ہی شراب ہے۔)

حضرت جگر نے بھی کچھ ایسی بات بڑے پیارے انداز میں کہی ہے:

اس واسطے پیتا ہوں کہ جل جائے جوانی   واللہ کسی شوق کے مارے نہیں پیتا

لیکن اس ساری باتوں سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہر شراب کا مقصود حقیقی شراب ہے۔

بعض حالات میں یہ محض علامتی شئے ہے۔ شراب مئے عرفان بھی ہے۔ فارسی اور اردو کے بیشتر اساتذہ نے اسے انھیں معنوں میں لیا ہے۔ ہاں بعض نے اسے مجازی معنی پہنائے ہیں۔ یہ بات بڑے فنکاروں کے ساتھ عجیب رہی ہے کہ نجی زندگی کی پرچھائیں تک اپنے فن پر پڑنے نہیں دیتے (میرا مطلب بے راہ روی سے ہے) یہ کردار کا معجزہ ہے، لیکن اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ عملی زندگی میں کسی نے شراب کو ہاتھ بھی نہ لگایا ہو اور شراب پر بے شمار پہلوؤں سے اشعار کہے ہوں۔ اردو میں ریاض اس کی تابندہ مثال ہیں، جن کے یہاں خمریات پر شاید سب سے زیادہ (ہزاروں اشعار) ہیں۔

مجھ سے مینا یہی کہتا ہے بہ آواز بلند   میرے ہوتے ہوئے اندیشۂ فردا کیا ہے

خیام کہتا ہے:

مئے خور کہ چنیں عمر کہ غم در پئے اوست   آن بہ کہ بخواب یا بہ مستی بگذرد

(شراب پی تا کہ زندگی میں جو غم ہے، وہ اس میں ڈوب جائے۔ ہر فکر کو مستی میں سمو کر ٹال دے!)

غم بھلانے کو شراب پینے کا جواز تقریباً سبھی شاعروں نے ڈھونڈا ہے، لیکن ہر ایک کا زاویۂ فکر جدا ہے۔ کوئی شراب کو شراب سمجھ کر پیتا ہے، کوئی خون دل پیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ شراب پی لی۔ اپنا اپنا ظرف ہے۔ بچن ان معنوں میں ہندی کے ریاض ہیں کہ انھوں نے خود شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اپنے مجموعۂ کلام ''مدھوشالا'' میں وہ کہتے ہیں:

''مدھوشالا کے بہت سے پاٹھک (قاری) اور شروتا (سامعین) ایک سمے (وقت) سمجھا کرتے تھے، کچھ شاید اب بھی سمجھتے ہوں کہ اس کا لیکھک (مصنف) دن رات مدیرا (شراب) کے نشے میں چور رہتا ہے۔ واستوکتا (حقیقت) یہ ہے کہ مدیرا نام دھاری درب (شراب نامی جنس) سے میرا پریچئے (تعارف) اکچھر شہ (لفظاً) برائے نام ہے۔ نشے سے انکار نہیں کروں گا۔ زندگی ہی ایک نشہ ہے۔ کویتا (شاعری) بھی ایک نشہ ہے، اور بھی بہت سے نشے ہیں۔ اپنے پریمیوں کا بھرم دور کرنے کے لیے ایک سمے (وقت) میں نے ایک

رباعی لکھی تھی:

سوئیم نہیں پیتا اوروں کو کینتو پلا دیتا ہالا   سوئیم نہیں چھوتا اوروں کو پر پکڑا دیتا پیالا
پر اپدیش کشل بہتیروں سے میں نے سیکھا ہے   سوئیم نہیں جاتا اوروں کو پہنچا دیتا مدھوشالا

(میں خود نہیں پیتا، لیکن اوروں کو شراب پلا دیتا ہوں۔ خود نہیں چھوتا، لیکن دوسروں کو جام پکڑا دیتا ہوں، لیکن یہ نصیحت میں نے بہت سارے ماہروں سے سیکھی ہے کہ خود نہیں جاتے، لیکن دوسروں کو مئے خانہ تک پہنچا دیتے ہیں۔)

پھر بھی برابر پرشن (سوال) ہوتے رہے۔ ''آپ پیتے نہیں تو آپ کو شراب پر لکھنے کی پریڑنا (تحریک) کہاں سے ملتی ہے؟'' پرشن بھولا تھا، پر تھا ایمان دار۔ ایک دن دھیان (خیال) آیا کہ کائستھوں کے کُل (خاندان) سے جنما (پیدا ہوا) ہوں، جو پینے کے لیے پرسِدھ (مشہور) ہے۔ سوچنے لگا کہ پوروَجوں (آباؤ واجداد) کا کیا ہوا مدُھو پان (مئے نوشی) مجھ پر سنسکار (روایت) نہ چھوڑ گیا ہوگا۔ ایک رباعی لکھی:

میں کائستھ کلو دھو، میرے پرکھوں نے اتنا ڈھالا   میرے تن کے لہو میں پچھتر پرتی شت ہالا
پشتینی ادھیکار مجھے ہے مدیرا لے کر آنگن پر   میرے پر دادوں کے ہاتھ بکی تھی مدھوشالا

(میں کائستھوں کی اولاد، میرے آباؤ اجداد نے اتنا ڈھالا کہ میرے جسم کے خون میں پچھتر فیصدی شراب ہے۔ میرا حق میخانے کے آنگن پر خاندانی ہے، چونکہ میرے دادوں، پردادوں کے ہاتھ میخانہ بکا تھا۔)

لیکن سچ تو یہ ہے کہ ہم لوگ اموڑھا کے کائستھ ہیں، جن کے یہاں کنوندتی (کہاوت) ہے کہ اگر کوئی شراب پی لے تو کوڑھی ہو جائے گا۔ یہ بھی نیتی (قدرت) کا ایک وینگیہ (طنز) ہے، جنھوں نے مدیرا (شراب) نہ پینے کی اتنی کڑی پرتگیا (عہد) کی تھی، ان کے ونشج (اولاد) نے مدیرا کی اتنی وکالت کی۔!''

رباعی کا فن ایک مخصوص بحر و وزن رکھتا ہے، آہنگ و نغمہ رکھتا ہے، لب و لہجہ رکھتا ہے۔ یہ فارسی الاصل ہے۔ ہندی میں اس کا تتبع بہت کم ہوا ہے۔ سب سے اہم کوشش بچن

نے کی اور اسے بعینہ رباعی تو نہیں، ہاں اس کے قریب لے آئے۔ ایک ہی التزام انھوں نے رکھا ہے کہ ہر چوتھے مصرعے میں 'مدھوشالا' (میخانہ) کی تکرار ہے۔ زبان و بیان کے لحاظ سے فراق نے 'روپ' کی رباعیاں لکھ کر اردو کو ہندی کے قریب کیا یا یوں کہیے کہ ہندی کو اردو کے قریب لے گئے۔ ہندی شاعری میں اردو (اور فارسی بھی) کے خلاف عشق کا اظہار جنسِ لطیف کی طرف سے ہوتا ہے اور یہی بنیادی فرق ہے، ہندی اور اردو شاعری کا۔ جہاں اردو میں مردانہ وقار اور آہنگ ہے، وہاں ہندی میں نسوانی حیا اور والہانہ پن ہے۔ جہاں جہاں ہندی نے اردو اور اردو نے ہندی کے اثرات قبول کیے ہیں، وہاں وہاں مزاج کی ہم آہنگی ملتی ہے۔ پھر بھی بنیادی وصف تہذیبی اور تمدنی قدروں کا حامل ہوتا ہے۔ اردو (دوسرے معنوں میں فارسی جس کے تہذیبی اور تمدنی اثرات اردو میں سب سے زیادہ ہیں) اپنا مخصوص مزاج رکھتی ہے اور ہندی اپنا، حالانکہ دونوں بہنیں ہیں۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ بچن کی رباعیاں عمر خیام کی رباعیوں سے اثر انداز ہوئی ہیں۔ فرق صرف قدروں اور تہذیبوں کا ہے...... ہندوستان اور ایران کا ماحول جداگانہ مزاج رکھتا ہے، لہٰذا قوتِ حیات کے اجزاء الگ الگ ہیں۔ بچن نے خود کہا ہے:

> ''میں نے عمر خیام کے ہردے (دل) بھاؤنا پرسونوں
> (جذبات کے پھولوں) کو اپنی بھاشا (زبان) کے تار میں
> پرو کر چڑھایا (پیش کیا) ہے۔''

عمر خیام کی رباعیاں بظاہر کتنی ہی سرشاری و سرمستی میں ڈوبی ہوں، مگر واقعتاً فکری اور فنی اعتبار سے اتنی بلند ہیں کہ ان تک ہر کس و ناکس کی رسائی ممکن نہیں۔ ان میں جذب بھی ہے اور خلوص بھی۔ یہی ان کی مقبولیت کا راز ہے۔ بچن بھی ہندی ادب مین کم مشہور نہیں۔ ان کی ایک تصنیف ''مدھوشالا'' کے ہی چودہ ایڈیشن نکل چکے ہیں اور پچھلے تیس برسوں سے آج تک اسی طرح مقبول عام ہیں۔ (۱) خلوص یہاں بھی ہے، مگر خیام کی طرح اپنا مخصوص فلسفۂ حیات نہیں۔ لہذا، فکری گہرائی اتنی زیادہ نہیں۔ پروفیسر نرنجن، جو بچن کے

بہت قریب رہے ہیں اور دل و جان سے انھیں عزیز کی طرح چاہا ہے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''مدھو شالا'' سمبندھی (سے متعلق) کویتائیں
(شاعری) ان کی فلاسفی کے کارن (سبب) اتنی شرلسکر
(اعلیٰ) پرتیت (محسوس) نہ ہوئیں۔'' بچن کی ''یگ دھونی''
سے موازنہ کرتے ہوئے آگے چل کر وہ لکھتے ہیں۔ ''ایک
کاچر پریمی (پرانا عاشق) ہوں تو ایک کاچر پرِچیت (پرانا
واقف کار)، ایک کاچر دھیانی (پرانا غور کرنے والا) ہوں، تو
ایک کاچر گیانی (پرانا عالم)۔''

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ایک کا اثر اگر ذہن پر پڑتا ہے تو دوسرے کا دل پر۔ ایک سے محض واقفیت ہے تو دوسرے سے قلبی لگاؤ ہے اور یہ دوسرا 'یگ دھونی' ہے نہ کہ 'مدھو شالا'۔ دراصل جو دل میں ہلچل مچادے، وہ پروفیسر نرنجن کے نزدیک اصل شاعری ہے۔ اسی میں انسان ڈوب کر رہ جائے۔ ان باتوں سے قطع نظر اگر دیکھئے تو آپ محسوس کریں گے کہ بچن کی رباعیاں خیام کی رباعیوں کی طرح جام میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ بچن نے خود ہی لکھا ہے:

''آج مدیرا (شراب) لایا ہوں، جسے پی کر بھوِشیہ
(مستقبل) کے بھئے (خوف) بھاگ جاتے ہیں اور بھوت
کال (ماضی) کے دارون دکھ (سنگین غم) دور ہو جاتے ہیں۔
جسے پان کر (پی کر) مان اپمان (عزت و ذلت) کا دھیان
(ہوش) نہیں رہ جاتا اور گورَو (غرور) کا گروَ (فخر) لپت
(پوشیدہ) ہو جاتا ہے، جسے ڈھال کر مانو (انسان) اپنے
جیون (زندگی) کی وِیتھا (الم) پیڑا (تکلیف) اور کٹھنائی
(مشکل) کو کچھ نہیں سمجھتا اور جسے چکھ کر منُش (آدمی) شرَم
(محنت)، سنکٹ (مصیبت)، سنتاپ (اذیت)، سبھی کو بھول

جاتا ہے۔ آہ! جیون کی مدیرا (زندگی کی شراب)، جو ہمیں
وِوَش (مجبور) ہوکر پینی پڑتی ہے، کتنی کڑوی ہے! یہ مدیرا
(شراب)، اس مدیرا کے نشے کو اتار دے گی۔!''

ان الفاظ سے بچن کی رباعیوں کا پس منظر واضح ہو جاتا ہے۔ زندگی بڑی سخت ہے، اس کے مصائب جان لیوا ہیں۔ ان سے بچنے کی ایک راہ ہے، وہ یہ کہ انسان انھیں بھول جائے۔ شراب کے نشے میں ڈوب جائے۔ شراب اور شراب خانہ یہاں پر پھر علامت بن جاتے ہیں۔ بچن کی 'مدھوشالا' (میخانہ) اشارہ ہے، محبت اور خلوص سے بھری ہوئی جگہ کے لیے اور 'مدیرا' محبت اور خلوص ہے، جسے پی کر اونچ نیچ بھید بھاؤ کا تفرقہ نہیں رہ جاتا، دیر و حرم، شیخ و برہمن کا جھگڑا ختم ہو جاتا ہے۔ جہاں ہر کسی کو پناہ ملتی ہے۔ جس جگہ ہر کوئی اپنا غم بھول جاتا ہے۔ انسان، انسان کامل بن جاتا ہے۔ کہتے ہیں:

مسلمان اور ہندو ہیں دو، ایک مگر ان کا پیالا ایک مگر ان کا مدیرالے ایک مگر ان کی ہالا
دونوں رہتے ایک، نہ جب تک مسجد مندر میں جاتے بیر بڑھاتی، مسجد مندر میل کراتی مدھوشالا

(مسلمان اور ہندو دو ہیں، مگر ان کا جام ایک ہے، ایک ہی میخانہ ہے، ایک ہی شراب ہے۔ دونوں ایک اس لیے نہیں رہتے کہ مسجد اور مندر ہیں، جو ایک نہیں ہونے دیتے۔ جھگڑا بڑھاتے ہیں، لیکن پھر میخانہ ان میں میل کراتا ہے۔)

اسی طرح مدیرا (شراب)، مدھوشالا (میخانہ)، پیالا (جام) اور ساقی کی علامات سے بڑا کام لے کر بچن نے اپنی رباعیوں میں بڑا تنوع پیدا کیا ہے۔ خیام ان معنوں میں ان سے آگے بڑھ جاتے ہیں، جن میں وہ سمجھتے ہیں کہ زندگی قضا و قدر کے ہاتھوں ہے۔ دو روزہ عمر ہنس کر کیوں نہ گزاری جائے۔ لہذا، وہ غم کو بھی شراب کی طرح پی جانا چاہتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مستی و سرشاری میں وہ بہت دور چلے جاتے ہیں۔

خیام از بہر گنہ این ماتم چیست در خوردن غم فائدہ بیش و کم چیست
آں را کہ گنہ نہ کرد غفران نہ بود غفراں نہ برائے گنہ آمد غم چیست

(اے خیام! گناہوں پر بیکار کڑھتا ہے۔ حق کے کرم کو اظہار کا یہی تو موقع ہے۔ جو گناہ نہیں کرتا، اس کی مغفرت کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔ گناہ کے لیے جب مغفرت ہے تو غم کس بات کا!)

بچن کہتے ہیں:

پاپ اگر پینا، سمدوشی تو تینوں، ساقی بالا نتیہ پلانے والا پیالا، پی جانے والا ہالا
ساتھ انھیں بھی لے جا میرے نیائے یہی بتلاتا ہے قید جہاں میں ہوں کی جائے قید وہیں مدھوشالا

(مئے نوشی اگر گناہ ہے تو تینوں ہی گناہ گار ہیں، ساقیِ گل اندام، روزانہ پلانے والا جام اور پی جانے والی شراب۔ انصاف یہی کہتا ہے کہ انہیں بھی میرے ساتھ لے جا۔ جہاں میں قید ہوں، وہیں پر میخانہ بھی قید ہو!)

انھیں احساس ہے کہ شراب اور اس کے لوازمات دراصل زندگی ہیں۔ اگر اس زندگی کے دروازے بند ہو جاتے ہیں تو زندگی کس کام کی۔ میرے لیے تو یہی سب کچھ ہے۔ زندگی سے اگر خلوص ومحبت نکال دیجیے تو پھر کیا رہ جاتا ہے۔

غم کے باب میں خیام کہتے ہیں:

کے ز غمِ زمانہ محزوں باشی با چشم پر آب و دل پرخوں باشی
مئے نوش و بہ عیش کوش وخوشدل باش زاں پیش کزیں دائرہ بیرون باشی

(کب تک زمانے کے غم میں پریشان ہوگا۔ کب تک چشم غم اور دل پرخوں لے کر رہے گا۔ مستی وشراب میں ہر غم کو ڈبو دے اور خوش رہ۔ کل کی کیا خبر کہ کیا ہوگا!)

خوش اوقات ہونے کی جہاں تک بات ہے، خیام کا اس میں جواب نہیں، لیکن خوش بسری کے ساتھ ہم سفری کا احساس بچن کو ہے۔ وہ میخانہ کو ایسی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، جن میں کوئی تفریق نہیں۔ ما و تو کا جھگڑا باقی نہیں رہ جاتا۔ سب برابر ہو جاتے ہیں۔ خیام مردِ خوش اوقات کا نمائندہ ہے اور بچن مرد کامل (اپنے خیال میں) کا نمائندہ ہے۔ جو بلا امتیاز ایں وآں سب کچھ اکیتا کے لیے نچھاور کر دیتا ہے۔ لطافت بچن کے یہاں بھی کم نہیں ہے۔

شراب اور ساقی کا ذکر ہی لطیف شئے ہے اور پھر اس کا والہانہ اظہار۔ ان کو اس اظہار پر قابو ہے۔ بچن کی آواز سیکڑوں میں پہنچانی جا سکتی ہے۔ ان کا منفرد لہجہ ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہندی شاعری کو انھوں نے ایک نئی جہت عطا کی۔ یہ بچن کا کارنامہ ہے اور اس میں وہ ایک مخصوص مقام رکھتے ہیں۔ ہندوستان ہی کی دوسری بڑی زبان اردو، جو فارسی سے اتنی قریب ہے، وہ بچن کے ایسا شاعر بھی ان معنوں میں پیدا نہ کر سکی، جن میں اپنی مکمل انفرادیت کے ساتھ اپنی مخصوص آواز کا کوئی شاعر ہمارے سامنے پیش کیا جا سکے۔ یہ ہندی کی خوش نصیبی ہے۔

لیکن بچن کے ساتھ یہ بڑی ٹریجڈی ہے کہ ہندی والے انھیں اردو کا اور اردو والے انھیں ہندی کا شاعر سمجھتے ہیں۔ ہندی والے ناراض ہیں کہ ان کی (بچن کی) شاعری کی بنیاد اردو کلچر پر ہے اور اردو والے ان کے یہاں کئی نئی بات نہیں پاتے۔ چونکہ خیام کے اثرات اردو میں یوں بھی کم نہیں، لیکن حقیقت یہ نہیں۔

بچن کی شاعری میں بیشتر پرانے خیالات کی بازگشت سہی، وہ ہندی ادب کو متنوع جذبات کی قوس وقزح سے روشناس ضرور کراتے ہیں۔ اردو والوں کے لیے وہ قابل احترام اس لیے ہیں کہ زبان و بیان کا ایسا گنگا جمنی رنگ پیدا کرتے ہیں کہ دل جھوم اٹھتا ہے اور جدید ادب میں زبان و بیان کا مسئلہ کم اہم نہیں۔ اس حیثیت سے وہ اردو والوں کے لیے قابل تقلید ہیں۔

(ماہنامہ شاعر، بمبئی، جلد۔ ۳۷، شمارہ۔ ۶، جون ۱۹۶۶ء، ص۔ ۲۶۔ ۳۹)

حوالہ جات وحواشی

۱۔ بلاشبہ ہری ونش رائے بچن کی ’’مدھوشالہ‘‘ ہندی شاعری کی مقبول ترین تخلیقات میں سے ایک ہے۔ اس کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۳۵ء میں شائع اس کتاب کی سحر انگیزی آج بھی ویسے ہی برقرار ہے۔ جنوری ۲۰۰۳ء میں شائع اس کے سردھا نجلی ایڈیشن کا جنوری ۲۰۰۶ء تک نو ایڈیشن آ چکے ہیں۔ مرتب

☆☆☆

مرقع اکبر تجویدی

سید علی عباس جلال پوری

''رباعیات عمر خیام مصور'' کے عنوان سے یہ حسین وجمیل مرقع شرکت سہامی تحریر ایران نے تہران سے شائع کیا ہے۔ اس میں حکیم عمر خیام کی ۷۵ منتخب رباعیات کو ایران کے نوعمر نقاش اکبر تجویدیؔ نے تصویر کا جامہ پہنایا ہے۔ یہ تصاویر ان کی سہ سالہ محنت و کاوش کا ثمرہ ہیں۔ راقم الحروف اس مقالہ میں حکیم عمر خیام کے فلسفۂ حیات کو معرض بحث میں نہیں لائے گا کہ اس کا حق مرقع کے مقدمہ نگاروں نے ادا کر دیا ہے، بلکہ ارباب وطن کو ایران جدید کے اس جواں سال اور ہونہار مصور کے فن سے روشناس کرانے کی کوشش کرے گا۔

تاریخ تمدن کے طلبہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ہماری تہذیب کے تار و پود میں ایرانی فرہنگ وتمدن کے عناصر وعوامل بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ ہمارے فنون لطیفہ موسیقی، مصوری، تعمیر، شاعری اور ہمارے تصوف وعرفان سے لے کر ہمارے ملبوسات، تفریحات، مشروبات و ماکولات اور روز مرہ کی رسوم تک میں ایرانی تمدن کے ہمہ گیر اور ہمہ جہت اثرات کا کھوج ملتا ہے۔ عنوان زیر نظر کی مناسبت سے فن مصوری کو لیجیے۔ ہندوستانی آرٹ میں مغل مصوری کو ایک قابل فخر مقام حاصل ہے اور یہ مصوری نتیجہ تھی ہندوستانی روایات فن

اور ایرانی مصوری کے خوش گوار امتزاج کا۔ گلیڈ سٹوئن سالومن کے الفاظ میں ہندوستانی تنے پر گلِ ایران کی شاخ کا پیوند لگایا گیا، جس نے جہاں گیر کے عہد میں عدیم النظیر شگوفے کھلائے۔ ظہیر الدین بابر اور ہمایوں اپنے ساتھ نہ صرف بہزاد اور اس کے معاصرین کے شاہکار لائے تھے، بلکہ ان سلاطین نے بہزاد کے شاگردوں کو بھی اپنے درباروں کی زینت بنایا۔ انہی ایرانی استادوں کے ذوقی فیضان کا نتیجہ تھا کہ ملکی روایات میں زندگی کی نئی رو دوڑ گئی اور مغل مصوری کا وہ شہرۂ آفاق دبستان تشکیل پذیر ہوا، جس کی روایات آج بھی بنگال کی مصوری میں زندہ باقی ہے۔

ایران و ہند میں باہمی تاثیر و تاثر کا سلسلۂ زریں صدیوں تک جاری رہنے کے بعد انقراض دولت مغلیہ پر منقطع ہوگیا۔ مقامِ مسرت ہے کہ پاکستان کی تاسیس کے بعد ان ملکوں کو دوبارہ ایک دوسرے کے قریب آنے کے مواقع مل گئے ہیں اور اس بات کا قوی امکان پیدا ہوگیا ہے کہ ایران اور پاکستان کے دانشور اور ارباب فن اپنے اسلاف کی طرح دوبارہ ایک دوسرے کے لیے ذوقی و وجدانی تحریک و تشویق کا باعث ہوں گے۔ اس وقت جبکہ ہمارے مصوروں کی اکثریت مریضانہ رومانیت یا تجریدی فن کے صحرا میں حیران و سرگرداں ہے، اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ انھیں اکبر تجویدیؔ کے فن سے متعارف ہونے کا موقع بہم پہنچایا جائے، جس نے مشرقی روایات کو جدید مغربی رجحانات میں مروج کرکے پیش کیا ہے۔

مرقع کی تقطیع جیبی ہے۔ اس کے دلفریب گرد پوش کے ایک طرف حکیم عمر خیام کی شبیہہ ہے اور دوسری جانب ایک مغنیہ کی تصویر ہے، جس نے انگور کی بیل کے نیچے بربط چھیڑ رکھا ہے۔ اس کے ادھر ادھر چنگ، خم مے، صراحی، ساغر اور کتاب جیسے آلاتِ ذوق و عیش بکھرے پڑے ہیں۔ یہ تصویر گویا عنوان ہے مرقع کے جملہ مطالب پر اور عنوان بھی ایسا کہ جس دلفریبی پر بقولِ غالب جان نذر کرنے کو جی چاہتا ہے۔

رباعیات کے فارسی متن کے ساتھ ان کے انگریزی، فرانسیسی، جرمنی اور عربی کے

منظوم ترجمے بھی پیش کیے گیے ہیں۔ انگریزی ترجمہ فٹز جیرلڈ کا ہے۔ جرمن ترجمہ غلام رسول تربیت، فرانسیسی ترجمہ اعتصام زادہ اور عربی ترجمہ احمد صافی النجفی کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ ناشرین کا ارادہ ہے کہ ان رباعیات کو یوروپ کے بیشتر ممالک میں مقبول بنایا جائے۔ چنانچہ اعلان کیا گیا کہ اس مرقع کا دوسرا ایڈیشن دنیا کی دس معروف زبانوں کے ترجموں پر مشتمل ہوگا۔ ان زبانوں میں اردو کا نام بھی لیا گیا ہے۔ رباعیات کے تراجم کے علاوہ انہی چار زبانوں میں پیش لفظ بھی لکھے گئے ہیں۔ سعید نفیسی کا پیش لفظ محض تبرک ہے، البتہ صادق ہدایت نے مبسوط اور محققانہ مقدمہ لکھا ہے، جس میں عمر خیام کے فلسفہ اور شاعری پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ مقام افسوس ہے کہ یہ صاحب بعض مقامات پر تعصب بے جا کا شکار ہو گئے ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

''قہقہ ہائے عصبانی او و کنایات واشاراتی کہ بہ ایران گذشتہ نماید پیداست کہ از تہ قلب از رہزنانِ عرب وافکارِ پست آنہا متنفر است وسمپاتی او بطرفِ ایرانی می رود کہ در دہنِ ایں اژدہائے ہفتاد سر غرق شدہ بود با تشنج دست و پا زدہ۔''

قطع نظر اس سے کہ عمر خیام جیسے وسیع القلب حکیم کے کلام پر تبصرہ لکھنے والے کو بھی وسیع النظری سے کام لینا چاہیے تھا، فاضل مقدمہ نویس نے تاریخ کے صریح واقعات کو جھٹلایا ہے۔ وہ اس بدیہی حقیقت سے ناواقف ہیں کہ عربوں کے غلبہ اور استیلاء نے ہی ایرانیوں میں تحصیل علم ومعرفت کے بے پناہ جذبہ کو بیدار کیا تھا۔ ایران کی سرزمین میں مامون الرشید کے اواخر عہد تک چند سالوں میں جتنے علماء وفضلاء پیدا ہوئے، اتنے ہخامنشیوں اور ساسانیوں کے ایک ہزار سالہ دور تسلط وحکومت میں بھی پیدا نہ ہو سکے۔ ''رہزنانِ عرب'' ہی ایران میں آزادیٔ فکر ونظر کا پیام لے کر آئے تھے۔ یہی صحرا نشین تھے، جنھوں نے ایران کے تنزل پذیر معاشرہ کی فرسودہ اقدارِ اخلاق وعمل میں زندگی کی نئی روح پھونک دی تھی اور عوام کو مستبد مرزبانوں اور دہقانوں کے آہنی پنجۂ استبداد سے نجات دلائی تھی اور یہ اسی ''اژدہائے ہفتاد سر'' میں غرق ہونے کا نتیجہ تھا کہ سرزمین ایران نے ابن سینا، فارابی،

البیرونی اور محقق طوسی جیسے لعلِ بے بہا اگلے تھے۔

پھر ارشاد ہوتا ہے:

''خیام در وصف طبیعت تا ہماں اندازہ کہ احتیاج دارد
باچند کلمۂ محیط و وضع را مجسم و محسوس می کند کہ آنہم در زمانی کہ
شعر فارسی در زیر تاثیر تسلطِ عرب یک نوع لغت بازی و اظہار
فضل و تملق گوئی خشک و بے معنی شدہ بود۔''

یہاں آپ نے تاریخ ادبیات ایران وعرب سے ناواقفیت کا ثبوت دیا ہے۔ عربی شاعری میں ''لغت بازی'' کا عنصر عباسی عہد میں دخیل ہوا جب بشار بن برد اور ابونواس جیسے ایرانی نژاد عربی گو شعراء نے دربار خلافت میں بار پایا تھا۔ ان لوگوں نے جاہلی اور اموی شعراء لبید، عنترہ، اخطل، جریر وغیرہ کی فطرت پرستی اور واقعہ نگاری کو صنائع بدائع اور خلوص بیان کو تصنع پر قربان کر دیا۔ بعد میں فارسی شاعری کی نشئت ہوئی تو یہ عناصر اس میں انہی ایرانی نژاد شعراء کے طفیل داخل ہوئے تھے۔

یہ اقتباسات بطور نمونہ پیش کیے گئے ہیں، ورنہ اس مقدمے کے کئی اور مقامات پر بھی گرفت کی جا سکتی ہے۔ بہر کیف، عمر خیام کی رباعیات کی مصوری میں اکبر تجویدی کو کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انھوں نے ایک ایسے شاعر کا کلام منتخب کیا ہے، جو ایک دقیق النظر فلسفی بھی تھا اور جس کے بعض بسیط افکار مو قلم کی دسترس سے ماوراء تھے۔ خیام کی جن رباعیات میں خیالی پیکر (Images) موجود ہیں، ان سے مصور نے بہ طریق احسن فائدہ اٹھایا ہے۔ مثلاً

ہنگام صبوح است وخروش اے ساقی ما و می و کوئ مے فروش اے ساقی
چہ جای صلاح است خموش اے ساقی بگذر ز حدیث و درد نوش اے ساقی

یہ رباعی پڑھتے ہی اس کا خیالی پیکر (Images) چشم تصور کے سامنے ابھر آئے گا۔ مصور نے اس کے نقش میں میکدہ کے دروازے پر بادہ خواروں کا ہجوم دکھایا ہے، جن کے ذو

معنی اشارے اور بلیغ حرکات وسکنات شراب کا تقاضا کر رہے ہیں۔

اکثر رباعیات میں عمر خیام نے لطیف تمثیلات اور شگفتہ تشبیہات سے کام لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی رباعیات کے مطالب ایک تصویر میں منتقل نہیں ہو سکتے تھے، اس لیے اکبر تجویدی نے ایک بدیع اسلوب اختراع کیا ہے۔ وہ تشبیہہ یا تمثیل کے نقوش کو تصویر کے پس منظر میں ہلکے رنگوں میں نمایاں کر دیتے ہیں اور پھر رباعی کا مرکزی خیال تصویر کی پشت پر خاکہ کی صورت میں پیش کر دیتے ہے۔ اس طرح رباعی کے مطالب پوری جامعیت اور اکملیت کے ساتھ تصویر میں منتقل کر دیتے ہیں۔ مثلاً

ما لعبتگانیم و فلک لعبت باز   از روی حقیقی و نہ از روی مجاز
بازیچہ ہمی کنیم بر نطعِ وجود   رفتیم بصندوقِ عدم یک یک باز

تصویر میں ایک حسین عورت بساطِ شطرنج کے سامنے بیٹھی ہے۔ مہرے ادھر ادھر بکھرے پڑے ہیں۔ پس منظر میں چند دھندلے پیکر دکھائی دیتے ہیں، جو ظاہراً پٹے ہوئے مہرے ہیں۔ تصویر کی پشت پر ایک خاکہ ہے، جس میں دست قضا و قدر و اشخاص کو رسی میں جکڑ کر کٹھ پتلیوں کی طرح نچا رہا ہے۔ اس طرح جبریت کا مرکزی تصور پوری طرح سے متشکل ہو گیا ہے۔

تیسری قسم ان رباعیات کی ہے، جن میں مبداء و معاد۔ گردش افلاک، ہستی و نیستی، جبر و تشائم کے بسیط و مجرد (ABSTRACT) افکار کو اشارہ و کنایہ کے رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ ان رباعیات کی تصویروں میں تمثیل و تشبیہ سے کام لیا گیا ہے اور مصور کو اپنے تخیل سے کام لینا پڑا ہے۔ اکبر تجویدی کی اس نوع کی کوششیں بیشتر ناکام ہیں اور وہ خیام کے بسیط افکار کو کماحقہ، مصور نہیں کر سکے۔ انہیں خود اپنی ناکامی کا احساس ہے۔ کہتے ہیں 'در بعض موارد فرمہا و کپوز۔ نہا فدای بیان مطلب شدہ' مثلاً ایک رباعی ہے۔

اے دل چو حقیقت جہاں ہست مجاز   چندیں چہ بری خواری ازیں رنج و نیاز
تن را بقضا سپار و با درد بساز   کایں رفتہ قلم ز بہر تو ناید باز

ظاہر ہے کہ کوئی تصویر ان مطالب کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اکبر تجویدی نے سمندر میں ایک غوطہ زن دکھایا ہے، جس کے چاروں طرف مچھلیاں گھوم پھر رہی ہیں۔ اس تصویر میں جبریت کی توضیح نہیں کی جاسکی، جو رباعی کا نفسِ موضوع ہے۔ بہر کیف، اکبر تجویدی اکثر رباعیات کی نقش گری میں بطرز احسن کامیاب ہوئے ہیں۔ اس مقام پر نامناسب نہ ہوگا، اگر ان کی چند نمائندہ قسم کی تصویروں پر مختصر تبصرہ کیا جائے۔ عمر خیام کی مشہور رباعی ہے ؂

گویند کساں بہشت با حور خوش است   من می گویم کہ آبِ انگور خوش است
ایں نقد بگیر و دست ازاں نسیہ بدار   کآوازِ دہل شنیدن از دور خوش است

تصویر میں ایک جوانِ رعنا ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور بائیں ہاتھ سے اپنی محبوبہ کو جام بلوریں پیش کر رہا ہے۔ اس جام میں انگور کی بیل سے لٹکتے ہوئے ایک خوشہ سے آبِ انگور کی لونڈی ٹپک رہی ہیں۔ حسینہ کا رخ ڈھول تاشے بجانے والوں کی طرف ہے، جو دور پس منظر میں گذرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور اس کا بایاں ہاتھ بے اختیار نوجوان کے پیش کردہ جام کی طرف بڑھا ہوا ہے۔ اسی طرح اس کی ذہنی کشمکش کو مرئی صورت میں دکھایا گیا ہے۔ دور افق میں بدلیوں کے بدلتے ہوئے رنگ پھولوں اور پتوں کو منور کر رہے ہیں۔ تصویر کے پیکر ایرانی حسن و جمال کے مثالی نمونے ہیں۔

رباعی ؂

خیام اگر ز بادہ مستی خوش باش   با ماہ رخی اگر نشستی خوش باش
چوں عاقبت کارِ جہاں نیستی است   انگار کہ نیستی چو ہستی خوش باش

تصویر میں ایک پودے کی گل ریز شاخوں نے دو پیکروں کو اپنی لطیف آغوشوں میں لے رکھا ہے۔ محبوبِ جواں سال نے سفید ریش فلسفی کی گردن میں اپنی مرمریں باہیں حمائل کردی ہیں۔ سال خوردہ مفکر از خود رفتگی کے عالم میں حسینہ کی نرگسی آنکھوں کی گہرائیوں میں شاید عمر رفتہ کے لیل و نہار تلاش کر رہا ہے۔ مصور نے نہایت چابکدستی سے پیر کہن سال کے استغراق و محویت کو اس کے بشرے پر متشکل کردیا ہے، جو اس کی نفسیاتی ژرف بینی کی دلیل

ہے۔اس کے ساتھ ہی ریش سفید اور زلفِ سیاہ کا تقابل خیال انگیز ہے اور حافظ شیرازی کی یاد تازہ کر دیتا ہے:

گر چہ پیرم تو شبے تنگ در آغوشم گیر   صبحدم تا ز کنارِ تو جواں بر خیزم

رباعی ؎

ایں کوزہ چو من عاشق زارے بودست   در بند سرِ زلفِ نگارے بودست
ایں دستہ کہ بر گردنِ او می بینی   دستی است کہ بر گردنِ یاری بودست

یہ تصویر اکبر تجویدی کے شاہکاروں میں سے ہے۔ کوزہ کی ساخت معنی خیز ہے۔ کوزے کے دہانے پر ایک عورت کی شبیہہ ہے، جس کو اس کے چاہنے والے نے آغوشِ شوق میں لے رکھا ہے۔ اس کے دہن سے الف لیلائی کوزے کی طرح دھواں اٹھ رہا ہے، جس نے بلند ہو کر دو عشاق کی صورت اختیار کر لی ہے۔ شاعر کے بشرے سے جو سامنے رکھے ہوئے کوزے کو مخاطب کر رہا ہے، ایک عجیب حسرت آمیز نفسیاتی کیفیت نمایاں ہے۔ تصویر کی پشت پر ایک خاکہ ہے، جس میں ایک کوزے کو ایک حسینہ اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ کوزہ دراصل دنیا کی بے ثباتی اور فنا کا علامتی مظہر (SYMBOL) ہے، جس کو عمر خیام نے بارہا نہایت کامیابی سے استعمال کیا ہے۔

رباعی

گر دست دہد ز مغز گندم نانی   وز می دو منی ز گوسفندی رانی
وآنگہ من و تو نشستہ در ویرانی   عیشی بود آں نہ حدی ہر سلطانی

تصویر کے پیش منظر میں ایک کھنڈر دکھایا گیا ہے، جس کے قریب سرسبز گھاس پر دو چاہنے والے بیٹھے ہیں۔ نوجوان کے دائیں بازو نے ملاطفت اور ملاعبت کے انداز سے اپنی محبوبہ کے گدرائے ہوئے جسم کو سمیٹ رکھا ہے۔ حسینہ کے چہرے پر سپردگی کی کیفیت نمایاں ہوگئی ہے۔ اس کے دائیں ہاتھ میں جام شراب ہے۔ نوجوان کے ہاتھ میں اشعار کی بیاض کھلی ہے۔ لطف یہ ہے کہ کھنڈر کی ایک دیوار نے بھی دوسری شکستہ دیوار کو سہارا دے رکھا

ہے۔ پس منظر میں ایک دربار کا نقشہ دکھایا گیا ہے، جس میں ایک سلطان شان تمکنت سے تخت شاہی پر بیٹھا ہے اور ایک درباری کورنش بجالا رہا ہے۔ تصویر کی پشت پر ایوانِ شکستہ کے قریب شراب کے بھرے ہوئے ساغر رکھے ہیں۔ جوانی کا استغراق اور محبت کی شیفتگی ہمہ گیر فنا کے ساتھ دست و گریباں ہے۔

رباعی

ایں قافلۂ عمر عجب می گذرد　　دریاب دمی کہ باطرب می گذرد
ساقی غم فردای حریفاں چہ خوری　　پیش آر پیالہ راکہ شب می گذرد

تصویر میں صبح صادق کا منظر دکھایا گیا ہے۔ جھلملاتی ہوئی بدلیوں میں ٹمٹماتے ہوئے ستارے دھندلا چکے ہیں۔ افق کے قریب ایک قافلہ گذر رہا ہے، جس کی طرف ایک نوجوان اپنے ہاتھ سے ذو معنی اشارے کر رہا ہے اور شاید اسے حسن طلب کا عنوان بنانا چاہتا ہے۔ ساقی مہ وش نے اپنے ہاتھ میں صراحی تھام رکھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی یہ صراحی نوجوان کو پیش کردی جائے گی۔ تصویر کی پشت کے خاکے میں بھی ایک قافلے کو گذرتے ہوئے دکھایا گیا ہے، جسے روکنے کے لیے فضا میں سے ایک غیبی ہاتھ بلند ہو گیا ہے، جو شاید عمرِ گریزاں کے سیماب پا لمحوں کو ٹھہرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ انسانی کوشش کی ازلی اور ابدی بے چارگی اور بے حاصلی۔

رباعی

یاراں چو باتفاق میعاد کنید　　خود را بجمالِ یک دگر شاد کنید
ساقی چو مئے مغانہ در کف گیرد　　بیچارہ فلاں را بدعا یاد کنید

تصویر میں بہار کا ایک حسین منظر پیش کیا گیا ہے۔ پہاڑ کا دامن ہے۔ ہر طرف سرو اور چنار کے درخت دکھائی دیتے ہیں۔ زمین پر سبزہ مخملیں کا فرش بچھا ہوا ہے، جس میں رنگ برنگ کے پھول گلکاریاں کر رہے ہیں۔ ایک کہنہ چنار کے خمیدہ تنے پر دو محبت کرنے والی روحیں محو اختلاط ہیں۔ دور پس منظر میں ایک اور جوڑا زندگی کے طاق سے عیش کا آخری

قطرہ نچوڑنے میں محو ہے۔ اس عالمِ سرخوشی اور سرشاری میں 'بیچارہ فلاں' کی یاد کیسے آسکتی ہے۔ حبیبِ غربت زدہ کی التجا میں حسرت وحرماں کی اذیت پرور کیفیت نمایاں ہے۔

رباعی

از جرم گل سیاہ تا اوجِ زحل کردم ہمہ مشکلاتِ کلی راحل
بکشادم بندہائی مشکل بحیل ہر بند کشادہ شد بجز بندِ اجل

یہ رباعی سوانحی معلوم ہوتی ہے۔ سقراط اور نیوٹن کی طرح ہر صاحب نظر کو کائنات کی پہنائیوں میں اپنی علمی کم مائیگی کا شدید احساس ہوتا ہے۔ شاید اسی تلخ احساس نے عمر خیام کو شراب وشعر کا دامن تھامنے پر مجبور کیا تھا۔ تصویر میں کتبِ حکمت اور آلاتِ رصد ادھر ادھر بکھرے پڑے ہیں۔ ایک حکیم اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے کھڑا ہے۔ اس کے ہاتھ زنجیروں میں جکڑ دیے گئے ہیں اور زنجیروں کا سرا موت کے عفریت نے تھام رکھا ہے۔ حکیم کے آسمان کی طرف پھیلائے ہوئے ہاتھ دیکھ کر چاند کے پراسرار چہرے پر ذومعنی تبسم نمودار ہوگیا ہے۔ تصویر کی پشت پر ایک حکیم اسی انداز سے پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر کھڑا ہے۔ اس کے پاؤں سے بندھی ہوئی زنجیر کو ایک غیبی ہاتھ ہتھوڑے سے چٹان میں نصب کر رہا ہے۔

رباعی

بر چہرۂ گل نسیمِ نوروز خوشست در صحنِ چمن روئی حل افروز خوشست
از دی کہ گذشت ہر چہ گوئی خوش نیست خوش باش وز دی مگو کہ امروز خوشست

تصویر میں دو محبت کرنے والے محو اختلاط ہیں۔ چاہنے والے کے بشرے پر اضطرابِ مواصلت اور وارفتگیٔ شوق کی وہ لطیف کیفیات نمودار ہوگئی ہیں، جنھیں دکھانا شاعر کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس تصویر میں مصوری شاعری سے بازی لے گئی ہے۔ مزید لطف یہ ہے کہ چنار کے درخت کو انگور کی بیل نے بھی اسی ذوق وشوق سے اپنی آغوش میں لے رکھا ہے، جس طرح چاہنے والے نے اپنی محبوبہ کو، اور پھر سرو کے درخت اور شراب کے

ظروف بھی ایک دوسرے کے قرب سے لذت اندوز ہوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

رباعی

مگذار کہ غصہ در کنارت گیرد   واندوہ مجال روزگارت گیرد
مگذار کتاب ولب جوی ولب کشت   زاں پیش کہ خاک در کنارت گیرد

اس تصویر میں کوزے کی بجائے گلِ کوزہ کو فنا کے علامتی مظہر کے بطور پیش کیا گیا ہے۔ ایک حسینہ کو خاک کے خوفناک عفریت نے اپنے آہنی پنجوں میں جکڑ رکھا ہے۔ اسی عفریت کے پامال کیے گئے لوگوں کے سر اور دست و بازو ادھر ادھر بکھرے پڑے ہیں۔ حسینہ کے ہاتھ سے شراب کی صراحی گر کر دور جا پڑی ہے۔ وہ مضطربانہ انداز سے عفریت کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہی ہے اور بے چارگی سے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ اس خاکِ لئیم میں خدا جانے کتنے گنج ہائے گراں مایہ فنا ہو چکے ہیں۔

رباعی

ہر جرعہ کہ ساقیش بخاک افشاند   در دیدۂ من آتشِ غم بنشاند
سبحان اللہ تو بادہ می پنداری   آبی کہ ز صد دردِ دلت برہاند

یہ تصویر اکبر تجویدی کا شاہکار ہے۔ ''صد دردِ دل'' خوفناک عفریتوں کی صورت میں عقب سے حملہ آور ہو رہے ہیں۔ ایک حسینہ یاس وحرماں کی زندہ تصویر سرنگوں بیٹھی ہے۔ عاشق اسے شراب کا پیالہ پیش کر رہا ہے، جو لازماً فرار کا سامان ہے۔ لاشعور کی الجھنوں کو عفریتوں کی شکل میں پیش کیا ہے، جو ایک نادر اور اچھوتا خیال ہے۔

رباعی

بر رہگذرم ہزار جا دام نہی   گوئی کہ بگیرمت اگر گام نہی
یک ذرہ زحکم تو جہاں خالی نیست   حکمش تو کنی و عاصیم نام نہی

تصویر میں ایک دشتِ خارزار دکھایا گیا ہے۔ ایک شخص دیوانہ وار ایک حسینہ کے تعاقب میں بھاگا جا رہا ہے۔ چشمہ کے پانی سے نمودار ہوتا ہوا حسینہ کا ہیولیٰ زہرہ کی پیدائش

کا منظر یاد دلاتا ہے۔ تعاقب کرنے والے کے کپڑے پھٹ چکے ہیں اور ہاتھ پاؤں کانٹوں کی خراشوں سے لہولہان ہو رہے ہیں۔ عین اس وقت جب کہ وہ ایک جست میں حسینہ کو پکڑ لینا چاہتا ہے، قضا و قدر کا ہاتھ غیب سے نمودار ہوتا ہے اور اس کی گردن کے آگے ایک تیز دھار والی درانتی رکھ دیتا ہے۔ یہ تصویر انسان کی ازلی جستجو اور ابدی حرماں نصیبی کو نہایت اچھوتے انداز سے واضح کرتی ہے۔

رباعی

افسوس کہ نامۂ جوانی طے شد   وآں تازہ بہار زندگانی دے شد
آں مرغِ طرب کہ نامِ او بود شباب   فریاد! ندانم کہ کے آمد و کے شد

تصویر میں ایک خزاں زدہ بے برگ و بار درخت دکھایا گیا ہے۔ شام کا وقت ہے، شفق کی سلگتی ہوئی چنگاریاں خاکستر میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ پیش منظر میں ایک خمیدہ کمر پیرِ فانی عصا ٹیکتا ہوا جا رہا ہے۔ اس کے قریب سے ہی ''جوانی کا پرندہ'' زریں غبار میں لپٹا ہوا اڑتا جا رہا ہے۔ تصویر بے حد عبرت آموز ہے۔

رباعی

با تو بخرابات اگر گویم راز   بہ زانکہ بمحراب کنم راز و نیاز
اے اول واے آخرِ خلقان ہمہ تو   خواہی تو مرا بسوز خواہی بنواز

اس رباعی کا موضوع بڑا نازک ہے۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ معبودِ حقیقی گوشۂ محراب سے مانگی ہوئی دعا کو زیادہ توجہ سے سنتا ہے یا میکدے کے در و دیوار سے بلند ہوتی ہوئی مناجات کو۔ خیام کا خیال ہے کہ ایک رندِ لم یزل کی دعا زیادہ موثر ہوتی ہے۔ تصویر میں ایک زاہد مسجد میں دست بدعا کھڑا ہے اور میکدے سے ایک بادہ نوش کے ہاتھ عالم خود فراموشی میں آسمان کی طرف اٹھ گئے ہیں۔ یہ ماننا پڑے گا کہ 'عابدِ خرابات' کے انداز میں زیادہ خضوع و خشوع پایا جاتا ہے۔ مصور یہ فرق دکھانے میں بدرجۂ اتم کامیاب ہوا ہے۔

رباعی

گویند بحشر جستجو خواہد بود وآں یار عزیز تندخو خواہد بود
از نیکئی محض جز نکوئی ناید خوش باش کہ عاقبت نکو خواہد بود

خیام کی اس منطق کا کیا جواب ہوسکتا ہے۔ تصویر میں خوش عیشی کے سب لوازم موجود ہیں۔ ایک زہد شکن کافر و محو رقص ہے۔ اس کے گھنے بالوں کے تموج میں اس کے گداز جسم کے لطیف خم و پیچ نمایاں ہوگئے ہیں، جن کو نغمات کے تہج نے اور بھی اجاگر کر دیا ہے۔ اس قسم کے ماحول میں قنوطیت کا کیسے گذر ہوسکتا ہے۔

میں نے طوالت کے خوف سے صرف چیدہ چیدہ تصاویر پر تبصرہ کیا ہے، جو میرے خیال میں شاعر اور مصور دونوں کے بنیادی اصول و فکر کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ورنہ دوسری تصاویر میں بھی دعوتِ نگاہ اور ذوقِ نظر کا سامانِ وافر موجود ہے۔ اصولِ فن کے نقطۂ نظر سے اس مرقع کا جائزہ لیا جائے تو سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینا ہوگی کہ اس میں ایران کا روایتی صغیر نگاری (MINIATURE PAINTING) کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ ایل خانی نقاشوں نے اس اسلوب کو ایرانی مصوری میں داخل کیا تھا۔ بعد میں کمال الدین بہزاد کے باکمال ہاتھوں یہ پایۂ تکمیل تک پہنچ گیا۔

اکبر تجویدی سے پہلے فرانس اور جرمنی کے مصوروں نے بھی رباعیاتِ عمر خیام کی تصویر کشی پر طبع آزمائی کی ہے، لیکن وہ مشرقی ماحول اور فضا سے نامانوس تھے۔ اس لیے انھیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے ہاں مشرق کا وہ تصور محض مریضانہ رومانیت کا حامل ہے اور یہ مصور چہرہ کے خدوخال، لباس کی تراش خراش، حاشیہ کی تزئین اور فطری مناظر کی نگارش میں لغزش کر جاتے ہیں۔ اکبر تجویدی کی تصاویر کے پیکر ایرانی ہیں، فضا ایرانی ہے۔ ان کے پیش کیے ہوئے نسوانی پیکر مشرقی حسن و جمال کے شگفتہ نمونے ہیں۔ ان میں فارسی شاعری کی روایتی محبوبہ اپنی تمام کافر سامانیوں اور رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر دکھائی دیتی ہے۔

اکبر تجویدی کی دوسری ممتاز خصوصیت ان کی ماہرانہ خط کشی اور رنگ آمیزی ہے۔

مغربی مصوروں میں ولندیزی مصور رنگ کے بادشاہ تھے اور اس بات کے تاریخی شواہد موجود ہیں کہ مغل مصوروں کی تصاویر تک ان کی رسائی ہوگئی تھی۔ اکبر تجویدی نے رنگوں کے انتخاب اور ان کی لطیف آمیزش میں استادانہ چابک دستی کا ثبوت دیا ہے اور اپنے ملک کی اس بیش قیمت روایتِ فن کی ماہرانہ ترجمانی کی ہے۔

اس مرقع میں 'برہنہ نگاری' (NUDE) کے بھی چند نہایت حسین و جمیل نمونے موجو ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اسلوب مغرب سے مستعار لیا گیا ہے۔ مشرقی مصوری میں اس نوع کی روایت مفقود ہے، لیکن اس پر بے جان نقالی کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا۔ برہنہ پیکروں کے زاویوں کے انتخاب میں اُپج کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

ان خصوصیات کی بنا پر مرقع زیرِ نظر کو جدید ایرانی مصوری کا ایک گراں قدر نمونہ سمجھا جاسکتا ہے۔ ہمارے نوجوان مصور اس سے بہت کچھ استفادہ کرسکتے ہیں۔

(مجلّہ نقوش، لاہور، شمارہ۔ ۶۸، ستمبر ۱۹۵۸ء، ص۔ ۲۳۸۔۲۴۴)

انتخاب عمر خیام

(مع ترجمہ)

قطعه

دوش با عقل این سخن گفتم
کشف کن با من احتمالی چند
گفتم ای مایۂ همه دانش
کرد خواهم ز تو سؤالی چند
گفتم از عمر من شدم بیزار
گفت سوز و بساز سالی چند
گفتم این دور زندگانی چیست
گفت خوابی و یا خیالی چند
گفتمش چیست کدخدائی گفت
اندکی عیش و غصه سالی چند
گفتم اهل ستم چه طایفه اند
گفت گرگ و سگ و شغالی چند
گفتمش چون ستائی ایشان را
گفت بد مهر و بد سگالی چند

گفتم این دل بہوش کی گردد
گفت چون خورد گوشالی چند
گفتمش چیست گفتۂ خیام
گفت پیراست حسب حالی چند

۱۔ کل میں نے عقل سے یہ کہا کہ کچھ اشکالات کا حل ڈھونڈنے میں میری مدد کرو۔

۲۔ اور اس سے کہا کہ اے تمام دانش کے ماحصل، تجھ سے میرے چند سوال ہیں۔

۳۔ میں نے کہا کہ اب اس زندگی سے بیزار ہوگیا ہوں، اس نے جواب دیا کہ چند سال اور خود کو زحمت دو اور سنوارنے کی کوشش کرو۔

۴۔ میں نے پوچھا کہ یہ زندگانی کیا ہے؟ اس نے کہا کہ کچھ خواب و خیالات کا مجموعہ۔

۵۔ اس سے میں نے پوچھا کہ یہ گھریلو زندگی کیا ہے، تو اس نے کہا کہ تھوڑا سا آرام اور باقی پریشانیاں۔

۶۔ میں نے پوچھا کہ یہ ظلم و جبر کرنے والے کس قسم کے لوگ ہیں، اس نے کہا ان میں بعض بھیڑیے اور بعض کتوں اور گیدڑوں جیسے ہیں۔

۷۔ میں نے کہا کہ ان کی تعریف کن لفظوں میں کریں گے، تو اس نے کہا کہ کچھ بداخلاق ہیں اور کچھ بدذات۔

۸۔ میں نے پوچھا کہ اس دل کو کب ہوش آئے گا تو اس نے کہا کہ جب کچھ گوشمالیاں ہو جائیں گی۔

۹۔ میں نے اس پوچھا کہ خیام کی باتیں کیسی ہوتی ہیں تو اس نے کہا کہ وہ بوڑھا اور تجربہ کار ہے اور اس کی باتیں اسی اعتبار سے حسب حال۔

(رباعیات خیام (طربخانہ)، یار احمد بن حسین رشیدی تبریزی (بہ تصحیح: استاد جلال الدین ہمائی)، موسسہ نشر ہما، تہران، ۱۳۶۷ش، ص۔ ۱۶۸)

رباعیات

اسرارِ ازل را نہ تو دانی و نہ من
این حرف معما، نہ تو خوانی و نہ من
ہست از پسِ پردہ گفتگوے من تو
چون پردہ بر اُفتد، نہ تو مانی و نہ من

ازل کے بھید سے نہ تو واقف ہے اور نہ میں۔ یہ دُنیا ایسی پہیلی ہے، جس کو نہ تو بوجھ سکتا ہے، نہ میں۔ میں اور تم تو پردے کے پیچھے (بے خبری میں) باتیں کر رہے ہیں۔ جب یہ پردہ اُٹھے گا تو اس وقت نہ میں موجود ہوں گا، نہ تو۔

دوری کہ درو آمدن و رفتن ماست
آنرا نہ بدایت، نہ نہایت پیداست
کس می نزند و می درین معنی راست
کین آمدن از کجاست، رفتن بکجاست

جس چکر (زمانہ) میں ہمارا آنا جانا لگا ہے، نہ اس کا آغاز ظاہر ہے، نہ انجام۔ کوئی شخص ٹھیک طور پر اِس بارے میں دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یہ آنا کہاں سے ہے اور یہ جانا کہاں کو ہے۔

اول بخودم چو آشنا می کردی
آخر ز خودم چرا جدا می کردی
چون ترکِ منت نبود از روزِ نخست
سرگشتہ بعالم چرا می کردی

جب تو نے ابتدا ہی میں مجھ کو خود سے آشنا کیا تو آخر کار اپنے سے جدا کیوں کر دیا؟ اور اگر روز اول سے مجھے چھوڑنا تیرا مقصد نہ تھا تو دنیا میں سراسیمہ کیوں پھرایا؟

آورد باضطرابم اول بوجود
جز حیرتم از حیات چیزے نفزود
رفتیم باکراہ ندانیم چہ بود
زین آمدن و بودن و رفتن مقصود

پہلے اس نے مجھ میں اضطراب پیدا کیا اور پوری زندگی میں حیرت کے سوا کچھ اضافہ نہ کیا۔ یہاں سے مجبوری میں لے جائے گئے اور کچھ معلوم نہ ہوسکا کہ یہاں آنے، رہنے اور جانے کا مقصد کیا تھا۔

در کارگہ کوزہ گرے بودم دوش
دیدم دو ہزار کوزہ گویا و خموش
ہر یک بزبان حال با من گفتند
کو کوزہ گر و کوزہ خر و کوزہ فروش؟

میں کل ایک کوزہ گر (یعنی کمہار) کے کارخانے میں تھا۔ میں نے وہاں دو ہزار کوزوں کو دیکھا جو گویا بھی تھے اور خموش بھی۔ ان میں سے ہر ایک زبان حال سے مجھ سے کہہ رہا تھا کہ کہاں گئے وہ کوزے بنانے والے، کوزوں کے خریدار اور کوزہ فروش۔

قومی متفکر اند در مذہب و دین
جمعے متحیر اند در علم و یقین
ناگاہ منادے بر آمد ز کمیں
کاے بے خبران، راہ نہ آن ست و نہ این

ایک قوم ہے جو مذہب اور دین کے حوالے سے متفکر ہے۔ ایک جماعت ہے جو علم اور یقین کے بارے میں حیرت زدہ ہے، تبھی اچانک کمیں گاہ سے ایک ندا آئی کہ اے بے خبرو! راہِ حقیقت نہ یہ ہے، نہ وہ۔

دشمن بغلط گفت کہ من فلسفیم
ایزد داند کہ آنچہ او گفت نیم
لیکن چو درین غم آشیان آمدہ ام
آخر کم ازان کہ من بدانم کہ کیم

دشمن غلط طور پر مجھے فلسفی کہتے ہیں۔خدا جانتا ہے کہ جیسا وہ کہتے ہیں، میں ویسا نہیں ہوں، لیکن جب دنیا کے اس غم خانہ میں آیا ہوں تو کیا اتنا بھی نہ جانوں کہ میں کون ہوں؟

گر بادہ خوری تو با خردمندان خور
یا با صنمی سادہ رخے خندان خور
بسیار مخور و رو مکن فاش مساز
اندک خور و گہہ گہہ خور و پنہان خور

اگر شراب پیتے ہو تو عقلمندوں کے ساتھ پیو یا پھر سادہ رخ اور متبسم محبوب کے ساتھ۔ زیادہ نہ پیو، تماشا نہ کرو اور ظاہر نہ کرو بلکہ تھوڑا پیو، کبھی کبھار پیو اور پنہاں پیو۔

من می خورم و مخالفاں از چپ و راست
گویند مخور بادہ کہ دین را اعداست
چوں معلوم شد کہ مے عدوے دین است
واللہ بخورم خون عدو را کہ رواست

میں شراب پیتا ہوں اور میرے مخالف ہر طرف سے یہ کہتے ہیں کہ نہ پیوں کیوں کہ یہ دین مخالف ہے۔ اب جب کہ یہ معلوم ہوگیا کہ شراب دشمن دین ہے، تو بخدا پیوں گا کیوں کہ خون عدو روا ہے!

یاقوت لب و لعل بدخشانی کو
آن راحت روح و راح روحانی کو
مے گرچہ در اسلام حرام است ولے
تو مے خور و غم مخور مسلمانی کو

وہ لعل بدخشاں اور یاقوت جیسے لب کہاں ہیں، اور وہ راحت روح اور روحانی خوشبو کہاں ہیں؟ شراب اگرچہ اسلام میں حرام ہے لیکن تم تو شراب پیو اور اس کی فکر نہ کرو کہ مسلمانی کہاں ہے؟

گویند بہشت و حور و عین خواہد بود
و انجا مے ناب و انگبین خواہد بود
پر کن قدح بادہ و بر دستم نہ
چوں عاقبت کار چنین خواہد بود

لوگ کہتے ہیں کہ جنت میں حور اور خوش چشم حسینائیں ہوں گی، اور بالآخر شراب و شہد میسر ہوں گے۔ جامِ شراب کو پر کرو اور میرے ہاتھوں میں رکھ دو، کیوں کہ آخرکار یہی تو ہونا ہے۔

آمد سحرے ندا ز میخانۂ ما
کاے رند خراباتی و دیوانۂ ما
برخیز کہ پر کنیم پیمانہ ز مئے
زان پیش کہ پر کنند پیمانۂ ما

صبح میخانہ سے یہ آواز آئی کہ اے مست شرابی اور میرے دیوانہ، اٹھو کہ پیمانوں کو شراب سے بھرلیں، اس سے قبل کہ ہمارا وقت پورا ہوجائے۔

بر خود درِ عیش و آرزو بربستم
وز منت ہر ناکس و کس وارستم
گر صوفی مسجدم، و گر راہب دہر
من دانم او چنانکہ ہستم، ہستم

میں نے دنیا کے عیش و آرام سے کنارہ کشی اختیار کی اور ہر کس و ناکس کے احسان سے آزاد ہوگیا۔ اگر صوفی مسجد ہوں تو اپنے واسطے اگر ملت نصاریٰ کا پیشوا ہوں تو اپنے لیے۔ مجھے معلوم ہے کہ میں خود کیا ہوں۔

من بے مئے ناب، زیستن نتوانم
بے بادہ کشیدِ بارِ تن نتوانم
من بندۂ آں دم کہ ساقی گوید
یک جام دگر بگیر و من نتوانم

شراب کے بغیر میری زندگی محال ہے۔ نہ ہی شراب کے بنا میں اپنے بدن کا بار اٹھا سکتا ہوں ۔ مجھے وہ وقت مرغوب ہے، جب ساقی اصرار کرے اور کہے ایک اور جام لو اور میں کہوں، اب معاف کر۔

دانی کہ سپیدہ دم خروس سحری

ہر لحظہ چرا ہمی کند نوحہ گری

یعنی کہ نمودند در آئینہ صبح

کز عمر شبے گزشت و تو بے خبری

کیا تجھے معلوم ہے کہ خروس خانہ صبح کے وقت نوحہ وفغاں کیوں کرتا ہے۔ آئینہ صبح میں وہ اس حقیقت کا مطلب سمجھاتے ہیں کہ ایک رات تیری عمر کی اور گزر گئی اور تم بے خبر ہو۔

رو بیخبری گزین، اگر با خبری

تا از کف مستانِ ازل بادہ خوری

تو بیخبری، بے خبری کار تو نیست

ہر بیخبری را نرسد بے خبری

اگر صاحب ہوش وخرد ہو تو دنیا سے بے نیاز ہو جا۔ تا کہ تجھ میں اہل حقیقت سے فیضیاب ہونے کی استعداد وظرف پیدا ہو جائے۔ چونکہ تو ان راز واسرار سے آشنا نہیں ہے، اسی لیے جو بے خبری میری مراد ہے، وہ تجھے نصیب نہیں ہو سکتی۔

اے بادۂ ناب و اے مئے مینائی
چندان بخورم تُرا منِ شیدائی
کز دور مرا ہر کہ ببیند، گوید
اے خواجہ شراب! از کجا می آئی

اے شراب ناب اور اے مئے مینا، میں تجھے اس قدر پی لوں کہ ہمہ تن شراب ہو جاؤں۔ یہاں تک کہ جو کوئی مجھے دور سے دیکھے، تو مجھے خواجہ شراب کہہ کر خطاب کرے اور پوچھے کہ کہاں سے آرہا ہوں۔

نہ سوے وصال تو مرا دست رسے
نہ طاقتِ ہجرانِ تو دارم نفسے
نہ زہرہ کہ باز گویم، این غم بہ کسے
مشکل کارے، طرفے غمی، خوش ہوسے

یہ میرے دست قدرت سے باہر ہے کہ تیرا وصال مقدر ہو۔ اور نہ ہی ہجر کی ایک گھڑی کو تحمل کرنے کی طاقت ہے۔ نہ ہی یہ مجال کہ غم دل کسی کے روبرو بیان کرسکوں۔ یہ محبت عجب مشکل کام ہے اور یہ غم بھی نایاب ہے اور یہ حسرت بھی عجب حسرت ہے۔

یزداں! خواہم جہاں دگرگون کُندے

اکنوں کنَدی تا نگرم چون کندے

یا نام من از جریدہ ای، بیرون کندے

یا روزی من ز غیب افزون کندے

اے خدا! میری یہ تمنا ہے کہ اس دنیا کو تہہ و بالا کردے اور ابھی کردے تا کہ مشاہدہ کرسکوں کہ کس طرح یہ جہان نو پیدا ہوا۔ یا پھر میرا نام جریدۂ عالم سے خارج کردے یا میرے آسائش روزگار اور رزق میں افزائش کردے۔

اے چرخ چہ کردہ ام ترا راست بگو

پیوستہ فگندۂ مرا در تگ و پو

نانم نہ دہی تا نہ بری کوے بہ کو

آبم نہ دہی تا نہ بری آب ز رو

اے آسماں! سچ بتا کہ میں نے تیری شان میں کیا خطا کی ہے کہ مجھے مسلسل دوڑ بھاگ میں لگا رکھا ہے۔ جب تک تو گلی کوچوں کی خاک نہیں چھنوالیتا، مجھے روٹی نہیں دیتا۔ اسی طرح جب تک میری آبرو ریزی نہیں کرلیتا، مجھے ایک جرعہ آب نہیں دیتا۔

بتخانہ و کعبہ خانہ بندگیست
ناقوس زدن ترانہ بندگیست
محراب و کلیسا و چہ تسبیح و صلیب
حقا کہ ہمہ نشانہ بندگیست

بتخانہ ہو یا کعبہ خانہ کی بندگی، ناقوس کی آواز ہو یا محراب و کلیسا ہو یا تسبیح و صلیب، یہ تمام اظہار عبودیت و بندگی کے مظاہر ہیں اور اہل معرفت ہر جگہ اور ہر صورت کے تقدس کا احترام کرتے ہیں۔

پر خون ز فراقت جگری نیست کہ نیست
شیدائے تو صاحب نظرے نیست کہ نیست
با آنکہ نہ داری سر سوداِ کسے
سودائے تو در ہیچ سرے نیست کہ نیست

کون ایسا جگر ہے جو تیرے فراق میں خون ریز نہیں اور کون سا ایسا صاحب نظر ہے جو تیرا شیدائی نہیں۔ بااین ہمہ کہ تجھے کسی کی پرواہ نہیں، مگر بالطبع ہر کوئی تیرا دیوانہ ہے۔

مئے خوردن و شاد بودن، آئین منست

فارغ بودن ز کفر و دین، دین منست

گفتم بعروس دہر کابین تو چیست

گفتا ز دل خورم تو کابین منست

مے خواری اور خوش رہنا میرا شیوہ ہے اور کفر و دین کے جھمیلے سے بے پروا رہنا میرا دین۔ کیوں کہ میں نے عروس دہر یعنی زمانہ سے جب دریافت کیا کہ تیرا مہر کیا تو اس نے کہا کہ رنج و پریشانی۔

من بندۂ عاصیم، رضائے تو کجاست

تاریک دلم، نور صفائے تو کجاست

ما را تو بہشت ار بطاعت بخشی

این مزد بوَد، لطف و عطائے تو کجاست

میں گنہگار ہوں لیکن تیری صفت ذاتی یعنی رضا کا اثر کہاں ہے۔ میرا باطن سیاہ ہے، لیکن تیرا نور کیوں میرا باطن روشن نہیں کرتا۔ اگر تو نے اپنے احکام کی تعمیل کے عوض میں مجھے جنت عطا کیا تو یہ مزدوری ہوئی۔ میں تری اس عنایت کا منتظر ہوں، جو بلاعوض ہے۔

اے در طلب تو عالمے در شر و شور
در پیش تو درویش و توانگر ہمہ عور
اے باہمہ در حدیث و گوش ہمہ کرّ
اے باہمہ در حضور و چشم ہمہ کور

تجھ تک رسائی کی تمنا میں ہر ذرۂ کائنات تگ و دو میں ہے۔ تیرے نزدیک درویش وتونگر سب ایک جیسے ہیں۔ تو ہر شخص سے گفتگو کر رہا ہے، مگر کوئی سن نہیں پاتا۔ تو سب کے روبرو موجود ہے، لیکن سب تیرے دید سے عاجز ہیں۔

تعارف

(مقالہ نگار حضرات)

ابوالنصر غلام یٰسین آہ دہلوی (وفات ۱۹۰۶ء)

آپ مولانا ابوالکلام آزاد کے بڑے بھائی تھے اور کم عمری میں انتقال فرماگئے۔ لیکن آپ کی دستیاب تحریروں اور کلام سے آپ کے نبوغ علمی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ خیام سے متعلق اردو میں پہلی کتاب تحریر کرنے کا اعزاز بھی آپ کے سر ہے، البتہ ان سے قبل کسی اور زبان میں بھی خیام سے متعلق کسی مستقل کتاب کا سراغ نہیں ملتا۔

مولانا ابوالکلام آزاد (۱۱ر نومبر ۱۸۸۸ء ۔ ۲۲ر فروری ۱۹۵۸ء)

عظیم مجاہد آزادی، عالم دین، صحافی، ادیب، مصنف، دانشور، آزادی کے بعد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم۔ آپ کی تصانیف میں بطور خاص ترجمان القرآن، غبار خاطر، تذکرہ وغیرہ کے علاوہ سیکڑوں مضامین وغیرہ شامل ہیں۔ الہلال اور البلاغ آپ کی صحافتی عظمت کے نشان ہیں۔ بحیثیت وزیر تعلیم آپ نے بنیادی اصول و

ضوابط وضع کیے۔ آئی آئی ٹی، آئی آئی ایس بنگلور، ساہتیہ اکادمی، نیشنل میوزیم اور آرکائیو وغیرہ آپ کی ہی فکری میراث ہیں۔

جواد علی خان عالی

ادیب اور مصنف۔

انور مسعود (پ۔ ۸ر نومبر ۱۹۳۵ء)

اردو اور پنجابی کے مقبول شاعر اور فارسی اسکالر۔ آپ پنجاب ے شہر گجرات میں پیدا ہوئے۔ لاہور میں سکونت رہی۔ وہیں سے فارسی میں ایم اے کرنے کے بعد اورینٹل کالج، لاہور اور دوسرے اداروں میں تدریس کی خدمات انجام دیں۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن (۔۱۹۸۷ء)

آپ دارالمصنفین اعظم گڑھ سے وابستہ رہے۔ حلقۂ شبلی کے متاخرین میں آپ کی خدمات فارسی زبان و ادب کے حوالے سے غالباً شبلی کے بعد سب سے

اہم ہیں۔ آپ نے زبان و ادب اور تاریخ و تصوف کے حوالے سے متعدد کتابیں تحریر کیں۔ ان میں کئی جلدوں پر مشتمل بزم صوفیہ، بزم مملوکیہ اور بزم تیموریہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

پروفیسر محمد اقبال

محمود شیرانی کے بعد کے اہم فارسی محققین میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ اورینٹل کالج، لاہور سے وابستہ رہے۔

پروفیسر سیّد امیر حسن عابدی (۱۹۲۱ء۔۴ر مئی ۲۰۱۱ء)

فارسی کے معروف استاد اور محقق۔ آپ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی سے وابستہ تھے۔ آپ نے متعدد اہم مخطوطات کی تلاش، تشخیص و تصحیح و تدوین کا اہم کارنامہ انجام دیا، جن میں ''یوگ بششٹ'' خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ فارسی زبان ادب سے متعلق مختلف موضوعات پر تحقیقی مقالات کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

شبیر احمد خاں غوری

آپ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات سے وابستہ تھے اور علوم و ثقافت اسلامی سے متعلق اہم تحقیقی کارنامے آپ کی یادگار ہیں جو بیشتر مجلہ علوم اسلامی اور فکر و نظر میں شائع ہوئے۔

ڈاکٹر نذیر احمد (۳/ جنوری ۱۹۱۵ء - ۱۹/ اکتوبر ۲۰۰۸ء)

ممتاز محقق اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں فارسی کے استاد۔ آپ نے فارسی زبان و ادب، تاریخ و ثقافت، لغت اور زبان شناسی وغیرہ کے حوالے سے سیکڑوں تحقیقی مقالے شائع کیے۔ آپ کی تصانیف اور تدوین و تصحیح کردہ کتابوں کی تعداد پچاس سے زائد ہے۔ آپ کے اہم کارناموں میں قدیم دیوان حافظ کی بازیافت و تصحیح کے علاوہ نایاب دواوین و کتب اور قدیم ترین لغات فارسی و اردو کی تصحیح و تدوین شامل ہیں۔

امتیاز علی خاں عرشی (۸/ دسمبر ۱۹۰۴ء - ۲۸/ فروری ۱۹۸۱ء)

اردو اور فارسی کے ممتاز محقق اور غالب شناس۔ اردو، فارسی، عربی اور پشتو زبان و

ادب کے علاوہ تاریخ و اسلامیات سے متعلق ان کے سوا سو سے زائد مقالات ہند و پاکستان کے ادبی و تحقیقی مجلوں اور رسالوں میں شائع ہوئے۔ ان میں تقریباً پچیس مقالے راست طور پر فارسی زبان و ادب و ثقافت سے متعلق ہیں۔ طویل عرصے تک رام پور رضا لائبریری کے ڈائرکٹر رہے۔ وہاں موجود عربی، فارسی اور اردو مخطوطات کی فہرست تیار کی۔ اردو، فارسی، عربی اور اسلامیات سے متعلق موضوعات پر تحقیقی کارنامے انجام دئے۔ غالبیات اور سفیان ثوری سے متعلق آپ کے تحقیقی کام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

عبدالباری آسی

آپ شاعر، محقق و ناقد ہیں اور شعریات کی بحث کے مرد میدان۔ آپ کی تصانیف میں بصائر، پھول وتی، رباعیات خیام پر ایک تحقیقی نظر، تذکرۂ معرکۂ سخن، تذکرۃ الخواتین وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں، جو عام طور سے آزادی سے قبل مطبع نولکشور، لکھنو سے شائع ہوئیں۔

مولوی غلام الثقلین

آپ کا تعلق حالی کے گھرانے سے تھا۔ خیام سے متعلق اردو میں پہلا مضمون آپ نے تحریر کیا۔ آپ کی صاحبزادی صالحہ عابد حسین ایک صاحب طرز ادیبہ تھیں۔ آپ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی اور میرٹھ سے ایک رسالہ ''عصر جدید'' جاری کیا۔ سیاست میں بھی فعال رہے۔

کرنل بھولا ناتھ

آپ انگریزی عہد میں فوج میں ملازم تھے اور غالباً موجودہ عراق میں بھی خدمات انجام دی تھیں۔ آپ کا تعلق لکھنو سے تھا اور زبان و ادب سے گہرا شغف تھا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مقدمہ میں آپ کی انگریز بہو کی شکایت پر ۱۹۲۷ء میں آپ کو ۵۰۰ روپے کا ہرجانہ دینا پڑا تھا۔

برہان احمد فاروقی (۱۹۰۴ء۔۱۹۹۵ء)

اسلامی اسکالر، مفسر اور فلسفی۔ اسلامی فلسفہ سے متعلق آپ کی تحریریں قابل قدر

ہیں۔ ان میں بطور خاص "منہاج القرآن" قابل ذکر ہے۔ آپ کے استاد ڈاکٹر سید ظفرالحسن لاہور کے معروف اساتذہ اور علامہ اقبال کے دوستوں میں تھے۔ آپ نے علامہ سے بھی کسب فیض کیا اور اپنی پی ایچ ڈی کا مقالہ انھیں کے مشورے پر لکھا۔

حسان ندوی

مصنف، مترجم ومحقق۔

قیصر سرمست

قیصر سرمست کا تعلق حیدرآباد سے ہے۔آپ نے بیشتر سائنسی موضوعات پر لکھا ہے جن کی اہمیت زیادہ تر درسی نوعیت کی ہے۔

ضیاء احمد ایم۔ اے (۔وفات ۱۹۷۴ء)

ڈاکٹر ضیا احمد بدایونی شعبۂ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے معروف اساتذہ میں تھے۔ آپ نے الہ آباد سے تعلیم حاصل کی۔ فارسی زبان و ادب کے علاوہ تاریخ و ثقافت، تصوف اور اسلامیات سے متعلق بھی لکھا ہے۔ آپ کے مقالات و مضامین کے تین مجموعے بعنوان مسالک ومنازل، مباحث و مسائل او رجلوۂ حقیقت کے نام

سے شائع ہوئے ہیں۔ آپ نے ۱۹۲۵ء میں ''مجموعۂ قصائد مومن'' بھی شائع کیا۔

خاقان حسین عارف

خاقان حسین عارف کا تعلق دہلی سے تھا اور اجداد قم، ایران سے آئے تھے۔ فارسی کے خوش فکر شاعر تھے۔ آپ کے والد نواب مظفر حسین خان سرخوش اور دادا علی حسین خاں تمنا بھی فارسی کے شاعر تھے۔ فارسی زبان و ادب سے متعلق آپ کے مقالے ۲۰ویں صدی کے اوایل میں شائع ہوئے۔

اکبر حیدری کاشمیری

اکبر حیدری کاشمیری ایک سنجیدہ محقق رہے۔ آپ نے فارسی اور اردو زبان و ادب بالخصوص اودھ کے رثائی ادب سے متعلق اہم تحقیقی کام انجام دیا۔ مخطوطات کے حوالے سے بھی آپ کی نگارشات قابل ذکر ہیں۔

محمد اسحاق ایم۔ اے

آزادی کے بعد جن اساتذہ نے ہندوستان میں فارسی تدریس و تحقیق کا ذمہ لیا، ان

میں ایک نام آپ کا بھی تھا۔ جدید فارسی شاعری کا انتخاب ایک اہم اور مقبول عام کام ہے۔ آپ نے کلکتہ میں انڈو ایران سوسائٹی کے قیام اور وہاں سے مجلّہ جاری کرنے میں اہم رول ادا کیا۔

محمود واجد

اردو کے ادیب اور ناقد۔ ادبی مجلّہ کے مدیر۔

سید علی عباس جلال پوری (۱۹/اکتوبر ۱۹۱۴ء۔ ۶/دسمبر ۱۹۹۸ء)

گورنمنٹ کالج، لاہور سے وابستہ فلسفہ کے معروف استاد اور مصنف۔ فلسفہ، ادب، تصوف اور ثقافت کے حوالے سے ایک درجن سے زیادہ کتابیں شائع کیں۔

اخلاق احمد آہن

شعبۂ فارسی، جواہرلعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی میں پروفیسر۔ فارسی اور اردو کے شاعر اور نقد و تحقیق سے شغف۔ تقریباً سو مقالات و مضامین کے علاوہ اب تک

بیس سے زائد کتابیں زبان و ادب اور تاریخ و ثقافت سے متعلق شائع ہوچکی ہیں، جن میں مولفہ، مترجمہ اور تصحیح شدہ کام شامل ہیں۔ امیر خسرو، بیدل، داراشکوہ اور ہندایرانی ادب سے خصوصی دلچسپی۔ متعدد علمی، ثقافتی و تحقیقی اداروں سے وابستگی اور بشمول ایران اور ترکی مختلف ممالک کا علمی سفر۔

کتابیات

۱۔ احمد، پروفیسر نذیر و دیگر، یادگارنامہ فخرالدین علی احمد، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۹۴ء

۲۔ اقبال لاہوری، کلیات اشعار فارسی مولانا اقبال لاہوری، (باہتمام احمد سروش)، انتشارات سنائی، چاپ ہفتم، ۱۳۷۶ش

۳۔ انوشہ، حسن، دانشنامہ ادب فارسی، جلد چہارم، بخش دوم، سازمان چاپ و انتشارات، تہران، ۱۳۷۵ش

۴۔ بچن، ہری ونس رائے، مدھوشالہ (ہندی)، ہند پاکٹ بکس، نئی دہلی، نویں شردھانجلی ایڈیشن، ۲۰۰۶ء

۵۔ برزی، اصغر، خیام نامہ، انتشارات اعظم بناب، ۱۳۷۶ش

۶۔ تفضلی، آذر و مہین فضائلی جوان، فرہنگ بزرگان اسلام وایران، بنیاد پژوہشہای اسلامی، بنیاد قدس رضوی، مشہد، ۱۳۷۲ش

۷۔ خاں، رشید حسن، ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ، اتر پردیش اردو کادمی، لکھنؤ، ۱۹۹۰ء

۸۔ خرمشاہی، بہاء الدین، فرہنگ اصطلاحات علوم و تمدن اسلامی، انتشارات

آستان قدس رضوی، مشہد، ۱۳۷۲ش

۹۔ خرمشاہی، بہاء الدین (بہ کوشش)، رباعیات خیام با ترجمہ انگلیسی (بہ تصحیح و تحشیہ۔ محمد علی فروغی و قاسم غنی)، انتشارات ناہید، تہران، ۱۳۷۳ش

۱۰۔ دشتی، علی، دمی با خیام، انتشارات اساطیر، ایران، ۱۳۷۷ش

۱۱۔ دہلوی، مولوی سید احمد، فرہنگ آصفیہ، جلد اول۔ سوم، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، دوسرا ایڈیشن، ۱۹۸۷ء

۱۲۔ رشک، میر علی اوسط، نفس اللغہ، اتر پردیش اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۷ء

۱۳۔ رضوی، مولوی سید تصدق حسین، لغات کشوری، دارالاشاعت اردو بازار، کراچی، بے تا

۱۴۔ رفیع، محمد، جامع اللغات اردو، الہ آباد، بارنہم، ۱۹۶۴ء

۱۵۔ زرین کوب، دکتر عبدالحسین، با کاروان حلّہ، انتشارات علمی، تہران، ۱۳۷۲ش

۱۶۔ سبحانی، استاد محقق جعفر، فرہنگ عقاید و مذاہب اسلامی، جلد ۱۔۴، انتشارات توحید، میدان شہداء، قم، ۱۳۷۱ش

۱۷۔ شبلی نعمانی، علامہ، شعرالعجم، جلد اول، دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ، ۲۰۰۴ء

۱۸۔ شفیعی کدکنی، محمد رضا، صور خیال در شعر فارسی، انتشارات آگاہ، تہران، ۱۳۵۸ش

۱۹۔ شمیسا، سیروس، فرہنگ تلمیحات، انتشارات فردوس، تہران، ۱۳۷۸ھ ش

۲۰۔ شیرانی، مظہر محمود، مقالات حافظ محمود شیرانی، جلد پنجم و ششم، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع اول، ۱۹۷۰ء

۲۱۔ عروضی، نظامی، چہار مقالہ (بہ اہتمام۔ دکتر محمد معین)، انتشارات امیر کبیر، تہران، ۱۳۶۴ش

۲۲۔ علیرضا، دکتر سید، تذکرہ نویسی فارسی در ھند و پاکستان، تہران، ۱۹۶۴م

۲۳۔ فرزاد، مسعود، منظومۂ خیام وار فیتز جرالد، تہران، ۱۳۴۸ش

۲۴۔ کتابخانہ رضا، رامپور، فہرست نسخہ ہای خطی فارسی، جلد اول، ۱۹۹۶م

۲۵۔ کیا، دکتر زہرای خانلری، فرہنگ ادبیات فارسی دری، انتشارات بنیاد فرہنگ ایران، تہران، ۱۳۴۸ش

۲۶۔ مسعود، انور، فارسی ادب کے چند گوشے، عاقب پبلیشرز، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء

۲۷۔ ندوی، علامہ سید سلیمان، خیام، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۸۸ء

۲۸۔ ہدایت، جہانگیر، خیام صادق، نشر چشمہ، تہران، چاپ سوم، ۱۳۸۴ش

29. Ivanow, Wladimir, *ConciseDescriptive Catalogue of the Persian Manuscripts*, The Asiatic Society, Calcutta,1924

30. Kaul, R. K., *Studies in William Jones: An Interpreter of Oriental Literature*, IIAS, Shimla, 1995

31. Lefevere, Andre, *Translation, Rewriting, and the Manipulation of Literary Fame,* Routlegue, London, first edition, 1992

32. Rypka, Jan, *History of Iranian Literature*, Dordrecht, 1968

33. Mahfuz-ul-Haq, M., *The Ruba'iyat of Umar-i-Khayyam*, The Royal Asiatic Society of Bengal, Calcutta, 1939

34. Tirath, Swami Govind, The Nector of Grace, Allahabad, 1941

35. Indo-Iranica quarterly(Omar Khayyam number), Vol.33, March-Dec.1980, No.-1-4, Iran Society, Calcutta

(نوٹ: یہاں ان رسائل کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، جن سے مضامین اخذ کیے گئے ہیں، کیونکہ ان کا اندراج مضامین کے ذیل میں ہو چکا ہے۔مرتب)

☆☆☆

پروفیسر اخلاق آہن

کی مولفہ، مرتبہ کتابوں کا تعارف:

تالیف:

ہندوستان میں فارسی صحافت کی تاریخ

تالیف کے کئی سال بعد ۲۰۰۸ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔٦ سے شائع ہوئی۔ جہاں تک ہندوستان میں فارسی صحافت کے آغاز کی بات ہے، اردو صحافت کی طرح اس کا عہد بھی انیسویں صدی کی تیسری دہائی ہے۔ اردو صحافت پر کتابیں پڑھنے کو مل جاتی ہیں، لیکن فارسی صحافت کی تاریخ کے حوالے سے یہ تحقیقی کارنامہ نقش اول کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اس کا ترجمہ اور اشاعت فارسی ملکوں میں بھی ہو رہا ہے۔

مسائلہ تمثیل در ادبیات فارسی

یہ کتاب ۲۰۰۰ء میں شائع ہوئی۔ اس میں تمثیل کی تعریف، اس کی تفہیم سے متعلق غلط فہمیوں کی شناخت، اس کی تاریخ اور فارسی ادب کے ساتھ عالمی ادب میں اس کے رواج پر تفصیلی گفتگو کے ساتھ ساتھ سبک ہندی میں اس ادبی ہنر کے استفادہ کو صائب اور بیدل عظیم آبادی کی شاعری کے حوالے جائزہ لیا گیا اور تمثیل کے شعری اور نثری نمونے بھی پیش کیے گیے ہیں۔

Amir Khusraw's India

۲۰۱۴ء میں بہ یک وقت فرانس، ہانگ کانگ اور ہندوستان سے شائع ہوئی۔ یہ بنیادی طور پر ایک کافی ٹیبل کتاب ہے، جس میں امیر خسرو، ان کے معاصر عہد، معاصرین اور متاخرین کے علاوہ ان کی شاعری میں ہندوستان کی تصویر کشی اور ہندوستان کے تعلق سے ان کے تصور کو متعارف کرایا گیا۔اس میں عہد خسرو کی تاریخی عمارتوں کی تصاویر کے علاوہ مغلیہ عہد سے قبل کے مخطوطات سے نایاب میناطوری نقاشی کے نمونے وغیرہ شامل ہیں۔

شعرنو و سہراب سپہری

ایران میں جدید شعری رویہ جو شعر نو کے عنوان سے جانا گیا۔ اس رویہ کے ابتدا اور ارتقا کے عوامل، اس رویہ کے بانی نیما اور ان کے معاصرین و پیروکاروں بالخصوص سہراب سپہری کے حوالے سے تنقیدی بحث۔ سپہری سبک ہندی سے بھی متاثر ہے۔

۱۸۵۷ء: ساجھی شہادت، ساجھی وراثت

ہندی میں لکھا گیا یہ مونوگراف ۲۰۰۷ء مین انقلاب ۱۸۵۷ء کے ڈیڑھ سوسالہ تقریبات کے موقع پر حکومت ہند کی طرف سے شائع ہوئی۔ اس میں مختصر طور پر اس عظیم تاریخی واقعہ کے مختلف پہلوؤں کا تعارف ہے۔

ترتیب:

مقالات مولانا عرشی

۲۰۰۷ء میں شائع ہوئی۔ فارسی اور مشرقی علوم کے معروف محقق مولانا امتیاز علی خان کے ان مقالات کا مجموعہ ہے، جو فارسی زبان و ادب اور ثقافت سے متعلق ہیں اور تقریباً پچاس سال کے ان کے علمی سفر کے دوران برصغیر کے مختلف جرائد و رسائل میں شائع ہوئے۔ انھیں جدید اصولوں کے تحت ایڈٹ کر کے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔

آصفی رام پوری

آصفی رام پوری فارسی کے ان بڑے شعراء میں جن سے ادبی دنیا نابلد ہے۔ مولانا عرشی نے موصوف شاعر کے دواوین کے حوالے سے مفصل مقالہ لکھا اور ان کے شاعرانہ کمالات کی نشاندہی کی۔ یہ اہم تحریر کتابی شکل میں ڈاکٹر آہن کے مبسوط تنقیدی مقدمہ کے ساتھ ۲۰۰۷ء میں شائع کیا گیا۔

امیر خسرو

۲۰۰۶ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں منعقدہ بین الاقوامی امیر خسرو سیمینار میں پیش کیے گیے فارسی، اردو، ہندی اور انگریزی مقالوں کا مجموعہ۔ معاون مرتب۔

کلیات رباعیات امیر خسرو

کئی برسوں کی محنت شاقہ کا نتیجہ۔ ہندوستان اور بیرون ملک موجود امیر خسرو کے مخطوطات آثار سے جمع کیے تمام رباعیات کا مجموعہ معہ مقدمہ۔ امیر خسرو کے حوالے سے اپنے طرز کی اولین کوشش۔

میرزا بیدل

پروفیسر نبی ہادی کا مونوگراف جو زبان و بیان کی شستگی کو خوبصورت مرقع ہے۔ اسے عام کی نیازات کے پیش نظر نئے طرز سے ترتیب دیا گیا۔ مرتب کے مقدمہ کے علاوہ معروف دانشور سید شاہد مہدی کا پیش گفتار شامل ہے۔ ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا۔

ہندی فارسی ڈکشنری

سنٹرل ہندی ڈائرکٹوریٹ، حکومت ہند کے زیر اہتمام اور ڈاکٹر اخلاق آہن کے زیرنگرانی مرتبہ۔

نصاب فارسی

جواہرلعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی میں ایم اے اردو کے طلباء کے لیے فارسی نصاب، جو کلاسیکی فارسی شعر و نثر پر مشتمل ہے۔

دھوپ چھاؤں

امریکہ میں مقیم اردو کے بزرگ شاعر منموہن عالم کی غزلوں کا مجموعہ معہ مقدمہ۔

آل احمد سرور: فکر وفن

معروف ادیب، ناقد اور دانشور آل احمد سرور کے صد سالہ یوم پیدائش تقریبات کے موقع پر قومی سیمینار کے تحت پیش کیے گیے مقالات کا مجموعہ۔

ترجمہ:

ادھوری تصویر

افغانستان خانہ جنگی کے دوران لکھے گیے دری پشتو افسانوں کے انتخاب کا ہندی ترجمہ۔

میرا جیون میرا سنگھرس

تاریخ ساز شخصیت اور معروف مجاہد آزادی خان عبدالغفار خان کی آپ بیتی کا ہندی ترجمہ معہ مبسوط مقدمہ۔

شعری مجموعہ:

سرور

اردو نظموں اور غزلوں کا مجموعہ۔ معروف دانشور اور فلسفی منندر ناتھ ٹھاکر اور سہیل ہاشمی کے مقدمہ کے ساتھ۔

سوچنے پہ پہرا ہے

ناگری خط میں معروف طویل نظم "سوچنے پہ پہرا ہے!" کے علاوہ دیگر منتخبہ اردو نظموں اور غزلوں پر مشتمل۔

زیر طبع:

بیدل شناسی (مقدمہ و ترتیب و تحقیق)
دی لیگیسی آف داراشکوہ (تنقید و تحقیق)
انڈو پرشین لٹریچر (تنقید و تحقیق)
مکاتیب محب اللہ شاہ الہ آبادی (مقدمہ و تدوین و تحقیق)
امیر خسرو اینڈ ہیز لیگیسی (تنقید و تحقیق)
کلیات رباعیات امیر خسرو (مقدمہ و تدوین و تحقیق)
مقالات نذیر احمد (مقدمہ و ترتیب)
فارسی ہندی ڈکشنری

پتہ:
سنٹر آف پرشین اینڈ سنٹرل ایشین اسٹڈیز،
اسکول آف لنگویزز، جواہرلال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔۶۷
akhlaq.ahan@gmail.com

KHAYYAM-SHANASI

by

Akhlaque Ahmad 'Ahan'

..... بلاشبہ شعرائے ایران کے درمیان کوئی ایسا نظر نہیں آتا' جسے خیام کی مانند عالمی شہرت ملی ہو۔

(مجتبیٰ مینوی' معروف ایرانی اسکالر)

.... 'مغربی خیام' یعنی فٹزجیرالڈ کی انگریزی رباعیوں میں جو سلاست وعذوبت اور حسن ترکیب و تاثیرِ بیان پایا جاتا ہے' اس کے سامنے تمام ترجمے اس طرح نظر آتے ہیں' جیسے کسی اصلی فارسی نظم کے مقابلے میں اس کا بے اثر لفظی ترجمہ۔ فارسی شاعری اور مغربی ادبیات اصولاً اس درجہ باہم مختلف ہیں کہ دونوں میں تباین و تضاد کا ایک اٹلانٹک بہہ رہا ہے۔ اسے عبور کرنے میں صرف فٹزجیرالڈ ہی کی ہمت کام کر گئی۔

(مولانا آزاد)

.... گزشتہ سو برس میں خیام کی رباعیات کے جو ترجمے ہوئے اور جو رسالے اس پر لکھے گئے ان کی فہرست بنانا محال ہے۔

(پیر پاسکال' ڈنمارک کے محقق اور خاور شناس)

.... خیام کی دوسری قسم کی شراب اخلاص کی بوتل میں بند ہے۔ چوں کہ زہاد و عباد کے نزدیک بادۂ مے' رندی و اوباشی کی علامت سمجھی جاتی تھی اور یہ زہاد و عباد تمامتر تلبیس و مکر و زور اور فریب خلق میں مبتلا رہتے تھے۔

(سید سلیمان ندوی)

.... خیام کی اقلیم سلطنت تمام عالم پر محیط ہے۔ اس کی امارت کے آگے ایک دنیا نے سر تسلیم ونیاز خم کیا ہے۔ اس کا طلسم جہانگیر ہے۔ اس کی رباعیاں' اس کی زندگی کے گمنام گوشے' اس کا فلسفہ و فکر' اس کے علمی کارنامے' اس کے دوست و معاصر؛ یہ سب گذشتہ ایک صدی سے مشرق و مغرب کے علمی و ادبی حلقوں میں دلچسپی کا موضوع بنے ہوئے ہیں۔

(اخلاق آہن)

....(اسی کتاب سے)

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
www.ephbooks.com

978-93-86486-94-3